

خوب صورت گیت نیوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

جولائی 2012

نا اعلیٰ

مجلد نمبر 1

PDF BOOKS FREE PK

مسافر

پہلی سنسنی خیز داستان کی
چوتھی قسط اندر کے صفحات پر

خبریں اور لائحہ عمل میں فرق کرنا،
معنوں کا ایک سبق آموز رنگ

خواب

تنویر ریاض 163

محفل شعروں

قاریین 160

آپ کے ہاتھوں ہی ایک نغمہ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

سپنس کی مجلس شاد ورت قارئین کی توجہ
شری باتیں، گلے شکے اور غلوں مشورے

آپ کے خط

مدیر اعلیٰ 12

انشائیہ

جون ایلیا 11

اس کائنات میں شعور کے بجٹے
ہوئے اختیار کا رابطہ پر فنکارانہ

کل وکلار سے آپ جتنا ایک
سائنس کے نوا کی روداد حیات

میسافر

ناصر ملک 108

کانچ کی پٹری

رجسٹر ہلال 171

نہ سو سالہ ماہر کی
سال

سائے کے تعاقب میں تھکن پان
والی ایک سینہ کی ہوشیاریاں

صالح صائم

ایم اے راحت 47

غزنی فانی

ڈاکٹر ساجد امجد 20

ماضی کا آئینہ با اختیار اور اختیار و قانون
کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

عظیم شہزاد بادشاہ اور عظیم
پیغمبر حضرت سلیمان کی روداد حیات

حضرت سلیمان

رضوانہ ساجد 233

نہلے پورے

سلیم انور 229

ایک ایسے صوبہ ساز کا قصہ
نہ اوقات کی سنگینی کا احساں نہ تھا

لب حاصل ایک پیاسے
ہونے کی حماستوں کا قصہ

اپنا بچہ

منظر امام 93

پیشکش

انوار صدیقی 62

اسرار اور تحریر کے پردے میں
لیٹنا ایک منفرد طویل ماحول

ایک فری چوک سے چوڑکا
دینے والے دلچسپ واقعات

گھٹیا حرکت

عبدالقیوم شاہ 249

حیثیت ہمارا

شرعباس 245

بے ستمی اور کم فہم
سینہ کی خوش فہمیاں

روسیوں کے روسیوں
ہرنوں کی سنگ دلی کا قصہ

سیدی با

ملک صدقہ حیات 110

شرارتی

مختار آزاد 97

اپنے سرگز سے بننے والے
چند شرارتی دوستوں کا ماجرا

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکے
اقتباسات، سکرینز اور تہذیب کے آئینے

کترینہ

ان اڑہ 000

دشت امریک

عائشہ فاطمہ 254

ایک لڑکے کے بھرے ہوئے کبھی جبر
مکمل مل کے نگہداشت کا محراب گزیریاں

بندگیوں میں بھٹکنے والے
ایک انسان دوست مجسمہ گروہ

جیسا تیسرا

کاشف زبیر 143

چور کا بھائی

بابر نعیم 135

نظروں سے اوجھل رہنے والی
پراسرار شخصیت کی ایک خوفناک جھلک

شعور

نام گہری ہو گئی ہے۔ دونوں وقت مل رہے ہیں اور مجھے نواب مرزا شوق لکھنوی کی زہرہ اور اراق اور شہرہ آفاق مثنوی ”زہر مشق“ یاد آ رہی ہے جو میں نے آٹھ نو برس کی عمر میں سنی تھی اور وہی گیارہ برس کی عمر میں پڑھی تھی۔ اس حشر انگیز مثنوی کا میرے خواب خواب لڑکپن کی دنیا، دنیا نہیں بلکہ میرے لڑکپن کی کائنات کا ایک مرطاری تھا۔ یہ مثنوی شاعری اور معشوقانہ شاعری کا ایک معجزہ ہے۔

میں مشق و حسن کے رشتے کے ایک خاص احساس کی حالت میں دیوان غالب تو کیا خدائے سخن میری کلیات تک کو ”زہر مشق“ پر وارسکا ہوں۔ آپ میں سے اگر کوئی صاحب میری اس بات کو غلط قرار دے تو میں ان سے کوئی حجت اور نگر نہیں کروں گا۔ یہ تو احساس اور تاثر کا معاملہ ہے اور احساس و تاثر کا بھلا حجت اور نگرار سے کیا اسطرح! ہاں تو اس وقت مجھے ”زہر مشق“ کا ایک شعر، ایک مجب حال خیزی کے ساتھ یاد آ رہا ہے۔

رخ پہ گیسو ہوا سے ہلتے ہیں
چلیے اب دونوں وقت لیتے ہیں

..... دونوں وقت لیتے ہیں“ سے میرے ذہن میں اچانک ایک لفظ ابھرا ہے اور وہ لفظ ہے انسان۔ یہ لفظ میرے ذہن میں اس لیے ابھرا ہے کہ انسان میں بھی دو کیفیتیں ملتی ہیں۔ ایک کیفیت خیر ہے اور دوسری شر۔ اب یہ ایک الگ بات ہے کہ بعض اوقات یا اکثر اوقات انسان سراپا شر نظر آتا ہے۔ اس لفظ یعنی انسان کا ”نادر“ یا عربی قواعد کی اصطلاح میں ”بنا“ الف، نون، سین یعنی ”انس“ ہے۔ انس کا ایک تلفظ ”انس“ ہے اور دوسرا تلفظ ”انس“ اس کے معنی ہیں خوش خلق، ہنسار اور ایک دوسرے سے مانوس ہونا۔ (غیرہ)

پہلا لفظ انسان کی اصل اور اس کے مادے کا نام ہے ہوا۔ اب میں انسان کے معنی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس لفظ کے معنی کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان وہ جاندار ہے جس کا مادہ ہوا ہے اور وہ سب لفظوں کا اس کے ساتھ کامل کے ساتھ ہونا اور اس سے اعلیٰ اور اشرف حیثیت رکھنا

کامل، مہم، انسان وہ (مستقامت) جاندار ہے جو راست کار، راست کوش اور درست راستے پر گامزن ہو اور اپنی نوع کے دوسرے افراد سے اعلیٰ رہے۔

اس مرحلے پر آپ بھی وہی کچھ سوچ رہے ہوں گے جو میں سوچ رہا ہوں اور وہ یہ کہ لغت کے اعتبار سے انسان کے جو معنی ہیں کیا ان معنی سے ہماری یعنی انسانوں کی اکثریت کوئی دور کا بھی تعلق رکھتی ہے؟

”کیا انسان واقعی وہ جاندار ہے جو راست کار، راست کوش اور درست راستے پر گامزن ہو؟“
”ہرگز نہیں۔“

”کیا انسان واقعی وہ جاندار ہے جو اپنی نوع کے دوسرے افراد سے اعلیٰ رکھتا ہو؟“
”ہرگز نہیں۔“

اس گفتگو کا جو پر مایہ نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ ہم یکسر بے معنی اور مہمل ہیں۔ یکسر بے معنی اور مہمل۔ اور جون ایلیا! اس میں شبہ بھی کیا ہے کہ ہم سدا کے بے معنی اور مہمل ہیں۔ الا ماشاء اللہ ہم وقت کا ایک معمولی پن اور تاریخ کی ایک ہڑبونگ ہیں۔

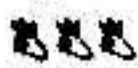
انسانو! چاہے تم کھشادیں کو پتلیوں کی طرح اپنی کمروں پر باندھ لو تب بھی تمہارا وجود یکسر بے معنی اور مہمل ہی رہے گا۔ تم کیا اور تمہارا نظام شمس کیا تمہاری ”کھلائی“ کیا اور تمہارے شہا ہے کیا۔ جو کچھ بھی ہونے کے حال میں ہے، وہ عبت ہے، سرتا پا عبت ہے..... اور میں بھی عبت ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس بد طور اور بے ہودہ ”عبت“ کا جو گر بھی ہوں۔ جو ذرا بھی بھلا مانس ہے اسے اس بد طور عبت کا جو گر ہونا چاہیے۔

کچھ انسان اگر کسی قدر ٹھیک ٹھاک ہونے کے طور سے کچھ ہیں تو فطرت کے اس عطیے کی وجہ سے ہیں جسے شعور کہا جاتا ہے اور اسی عطیے کی وجہ سے وہ اپنے ہستی ہونے پر اصرار کرتے رہے ہیں اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا یہ اصرار درست ہے۔ پر یہاں کہنے کی جو بات ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی اکثریت نے فطرت کے اس عطیے سے عام طور پر بڑی بے تدبیری اور بے دانشی کے ساتھ کام لیا ہے۔

تم اپنی بد طور مہملیت اور بے ہودہ عبت کے باوجود اگر شعور کو جزوقتی طور پر نہیں بلکہ کل وقتی طور پر کام میں لاؤ تو تمہاری وجودی مہملیت اور عبت کی چیرہ دہی تمہارا کچھ بہت زیادہ نہیں بگاڑ سکے گی۔

فہم رہی انسانوں کو اختیار سے نوازتا ہے اور شعور ہی آزادی عطا کرتا ہے۔ چاہے وہ اختیار بہت زیادہ نہ ہو اور چاہے وہ آزادی پوری آزادی نہ قرار دے۔

ہمیں کہ اس کائنات میں، اپنے آپ میں گمن رہنے والی اور اپنا آپا چھپانے والی اس غریبی کائنات میں شعور کے بخشے ہوئے اختیار، ادنیٰ اختیار اور فہم، ادنیٰ فہم کی ہولی آزادی، بہت کم آزادی کی حالت بھی فطرت کا کوئی معمولی عطیہ نہیں ہے۔



جون 2012ء کا شمارہ حاضر خدمت ہے۔ ماہ جون پاکستانی حکمرانوں اور عوام کے لیے ایک مخصوص حوالہ "بحث" سے جانا جاتا ہے جس کے آنے سے پہلے عوام پر خوف کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور سیزار کن ماحول میں مختلف جھینگوئیاں جنم لیتی ہیں اور اس کے آنے کے بعد عوام دھن اور عوام دوست کی بجائے دیر تک موضوع گفتگو رہتی ہیں مگر..... سب لا حاصل۔ پچھلے دنوں بد قسمتی سے پاکستانی عوام یکے بعد دیگرے دو بڑے حادثات سے دوچار ہوئی..... گیارہ سیکٹر میں ایک برقیاتی تودہ پاک فوج کے سوسے زائد چراغ گل کر گیا..... تاریخ میں لازوال قربانی کا ایک اور باب رقم ہو گیا۔ دوسری جانب اریلیو کے زخم ابھی بھرے نہیں تھے کہ بھوجا انزلائن کا حادثہ سامنے آ گیا جس میں سیکڑوں قیمتی جانیں تلف ہو گئیں۔ پچھلے حادثے کے متاثرین ہنزوا اور سکی کے لشکر ہیں۔ اس حادثے کے بعد پاکستان میں فوجی انزلائن کی کارکردگی اور مستقبل پر بھی سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ خیر یہ تو ایک الگ بحث ہے ہماری دعا ہے کہ انسانی قربانی ہلاک شدگان کو جوار رحمت میں جگہ اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور آئندہ اس قسم کے حادثات سے محفوظ رکھے، آمین۔ ان دنوں پاکستان میں پاک فوجی بھارت ٹریڈ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دونوں جانب سے تمام بڑے تاجروں اور کاروباری اداروں اور حضرات نے شرکت کی، اس کانفرنس کا مقصد دونوں ممالک کے درمیان دوطرفہ تجارت کے فروغ کے لیے تجاویز و منصوبے ترتیب دینا تھا۔ ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے معاہدات ہونے چاہئیں کیونکہ معیشت کے استحکام کے لیے تجارت نہایت ضروری ہے لیکن بات وہی ہے کہ دوطرفہ تجارت اور اس عمل کے مثبت نتائج میں عوام کا بھی حصہ ہو..... کیونکہ یکساں نہیں کیا ہے کہ جب بھی کوئی اہم فیصلہ کیا جاتا ہے تو وہ ظاہر عوام کی بھلائی کے لیے ہی کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب اس پر عمل ہوگا تو اس کے ثمرات عوام تک بھی پہنچیں گے لیکن زمینی حقائق یہی بتاتے ہیں کہ یہ "جب" "بھی" "اب" میں تبدیل نہیں ہوئی۔ ہماری دعا ہے کہ اس مرحلہ ایمانہ ہو اور اس تجارت کے ثمرات عام آدمی تک بھی پہنچ سکیں بالکل ایسے ہی جیسے ہر خاص و عام آدمی کی دسترس ہماری ٹھکانے والی محفل تک ہے..... تو دیر کس بات کی، دو بیجے دسک۔

مالک مکی الدین لوہے جن کے وجہ سے ہم ڈائجسٹ کی دنیا سے آشنا ہوئے کو تلاش کرتے پائے آکھوں کے سامنے ماہی کی کبڑ چھائی اور نہ جانے اس کبڑ کو چھٹنے میں ابھی کتنا عرصہ باقی ہے؟ (بہت جلد انشا اللہ) پیچیدہ الفاظ اور اعزاز بیاں پر مشتمل انشاء کیہ کو پڑھ کر یہ جانا کہ کدو ارض کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے مضر علم ہیں خصوصاً سحری علوم پر دسترس رکھنے والے عالم۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ طالب دنیا کو علم سکھانا ایسا ہے جیسے کسی راہزن کے ہاتھ میں تلوار دینا۔ اور یہ لے حسب معمول پہلے دکھ پھر سکھ کی خبر سنائی۔ ارفع کریم کے بعد پچالیہ کے ہونہار طالب علم 13 سالہ موسیٰ فیروز اور حسین نے انٹریٹ میت مقابلے میں بالترتیب پہلی، دوسری پوزیشن لے کر پاکستان کو عالمی سطح پر سرخرو کیا جو کام ہمارے ملک کے بڑوں کو کرنا چاہیے وہ ملک کے بچے کر رہے ہیں۔ محترمہ عائشہ فاطمہ کی محنت و داد ادا ہوتا ہوا ملک بھر کے بھوکے بچے ہنسے وانی تحریر تھی، وہاں صحت اللہ نے جان کی قربانی دے کر ثابت کر دیا کہ ماں باپ کی خواہشات جو اولاد کی بہتری کے لیے ہی ہوتی ہیں کا احترام اولاد پر از حد لازم ہے اولاد وہ ہے وہاں پودا ہے جس کی آبیاری والدین ہمیشہ اپنے خون سے کرتے ہیں۔ دادا پوتے کا انجام آکھوں کو بھگوانا۔ خون سے تسخیری ہوئی تاریخ کے اوراق کا مطالعہ کیا۔ تف ہے ہمارے ان حکومت پرست حکمرانوں پر جو اسلام کی تبلیغ اور مسلمانوں کی ترقی کے بجائے پیش و نشانی کی دلدل میں دھنسنے لگے۔ دنیاوی رشتے کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں ان میں ایک نہ ایک دن پھوٹ پڑتی ہے۔ خالد اور شہریار کی دوستی میں راز پڑنے کی یہ تو سوچا تھا مگر اتنی جلدی اور وجہ عداوت خالد کی بہن کی بے راہ روی ہے گی یہ نہ سوچا تھا۔ انتظار کرانے کے فن میں قاضی ناصر ملک کی اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ کھکھول حسب معمول رہی۔ مجرم لاکھ چاہے جرم کی بہتر سے بہترین منصوبہ بندی کر کے مطمئن ہو جائے مگر جب دست خدا حرکت میں آتا ہے تو سب تدبیریں ہاتھوں سے بھینکتی ہوئی ریت کی مانند ہو جاتی ہیں نظارت لعل کی دریافت بھیدی کا انجام گھر کا بھیدی لنگڑا حائے جیسا رہا۔ بھوک دوسم کی ہوتی ہے ایک پیٹ کی اور دوسری جنس کی۔ ساحرہ اسی بھوک کی دوسری خطرناک قسم کا شکاری محبت تھی اور کے ساتھ، شادی کی اور کے ساتھ۔ ایسے رشتے منافقت کے شے کہلاتے ہیں اور ساحرہ ایسے رشتے کی قائل تھی، والدین کی بے پروائی کے متعلق لکھے ہوئے آخری کلمات ہم سب کے لیے انتہائی توجہ کے متقاضی تھے۔ آج اقبال کی انتہائی نازک مسئلے پر لکھی ہوئی تحریر اچھوتی محبت تا پ کی تحریر تھی۔ سیاسی طوائفوں کے متعلق لکھی گئی بھی صاحب کی کاوش بمقابلہ پڑھنے کے بعد بی ای لندن کے چند سال پہلے پاکستانی قوم کے متعلق کہے گئے ریمارکس کہ پاکستانی قوم دنیا کی وہ بے وقوف قوم ہے کہ یہ جس سیاسی جماعت کے اقتدار میں آنے خوشیاں مناتی ہے پھر اسی کے جانے پر لٹو باہتی ہے۔ ایسا انصاری آپ کا محاوروں والا خط پڑھ کر معلوم ہوا کہ آپ بہترین تحقیقی ذہن کی مالک ہیں۔ قدرت صاحب اب تک کی فرضی تحقیق و تفتیش کے مطابق سہ یہ بخاری کو توجہ کی تاریخ بھی یاد نہیں رہتی۔ رمضان پاشا غالباً کسی بھی خوبصورت طرح دار لڑکی کے تھے جو ان مرد کو دیکھ کر آپ کو اچھا نہیں لگتا ہوگا۔ ہمایوں سعید راج اپریل کے شمارے میں تصویر الحسن کو آپ کا جواب قابلِ احترام اور غیر اخلاقی تھا۔ ہماری دعا ہے کہ آپ کو کوئی ہاتھوں میں سے ٹھکس ہاتھ بھی مل جائے گا۔ بلیک لسٹ عرف کھڈے لائن کو محاضری رجسٹر کا نام دے کر ہمارے رستے زخموں پر بھار کھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مقصود الحسن ظاہر شکر یہ آپ نے ہماری عدم موجودگی میں ہمارے طویل خط پر کیے گئے اعتراض کا تسلی بخش جواب دیا۔ دیدی رجنی ٹیل ہم باہماں تھے جوڑ کے عرفان شہزاد کی طرح بنی کرتے ہیں کہ لوٹ آؤ، پلیز صبر تمہوک دو۔ عرفان شہزاد ادا دشت تنہائی کو کھانے کی طشت میں رکھ کر پڑھ رہے ہو جو مزہ ہے۔ عمران علی ہمارا خیال ہے کہ تفسیر مہاس چار پائی پر بیٹھ کر تبصرہ لکھتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ گہرائی میں جا کر لکھتے ہیں۔ ظاہر و نگار کے متعلق آپ کے حالات بالکل غلط ہیں۔ راجا جت قب لواز قب غالباً گندم کی کٹائی میں مصروف تھے جو تبصرہ طویل تحریر نہ کر سکے۔ ظاہر و نگار آپ کو اپنے مسلمان ہونے پر شرم نہ خن کرنا چاہیے۔ ماہا ایمان خط تو آپ کا ادنیٰ ویلڈن ویلڈن تھا۔ ظاہر و یا سمین تفسیر مہاس، قدرت اللہ، ماہا ایمان کے شاندار تبصرے پڑھنے کے بعد سردستی کی دیں۔ بار مہاس گزشتہ ماہ سے آپ کے تمام خبر آف جا رہے ہیں۔

۱۱ اور ایسے ماحول خانہ، ناظم آباد سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ماہ مئی کا سسٹن خوبصورت رنگوں اور کہانیوں سے سجا ہوا ان محبت سے مزین ٹائٹل
۱۲ اس کے ہندوؤں کے ترجمان دو کورتہاہم مازو نیا زتھے۔ انٹائیہ سے بالکل اتفاق کرتے ہوئے دوستوں کی انجمن میں پہنچے جہاں سب
۱۳ اللہ تعالیٰ کی مادی نظر آ رہے تھے، مبارک یاد قبول کریں۔ مسافر سے ابتدا کی، مسافر ابھی کہانی ہے اور اپنی دلچسپی کے لحاظ سے سرفہرست
۱۴ انگریزوں کی جان کے دو بے اس کا ہی دوست ہو گیا۔ آگے کی قسط کے بے چینی سے بھرتور ہیں گئے۔ مشکوٰۃ بھی کامیابی سے جاری ہے،
۱۵ لیکن کہانی میں کوئی کام نہیں۔ جس کا ثبوت مشکوٰۃ ہے کہ ایک ہی نشست میں پوری قسط پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔ داؤد ابھی اچھا تاثر لیے ہوئے
۱۶ ہلاک ہلاک محرم کی کہانی بھی کھردنا کا بڑے سے بڑا مجرم کتنا ہی جالاک ہوا خرابی غامی سے پکڑا جاتا ہے۔ فضل ابھی ساجد ابھی کی تاریخی مزاح
۱۷ شوق مردانگی میں جرم کی راہ پر چلنے والے طبع پرست ڈاکٹر کی کہانی تھی۔ جو دولت کے حصول میں جائز اور ناجائز کے واضح فرق کو بھول
۱۸ اٹھ گیا۔ جہاں ایک عورت کی نفسیاتی کہانی تھی، صبح کہا ہے کسی نے کہ عورت کی نفسیات کو کوئی نہیں سمجھ سکا۔ رقیب، کپیوٹر کی انسان سے رقابت کی
۱۹ مزہ میں منتخب اشعار معیاری اور اچھے تھے۔ نظارت نصر کی بیدی بھی اچھا تاثر لیے تھی۔ اثر نعمانی کی مصروف لاش، بہتر تھی جہاں ایک جاسوس
۲۰ دھوکہ کھانے کے الزام میں پھنسنے سے بچا لیا۔ بمقابلہ عبدالرب بھٹی کی تحریر اچھی لگی۔ روحانی سلسلہ حضرت داؤد علیہ السلام بہت اچھا سلسلہ تھا جس میں
۲۱ اسلام کے حالات واقعات سے آگاہی ہوئی۔ شیریں زہری بھی اچھی تحریر تھی جہاں ایک بوڑھی خاتون نے اپنی زمین بڑب کرنے والی اپنی پڑوسی کو بڑ
۲۲ ہر طریقے سے ہلاک کر دیا۔ سب سے منفرد اور خوبصورت کہانی اچھوتی محبت تھی جو آخری صفحات کا خاصا ہے اور ایچ اقبال کی تحریر کی پہچان، ایسی محبت کو بڑ
۲۳ یابی محبت کہنا زیادہ بہتر رہے گا۔

[illegible]

الحمد للہ رمضان پاشا، گلشن اقبال کراچی سے چلے آ رہے ہیں "مئی 2012ء کا سسپنس مقررہ تاریخ کو بازار میں آ گیا، حسب روایت سرورق اچھا تھا، تبھی ابھی لگی۔ اس بار تبصرہ لکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، سبب اس کا یہ ہے اسلام آباد میں ہونے والا خوف ناک اور المناک طیارہ حادثہ جس میں بہت سی قیمتی سائنات ہوئیں، جاں بحق ہونے والوں کے گھر میں کیا حالت ہوگی یہ سوچ کر ہی دل لرزاں اور ذہن ماؤف ہو گیا۔ ٹی وی دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ایک صاحب ہاس نام کے اپنے صاحبزادے کی علالت کی وجہ سے اس طیارے میں نہیں گئے، کیا یہ صاحب ہمارے اپنے شرمسار ہیں سسپنس والے؟ (جی نہیں وہ اس سے میں سوار نہیں تھے۔ ان کی خیریت دریافت کرنے کا شکر یہ۔ اللہ حادثے میں جاں بحق ہونے والوں کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین) آپ کے خط میں حسب عادت نسب سے پہلے آپ کا اوداریہ پڑھا، حالات حاضرہ پر لکھایا اوداریہ قابلِ فخر تھا، واو دیتا ہوں۔ اول نمبر آنے والے تھے اللہ نازی صاحب کا تبصرہ اچھا تھا مبارکباد دیگر تبصروں میں ہمایوں سعید راج، جعفر حسین، طاہر الدین بیگ، مایا ایمان کے تبصرے پسند آئے۔ اشعار کی میں کورنگی والے محمد اقبال، حسنین ماس بلوچ، طاہرہ یاسمین، فرمان اللہ کاڑ کے اشعار قابلِ داد تھے۔ تاریخی کہانی فصل از گئی۔ علاؤ الدین خلجی کے دورِ اچھوت راجاؤں کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں جو پہلے نہیں معلوم تھیں، دو شیروہ و پولدی کے بارے میں تو میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ شوق



✠ تصویر الحسن، اوکاڑہ ٹی سے تبصرہ کر رہی ہیں "میرادل بہت اداس ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی گہری کھائی میں چلا گیا ہے دل۔ پہلے بہن کی رخصتی اور اب جو یہ طیارے کا حادثہ پیش آیا ہے مجھے بہت دکھ ہوا۔ خدا اس حادثے میں شہید ہونے والوں کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ آج کل دل بالکل کسی چیز میں نہیں لگ رہا۔ اس دفعہ سسٹنس کے ٹنل پر سوائے دو کیتروں کے کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔ آپ کے ذریعے جو پاکستانی طلبہ کی کامیابی کا علم ہوا پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ خدا پاکستان کا نام پوری دنیا میں اچھے معنوں میں اور بھی روشن ہو، آمین۔ صدارت کی کرسی پر محمد قدرت اللہ نیازی صاحب براجمان تھے، مبارک ہو آپ کو نیازی صاحب میں میل نہیں فی میل ہوں۔ یاد رکھیے گا اور خیر مبارک۔ رمضان پاشا آپ کا تبصرہ اچھا تھا، ہمایوں سعید راج آپ کو تو لگتا ہے آج کل شادی کا شوق چڑھ گیا ہے۔ اگر آپ کے والدین بھی سسٹنس یا جاسوسی شوق سے پڑھتے ہیں تو ان سے اتنا سہا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے ہاتھ جلدی ہی پہلے کر دیں۔ ویسے اس دفعہ آپ کے خط سے جلنے کی شدید بو آ رہی تھی۔ شیر علی خاں آپ ہماری بھائی کو اپنا نام نہ خراب کرنے دینا۔ جعفر حسین یہ کیا رپورٹ بتا دی آپ نے ملگتا ہے کہ سروے صحیح تھا میرا خود کا دل بہت اداس ہے۔ پاکستان نے تو اداسی کے معاملے میں چوتھے نمبر پر آنا ہی تھا۔ ڈیٹا فیروز میری خوشی میں خوش ہونے کا بہت شکریہ۔ یہ آپ دوستوں کا خلوص ہی ہے جو کہیں بھی جانے نہیں دینا۔ کاش کوئی اس معیاری لڑکی سے بھی پوچھ لے کہ وہ قدرتی انسان ہمایوں سعید راج کا ساتھ قبول کرے گی کہ نہیں۔ اتنا اچھا نام ہے طاہرہ یاسمین نے نام بدلا تو بدلا آپ خود اپنا نام بھی شہزادہ یزدی شوکر ہے ہیں۔ ایم اے چودھری بزرگ ہی بنانا تھا تو آنٹی کی جگہ ثانی یاد دی تو لکھ دیتے کچھ عزت ہی رہ جاتی۔ آپ سے گزارش ہے کہ آئندہ مجھے بزرگ ذرا بچ والا بنایا کریں اور ہاں چودھری بیٹا تمہارے منہ سے فیڈر لگایا نہیں۔ طاہر الدین مجھے دیکھ کر کیوں حیرانگی ہوئی آپ کو وہ تو بیان کر دیجئے۔ عمران علی مبارک باد اور دعاؤں کا بہت شکریہ۔ راجا اور نواز صاحب آپ لوگ تو میرے پڑوسی ہیں۔ طاہرہ گلزار اگر آپ سہیدگی سے بتا رہی ہیں کہ عمن عباس، تفسیر عباس کے ڈھائی سال کے بیٹے کا نام ہے تو طاہرہ یاسمین بھی کہیں آپ کی رشتے دار نہ ہوں کیونکہ دونوں ہم نام ہیں نا۔ اور یہ بیٹا کجرات کہاں چلا گیا۔ ماہا ایمان مبارک باد کے لیے شکریہ۔ بار بہت زبردست تبصرہ تھا تمہارا، سب کی خوب بات گنجی تم نے۔ طاہرہ یاسمین آپ نے ماہا ایمان کی زیادہ تعریف نہیں کر دی؟ مقصود الحسن طاہر آپ کی خوشی کا بہت شکریہ آپ کے ذمہ کی آواز مجھے یہاں تک آ رہی ہے۔ ویسے یہ ایک بات بتائیں کہ آپ تمام دوستوں کو مجھ میں اور ماہا ایمان میں کیا بات مشترک لگتی ہے۔ ویسے ماہاسن لیس۔ ہم دونوں ایک ہی ہیں۔ اب یہ بات ہم نے سب پر ثابت بھی کرنی ہے کیا خیال ہے آپ کا اس بارے میں؟ مشکول واقعی بہت اچھی ہے۔ لیاقت حسین اب یقیناً جگہ کی جان بچائے گا۔ آئندہ قسط کا انتظار رہے گا۔ مسافر میں خالدہ نے شہر یار کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ شہر یار بچ تو جائے گا مگر دونوں دوستوں کی دوستی میں فرق آئے گا یا نہیں یہ آئندہ قسط میں ہی پتا چلے گا، بھیدی میں ایڈم اور جیڈ دونوں کے جرم کو ان کے بیٹے ایڈ کرنے کھول دیا۔ محفل شعر و سخن میں کنول زریں، طاہرہ یاسمین، محمد عزیز، امتیاز احمد اور ساگر تلک کرکی چوائس اچھی لگی۔" (کہانیوں پر اتنا سا تبصرہ.....؟)

✠ احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل مل کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "انتخاب آخری المیہ موجودہ وطن عزیز کے حالات، بحالیہ عدالت عظمیٰ کا فیصلہ اور ڈیکٹیشن کی بغاوت۔ اقبال کے خواب والے پاکستان پر معراج رسول جیسے ہائیر فکشنی ٹرپ والے کم مسم سکتے کے عالم میں نہ ہوں تو کیا کریں؟ قدرت اللہ نیازی کرسی صدارت مبارک ہو۔ تبصرہ گڈ، ہمیں بادام کھانے کا مشورہ دیا آج 27 اپریل تک مارچ کی تنخواہ بھی نہیں ملی۔ روٹی ملے تو بھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر۔ بادام بہت میٹھے۔ رمضان پاشا، ہمایوں سعید راج، شیر علی خان نے اچھے تبصرے لکھے۔ شبیر احمد بھٹی بہاؤ پور کیا واقعی الیاس سینا پوری کی رحلت کا علم نہ تھا؟ جعفر حسین بھوانہ شرمین عبید جیسے ذہین لوگوں کو جاگیر دار ٹولہ کب برداشت کرتا ہے؟ ڈیٹا ٹوبہ ایک سنگم سرگزشت و سسٹنس جیسی تحریر کہاں ملتی ہے۔ کاش یہ ماہانہ کے بجائے ویلگی ہو جائیں۔ ایم اے چودھری احمد پور شرقیہ میرا تبصرہ اچھا لگا۔ شکریہ تبصرہ آپ کا بھی بہت گہرا ہوتا ہے۔ طاہر، عمران، ماہا ایمان دو دیگر ساتھیوں کے تبصرے اچھے مگر طویل تھے دوسروں کو بھی جگہ دیا کریں۔ فصل اجڑ گئی، ڈاکٹر صاحب نے مظہر دور کی معلوماتی تاریخی تحریر پیش کی۔ مظہر دور سے ہمارا قافلہ اب زیادہ ہو گیا۔ برصغیر کے عظیم مسلمان رہنماؤں اور شاعر حضرات کی سوانح عمری بار بار لکھ کر نئی نسل کو آگاہ کریں۔ شوق مردانگی ابھی کہانی ہے۔ دور اہما، آصف نے بروقت ماہاسے اظہار محبت نہ کیا آرزو کا مذاق بری بات۔ ماہا کا فیصلہ بہت اچھا۔ مشکول کے صفحات کم ہیں۔ فتح حامد کا انجام بلیک، مانیکر جیسا ہوگا۔ ہماری پولیس اور جیل سے واسطہ پڑنے کے بعد شریف آدمی جگانہ بنے تو کیا بنے؟ دادا پوتا، عائشہ فاطمہ کی اچھی کہانی تھی۔ چودھری ملک دین جیسے سور کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ البتہ خان صاحب کو وکیل کے گھر رشتہ لینے جانے سے قبل بیٹے سے پوچھنا چاہیے تھا۔ بالغ اولاد کی رضامندی شرعاً لازم ہوتی ہے۔ شوق مردانگی بخار آزاد، رقیب سلیم انور، بھیدی نظارت نصر انگش کہانیاں متاثر نہ کر سکیں۔ مجرمانہ ذہن، بیگ صاحب اور ملک مندر حیات، سدا اصل قاتل تک پہنچ جاتے ہیں۔ ملتی جلتی کہانی پہلے بھی شائع ہوئی۔ راجا ضیا الحسن، سعید عباسی، حسنین بلوچ، صوبیدار انگش، ماہا ایمان کے اچھے اشعار ہیں۔ مسافر، ویری گڈ ناصر ملک۔ دلچسپ سا میں جیسے بہرہ ہے ہر جگہ موجود ہیں۔ بخت خان، ڈاکٹر شاہ صاحب کی جبر کے بارے میں رائے بہت اچھی لگی، خالدہ عرف بلوکی حرکت بہت بری محسوس ہوئی۔ آگے شہر یار اور کھالے کے تعلقات کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ بمقابلہ ڈاکٹر بھٹی کی ہر کہانی منظر نامہ کی طرح ایک سے بڑھ کر ایک۔ لڑاؤ اور حکومت کرو۔ منظر نامہ غائب ہیں۔ محسن اختر کی پہلی برسی کہانی کی قوی امید تھی، ہمایوں ہوئی۔ شیریں زہر، صوفیانے بے ضمیر لوگوں والی غلط حرکت کی۔ میڈیم آر تھر کوٹو پودے کی حقیقت علم ہونے کے باوجود پودا لگانا اور شہر بدلنا اچھی بات نہ تھی۔ اچھوتی محبت، احسن کے والدین کا سانحہ بہت افسوسناک ہے۔ ساحرہ کی روش بالکل غلط تھی۔ عشرت احوان سے آغا نصیر کی زیادتی۔ عشرت کا آغا نصیر کی پہلی بیویوں کو قتل کرنا سو فیصد غلط اقدام ہے۔ انتقام لینا تھا تو آغا نصیر سے لیتی، شبیا عظیم ہے۔ صبر اور نیک نیتی کا صلہ خاموش محبت حسن کی مل گئی۔"

اب آخر میں ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے اس ماہ شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

آغا فرید احمد خان، سکھر۔ اختر شاہ عارف، ڈھوک جعد، جہلم۔ ملک بشری ٹکڑا پٹناتی ٹکڑا، کراچی۔ محمد شمیم ہارون، کراچی۔ ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر منغل، جلال پور بھٹیاں۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ آرسا حرا، نامعلوم مقام۔ مقصود الحسن طاہر، پتوکی ضلع قصور۔ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ناؤن ضلع خانیوال۔ جعفر حسین، بھوآند، چنیوٹ۔ فرحان الفت، پلا پور۔ ہمایوں سعید راج، بنوں۔ شیر علی خان، خانیوال۔ محسن علی موم، بالا کوٹ۔ محمد زبیر ساگر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لیہ۔ ڈاکٹر وسیم خالق کہیاں، کجرات۔ محمد کامران خالد، مچھ، ضلع ایبٹ آباد۔



غزنی

سلطان شہاب الدین غوری، ایک نرم دل شہنشاہ... قطب الدین ایبک ایک قابل غلام... جب قدرت یہ چاہتی ہے کہ کوئی بچہ ایک بڑے انسان کے روپ میں زندگی گزارے تو اس کے لیے حالات اس کی پیدائش کے وقت سے ہی سازگار کرنا شروع کر دیتی ہے... اور پھر وقت کا یہی اتار چڑھاؤ اس کی تربیت کرتے ہوئے اس کی بصیرت، شعور و آگہی میں گہرائی پیدا کرتا رہتا ہے۔ قطب الدین ایبک کا شمار بھی قدرت نے ایسے ہی لوگوں میں رکھ چھوڑا تھا۔ شہاب الدین غوری نے اپنے غلاموں کو ہمیشہ بیٹوں کا درجہ دیا اور تاریخ شاید یہ کہ ان ہی غلاموں نے کتنے طعطران سے ہندوستان کی سرزمین پر اپنی بادشاہت قائم کی... تاریخ کے اوراق سنہرے ہوں یا سیاہ تاریک... حالات و واقعات کی تمام ترتیب کو اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ جو کبھی آئینہ بن کر درس دیتے ہیں تو کبھی عبرت بن کر اذیت کا نشان بن جاتے ہیں۔ بادشاہوں کا جاہ و جلال بادشاہت کی روایت سہی لیکن وقت کی بساط پر لڑکھڑائی چالوں کا شکار ہونا بھی تو تاریخ کی روایت ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

سامنے پیش کر دوں؟ دلپت رائے نے کہا۔
”راج نیتی چوہوں کے بلوں میں گھس کر نہیں کی جاتی لیکن عقل کے بغیر بھی نہیں کی جاتی۔ جب دریا میں باڑ آتی ہے تو کشتیاں پانی میں نہیں اتاری جاتیں۔ اس گھاٹ کی تلاش کی جاتی ہے جہاں پانی کم ہوتا ہے۔ اپنے لشکر کو دیکھو اور شہاب الدین کی طاقت کو دیکھو۔ ہاتھی کی مستک سے سر ٹکراؤ گے تو مارے جاؤ گے۔“

”چمپانیر!“ دلپت رائے دہاڑا۔ ”تو ہرگز اس قابل نہیں کہ تجھے میں اپنی رانی کہوں۔ رانیاں تو وہ ہوتی ہیں جو وقت پڑنے پر ہتھیار سجا کر میدان میں اترتی ہیں اور ایک تو ہے جو مجھے بزدلی کا سبق پڑھا رہی ہے۔“

”تو بھی کیسا راجا ہے کہ تیری گدی میں عقل ہی نہیں۔ تو وہ کام کر رہا ہے کہ خود بھی مارا جائے گا۔ تیرے ساتھ ہم بھی اور تیری پر جا بھی بے موت ماری جائے گی۔ شہاب الدین جب فارغ بن کر شہر میں داخل ہوگا تو کیا تجھے نہیں معلوم کہ وہ شہر کا کیا حال کرے گا۔“

”یہ تو اس وقت ہوگا بے عقل رانی جب اسے فتح ملے گی۔ میں سب انتظام کر چکا ہوں۔ اسے اپنے لوگوں کی

راجا دلپت رائے اور اس کی رانی چمپانیر کے درمیان پچھلے دو دنوں سے سخت بحث چھڑی ہوئی تھی اور اب اس بحث نے نئی کاروب و حار لیا تھا۔ ماں کو گرجتے برستے دیکھ کر راجا ہماری بھی ماں کے ساتھ شامل ہو گئی تھی اور ماں کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

اس نئی کا باعث تھا غزنی سے ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہونے والا سلطان شہاب الدین غوری جو ملتان کے قرامطیوں کو شکست دینے کے بعد اب اچ کی طرف بڑھنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اچ کے راجا دلپت رائے اور اس کا سپہ سالار بالک رام شہاب الدین غوری سے مقابلے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے جبکہ رانی اس مقابلے کے خلاف تھی۔

”یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ ہم اس مسلمان بادشاہ سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لیں جو قرامطیوں کو شکست دے چکا ہے۔ کیا تمہارے پاس قرامطیوں سے بڑا لشکر ہے، کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو۔“

”راج نیتی چوہوں کے بلوں میں گھس کر نہیں کی جاتی۔ وہ ڈاکو ہمارے علاقے میں گھس آیا ہے اور میں اس کا مقابلہ بھی نہ کروں۔ اپنی سلطنت تھانی میں سجا کر اس کے



جون 2012ء کے

شمارے کی گرم جوشیاں

عمیرہ احمد..... عکس

عکس در عکس پھیلے سلسلہ زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج جستجو کا سفر

ناہید سلطانی اختر زندگی

زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں سے روشناس کراتا آپ کی پسندیدہ مصنفہ کے قلم سے لکھنا سلسلے وار ناول

ایسے دل نادان

ایک لڑکی کی زندگی کے نشیب و فراز جو اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں تھی میمونہ خورشید کی ناقابل فراموش تحریر

فیصلوں کا سفر

محبت کہیں زندگی کو رعنائیوں اور رنگوں سے مزین کرتی ہے تو کہیں زندگی کو صحرا بنا دیتی ہے کچھ اسی رنگ میں عالیہ حرا کی تحریر

اقبال بانو، عطیہ عمر، عقیلہ حق،

فرحانہ ناز ملک، لبنی عروج

اور دیگر مصنفات کی دلچسپ و یادگار تحریریں

پاکیزہ کی آواز شائستہ حسنہ کی آواز

گلیاں آپ جس ماہ کا پکیڑ رہے ہیں ان کی آواز سنیں

اس طرف کا رخ نہ کرے۔

اپنے مالک کو ہمارا یہ پیغام بھی پہنچا دو کہ وہ محاصرے لے لو گے نہ آئے دے۔ شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کرے۔ ہمارے ایک لشکر روانہ کرنے والا ہوں جو مسلمانوں کی مدد سے حملہ آور ہوگا۔ چکی کے دو پاٹوں کے بیچ شہاب الدین بس کر رہ جائے گا۔ ممکن ہے مارا بھی جائے۔ دلپیت کی تم بھی ہو گی۔

قاصد نے ہاتھ جوڑ کر راجا کا شکریہ ادا کیا۔

یہ قاصد، بھیم دیو کا پیغام لے کر پہنچا تو دلپیت تمام دریاں ٹھل کر چکا تھا۔ اتنے میں یہ خبریں بھی پہنچ چکی تھیں کہ سلطان شہاب الدین آج کے نزدیک پہنچ چکا ہے اور ایک میدان میں پڑاؤ کر کے جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔

بھیم دیو کی طرف سے پیغام آنے کے بعد دلپیت کی ٹوٹی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ رانی نے ایک مرتبہ پھر اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اب وہ کہاں رکنے والا تھا۔ گجرات کا راجا بھی اس کے ساتھ تھا تو مقابلہ کیوں نہ کیا جاتا۔ وہ شہر سے نکلا اور شہاب الدین کے لشکر کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔

”مالک رام، ذرا شہاب الدین کے لشکر کا جائزہ لے کر یہ اندازہ تو کر کہ اس کا لشکر بڑا ہے یا ہمارا؟“

”مالک، میں پہلے ہی اندازہ کر چکا۔ دونوں کے لشکر تقریباً برابر ہیں لیکن جب بھیم دیو کا لشکر ہم سے آنے لے گا تو شہاب الدین کا لشکر اونٹ کے منہ میں زیرے کی طرح ہوگا۔“

”تم کیا کہتے ہو۔ ہم بھیم کا انتظار کریں یا جنگ کا آغاز کر دیں؟“

”میرے خیال میں تو ہمیں صبح ہوتے ہی جنگ کا آغاز کر دینا چاہیے تاکہ دشمن پر ہمارا رعب طاری ہو جائے اس وقت تک بھیم دیو بھی پہنچ ہی جائے گا۔“

”پھر تم تیاری کرو۔ صبح ہوتے ہی ہم لشکر کو آگے بڑھا دیں گے۔“

سلطان شہاب الدین عشا کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تھا کہ اس کا چیتا غلام قطب الدین ایک خیمے میں داخل ہوا۔ غلام تھا۔ قاہری حسن سے بھی عاری تھا لیکن عقل و دانش اور بہادری ایسی رکھتا تھا کہ روز بہ روز ترقی کرتا گیا۔ شہاب الدین نے اسے داروغہ امین بنایا اور پھر غزنویوں کے خلاف ہونے والے معرکوں میں اسے اپنے ساتھ لے جانے کا حکم دیا۔ اس معرکہ میں بھی وہ اس کے ساتھ تھا۔

وہ ابھی بچہ تھا کہ بردہ فروش اسے ترکستان سے اٹھا کر

ہے؟“

”میں آج کے راجا دلپیت رائے کا قاصد ہوں۔ تمہارے راجا کے نام اس کا ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔“

”جھوٹ بولا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان داخل ہو چکے ہیں۔ تو ہمیں ان کا بھیجا ہوا خبر معلوم ہوتا ہے۔“

”تم لوگ میری بات کا یقین کرو۔ مجھے رائے بھیم دیو کے پاس لے چلو۔ وہ دلپیت رائے کی تحریر کو ضرور پہچان لے گا۔“

”تیری قسمت اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ بھیم دیو بھی اسی مقام پر موجود ہے۔ ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے کہ تو کون ہے۔“

یہ خبر تیزی سے پھیل گئی تھی کہ ایک خبر پکڑا گیا ہے۔ بھیم دیو کو بھی یہ خبر اس طرح پہنچا دی گئی تھی اور اس نے حکم دیا تھا کہ اس شخص کو اس کے سامنے پیش کیا جائے جو خود کو دلپیت رائے کا قاصد بتاتا ہے۔

دلپیت رائے کے قاصد کو گھوڑے سے اتار کر پیدل لے جایا جا رہا تھا۔ محافظ دستہ اس کے ساتھ تھا۔ راجا بھیم دیو اپنے لشکر کے معائنے کے لیے اس میدان میں آیا ہوا تھا۔ اس کی فوج کے اعلیٰ سالار بھی اس وقت اس کے ساتھ تھے، وہ اس وقت ایک بڑے سے شامیانے کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔

دلپیت رائے کے قاصد نے جنگ کر اسے تعظیم پیش کی۔

”میں دلپیت رائے کا قاصد ہوں۔ اس کا ثبوت یہ تحریر ہے جو میرے مالک نے آپ کے نام بھیجی ہے۔“ قاصد نے ایک کاغذ راجا کی طرف بڑھا دیا جس پر کچھ تحریر تھا۔

لاشیں اٹھانے کا موقع بھی نہیں ملے گا اور وہ بھاگنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

”راجا بھاری جوان ہے، خوب صورت ہے۔ کیا تجھے ڈر نہیں لگتا کہ شہاب الدین اسے اٹھا کر لے جائے گا؟“

”میں نے کہہ دیا ناں کہ یہ سب اس وقت ہوگا جب میں اسے یہاں تک پہنچے دوں گا۔“

”دیکھو دلپیت، شہاب الدین یہاں پر دیکھی ہے، وہ اپنے دیکھ سے دور ہے۔ اس کی عورتیں اس کے ساتھ نہیں ہیں۔ اس کے شہر ہماری پہنچ سے دور ہیں۔ اسے اگر شکست ہوئی تو وہ اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوگا لیکن ہم ہارے تو ہمارا سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔“

”تو مجھے اپنا گھما کر اوسے دے جسے پہن کر بیٹھ جاؤں۔ میں راجا ہوں تو راجا کی طرح لڑوں گا۔ تجھے اگر شہاب الدین پسند آ گیا ہے تو میں تجھے نہیں روکتا۔ جا اس کے پاس چلی جا۔ اس کی رانی بن کر رہ یا رکھل، مجھے پروا نہیں۔“

”لعنت ہو تیرے راجا ہونے پر کہ اپنی جتنی کو ایک مسلمان کی رکھل بننے کو کہتا ہے۔ اس کی حفاظت کا نہیں سوچتا۔ اس کی حفاظت اس میں ہے کہ تو ایک وفد شہاب الدین کی خدمت میں بھیج اور اس سے صلح کر لے۔ تیری سلطنت بھی بچ جائے گی اور تیری رانی اور راجا بھاری بھی۔“

”تم لوگ میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ۔ میں بالک رام کو حکم دے چکا ہوں، وہ لشکر ترتیب دے رہا ہے۔ ہم باہر نکل کر شہاب الدین کا مقابلہ کریں گے اور اب تم میں سے کوئی میرے بیچ میں نہیں بولے گا۔“

یہ عجیب بات تھی کہ راجا بھاری دیو اس ان سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا جیسے ان باتوں سے اسے کوئی سروکار ہی نہ ہو، حالانکہ اب وہ جوان ہو چکا تھا۔ اسے حمایت یا مخالفت میں بولنا چاہیے تھا۔

رانی نے بھی چپ سا دھلی تھی۔

گھڑسوار گجرات کے راجا بھیم دیو کی سرحد میں داخل ہوا۔ اس نے گھوڑے کی رفتار کو مزید بڑھا دیا تھا کہ جلد سے جلد راجا کے محل تک پہنچ سکے۔

راستے میں اسے راجا کا لشکر ادھر ادھر بکھرا ہوا نظر آیا تو اسے تعجب ہوا کہ کیا یہاں بھی جنگ چھڑ گئی ہے جو لشکر تیاری کر رہا ہے۔ اس نے گھوڑے کی رفتار دھیمی کر لی تھی کہ حالات کا جائزہ لے سکے۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک محافظ دستے نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

”کون ہے تو اور یہاں ریگستان میں کیا لینے آیا

نیشاپور لے آئے اور قاضی فخر الدین بن عبدالعزیز کوئی کے پاس بچ دیا جو حضرت امام ابوحنیفہؒ کی اولاد میں سے تھے۔ خداوند تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ قطب الدین ایک ایک دن بڑا آدمی ہوگا۔ اس لیے بچپن ہی سے اس کے چہرے سے عظمت اور برتری کے آثار نمایاں تھے۔ قاضی فخر الدین اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ انہوں نے اس کی پرورش بیٹوں کی طرح کی۔ اسے دینی تعلیم کے علاوہ شہسواری اور تیراندازی کی بھی تعلیم دی۔

قاضی صاحب کے انتقال کے بعد ان کے کسی بیٹے نے قطب الدین کو ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس سوداگر نے اسے تحفے کے طور پر سلطان شہاب الدین غوری کی خدمت میں پیش کر دیا۔

قطب الدین کے ایک ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہوئی تھی اس لیے بادشاہ اور درباریوں نے اسے ایک کہنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ اس کے نام کا جزو بن کر رہ گیا۔ قطب الدین نے بڑے سلیقے اور محبت کے ساتھ سلطان کی خدمت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مختصر مدت میں اس نے بادشاہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

قطب الدین کی قسمت کا ستارہ روز بہ روز بلند ہوتا گیا اور کچھ ہی دنوں میں اسے ”امیر اخوری“ کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ جس زمانے میں غور، غزنی اور بامیان کے حکمرانوں نے باہمی اتحاد سے خوارزم پر لشکر کشی کی تھی اسی زمانے میں قطب الدین بھی اس معرکہ کارزار میں شریک تھا۔

قطب الدین خیمے میں داخل ہو کر کچھ دیر سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس کی عادت تھی کہ جب تک سلطان اسے اذن کلام نہیں دیتا تھا وہ خاموشی اختیار کرے رہتا تھا۔

”ایک، کہو کیا بات ہے؟“

”حضور ابھی ابھی ہمارا ایک خبر ایک خبر لے کر آیا ہے۔ دلپت رائے نے اپنا قاصد رائے بھیم دیو کے پاس روانہ کیا تھا۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیا پیغام لایا ہے لیکن قیاس کہتا ہے، بھیم دیو نے دلپت رائے کی مدد کا عندیہ دیا ہے۔ میرا اندازہ کہتا ہے کہ بھیم دیو نے لشکر روانہ کر دیے ہوں گے۔ اسی لیے دلپت رائے کی اتنی ہمت ہوئی ہے کہ وہ اپنے لشکر کو شہر سے باہر لے آیا ہے۔“

”تمہارے خیال میں اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”دلپت رائے یقیناً بھیم دیو کا انتظار کرے گا اور جنگ شروع کرنے میں دیر کرے گا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم صبح ہوتے ہی جنگ کا آغاز کر دیں۔“

”ہم تمہاری تجویز کو منظور کرتے ہیں۔“

”غلام ایک اور اجازت کا طلب گار ہے۔“

”کہو، ہم سن رہے ہیں۔“

”بھیم دیو یقیناً ہمارے لشکر کی پشت پر حملہ آور ہوگا۔“

آپ سے گزارش یہ ہے کہ لشکر کا ایک حصہ میرے حوالے کر دیں۔ میں دور نظر آنے والے ریت کے ٹیلوں کے عقب میں گھات لگا کر بیٹھوں گا اور بھیم دیو کے لشکر کو یہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی تھس نہس کر کے رکھ دوں گا۔“

”ایک ادنیٰ کو بتا دو کہ میں اپنے غلاموں کو یونہی اپنا فرد نہیں کہتا ہوں۔ بے شک اتم جتنے سپاہی اپنے ساتھ لے جانا چاہو لے جا سکتے ہو۔“

سلطان شہاب الدین کو اللہ تعالیٰ نے صرف ایک بیٹی دی تھی۔ اس کے گھر میں کوئی بیٹا پیدا نہ ہوا تھا۔ اس لیے اس کو ترکی غلام خریدنے اور انہیں بیٹوں کی طرح پالنے کا بڑا شوق تھا۔

کسی نے اس سے ایک روز کہا۔ ”کیا ہی اچھا ہوتا کہ خداوند تعالیٰ بادشاہ کو کوئی بیٹا بھی عطا کرتا تا کہ کسی ناگزیر واقعے کے پیش آنے کی صورت میں اس کو تخت کا وارث بنایا جاتا۔“

سلطان نے جواب دیا۔ ”عام طور پر بادشاہوں کے چند بیٹے ہوتے ہیں جو اپنے باپ کی وفات کے بعد حکومت کے وارث قرار پاتے ہیں لیکن میرے کئی ہزار ایسے سعادت مند بیٹے ہیں جو میرے بعد عمان حکومت سنبھالیں گے اور میرا نام زندہ رکھیں گے۔“

اس کا اشارہ انہی غلاموں کی طرف تھا جو اس کے دربار میں موجود تھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس کے غلاموں نے نہایت رعب و اب کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کی۔

قطب الدین ایک نے ایک چھوٹا سادہ اپنے ساتھ لیا اور رات میں ہی ریت کے ٹیلوں کی طرف چل دیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی سلطان نے اپنے سالاروں کو طلب کیا۔ انہیں حکم دیا کہ صبح کی پہلی کرن کے نمودار ہوتے ہی جنگ کا آغاز کرنے میں پہل کر دیں۔

ان سالاروں میں سے چند نے کچھ کہنا چاہا لیکن سلطان کے اشارے نے انہیں خاموش رہنے کے لیے کہہ دیا۔ وہ غالباً واقف نہیں تھے کہ جنگ میں بلدی کیوں کی جارہی ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قطب الدین کو کہاں پہنچ دیا گیا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ خود دلپت رائے

غزنی تادہلی

میں بھی اہل کرنا ہے۔

صبح ہوتے ہی دلپت رائے نے سلطان کے لشکر کی طرف سے گھیر کے لرے بلند ہوتے ہوئے سنے۔ پھر دیکھا کہ سالاروں کا لشکر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے۔ دلپت رائے نے بھی چونکہ رات ہی کو صفیں درست کر لی تھیں اس لیے اس کے لشکر کو گھبراہٹ کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔

دلپت رائے نے اس امید کے ساتھ کہ بھیم دیو کا لشکر اس آنے ہی والا ہوگا اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا، وہ چاہتا تھا کہ سلطان کا لشکر جنگ میں الجھ کر اپنی پشت سے نابل ہو جائے۔

دونوں طرف سے ہولناک شور بلند ہوا اور پھر دونوں لشکر آپس میں ختم ہونے لگے۔ چیخوں اور ٹکڑوں کی جھٹکار کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

دلپت رائے کا لشکر تعداد میں زیادہ تھا لیکن ابتدا ہی میں ظاہر ہونے لگا کہ مسلمان حاوی ہو رہے ہیں۔ بالک رام اپنے گھوڑے پر سوار صفوں کے درمیان دوڑ رہا تھا اور اپنے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

”جم کر لڑتے رہو۔ جاکم گجرات کا لشکر پہنچنے والا ہے۔ بس کچھ دیر جاتی ہے۔ فتح کے شادیاں بجانے کے لیے تیار رہو۔“

میدان جنگ میں وقت چلتا نہیں دیکھتا ہے۔ خون بہتا رہا۔ گردنیں کٹتی رہیں۔ دلپت رائے بار بار اپنے گھوڑے پر پورے قد سے کھڑے ہو کر دیکھ لیتا تھا کہ میدان جنگ سے دور کہیں دھول اڑتی نظر آئے لیکن میدان صاف پڑا تھا۔ بھیم دیو کے لشکر کے آثار دور دور تک نہیں تھے۔ واپسے سر اٹھا رہے تھے۔ کہیں بھیم دیو اپنے وعدے سے پھر تو نہیں گیا۔

وہ انہی اندیشوں کو اپنے ساتھ ساتھ لیے ادھر سے ادھر دوڑتا پھر رہا تھا کہ اس نے ایک سوار کو آتے ہوئے دیکھا۔ یہ کون ہو سکتا ہے جو ٹکڑوں کے بیچ دوڑا چلا آ رہا ہے۔ وہ شخص قریب آیا تو دلپت نے اسے پہچان لیا۔ یہ اس کا ایک خبر رام اس تھا۔ دلپت کو دیکھتے ہی وہ گھوڑے سے کود گیا۔

”کہو رام داس، کیا خبر لائے؟“

”مالک میں ایک بری خبر لے کر آیا ہوں۔ راجا بھیم نے ہمارے مدد سے ہاتھ بچھینچ لیا ہے۔ اب اس کے کسی لشکر کا اٹھار فضل ہے۔“

”اس نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ لشکر بھیجے گا۔ کیا اب راجا ہم اپنے قول سے مکر نہ لگے ہیں؟“

”جی مالک۔ اس کا خیال ہے کہ اگر آپ کو شکست

ہوگی تو سلطان شہاب الدین آپ کی مدد کرنے کے جرم میں اس کے علاقے کو پامال کر رہے گا۔ وہ سلطان سے مصالحت کے راستے بند کرنا نہیں چاہتا۔“

”اب تم جاؤ اور خبردار کسی سے اس کا ذکر مت کرنا۔ میرے لشکر کو یہی سمجھنے دو کہ بھیم دیو پہنچنے والا ہے۔“ دلپت رائے نے کہا اور مالک رام کو تلاش کرنے لگا جو ہر اس جگہ پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں اس کا کوئی سپاہی مصیبت میں تھا۔ دلپت رائے نے گھوڑا دوڑایا اور بالک رام کے پاس پہنچ گیا۔

”بالک رام، بھیم دیو نے غداری کی ہے۔ اس نے ارادہ بدل دیا ہے۔ اب اس کا لشکر ہماری مدد کو نہیں پہنچے گا۔ میں اس کے سہارے پر شہر سے باہر نکلا تھا ورنہ شہر کے دروازے بند کر کے بیٹھ جاتا اور مناسب موقع پر نکلتا اور اسی نے ساتھ چھوڑ دیا۔“

”بالک یہ تو بہت برا ہوا۔ ہم یوں بھی کمزور پڑتے جا رہے ہیں۔ اگر اس وقت.....“

”لشکر میں کسی کو یہ بات معلوم نہ ہو۔ تم چپ چپ کر کہتے رہو کہ بھیم دیو کا لشکر آنے والا ہے۔ اگر یہ بات پھیل گئی کہ بھیم دیو انکار ہی ہو گیا ہے تو ہمارے سپاہیوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں گے۔“

ہندو سورا اس امید پر لڑتے رہے کہ بس بھیم دیو کا تازہ دم لشکر پہنچے ہی والا ہے۔ اتنی دیر میں مسلمانوں کے لشکر کے عقب سے دھول اڑتی نظر آئی۔ دلپت کے سپاہی یہ سمجھے کہ بھیم دیو کا لشکر آ گیا۔ وہ جان کی پروا کیے بغیر سلطان کی اگلی صفوں میں گھس گئے۔ پھر یہ دیکھ کر ان کے ہاتھوں سے ٹکڑاں گرنے لگیں کہ یہ مسلمان سپاہیوں کا ہی تازہ دم دستہ ہے جو کسی جگہ چھپا ہوا تھا اور اب میدان میں کودا ہے۔

یہ دراصل قطب الدین ایک تھا جو اپنے دستے کے ساتھ بھیم دیو کا راستہ روکنے گیا تھا اور اب اس کی طرف سے مایوس ہو کر واپس آ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر دلپت رائے کا بھی حوصلہ پست ہو گیا۔

دلپت رائے نے گھبرا کر اپنی صفوں کی طرف دیکھا۔ اگلی صفیں پامال ہو چکی تھیں۔ پچھلی صفوں کے لشکر آگے جانے سے تترارہے تھے۔ مسلمانوں کی ٹکڑاں بڑی تیزی سے قتل عام کر رہی تھیں۔

مسلمان پوری طرح حاوی ہو چکے تھے۔ اب سپاہی کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ واپسی کے راستے بھی بند ہو جائیں۔ وہ شکست اٹھا کر راج شہر میں داخل ہوا اور



پروفیسر

آندے مینڈے برسز

کالج کے طلباء کو سلا

انعامات تقسیم کرنے کے بعد انعام یافتہ تصاویر اور مجسمے دیکھنا شروع کیے۔

ایک مجسمہ جس کا عنوان تھا "ساحر" ایک ۱۹ سالہ خالق آلبرٹ مونیٹ کا بنایا ہوا تھا۔ یہ مجسمہ سنگ مرمر کا ایک ڈھیر تھا جس میں سولہ بنے ہوئے تھے۔

پروفیسر نے جو اس کالج کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے، ایک سوراخ میں ہتھ ڈال کر دیکھا تو اس کا سوراخ کی گہرائی بختی ہے کہ ان کا ہاتھ اس کے اندر چس گیا۔

فائر ریگید کو یہ مجسمہ توڑا پڑا، تب کہیں جب کہ پروفیسر کا ہاتھ باہر نکل سکا۔

آلبرٹ مونیٹ یہ دیکھ کر رو دیا۔ "مجسمہ بنانے میں چار ماہ لگ گئے تھے اور اسے تباہ کرنے میں صرف دو منٹ لگے۔"



میرے چچا علاؤ الدین کے کسی نے ایسے کان بھرے کہ اس نے ہم دونوں بھائیوں کو تید کر دیا۔ وقت اسی طرح تبدیل ہوتا ہے۔ جب چچا کا انتقال ہو گیا تو اس کا بیٹا سیف الدین غورستان کا حکمران بنا۔ اسے مجھ پر اور میرے بھائی پر رحم آیا اور اس نے ہمیں رہا کر دیا۔

ہم دونوں بھائیوں کی قسمت عروج پر تھی۔ ابھی ایک سال اور کچھ مہینے ہی گزرے تھے کہ سیف الدین، غزنویوں سے معرکہ آرائی میں مارا گیا۔ غور کی بادشاہت میرے بڑے بھائی غیاث الدین کے ہاتھ میں آئی۔ غیاث الدین نے مجھے یعنی شہاب الدین کو یکناباد (بعض نے تنگنا باد لکھا ہے) میں چھوڑا اور دوسرے علاقوں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا۔

یہاں تک سوچنے کے بعد وہ دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ میں یکناباد میں تھا لیکن چھوٹے چھوٹے لشکر لے کر غزنی پر حملے کرتا رہتا تھا۔ ان حملوں کو سپاہیانہ شہرت ہی کہا جاسکتا ہے۔ ان حملوں کا مقصد یہ تھا کہ غزنی جو سبکیں کی اولاد کے قبضے میں چلا گیا تھا اسے دوبارہ غور کی سلطنت میں شامل کیا

میں داخل ہوا۔ انہوں نے لوگ خوف زدہ تھے لیکن انہیں "اب" کہہ ساقیوں نے اتھار پچھ کر لیے ہیں اور ان کا اٹھا کر دیکھ رہے ہیں۔

شہاب الدین غوری راج محل کے دروازے پر پہنچا تو الیٰ اظہال کے لیے تیار کھڑی تھی۔ دلپت کا سپہ سالار بالک رام ہاتھ باندھے خاموش تھا۔ محل میں موجود جتنے سپاہی تھے، سب کے انداز میں زمین پر پڑے ہوئے تھے۔

"میں تم سب کو امان دیتا ہوں۔ تم میری طرف سے آ جاؤ۔ جہاں جاؤ چلے جاؤ۔ اگر میری ملازمت میں رہنا چاہتے ہو تو شہر کے نظم و نسق میں میرے لشکریوں کا ہاتھ بناؤ۔" چند ضروری احکام جاری کرنے کے بعد قطب الدین ایک اور علی کرماج کو شہر کے نظم و نسق پر متعین کیا اور خود رانی کے ساتھ اس کے محل میں پہنچ گیا؟

"میں امید کروں کہ سلطان کو اپنا وعدہ یاد ہے؟"

"میں مسلمان ہوں، مسلمان اپنا وعدہ کبھی نہیں بھولتا۔"

"راج کماری آپ کے انتظار میں ہے۔"

"ہم آج صبح اتاریں گے۔ کل راج کماری کو اسلام قبول کرنا ہوگا۔"

"مجھے بھی اپنا وعدہ یاد ہے۔ ہم ہندو عورتوں کا دھرم وہی ہوتا ہے جو اس کے پتی کا ہوتا ہے۔ وہ اس کے لیے جی سے تیار ہے۔"

"اور تم رانی چاہا؟"

"میں بھی اپنا دھرم چھوڑنے کو تیار ہوں۔"

"ہمیں اب آرام کرنا ہے۔"

وہ آرام کرنے کے لیے اس بستر پر لیٹا جو کبھی دلپت رائے کے استعمال میں رہتا ہوگا تو دنیا کے شیب و فراز کے کئی رنگ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہو کر گزر گئے۔

اس کے سامنے اس کے ماضی کا ایک ایک ورق کھلا ہوا تھا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب اس کے باپ بہاء الدین کے احوال کے بعد اس کے چچا علاؤ الدین جہاں سوز نے غزنی پر قبضہ کیا اور ظلم و بربریت کا ایسا بازار گرم کیا کہ علاؤ الدین جہاں سوز کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس نے آل سبکیں کی فہریم کھدوائیں اور ان کی ہڈیوں کو نذر آتش کیا۔ اور گور تان واپس آ کر اپنے بیٹوں شہاب الدین اور غیاث الدین کو شہر کی حکومت عطا کی۔

ظہر تبدیل ہوا، شہاب الدین اور غیاث الدین ۹۸۸ھ کے قلعے میں قید تھے۔

کسی وقت بادشاہ نے یہ شہر کسی کے حوالے کرنا چاہا تو تم یہاں موجود ہو گے۔"

"نہ جانے آپ لوگوں سے کب تک ملاقات نہ ہو۔"

"راج کماری جیسے ہی سلطان کے دل میں گھر کر لے گی ہم جہاں بھی ہوں گے تمہیں بلانے کی کوشش کریں گے۔ یہ بھی کوشش کرتے رہیں گے کہ تمہیں اچ شہر کا راجا بنا دیں۔"

اگر سلطان شہاب الدین کا کھراؤ ہندو راجاؤں سے ہو تو تم اس جنگ میں شامل ہو جانا اور اپنا حق طلب کرنا۔ ابھی تو تم بالک ہو مگر یہ سب کچھ آج نہیں ہوتا ہے۔ راجا بھیم دیو کو اپنا دشمن سمجھنا کہ اسی کی غداری نے سلطان کو ہم پر مسلط کیا ہے۔"

یہ رات گزری اور صبح ہوئی تو راج کماری نے اپنے بھائی کو آخری مرتبہ جی بھر کے دیکھا۔ دونوں بھائی بہن دیر تک گلے لگ کر روتے رہے۔ دیو داس نے ماں کے قدم چھوئے اور چلا گیا۔

دلپت اپنی پریشانیوں میں گم تھا۔ اسے خبر تک نہ ہوئی کہ راج کماری محل میں نہیں۔

اب صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا۔

شام کے وقت دلپت رائے روزانہ کی طرح محل سے نکلا اور فصیل پر جانے کے لیے میزبیاں چڑھنے لگا۔ رانی بھی اس کے ساتھ تھی۔

"تم کیوں چلی آ رہی ہو؟" دلپت نے کہا۔ "تم تو سلطان کے ساتھ ہو؟ میرے خلاف ہو۔"

"میں آپ کو سمجھاتی رہی ہوں لیکن میرا دھرم تو آپ کے ساتھ ہے۔ جو آپ کا فیصلہ وہی میرا فیصلہ۔"

دونوں بہت بلندی تک پہنچ گئے تھے۔ اچانک دلپت رائے کا پاؤں پھسلا اور وہ اتنی بلندی سے نیچے آ گیا۔ جو لوگ رانی اور راجا کے ساتھ چل رہے تھے کچھ سمجھ ہی نہ پائے اور نیچے کی طرف بھاگے۔ رانی بھی لوگوں کو دکھانے کے لیے چپٹی ہوئی نیچے آئی، وہ یہ دیکھنے آئی تھی کہ دلپت مر گیا یا بچ گیا۔

سب کی طرح وہ بھی حیران تھی۔ دھکا تو اس نے دیا تھا لیکن تیر اس نے نہیں چلایا تھا جبکہ اوندھے پڑے ہوئے دلپت کی پٹھ میں ایک تیر بھی بیوست تھا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ فصیل پر بیٹھا ہوا کوئی سپاہی بھی دلپت سے بے زار تھا۔

دلپت مر گیا۔ یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ اس کی موت میزبیاں سے گرنے سے ہوئی یا تیر جان لیوا ثابت ہوا۔

اب رانی کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے شہر کے دروازے کھلوا دیے۔ شہاب الدین غوری اپنے لشکر کے

"بادشاہ یقیناً یہاں نہیں رہے گا۔ وہ راج کماری کو جہاں لے کر جائے گا میں بھی اپنی بیٹی کے ساتھ جاؤں گی۔ کیونکہ یہاں رہنا میرے لیے خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ دلپت کے وفادار مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں آپ کو ضمانت دیتا ہوں کہ جہاں راج کماری جائیں گی آپ ان کے ساتھ ہوں گی۔"

"اپنے بادشاہ سے یہ بھی کہنا کہ جب وہ شہر میں داخل ہو تو اس کے لشکری لوٹ مار نہ مچائیں۔ میرے خاندان کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

"اور دلپت رائے؟"

"اس کے ساتھ بادشاہ جو چاہے سلوک کرے۔ جو بادشاہ کے خلاف کوار اٹھائے اس کے لیے بھی بادشاہ آزاد ہوگا۔ جس طرح چاہے نئے۔"

قاصد نے اس کی تمام شرطیں مان لیں۔

"اب تم جاؤ۔ دو دن بعد شہر کے دروازے کھل جائیں گے۔"

قاصد کے جانے کے بعد رانی نے اپنے دونوں بچوں راج کماری سون کرنا اور راج کماری دیو داس کو اپنے پاس بلایا اور انہیں قاصد سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔

"میرے بچو! میں نے تمہارے باپ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ سلطان کسی نہ کسی دن اس شہر کو فتح کر لے گا۔ اس کے بعد ہماری جانیں اس کے رحم و کرم پر ہوں گی۔ اس کے سپاہی اس شہر کو جی بھر کر لوٹیں گے۔ اب جو اس نے پیغام بھیجا ہے کہ وہ راج کماری کو اپنی ملکہ بنائے گا اور شہر کو نہیں لوٹے گا تو اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ میں اس کے لیے شہر کے دروازے کھول دوں۔ راج کماری بہت بڑے بادشاہ کی ملکہ ہوگی۔ کیا تمہیں میرے فیصلے سے اختلاف ہے؟"

"ہم دونوں نے آج تک آپ کی کوئی بات نہیں مانی۔" دیو داس نے کہا۔

"دیو داس! تمہارے لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تم کل ہی اپنے ماموں کے پاس ہانسی چلے جاؤ گے۔ دریائے سرسوتی کے کنارے کھڑی خویلوں میں سے کوئی بھی تمہیں مل جائے گی۔"

"میں وہاں کیوں جاؤں۔ آپ کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔" دیو داس نے پہلی مرتبہ اس سے اختلاف کیا۔

"میں نے کچھ سوچ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ تم آج شہر کے وارث ہو۔ تمہارا ہندوستان میں رہنا ضروری ہے۔ اگر

وہ ان سب کو اسی کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔

ReRe

سلطان شہاب الدین غوری اپنے لشکر کے ساتھ غزنی سے چلا۔ گھانٹوں اور دیواروں کو عبور کرتا ہوا ملتان اور راج کی طرف آیا اور یہاں سے براہ ریکستان گجرات کی طرف روانہ ہوا۔ یہ 574ھ کا واقعہ ہے۔ وہ نہروالا کے نواح میں پہنچا تو بہیم دیو اس سے پہلے ہی پڑاؤ ڈال چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جنگ نہیں ہوتی ہے۔ شہاب الدین بھی کچھ قاصد پر خیمہ زن ہو گیا۔

شہاب الدین آنے والے حالات سے قطعی بے خبر تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تین بڑے لشکر اپنے علاقوں سے اس جنگ میں شامل ہونے کے لیے چل پڑے ہیں۔ اس کے خبر اصرار دھر پھیل گئے تھے لیکن یہ لشکر غیر معروف راستوں پر تھے لہذا خبروں کو کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ ان لشکروں کو بھی کوئی جلدی نہیں تھی کیونکہ طے یہ ہوا تھا کہ یہ لشکر جنگ شروع ہونے کے بعد میدان میں اتریں گے تاکہ شہاب الدین کو سنبھالنے کا موقع نہ مل سکے۔

شہاب الدین نے بہیم دیو کے لشکر پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی اور اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ دوسری طرف سے بہیم دیو کی فوجیں آگے بڑھیں۔ بہیم دیو کی فوجوں نے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جلد ہی قدم اکھڑنے لگے۔ سورج آگ برسا رہا تھا کہ خون، زمین، کی پیاس بجھانے لگا۔ کھواروں کے زور نے بہیم دیو کی اگلی صفوں کو صاف کر دیا۔ پسائی کے آثار صاف دکھائی دینے لگے تھے کہ عین اس وقت راجا جمیر کا لشکر نمودار ہوا۔ شہاب الدین نے اس نئے حملہ آور کو تشویش سے دیکھا۔ سالاروں کو حکم دیا کہ بہیم کے ٹھکے ہوئے سپاہیوں کو چھوڑ کر نئے حملہ آوروں کو کھواروں پر رکھ لیں۔ کھواروں نے اپنا رخ تبدیل کیا ہی تھا کہ کھانڈے رائے آن موجود ہوا اور پھر قہقہے کا راجا آگیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ پورا ہندوستان اس میدان میں سما جانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ ہر راجا کا لشکر شہاب الدین کے لشکر سے بڑا تھا۔

شہاب الدین کا لشکر پہاڑوں میں گھرے اونٹ کی طرح کم حیثیت نظر آ رہا تھا۔

جنگ کا نقشہ بدل گیا تھا۔ مسلمان سپاہی کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ اب مزید جنگ کرنا اپنے سپاہیوں کو خودکشی پر مجبور کرنا تھا۔ اس نے پسائی اختیار کی۔ فرار ہی میں عافیت سمجھی۔ اس نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ اتنے بڑے لشکر کے سامنے سے بچ لکنا ہی کسی کا رنہ سے کم نہیں تھا۔

لہو والا، عالم گھراٹ رائے بہیم دیو رانی راج کنول اہلار رام دیو گل کے ایک کمرے میں خاموش بیٹھے سب کے چہروں سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ بہیم دیو بھی اسی ایک انہی خبر سنا چکا تھا کہ سب کا پریشان ہونا لازمی تھا۔ وہ اپنے اہل خانہ کو بتا چکا تھا کہ غزنی کا بادشاہ سلطان شہاب الدین ہم پر حملہ آور ہونے کے لیے اپنے علاقوں سے نکل کر ہندوستان میں داخل ہو چکا ہے۔

اس خاموشی کو ایک مرتبہ پھر خود بہیم نے توڑا۔ "اس مرتبہ شہاب الدین اپنے لشکر کو زندہ واپس نہیں لے جائے گا۔ میں نے اجیر کے راجا رائے پتھو را، قہوج لے راجا بے چند اور دہلی کے راجا کھانڈے رائے کو خط لکھ دیے تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے اپنے لشکر ہماری مدد کو بھیجیں گے۔ سوچو وہ منظر کیسا ہوگا جب تینوں راجاؤں کے لشکر ہماری مدد کو پہنچیں گے اور شہاب الدین کو عظیم الشان شکست ہوگی۔"

رام دیو کے جوان خون نے شور مچایا۔ "کیا ہم اکیلے شہاب الدین کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو آپ نے ان راجاؤں کا احسان قبول کر لیا۔"

"شہاب الدین کوئی معمولی طاقت نہیں۔ وہ ملتان اور اچ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کر چکا ہے۔"

"پتا جی، اس نے اچ میں بہادری سے نہیں چال بازی سے کام لیا تھا۔ اگر وہاں کی رانی غداری نہ کرتی تو اچ پر قبضہ نہیں ہو سکتا تھا۔"

"یہ تم غلط کہہ رہے ہو۔ وہ دلپت رائے کو میدان میں شکست دے چکا تھا۔ رانی نے ٹھیک کیا کہ دروازے کھلوا دیے ورنہ وہ دیر سے سکی، شہر میں داخل ہو ہی جاتا۔"

"آپ دلپت رائے نہیں ہیں پتا جی۔ ہم اکیلے بھی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آپ نے مدد طلب کر کے ریت ڈال دی ہے۔ کل کو ان پر مشکل آئے گی تو ہمیں بھی پہنچنا پڑے گا۔"

"تم ابھی بالک ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے ان تینوں کو شہاب الدین کا دشمن بنادیا ہے۔ شہاب الدین اس شکست کے بعد اگر ہندوستان آیا تو

وہ تیاری مکمل کر چکا تھا کہ غزنی سے بغاوت کی خبریں آنے لگیں۔ اس نے اپنے ایک سردار علی کرماج کو ملتان، اچ اور اردگرد کے علاقوں کا حاکم بنایا اور خود غزنی واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے ہندو راجاؤں نے سکھ کا سانس

لیا۔

اب ہم دیو کو ضروری معائنے کے لیے لشکر گاہ کی طرف جانا تھا۔

کے ساتھ میدان جنگ میں نہیں جائیں گے۔"

"پھر بھی تم لوگوں کو غزنی جانا ہوگا۔"

بادشاہ کے حکم سے سرتابی نہیں کی جاسکتی تھی۔ رانی اور ابجھاری کو غزنی جانا پڑا۔

رانی کو سلطان کے تیور دیکھ کر ایسا دھچکا لگا کہ غزنی پہنچنے ہی بیمار پڑ گئی۔ اس کی بیماری کی خبر سلطان تک پہنچائی گئی لیکن وہ یہاں کے نظم و نسق میں مصروف رہا۔

شہاب الدین نے رانی کے توسط سے اپنا کام نکال تو لیا تھا لیکن دل ہی دل میں اس سے ناراض تھا کیونکہ اس نے اپنے شوہر سے بے وفائی کی تھی۔ اس نے اس کی بیماری کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ پھر اسے اطلاع ملی کہ رانی کا انتقال ہو گیا۔ غزنی میں راج کمار کی اکیلی رہ گئی تھی۔ سلگتے دن جلتی راتیں تنہائی میں گزرنے لگیں۔ کچھ ماں کی موت کا صدمہ، کچھ سلطان کی بے رخی کا احساس۔ وہ پتھر کی طرح خاموش ہو گئی۔ بیٹھی دیواروں کو گتھی رہتی۔ اس کے خدمت گاروں کو تو یہ شک ہونے لگا تھا کہ راجکمار کی بولنا بھول گئی ہے، قوت گویائی سے محروم ہو گئی ہے۔

سلطان کو خیال بھی نہیں آیا کہ اسے غزنی سے بلوالیتا۔ شاید اسے یاد بھی نہیں رہا تھا کہ راجکمار سے اس کی شادی ہوئی ہے۔

راجکمار اس تنہائی کا مقابلہ نہ کر سکی اور اس کا بھی انتقال ہو گیا۔

سلطان شہاب الدین اردگرد کے علاقوں کا نظم و نسق درست کر چکا تھا۔ اب وہ حاکم گجرات رائے بہیم دیو کی طرف متوجہ ہونے کا خواہش مند تھا۔ وہ ابھی بھولنا نہیں تھا کہ اس نے دلپت رائے کو مقابلے پر اکسایا تھا اور اس کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔ یہ الگ بات کہ بعد میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا تھا اور اب سلطان کے علم میں یہ خبریں بھی آرہی تھیں کہ بہیم دیو، ہندوستان کے راجاؤں کو سلطان کے خلاف بھڑکا رہا ہے اور مل کر مقابلہ کرنے کے لیے ساز باز کر رہا ہے۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس سے پہلے کہ یہ راجا بہیم دیو کی مدد کو پہنچیں وہ اس پر حملہ کر دے گا۔

وہ تیاری مکمل کر چکا تھا کہ غزنی سے بغاوت کی خبریں آنے لگیں۔ اس نے اپنے ایک سردار علی کرماج کو ملتان، اچ اور اردگرد کے علاقوں کا حاکم بنایا اور خود غزنی واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے ہندو راجاؤں نے سکھ کا سانس

لیا۔

ReRe

جائے۔ میری بار بار کی کوششوں کے باوجود غزنی پر قبضہ نہ ہو سکا۔ پھر غیاث الدین نے خود لشکر کشی کی اور غزنی کو غورستان کا حصہ بنا دیا۔ یہاں کی حکومت میرے سپرد کر دی۔ میں غوری تھا اور غزنی پر حکومت کر رہا تھا۔ وہ غزنی جس پر سلطان محمود غزنوی حیدر طاقتور بادشاہ حکومت کر چکا تھا۔ اس کو کہتے ہیں دنیا کے نشیب و فراز۔

میں نے اپنے بھائی غیاث الدین کے حکم سے ملتان پر حملہ کیا اور اب اچ فتح کر لیا۔ وہ بستر جس پر کبھی دلپت رائے موتا تھا میرے نیچے بچھا ہوا ہے۔ اسے کہتے ہیں دنیا کے نشیب و فراز۔

وہ رات پھر انہی خیالات میں غلطاں رہا۔ صبح سو کر اٹھا تو ٹھنکن اتر چکی تھی لیکن آنکھیں نیند کے بوجھ سے بھاری ہو رہی تھیں۔

اس نے ماں بیٹیوں کو مسلمان کیا اور راجکمار اس کے حرم میں آگئی۔

سلطان شہاب الدین نے اس کے ساتھ شب زفاف گزارا ضرور لیکن یہ خیال بار بار آتا تھا کہ یہ اپنے باپ کے قتل میں اپنی ماں کی شریک رہی ہے۔ یہ اپنی ماں کو روک سکتی تھی لیکن ملکہ بننے کے لالچ میں خاموش رہی ہوگی۔ رانی ملاقات کے لیے آئی تو بھی یہی خیال دامن گیر رہا۔ جس عورت نے اپنے شوہر سے بے وفائی کی اس پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے، یہ دونوں اگر یہاں رہیں تو ضرور کوئی نہ کوئی گل کھلائیں گی۔

راجکمار کے ساتھ چند دن گزارنے کے بعد ہی جب سلطان نے یہ حکم جاری کیا کہ رانی اور راجکمار کو غزنی بھیج دیا جائے تو رانی سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"رانی کی شادی کو ابھی دن ہی کہتے ہوئے ہیں اور آپ اسے غزنی جیسے دور دراز ملک میں بھیج رہے ہیں اور وہ بھی اکیلی۔"

"اکیلی کہاں، تم بھی اس کے ساتھ ہوگی۔ کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ جہاں تمہاری بیٹی رہے گی وہاں تم بھی رہوگی۔"

"ملکہ تو بادشاہ کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔ جب آپ یہاں ہیں تو اسے بھی یہیں رہنا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ غزنی جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ چلے جائیں۔"

"مجھے ابھی یہاں بہت سے سر کے سر کرنے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں جنگوں میں اپنی عورتوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔"

"میں اور راج کمار اچ میں ہی رہیں گے۔ آپ

شہاب الدین نے بڑی مشکوں سے جان بچائی اور بچے کچھ لشکر سمیت بھاگتے ہوئے غزنی کی راہ لی۔

وہ اتنی بڑی ہزیمت اٹھا کر غزنی آیا تھا کہ حوصلوں نے سپر ڈال دی تھی لیکن شہاب الدین کو تاریخ میں اپنا نام درج کرانا تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ غزنی میں جگہ جگہ بھٹیاں لگا دی گئیں۔ بڑے پیمانے پر اسلحہ تیار ہونے لگا۔ بڑے پیمانے پر بھرتیاں کیں اور ایک نیا لشکر تیار کر لیا۔

اسے پچھلے سال تجربہ ہو چکا تھا کہ ہندوستان کے راجا متحد بھی ہو سکتے ہیں۔ اس مرتبہ اس نے یہ حکمت عملی تیار کی کہ راجاؤں پر حملہ آور ہونے سے پہلے راستے میں پڑنے والے تمام بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا جائے تاکہ ان راجاؤں پر اس کا رعب بھی قائم ہو اور ان قوتوں کا بھی کا خاتمہ ہو جو ان راجاؤں کی مدد کر سکتی ہیں۔

وہ غزنی سے نکلا۔ گویا شیر کھار سے باہر گیا۔ اس نے اپنے گھوڑوں کا رخ پشاور کے نواح کی طرح موڑ دیا۔ ان علاقوں تک پہنچا جو ابھی تک اس کی مملداری میں نہیں تھے۔ یہ علاقے اس وقت بکرام، پرشور اور فرسور کہلاتے تھے۔ جو طاقت سامنے آئی اسے مسل کر رکھ دیا۔ ان علاقوں پر اس کا قبضہ ہو گیا۔

پشاور اور اس کے گرد و نواح میں اپنی عملداری مضبوط کرنے کے بعد وہ لاہور کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ لاہور کی حکومت اس وقت غزنوی خاندان کے آخری تاجدار خسرو ملک کے ہاتھوں میں تھی۔

خسرو ملک کی حکومت کی بنیادیں راجا دہلی اور دوسرے راجاؤں کے بار بار حملوں اور افغانوں کی یورشوں کے سبب کمزور ہو چکی تھیں۔ اب خسرو ملک میں اتنی طاقت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ شہاب الدین کا مقابلہ کرتا۔ وہ کھلے میدان میں گرجنے کے بجائے قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی بہت گفت و شنید کے بعد شہاب الدین نے بھی جنگ کا ارادہ ترک کر دیا۔

خسرو ملک نے اپنا ایک نو عمر لڑکا، ایک ہاتھی چند تحائف کے ساتھ سلطان کے پاس بھیجے اور صلح کا خواہاں ہوا۔

”میں صلح کا خواہاں ہوں۔ آپ ہندو راجاؤں سے جنگ کے لیے نکلے ہیں۔ مجھ مسلمان پر ہاتھ نہ ڈالیں۔ میری حکومت میرے پاس رہنے دیں۔ میں کسی بھی وقت آپ کی راہ میں مزاحم ہونے کی جرأت نہیں کروں گا۔ آپ میرے لڑکے کو بہ طور ضمانت اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔“

نیک نیت بادشاہ نے خسرو ملک کے بیٹے کو واپس کر دیا

اور لاہور کی حکومت خسرو ملک کے حوالے کر کے غزنی چلا گیا۔ 576ء میں شہاب الدین ایک مرتبہ پھر غزنی سے نکلا اور سندھ کے مشہور شہر دہیل یا دہول پر حملہ آور ہوا۔ یہ سندھ کی قدیم بندرگاہ اور مشہور شہر تھا۔ یہ وہی دہیل تھا جہاں بھی محمد بن قاسم آیا تھا اور راجا داہر کو شکست دی تھی۔

شہاب الدین نے صرف تین ماہ میں نہ صرف دہیل بلکہ دریائے سندھ کے تمام مقامات کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اپنے ایک امیر سیف الملوک کو سندھ کا حاکم بنایا اور خود بے پناہ مال غنیمت لے کر اپنے وطن لوٹ گیا۔

سندھ کی فتح کے بعد چار سال تک غزنی سے ہندوستان تک کے راستوں نے کسی لشکر کا منہ نہیں دیکھا لیکن 580ء میں گھوڑوں کی ٹاپوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ شہاب الدین نے ایک مرتبہ پھر ایک مہم شروع کی۔ دریائے راوی اور چناب کے ارد گرد کے علاقوں کو خوب جی بھر کر لوٹا اور سیالکوٹ پہنچ کر اسے فتح کر لیا۔ یہاں اس نے ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا۔ سیالکوٹ اور گرد و نواح کے جتنے علاقے اس نے فتح کیے تھے، ان کی حکومت اپنے ایک سالار حسین خرمل کے سپرد کی اور خود غزنی واپس چلا گیا۔

اس کے عزائم کچھ اور تھے لیکن وہ یہ سیزھیاں زینہ بہ زینہ چڑھ رہا تھا۔

شہاب الدین کے چلے جانے کے بعد لاہور کے حاکم خسرو ملک کو قلعہ سیالکوٹ کو فتح کرنے کی سوجھی۔ اس نے آس پاس کے ہندوؤں اور کھنکر قوم کو اپنے ساتھ ملایا اور قلعہ سیالکوٹ کو فتح کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

کھنکر ایک لاد مذہب قوم تھی۔ یہ لوگ دریائے سندھ سے لے کر کوہ سواک کے دامن تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ قوم نہایت فتنہ پرور تھی۔ آس پاس کے قبیلوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ ان لوگوں نے خدا پرست مسلمانوں کے لیے پنجاب کا سفر کرنا بھی مشکل کر دیا تھا۔

یہ لوگ کسی مذہب اور اخلاقی اصولوں کے قائل نہیں تھے۔ لڑکیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ نہایت برا تھا۔ ان کے ہاں رواج تھا کہ جب ان کی لڑکی جوان ہو جاتی تھی تو لڑکی کا باپ یا بھائی اسے دروازے پر لے کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ایسا لباس پہنایا جاتا تھا کہ اس کے جسم کے حصے صاف نظر آئیں۔ راستہ چلنے والوں کو اشارے سے بلایا جاتا تھا۔ لڑکی کی قیمت بتائی جاتی تھی۔ خریدار بھی لڑکی کے جسم کو ٹٹول کر دیکھتا تھا اور اپنی سلی کر لیتا تھا۔ گاہک آتے رہتے تھے اور یہ عمل جاری رہتا تھا۔ اگر کوئی خریدار لگ جاتا تو وہ لڑکی اس کے حوالے کر

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا
اب اس کا حال بتائیں کیا

مگر ہم آپ کو بتائیں گے اور خوب بتائیں گے۔

جی ہاں **سنگرشت** کا ایک اور معرکہ الارا خاص نمبر

عشق ناکا کا گمراہ

عشق جس میں مہر بھی ہے اور قہر بھی، وصل بھی ہے اور فراق بھی عشق، انسان سے کیا کچھ نہیں کراتا انہوں نے بھی اپنی شہرت و ناموری کو داؤ پر لگا دیا۔

مشہور و معروف ہستیوں، تاریخ ساز افراد کے ناکام عشق کی داستانیں دل پر اثر کرنے والی سچ بیانیاں، ایسی دلچسپ سچی کہانیاں جو آپ کو چونکا دیں گی۔

ایک ایسا خاص شماره جسے آپ مملوٹ رکھنا ضروری سمجھیں گے

مہر و جلال آپ کے ہاتھوں میں ہوگا

ہر صاحب علم کے لیے تحفہ خاص

نیزہ سیدھا کیا۔ اس کی طرف بڑھا اور ہاتھی کے پاس پہنچ کر اس نے پورے زور سے ہاتھی کے منہ پر نیزے کا وار کیا۔ نیزہ ہاتھی کے منہ میں چلا گیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ ہاتھی کے دانت ٹوٹ گئے۔ کھانڈے رائے بہادر راجپوت تھا۔ اس افتاد سے ذرا بھی نہیں گھبرایا۔ پورے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے ہاتھی پر بیٹھے بیٹھے شہاب الدین کے بازو پر کھوار کا ایسا وار کیا کہ شہاب الدین بری طرح زخمی ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ شہاب الدین بے ہوش ہو کر گھوڑے سے گر جائے، ایک چنگی سیاہی نہایت پھرتی سے شہاب الدین کے گھوڑے پر چڑھ گیا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ یہ سپاہی اسے لے کر ان امیروں کے پاس پہنچا جو میدان جنگ سے بھاگ آئے تھے اور میں کوس کے فاصلے پر خیمہ زن تھے۔ ایک مورخ نے اس واقعے کو اس طرح قلم بند کیا ہے۔

”جب کھانڈے رائے کے ہاتھوں زخمی ہو کر شہاب الدین زمین پر گر پڑا تو شام تک یہ شیر غورستان اسی عالم میں زمین پر پڑا رہا۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ جب سورج غروب ہو گیا تو اس کے غلاموں کا ایک گروہ اسے تلاش کرتا ہوا اس کے پاس سے گزرا۔ اس وقت تک وہ کچھ کچھ ہوش میں آچکا تھا۔ وفادار غلام اپنے بادشاہ کو صبح و سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اسے ”اٹھا کرو ہاں لے گئے جہاں جنگ سے فرار ہونے والے امیر جمع تھے۔“

دونوں واقعات میں یہ مماثلت یکساں ہے کہ شہاب الدین کی جان بچ گئی اور اسے اس کے امیروں تک پہنچا دیا گیا۔ یہاں سے وہ غورستان چلا گیا۔

شہاب الدین کو شکست دیتے ہی رائے تھوڑا نئے ٹھنڈا کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ تیرہ مہینے تک قائم رہا بالآخر حاکم قلعہ ملک بہاء الدین نے رائے تھوڑا سے صلح کر لی۔ قلعے پر ہندوؤں کا قبضہ ہو گیا۔

محمد قاسم فرشتہ نے تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ غورستان واپس پہنچ کر شہاب الدین نے میدان جنگ سے بھاگنے والے امیروں سے تو کچھ نہیں کہا لیکن چنگی اور غوری امیروں کو سخت سزا دی۔ اس نے تو بڑوں میں کچے جو بھردا کر ان امیروں کی گردنوں میں لٹکا دیے اور اسی حالت میں ان کو سارے شہر میں پھرایا۔ یہ حکم بھی جاری کیا کہ جو امیر کچے جو نہ کھائے اسے قتل کر دیا جائے۔ امیروں نے اپنی جانوں کی سلامتی کو غنیمت سمجھا اور کچے جو کھالیے اور اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کیا۔

میں طالب مروا گئی سمجھا کہ لشکر کی کمی کا بہانہ لے لیا ہوا ہے۔ وہ اسی لشکر کے ساتھ رائے کے علاقے کے لیے روانہ ہوا۔ دہلی سے چالیس کوس کے فاصلے پر سوسنی کے کنارے پر واقع قصبہ ترائن واپس لوہوں کا آنا سامنا ہوا۔ رائے تھوڑا کے لشکر کی عجیب کیفیت تھی۔ انسانوں کا گھنٹا ہوا شہاب الدین کے سامنے کھڑا تھا۔ بڑے بڑے دل ہائے جارہے تھے۔ قزاقوں کی آوازوں سے دل دہل رہے تھے۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ نے میدان سر پر اٹھایا ہوا معلوم ہوتا تھا ہاتھیوں کی سونڈیں نہیں ہیں، اندھیری رات میں درخت کھڑے جموں رہے ہوں۔ تین ہزار مست فوجی لشکر کے آگے دیوار بنے کھڑے تھے۔ شہاب الدین کا لشکر بھی نعرہ ہائے تکبیر بلند کر کے اپنے لے کا تھین دلارہا تھا۔

معرکہ کا رزا گرم ہوا تو دونوں طرف کے سواروں نے جانبازی کے جوہر دکھانے شروع کیے۔ ہندوؤں کا لشکر تھوڑا سا زیادہ تھا کہ مسلمان سپاہیوں کے قدم اکھڑنے لگے۔ شہاب الدین کے لشکر کا مینہ اور میسرہ بالکل خالی ہو گیا۔ قلب لشکر میں البتہ کچھ لشکر باقی رہ گئے تھے جو ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ تھوڑی دیر میں قلب کا زور بھی ٹوٹ جائے گا۔ اس افراتفری میں ایک امیر گھوڑا دوڑاتا ہوا شہاب الدین کے قریب آیا۔

”سلطان، ہماری فوج کے مینہ اور میسرہ کے دونوں امیر خوفزدہ ہو کر میدان جنگ سے فرار ہو چکے ہیں۔ افغانی اور گجراتی سردار بھی جو ہمیشہ بڑھ چڑھ کر باتیں کیا کرتے تھے، ناکب ہو چکے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ بھی اس وقت جنگ سے ہاتھ اٹھائیں اور لاہور کی طرف روانہ ہو جائیں۔“

”کیا بکتا ہے۔“ سلطان نے ڈانٹ کر کہا۔ ”مجھے دہلی کا سبق سکھانا ہے۔ میں بھی اگر فرار ہو گیا تو مجھ میں اور بھاگنے والے سرداروں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ مجھے قسمت لے آئی جنگ لڑنے پر مجبور کر دیا ہے، میں آخری جنگ لڑا ہوں۔ اگر تجھے بھاگنا ہے تو بھاگ جا۔“

سلطان نے اللہ کا نام لیا اور قلب لشکر کے باقی ماندہ سپاہیوں کو ساتھ لے کر دشمن پر حملہ کر دیا۔ وہ اس بہادری سے لڑا کہ دشمن کے سپاہی بھی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکے تھے کہ اہل دہلی کے راجا کھانڈے رائے کی نظر اس پر پڑی۔ اس نے اپنا ہاتھی شہاب الدین کی طرف بڑھایا۔ اسی لمحہ شہاب الدین نے بھی کھانڈے رائے کو دیکھ لیا۔ اپنا

الدین نے دونوں باپ بیٹوں کو چڑھستان کے ایک قلعے میں قید کر دیا۔ یہ وہی قلعہ تھا جس میں بھی علاؤ الدین جہاں سوز نے غیاث الدین اور شہاب الدین کو قید کیا تھا۔ اسی کو کہتے ہیں دنیا کے نشیب و فراز۔

اس قلعے میں اور بھی غزنوی قیدی تھے۔ غیاث الدین نے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان میں خسرو ملک بھی شامل تھا جو قتل ہوا اور یوں سلطان محمود کے خاندان کا آخری چراغ بھی گل ہو گیا۔

587ء میں شہاب الدین غوری ایک مرتبہ پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ لاہور اب غوریوں کے قبضے میں تھا۔ شہاب الدین کا امیر علی کرم راج اس کا حاکم تھا۔ اردگرد کے علاقوں میں شورشیں ہوتی رہتی تھیں۔ دہلی اور اجیر کے راجا بھی چیمیز چھاڑ کرتے رہتے تھے جنہیں علی کرم راج بڑی خوبصورتی سے پسپا کرتا چلا آ رہا تھا۔

لاہور شہر دہلی تک پہنچنے کا ایک شاعر دروازہ تھا۔ اسی لیے شہاب الدین چاہتا تھا کہ لاہور کو مستحکم کیا جائے اس کے لیے ضروری تھا کہ لاہور کے اردگرد جو عام شہر ہیں انہیں اپنی عملداری میں کر لیا جائے۔ اس سے پہلے وہ اسی خیال سے سیالکوٹ کی طرف گیا تھا۔ اس مرتبہ جو وہ ہندوستان آیا تو اس نے ٹھنڈا کے قلعے کا رخ کیا۔ ٹھنڈا نہایت اہم شہر تھا اور اجیر کے راجا کی سلطنت میں شامل تھا۔ ٹھنڈا میں رائے تھوڑا کا ایک خاصا بڑا لشکر موجود تھا۔ شہاب الدین نے کامیاب حملہ کیا اور معمولی سی جہزپ کے بعد قلعہ فتح کر لیا۔

اس نے یہ قلعہ ملک بہاء الدین کے سپرد کیا اور تیرہ سو سواروں کی جماعت کے ساتھ یہاں چھوڑ کر خود واپسی کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ وہ واپسی کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا کہ غجروں کی اطلاع اس کے کان کھڑے ہو گئی۔ اسے اطلاع ملی کہ رائے تھوڑا اور اس کا بھائی کھانڈے رائے، راجا دہلی دو لاکھ سواروں اور تین ہزار ہاتھیوں کا ایک زبردست لشکر لے کر ٹھنڈا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے ہندوستان کے دیگر راجاؤں کو بھی خط لکھے ہیں۔ دیگر راجا بھی جلد ہی اس جنگ میں شامل ہو جائیں گے۔ رائے تھوڑا بھی اپنے لشکر کے ساتھ چل نکلا ہے۔

اس خبر کو سنتے ہی شہاب الدین نے سامان سفر کھول دیا۔ لشکر بھیجا کہ یہ ہنگامہ کارزار اس کی غیر موجودگی میں برپا نہیں ہوا۔

شہاب الدین اس سال اپنی فتوحات کو ٹھنڈا تک محدود رکھنا چاہتا تھا اس لیے زیادہ بڑا لشکر اس کے پاس نہیں

دی جاتی تھی ورنہ اس بے زبان کو وہیں موت کے گھاٹ اتار کر اس کے بوجھ سے نجات حاصل کر لی جاتی تھی۔

ان لوگوں میں یہ دستور بھی تھا کہ ایک بیوی کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے۔ جب کسی شوہر کو اپنی خواہش پوری کرنی ہوتی تھی اور وہ بیوی کے گھر میں داخل ہوتا تھا تو دروازے پر اپنا نشان لگا جاتا تھا تاکہ دوسرے شوہروں کو اس کی موجودگی کا علم رہے۔ ایسے عالم میں اگر کوئی دوسرا شوہر عورت کے مکان پر آتا تو وہ نشان دیکھ کر اعزازہ کر لیتا کہ اس وقت اس کی بیوی تنہا نہیں ہے۔ وہ واپس چلا جاتا تھا۔

یہ وہ عورتیں ہوتی تھیں جنہیں کئی خریدار مل کر بھاری رقم میں خریدتے تھے لہذا ان سب کا اس پر برابر کا حق ہوتا تھا۔ خسرو ملک نے اسی بے دین قوم کو اپنے ساتھ ملا کر قلعہ سیالکوٹ کو فتح کرنا چاہا لیکن ناکام رہا اور واپس ہونے پر مجبور ہو گیا۔

اس کی اس ناکامی کا ایک سبب جموں کا راجا چکرو دیو تھا جو خسرو ملک سے عداوت رکھتا تھا۔ اس نے ایک طرف تو اپنا قاصد غزنی کی طرف دوڑایا کہ وہ شہاب الدین کو باخبر کر دے، دوسری طرف وہ اپنا لشکر لے کر سیالکوٹ کے قریب پہنچ گیا۔ اب خسرو ملک دو طرفہ گھیر گیا تھا۔ آگے بڑھتا تو حسین خرمیل قلعے سے نکل کر حملہ آور ہوتا پیچھے چکرو دیو کا لشکر کھڑا تھا۔ اس نے واپسی میں عافیت بھیجی۔

شہاب الدین کو خبر پہنچی تو وہ خسرو ملک کی اس حرکت پر سخت برا فروختہ ہوا اور ایک زبردست لشکر تیار کر کے لاہور آ گیا۔

خسرو ملک اس بار بھی مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے قلعہ بند ہو گیا۔ بیٹھا سوچتا رہا کہ وہ کب تک قلعہ بند رہ سکے گا۔ شہاب الدین کا غصہ کم کرنے کا ایک یہی طریقہ ہے کہ قلعے کے دروازے کھول دیے جائیں۔ شاید اس مرتبہ بھی اسے معافی مل جائے۔

اس نے قلعے کے دروازے کھول دیے اور نہایت عاجزی کے ساتھ سلطان کی خدمت میں پہنچ گیا اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ اسے شہر میں لے کر آیا۔ اس طرح لاہور بھی فتح ہو گیا۔ اس نے لاہور کو بھی ملتان کے حاکم علی کرم راج کے حوالے کر دیا۔

خسرو ملک نے پہلے کی طرح اب بھی چاہا کہ اسے امان دے دی جائے لیکن شہاب الدین اب اس کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ اس نے خسرو ملک اور اس کے بیٹے کو غیاث الدین کے پاس فیروز کوہ کی طرف روانہ کر دیا۔ غیاث

بہائیکٹر بکس

999/-

معروف اسکالر سرفراز شاہ کی نئی کتاب

دارالاسلام دہلی، دارالعلوم دیوبند، دارالافتاء دہلی



499/-
الغنا جیل پبلشرز میں بیٹے لمحات کی
دہائی گزشتہ دہائی موت کے منہ سے واپس

اردولفت

(جامع ترین)

مرفوج وقت قدیم الفاظ، فقریات
نحو اورات، ضرب الامثال اور
فنی اصطلاحات کا مستند ترین لغت

575/-

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

- | | | |
|--|---|--|
| <p>آخری معرکہ 350/-
پہلی بار اس ناول کی کہانی نے ہندوستان کی تاریخ کی ایک نئی تصویر پیش کی ہے۔ اس میں ہندوؤں کی ہلاکت اور مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ ہے۔</p> <p>آخری چٹان 350/-
اس ناول میں ہندوؤں کی ہلاکت اور مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ ہے۔</p> <p>سوسال بعد 150/-
اس ناول میں ہندوؤں کی ہلاکت اور مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ ہے۔</p> <p>شاہین 350/-
اس ناول میں ہندوؤں کی ہلاکت اور مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ ہے۔</p> | <p>مظہر علی 350/-
اس ناول میں ہندوؤں کی ہلاکت اور مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ ہے۔</p> <p>خاک اور خون 450/-
اس ناول میں ہندوؤں کی ہلاکت اور مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ ہے۔</p> <p>کلیسا اور آگ 350/-
اس ناول میں ہندوؤں کی ہلاکت اور مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ ہے۔</p> <p>قافلہ حجاز 425/-
اس ناول میں ہندوؤں کی ہلاکت اور مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ ہے۔</p> <p>محمد بن قاسم 350/-
اس ناول میں ہندوؤں کی ہلاکت اور مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ ہے۔</p> <p>پورس کے ہاتھی 199/-
اس ناول میں ہندوؤں کی ہلاکت اور مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ ہے۔</p> | <p>آخری معرکہ 400/-
پہلی بار اس ناول کی کہانی نے ہندوستان کی تاریخ کی ایک نئی تصویر پیش کی ہے۔ اس میں ہندوؤں کی ہلاکت اور مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ ہے۔</p> <p>آخری چٹان 350/-
اس ناول میں ہندوؤں کی ہلاکت اور مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ ہے۔</p> <p>سوسال بعد 150/-
اس ناول میں ہندوؤں کی ہلاکت اور مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ ہے۔</p> <p>شاہین 350/-
اس ناول میں ہندوؤں کی ہلاکت اور مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ ہے۔</p> |
|--|---|--|

Buy online:
www.jbdpress.com

042-37220879
041-2627568

051-5539609
021-32765086

061-4781781
022-2780128

بہائیکٹر بک ڈپو

زیادہ اس خط میں چھی ہوئی رائے پتھورہ کی نیت کو سنا رہا تھا۔ جب قاصد خط ختم کر چکا تو شہاب الدین نے جواب لکھوانا شروع کیا۔

”مجھے اس امر کا پورا پورا اندازہ ہے کہ آپ کا خط محبت اور ہمدردی کے جذبات سے بھرپور ہے۔ میں آپ کی ہدایت پر ضرور عمل کرتا لیکن کیا کروں، مجبور ہوں۔ میں اپنے بھائی کا مکتوب ہوں اور اسی کے حکم کے مطابق یہ ارادہ کیا ہے کہ اگر مجھے اتنی فرصت ملے کہ میں کسی قابل اعتبار قاصد کو اپنے بھائی کے پاس بھیج کر آپ کے لشکر کی کثرت و قوت کا حال بیان کر سکوں اور اپنی کمزوری کی روداد بتا سکوں تو مجھے یقین ہے کہ اس شرط پر صلح ہو سکتی ہے کہ سرحد، پنجاب اور ملتان پر تو غوریوں کا قبضہ رہے اور باقی تمام ہندوستانی علاقے آپ کی حکومت میں چھوڑ دیے جائیں۔“

جب قاصد خط لے کر روانہ ہوا تو امرا کی حیرت بلکہ پریشانی ان کے چہروں سے ظاہر ہونے لگی۔ امرانے آنکھوں آنکھوں میں قطب الدین ایک کو اشارہ کیا کہ وہ استفسار کرے کہ ایسا معذرت خواہانہ خط بادشاہ نے کیوں لکھوایا۔

”ہم غلاموں کو یہ پوچھنے کا حق تو نہیں کہ حضور کی کیا مصلحت تھی پھر بھی ہم یہ جاننے کی کوشش ضرور کریں گے کہ دشمن پر اپنی کمزوری ثابت کرنے میں کیا مصلحت تھی۔“

”اگر آپ لوگ نہ بھی پوچھتے تو میں بتاتا۔ یہ خط نہیں تھا میری ایک چال تھی جو میں نے رائے پتھورہ کو اپنا پیچھا دی ہے۔“

”کیا ہم یہ سمجھیں کہ یہ جنگ کچھ دنوں کے لیے ٹل گئی ہے؟“

”ہرگز نہیں بلکہ اب جنگ میں پہلے سے زیادہ جلدی کرنی ہے۔“

”پھر یہ خط؟“

”میں نے اپنی کمزوری اور ان کی قوت کا ذکر جان بوجھ کر کیا ہے تاکہ وہ زیادہ شہد سے تیاری نہ کریں بلکہ مطمئن رہیں۔ اس دھوکے میں رہیں کہ ہم پر ہر حال میں غلبہ پائیں گے۔ ہماری قوت کا صحیح اندازہ نہ کر سکیں۔ میں نے ان سے جان بوجھ کر اپنے بھائی سے مشورہ طلب کرنے تک مہلت مانگی ہے تاکہ وہ ہماری طرف سے غافل ہو جائیں اور یہ سمجھیں کہ ہم ان سے پہلے جنگ نہیں چھیڑیں گے جبکہ ہمیں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر فوراً جنگ چھیڑنی ہے۔ شاید کل صبح۔“

سپاہیوں کی غربت پر رحم کھاؤ۔ ہم نے اپنے معبودوں کے سامنے قسم کھائی ہے کہ اگر تم اپنے ارادے سے باز آ کر واپسی کا ارادہ کر لو گے تو ہم تم سے کسی قسم کا تعرض نہیں کریں گے اور تمہارا راستہ نہ روکیں گے۔

ہم تم پر رحم کھا کر تمہیں واپسی کا نیک مشورہ دیتے ہیں ورنہ یاد رکھو کہ کل صبح ہم اپنے تین ہزار ہاتھیوں کے ساتھ بے شمار توپچی سپاہیوں کی فوج سے میدان جنگ کو میدان حشر بنا دیں گے اور اس کے نتیجے میں تمہیں شکست کھا کر ذلت و رسوائی کے ساتھ یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔“

سلطان شہاب الدین اپنے خیمے میں تشریف فرما تھا۔ مشعلیں روشن تھیں۔ مشعلوں کی روشنی میں صاف دیکھا جاسکتا تھا کہ اس کے دائیں جانب قطب الدین ایک، غیاث الدین خلجی، حسین خرمیل اور کچھ دوسرے سالار بیٹھے ہوئے ہیں۔ دوسری جانب اس کے وزیر اور دوسرے عمائدین ہیں۔

یہ سب آنے والی جنگ کے لیے حکمت عملی طے کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ اس وقت سب خاموش تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ سلطان کب سلسلہ کلام آغاز کرتا ہے۔ سلطان نے سالاروں اور عمائدین کو مخاطب کیا۔

”عزیزان من!“

ابھی وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ رکن الدین حمزہ خیمہ شاہی میں داخل ہوئے۔

”حضور، رائے پتھورہ کا ایک قاصد لشکر گاہ میں آیا ہے۔ اس کے پاس کوئی پیغام ہے جو وہ آپ تک پہنچانا چاہتا ہے۔“ اس اطلاع پر سب نے ایک دوسرے کی طرف چونک کر دیکھا۔

قطب الدین ایک نے کسی قدر فطنت سے کہا۔ ”اس قاصد کو ابھی وہیں روکو۔ ہمارا اجلاس ختم ہو جائے اس کے بعد اسے باریابی ملنی چاہیے۔“

دوسرے کئی لوگوں نے بھی اس کی تائید کی لیکن بادشاہ نے ان سب کو ٹوک دیا۔

”صاحبو! پہلے اس قاصد سے ملاقات کر لینی چاہیے۔ معلوم تو ہو وہ کیا پیغام لایا ہے۔ اس وقت آپ لوگ موجود ہیں۔ اس کے پیغام کا جواب دینے میں آپ لوگوں کے مشورے کی ضرورت ہوگی۔“

قاصد کو پیش کر دیا گیا۔ وہ اپنے ساتھ خط لایا تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ وہ اس خط کو بہ آواز بلند پڑھے۔ قاصد نے حکم کی تعمیل کی۔

شہاب الدین نے مبر و سکون سے خط سنا۔ وہ خط سے

پورا پورا علم تھا، اس کا سامنا کسی معمولی دشمن سے نہیں تھا۔ راجپوتوں کی بہادری کا تجربہ اسے پہلے بھی ہو چکا تھا اور اس وقت تو پورا ہندوستان اٹھ اٹھا تھا۔ یہ آخری جنگ ہو سکتی تھی اور وہ اسے آخری جنگ کی طرح ہی لڑنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی فوج کو چار حصوں میں منقسم کیا اور ہر حصے کو یہ ہدایت کی کہ وہ باری باری ہندوؤں سے لڑائی کرے۔ اپنی فوج کو یہ ہدایت بھی کی کہ جب ہندوستانی ہاتھیوں کی قطاریں مسلمانوں پر حملہ آور ہوں تو یہ لوگ اپنے آپ کو جھوٹ موٹ کے فراری ثابت کریں اور جنگ کے میدان سے منہ موڑ کر ہندوؤں سے مقابلہ کرنے سے بھاگیں۔ جب ہندوستانی لشکر کے سپاہی ان کا پیچھا کرتے ہوئے اپنی حدود سے تھوڑا بہت باہر نکل آئیں تو پلٹ کر ان پر حملہ کر دیں اور اپنے نیزوں اور گواروں کی جاں گزرا ضربوں سے دشمن کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔

”فوج کا ایک حصہ میرے پاس دوسرا قطب الدین ایک تیسرا غیاث الدین خلجی اور چوتھا حسین خرمیل کے پاس ہوگا۔ میرے ساتھ میرے نائب کی حیثیت سے محمد علی غازی اور امیر شکار ناصر الدین ہوں گے۔ فوج کے چاروں حصے ایسے تیر انداز مقرر کریں گے جو صرف یہ کام کریں گے کہ اپنے تیروں سے ہاتھیوں کو نشانہ بنائیں گے۔ دوسرے لشکری ہاتھیوں کے اندر جو دشمن کے لشکر کی صفیں ہوں گی انہیں ہدف بنائیں گے۔ اس کے بعد کچھ اس طرح پسپائی اختیار کی جائے گی کہ دشمن کو یہ گمان ہو کہ ہم فرار ہو رہے ہیں۔ بس یہی موقع ہوگا جب دشمن کا لشکر ہاتھیوں کی دیوار کو پیچھے چھوڑ کر ہمارے تعاقب کے لیے باہر نکل آئے گا۔ تم بھاگتے رہنا۔ پھر نعرہ نکبیر بلند کروں گا، اس وقت پلٹ آنا اور تعاقب کرنے والوں پر ٹوٹ پڑنا۔ کچھ دائیں پہلو کو دبانے کا کچھ بائیں پہلو۔ میں سامنے کی طرف سے حملہ آور ہوں گا۔ مجھے امید ہے اس اچانک افتاد سے دشمن سنبھل نہیں پائے گا۔“

ان ہدایات کے بعد اس کے سالار اپنے اپنے لشکر کی صفوں کی درستی کے لیے باہر نکل گئے کیونکہ صبح ہوتے ہی جنگ کا آغاز کر دینا تھا۔ شہاب الدین سجدے میں گر کر اللہ تعالیٰ سے اس کی مدد کے لیے دعا گزار ہو گیا۔

رائے پتھو را کا قاصد شہاب الدین کا جواب لے کر اپنے لشکر میں پہنچا اور راجاؤں کے سامنے پیش ہو کر خط ان کے سامنے رکھ دیا۔ خط کو بہ آواز بلند پڑھا گیا۔ اس خط کا ایک ایک لفظ ان راجاؤں کے لیے طمانیت کا باعث تھا۔ رائے پتھو را نے راجاؤں کو مخاطب کیا۔ ”آخر شہاب الدین کی سمجھ میں ہماری بات آگئی۔ ہمیں بھی اس

مہلت کا انتظار کرنا چاہیے جو اس نے مانگی ہے۔ ممکن ہے اس مہلت سے پہلے ہی وہ یہاں سے چلا جائے۔“

”رائے پتھو را، ایسا تو نہیں اس نے کوئی چال چلی ہو۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کیا وہ ہمارے لشکر کی تعداد کو نہیں دیکھ رہا ہے۔ اسی لیے اب وہ معافی طلبی پر اصرار آیا ہے۔“

”شہاب الدین کی عادت ہے کہ وہ شاطرانہ چالوں سے اپنا مطلب نکال لیتا ہے۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ دلپیت رائے کے ساتھ اس نے کیا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی کو لے کر بھاگ گیا تھا۔“ ایک راجا نے کہا۔

”ہمارے لشکر میں کوئی رانی آج نہیں ہے۔ وہ اگر جنگ میں پہل کرتا ہے تو نقصان اسی کا ہوگا۔ ہم تو خود یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہم سے جنگ کرے۔ اب اگر وہ مہلت مانگ رہا ہے تو ہمیں بھی جلدی نہیں۔“

”پھر بھی ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیے۔“

”ہمارے لشکر میدان میں موجود ہیں، چلے نہیں گئے ہیں۔ تم مطمئن رہو راجا بنارس۔“

رائے پتھو را نے شہاب الدین کے جواب سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسلمانوں کا لشکر واقعی بہت کمزور ہے اور پریشانی کی حالت میں ہے لہذا وہ اپنی قوت و کثرت کے نشے میں سرشار ہو کر مسلمانوں کی طرف سے بالکل غافل ہو گیا۔ اس کے لشکر میں رات بھر جنگ کی تیاری کے بجائے شراب کے دور چلتے رہے۔ نشے میں ڈولتے یہ راجا اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ لشکر بھی مطمئن تھا کہ جنگ کچھ دنوں کے لیے ٹل گئی ہے۔

ابھی پوری طرح دن نکلنے بھی نہیں پایا تھا کہ شہاب الدین کی فوج کے چاروں حصے بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑے۔ ہندوؤں کے لشکر کے سردار اگرچہ اس بلائے ناگہانی سے سخت پریشان ہوئے۔ ان کے ہتھیار تنگ ان کے جسموں سے الگ تھے لیکن انہوں نے جس طرح بھی ہوسکا جلد از جلد تیاری کی اور مسلح ہو کر مقابلے پر آڈٹے۔

پھر وہی ہوا جس کی ہدایت شہاب الدین نے کی تھی۔ شہاب الدین کے لشکر کے تیر اندازوں نے ہاتھیوں کو چھلنی کر دیا۔ ہاتھی گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگے۔ اگلی صفیں ہاتھیوں سے آگے نکل آئیں، دو بدولتوں کی شروع ہو گئی۔ یہ ایسی افتاد تھی کہ اگر رائے پتھو را کے لشکر کی تعداد کم ہوتی تو یہ صفیں کب کی اکھڑ جاتیں۔ ہندو کٹ کٹ کر گر رہے تھے لیکن جتنے

لہاں سے زیادہ سامنے آ جاتے تھے۔ انسا لوں کا لہاں لی لہریں ایک کے بعد ایک آرہی تھیں۔ گھنٹوں گنگے تھے لیکن ہندوؤں کے قدم جھے ہوئے تھے۔ بس ایک دفعہ شہاب الدین نے نعرہ نکبیر بلند کیا۔ اشارہ دیا گیا تھا۔ مسلمان لشکر نے پسپائی کے انتظار میں پیچھے ہٹا دیا۔ ہندو سرداروں نے اپنے لشکر کو لٹکایا۔ لشکر بھی اٹھ اٹھا۔ تھے کہ مسلمان پسپا ہو رہے ہیں۔ وہ ان کا پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ دو بج کے نشے میں اتنے سرشار تھے کہ ان کی صفیں بے ترتیب ہو گئیں۔ ایک جھوم تھا جو مسلمانوں کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ نکبیر کی آواز پھر بلند ہوئی۔ بھاگتے ہوئے سپاہی پلٹ آئے۔ شہاب الدین کے بارہ ہزار سپاہی الگ تھلک کھڑے تھے وہ بھی ہندوؤں پر ٹوٹ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہندوؤں کا وہ لشکر پوری طرح کٹ گیا جو مسلمانوں کا پیچھا کر رہا تھا۔

اس گزبڑ میں زخمی ہاتھی اپنے ہی لشکر کو روندنے لگے تھے لہذا ان ہاتھیوں کو میدان سے نکال لیا گیا۔ ان کے نکل جانے کے بعد مسلمانوں کے سروں سے ہاتھیوں کا خطرہ ٹل گیا۔ اتنی دیر میں مسلمانوں کو موقع مل گیا۔ فوج پھر چار حصوں میں تقسیم ہو گئی اور اس فوج نے چاروں طرف سے ایک ساتھ حملہ کر دیا۔

ہندو سردار بار بار اپنے سپاہیوں کو لٹکارتے تھے لیکن سپاہیوں پر خوف طاری ہو چکا تھا۔ پھر تران پر چھائے ہوئے آسمان نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ اتنی بڑی تعداد ہونے کے باوجود ہندو سپاہی میدان جنگ سے منہ موڑنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کھانڈے رائے اور دوسرے بہت سے ہندوستانی راجا ہلاک ہو گئے۔ رائے پتھو را تھوڑی بہت بچی ہوئی فوج کو اپنے ساتھ لے کر بھاگ نکلا۔

شہاب الدین نے اس عظیم الشان فتح کے نشے میں سرشار ہونے کے باوجود صورت حال پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ رائے پتھو را فرار ہو رہا ہے۔ اس نے کچھ دستوں کو اس کے تعاقب میں لگا دیا اور حکم دیا کہ راجا کو زندہ گرفتار کر کے اس کے پاس لایا جائے۔

رائے پتھو را نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی طرح اجیر کی طرف نکل جائے لیکن شہاب الدین کے بھیجے ہوئے دستوں نے اسے جالیا اور حکم کے مطابق زندہ گرفتار کر کے شہاب الدین کے سامنے پیش کر دیا۔

”آؤ رائے پتھو را تم بھاگتے ہوئے اچھے نہیں لگ رہے تھے اس لیے ہم نے تمہیں اپنے پاس بلا لیا۔ کہو کیسا لگا

تمہیں ہمارے پاس آنا؟“

”وقت وقت کی بات ہے مہاراج۔“ رائے پتھو را نے کہا۔ ”ایک دن وہ تھا جب تم ای میدان سے بھاگے تھے۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ اس وقت میں نے تمہیں جانے دیا۔“

”غلطی تو تم سے یہ بھی ہوئی کہ تم نے میری طاقت کا غلط اندازہ لگا دیا اور میرے امن و سلامتی کے پیغام کے باوجود مجھ سے لڑنے چلے آئے۔“

”سلطان، تم نے میرے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ پھر میں جنگ نہ کرتا تو اور کیا کرتا؟“

”تم میری اطاعت کر کے اپنی سلطنت قائم رکھ سکتے تھے۔ میں واپس جانے کو تیار تھا لیکن تم نے میرے قاصد کے پیغام کو ٹھکرا دیا میرے دین کا مذاق اڑایا۔“

”میں نے تو میدان جنگ میں بھی تم سے ہمدردی کی تھی اور تمہیں اس جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔“

”تو نے اپنے لشکروں کی قوت و کثرت کا ذکر کر کے مجھے دھمکانا چاہا تھا۔ میرے لیے ضروری تھا کہ میں تیرے غرور کو پاش پاش کر دوں، اب تو اس حال میں میرے سامنے آیا ہے۔ کہاں گئے تیرے لشکر؟“

”یہ کوئی نئی بات نہیں۔ کبھی تمہیں شکست ہوئی تھی آج مجھے شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہے لیکن مادر کہ شہاب الدین، یہ ہندوستان ہے۔ چند راجا مرے ہیں، سب نہیں مر گئے۔ تیرے خلاف پھر آدمی چلے گی۔ تو تنکوں کی طرح بکھر جائے گا۔ تو ایک فتح پر مغرور نہ ہو اور مجھے جانے دے۔“

”کیا تو اب بھی میری اطاعت قبول کرنے اور جزیہ دینے پر تیار ہے؟“

”یہ میری سرشت میں نہیں۔“

”کیا تو اب بھی مجھ سے جنگ کرنے کی ہمت رکھتا ہے؟“

”موقع ملا تو ضرور لڑوں گا۔“

”کیا میں تجھے زندہ رہنے دوں گا؟“

”تو ہرگز ایسا نہیں کرے گا۔“

”کیوں؟“

”تو مجھ سے ڈرتا ہے۔“

”میری جگہ تو ہوتا تو کیا کرتا؟“

”میں تجھے قتل کر دیتا۔“

”اگر میں بھی تیرے ساتھ یہی سلوک کروں؟“

”تو قانع نہیں غاصب ہے۔ تجھے یہ حق نہیں مانگنا۔“

”میں دشمن کو معاف کر سکتا ہوں، گستاخ کو نہیں۔ اب تو

اپنے مردہ بھائی ہندوؤں کے پاس جانے کے لیے تیار ہو جا۔“
شہاب الدین نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور اپنے
آدمیوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ اسی وقت کئی ہاتھ حرکت میں
آئے اور رائے پتھوراکو لشکرگاہ کی طرف لے گئے۔

اس کا سراں کے تن سے جدا کر دیا گیا۔
رائے پتھورا، بکھری ہوئی لاشوں میں سے ایک لاش
بن گیا۔

ترائن کے میدانوں سے نکل کر شہاب الدین نے
تیزی سے اجیر کا رخ کیا۔ رائے پتھورا کا بیٹا راجا کولا اس
وقت رائے پتھورا کی ناست کر رہا تھا۔ اسے یہ خبریں مل چکی
تھیں کہ نہ صرف رائے پتھورا اور کھانڈے راؤ مارے گئے
ہیں بلکہ سلطان شہاب الدین وہ عظیم طاقت ہے جس نے
راجاؤں کی متحدہ قوت کو شکست دی ہے۔ وہ اکیلا کیا مقابلہ
کر سکتا ہے۔ اس نے عقل مندی کی اور اپنی سلطنت کے
سرکردہ لوگوں کے ساتھ شہاب الدین کے استقبال کے لیے
اجیر سے باہر نکل آیا۔

اس نے شہاب الدین کی خدمت میں قیمتی تحائف
پیش کیے اور التجا کی کہ اسے اجیر کی حکومت بخش دی جائے۔
”میں بزور شمشیر اجیر پر قبضہ کر سکتا ہوں لیکن میں
تمہاری عاجزی قبول کرتے ہوئے تمہاری حاکمیت، برقرار
رکھتا ہوں مگر یہ تنبیہ بھی کرتا ہوں کہ کبھی سرکشی مت کرنا ورنہ
تمہارا انجام تمہارے باپ سے مختلف نہیں ہوگا۔“
”سلطان محترم! میں آپ کا اطاعت گزار رہوں گا اور
جو خراج میرے لیے مقرر کیا جائے گا اسے پابندی سے ادا
کرتا رہوں گا۔“

شہاب الدین نے اس پر خراج مقرر کیا اور کچھ دن
اجیر میں قیام کے بعد وہ دہلی کی طرف چل دیا۔ دہلی کا راجا
ترائن کی جنگ میں مارا گیا تھا اور اب اس کے خاندان کے
کچھ افراد دہلی کا نظم و نسق چلا رہے تھے۔ دیکھنا یہ تھا کہ ان کا
ردعمل کیا ہوتا ہے۔ مقابلہ کرتے ہیں یا استقبال۔

ترائن کی اتنی بڑی فتح کے بعد کس کی ہمت تھی جو
شہاب الدین کے مقابلے پر آتا۔ راجپوت اس وقت سب
ہوئے چوبوں کی طرح تھے۔

کھانڈے رائے کے عزیز و اقارب کا بھی اس وقت
یہی حال تھا۔ انہوں نے بھی راجا کولا کی طرح دہلی سے نکل کر
شہاب الدین کا استقبال کیا۔ شہاب الدین تاریخ اسلام کا
پہلا بادشاہ تھا جو اس وقت دہلی کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔
دہلی سے کوچ کرنے کے بعد شہاب الدین نے اپنے

لشکر کے ساتھ کھرام شہر میں جا کر قیام کیا۔ یہ شہر دہلی سے
تقریباً سو سو میل دوری پر ایک مشہور شہر تھا۔ اس نے قطب
الدین کو کھرام کا حاکم بنایا اور خود شمالی ہندوستان کے کوہستانی
علاقوں کی غارتگری میں مشغول ہو گیا۔

ان علاقوں کو تباہ و برباد کر کے غزنی واپس چلا گیا۔ اس
کے چلے جانے کے بعد قطب الدین ایک نے اسی سال دہلی
اور میرٹھ کے قلعوں پر حملہ کر کے ان دونوں علاقوں کو اسلامی
مقبوضات میں شامل کر لیا۔ قلعہ کول کو تسخیر کیا اور اسی سال
(589ھ) دہلی کو اپنا دارالسلطنت بنا کر آس پاس کے
علاقوں اور شہروں پر قبضہ کر لیا۔

کچھ عرصہ بعد شہاب الدین غزنی سے پھر ہندوستان
آیا۔ اس بار اس نے قنوج کا راستہ لیا۔ قنوج کے راجا نے
مقابلہ ضرور کیا لیکن ٹھہر نہ سکا اور اپنے کوہ پیکر ہاتھیوں کی
قطاریں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ شہاب الدین نے یہاں کے تمام
مال و متاع پر قبضہ کر کے بنارس کی طرف کوچ کیا۔ یہاں پہنچ
کر اس نے ایک ہزار مندروں کو اس غرض سے مسمار کیا کہ
مسلمانوں کے رہنے کے لیے مکان بنائے جائیں۔

اب ترائن کے میدان سے بنارس تک کوئی طاقت نہیں
تھی جو مسلمانوں کے خلاف سر اٹھا سکے۔ کچھ علاقے آزاد رہ
گئے تھے، باقی شہاب الدین کے اطاعت گزار تھے۔ انہوں
نے خراج ادا کر کے اپنی سلطنت قائم رکھنے کی اجازت لے
لی تھی۔ یہ ظاہر سنا تھا لیکن اندر لاوا پک بھی رہا تھا۔ رائے
پتھورا کا ایک رشتہ دار مجیم راج تھا۔ وہ شہاب الدین سے
انتقام لینے کے لیے اپنی قوت میں اضافہ کر رہا تھا۔ ترائن کے
میدان میں جو لشکر مرنے سے بچ گئے تھے وہ بھاگ بھاگ کر
اس کے پاس جمع ہو رہے تھے۔ قنوج کا راجا بھی شہاب
الدین سے شکست کھا کر مجیم راج کے پاس پہنچ گیا تھا۔ مجیم
راج کو صرف یہ انتظار تھا کہ شہاب الدین غزنی واپس چلا
جائے تو وہ اپنے ارادوں کی تکمیل کرے۔

شہاب الدین نے بنارس کے انتظامات مکمل کرنے
کے بعد ہندوستانی علاقوں کی حکومت قطب الدین ایک کے
سپرو کی اور غزنی واپس چلا گیا۔

شہاب الدین کے جاتے ہی مجیم راج اور راجا قنوج
نے مل کر رائے پتھورا کے بیٹے راجا کولا پر حملہ کر دیا اور راجا
اجیر کو اس کے قبضے سے نکال لیا۔

اجیر شہاب الدین کا باج گزار تھا لہذا اس کی حفاظت
مسلمانوں کی ذمہ داری تھی۔ قطب الدین نے آگے بڑھ کر
مجیم راج کا راستہ روکا۔ دونوں میں زبردست جنگ ہوئی۔

غزنی تادہلی

مجیم راج اس جنگ میں مارا گیا اور اجیر پر مسلمانوں کا براہ
استلزام ہو گیا۔

اس ہنگامے سے فرصت پانے کے بعد قطب الدین
سہرا والا پر حملہ کیا اور مجیم دیو دانی کجرات کو شکست دی۔

اس غنیمت کے بعد قطب الدین بہت سال غنیمت
لے کر غزنی گیا اور شاہی عنایتوں سے سرفراز ہو کر واپس
دہلی آیا۔

ٲٲٲٲ

راجپوت اپنی پوری طاقت اور قوت کے ساتھ
”جہنم“ شہر کے گرد و نواح میں جمع ہو رہے تھے۔ آج کل اس
مقام کو بیانہ کہا جاتا ہے۔

تجربوں نے اس کی اطلاع غزنی بھی پہنچا دی اور
قطب الدین ایک کو بھی۔ یہ خبر ملتے ہی شہاب الدین غزنی
سے نکل کھڑا ہوا۔ قطب الدین ایک بھی بیانہ کی طرف چلا۔
بیانہ سے کچھ دور سلطان کا لشکر قطب الدین سے آن ملا۔ یہ
اطلاع ملتے ہی راجپوت بھی بیانہ سے نکل آئے تھے۔ سلطان
نے بھی چڑاؤ کیا۔

یہ ایک اور چھوٹا اتحاد تھا جو ہندوؤں نے قائم کیا تھا۔
گوالیار، اجیر، کالنجر اور بدایوں کے ان گنت راجپوت اس
لشکر میں شامل تھے۔

اس کثرت نے راجپوتوں کو ایسے محمض میں مبتلا کر دیا
کہ فوراً مضیں درست کیں اور جنگ کی ابتدا کر دی۔ جوش
سے بھرے ہوئے راجپوت مسلمانوں سے انتقام لینے کے
لیے اس شدت سے ٹکرائے کہ زمین کا نینے لگی لیکن ان کی کوئی
تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ شہاب الدین کا لشکر بڑی تیزی سے
آگے بڑھ رہا تھا اور راجپوتوں کی تعداد کم کرتا جا رہا تھا۔ ایک
وقت وہ آیا کہ راجپوتوں کے قدم اکٹڑ گئے۔ راجپوتوں کو
بدترین شکست ہوئی۔ بچے کچے راجپوت گوالیار کی طرف
بھاگ کھڑے ہوئے۔

شہاب الدین ابھی بیانہ ہی میں تھا کہ غزنی سے خبر آئی
طوس اور سرخس کے شہروں میں بغاوت مچی ہے۔ اس کا جانا
ضروری تھا۔ وہ ابھی اس خبر سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ اس کے
بھائی غیاث الدین کی بیماری کی خبر مچی۔ اس نے نہایت جلدی
میں اپنے ایک سالار بہاء الدین طغرل کو قلعہ گوالیار سر کرنے
کے لیے روانہ کیا اور خود اپنے لشکر کا آدھا حصہ قطب الدین
ایک کے پاس چھوڑ کر غزنی روانہ ہو گیا۔

وہ ابھی طوس اور سرخس کے مسائل کو سلجھا رہا تھا کہ
اسے غیاث الدین کے انتقال کی خبر ملی۔ شہاب الدین

باغیس پہنچا اور اپنے بھائی کا پوری طرح سوگ منایا۔
جب وہ بھائی کے سوگ سے فارغ ہو چکا تو اس نے
اپنے عزیزوں کو نوازنے کے لیے خراسان کی حکومت اپنے
عزیزوں میں تقسیم کر دی۔ اس نے اپنے چچا زاد بھائی ملک
ضیا الدین کو فیروز کوہ اور غورستان کا حاکم بنایا۔ غیاث الدین
کے بیٹے سلطان محمود کے حوالے لیست، فرج اور اسفرائن کی
حکومت کی۔ اپنے بھانجے ناصر الدین کو ہرات اور اس کے
مضافات کا حاکم بنایا اور خود غزنی پہنچ کر شاہی تخت پر قدم رکھا۔
مرد کے حاکم محمد خیر بیگ کو خوارزم کے حکمران محمد
خوارزم شاہ نے قتل کر دیا تھا۔ محمد خیر بیگ شہاب الدین کا
حمایتی اور دوست تھا۔ جب غزنی پہنچ کر شہاب الدین کو اس
حادثے کی اطلاع ہوئی تو وہ حاکم مرو کا انتقام لینے کے لیے
خوارزم پر حملے کی غرض سے نکلا۔

خوارزم نہایت محفوظ شہر خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے
ارد گرد کوہستانی اور بڑے بڑے پتھروں سے بنی ہوئی
انتہائی مضبوط اور مستحکم فصیل تھی۔ دریاے جہوں سے ایک
نہر نکال کر خوارزم کے شرق سے گزاری گئی تھی چنانچہ اگر کسی

Monthly Digest
Suspense
سینر
ARGUZASHT
سرگزشت
PAKEEZA
پاکیزہ
JASOOSI
جاسوسی

مکتبہ املا و سہلا
Sole Distributor
ویلکم بک شاپ
WELCOME BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama, Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
E-mail: welbook@emirates.net.ae
JD Group of Publications

کو خوارزم پر حملہ آور ہونا ہوتا تو اسے یہ نہر بھی عبور کرنا ہوتی تھی۔ اگر کشتیوں کے ہل توڑ دیے جائیں تو حملہ آور کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

خوارزم شاہ کو شہاب الدین کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ اپنے لشکر کے ساتھ خوارزم سے نکلا۔ خوارزم کے مشرق میں جو نہر تھی اسے عبور کر کے وہ کھلے میدانوں میں خیمہ زن ہو گیا۔

دریائے جیہوں کے جنوب میں دونوں لشکروں کے درمیان ٹھکانہ کارن پڑا۔ خوارزم شاہ کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور وہ اپنے مرکزی شہر خوارزم میں محصور ہو گیا۔

سلطان شہاب الدین نہر عبور کرنے سے گریز کر رہا تھا کیونکہ فصیل سے چلائے جانے والے تیر نہر کے قریب تک پہنچ رہے تھے اور نہر عبور کیے بغیر خوارزم تک پہنچنا نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے سپاہی بار بار نہر عبور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

شہاب الدین ابھی نہر پار کر کے فصیل تک پہنچنے کی کوشش ہی کر رہا تھا اور اس کوشش میں وہ اپنے کئی دن ضائع کر چکا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ خوارزم شاہ نے سر قند کے حکمران سلطان عثمان خاں اور ملک خطا کے سپہ سالار قراہیگ خاں کو اپنی مدد کے لیے خط لکھ دیے ہیں۔

صورت حال دیکھتے ہی دیکھتے اس کے خلاف ہو گئی۔ تین بڑے دشمنوں کے مقابلے میں وہ اکیلا تھا۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ تین مختلف سمتوں سے اس پر حملے شروع ہو گئے۔

شہاب الدین نے نہایت بہادری سے ترکوں پر حملہ کیا اور انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

اس موقع پر حسین خرمیل شہاب الدین کے پاس آیا اور اسے تجویز پیش کی ”ہم تین دشمنوں کا ایک ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے، یہ موقع اچھا ملا ہے۔ آپ ترکوں کا تعاقب کرتے ہوئے آگے نکل جائیں اور غزنی پہنچ جائیں۔ اس جنگ سے ہاتھ اٹھالیں۔“

شہاب الدین نے اس کی تجویز کو رد کر دیا۔ حسین خرمیل ایسا ناراض ہوا کہ اپنے چھ ہزار ہمراہیوں کو لے کر میدان سے چلا گیا۔

ایسا قابل جرات چلا گیا۔ چھ ہزار ساتھی بھی کم ہو گئے لیکن شہاب الدین نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ دشمنوں سے لڑتا رہا لیکن جب اس نے مقابلے کی تاب نہ دیکھی تو ضرورت سے زیادہ سامان کو آگ لگا دی اور خراسان کی طرف بھاگ نکلا۔

خوارزم شاہ اس فرار کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے شہاب الدین کا پیچھا کیا اور اس بری طرح پیچھے پڑا کہ شہاب الدین کو مجبوراً پلٹ کر اس سے معرکہ آرائی کرنے پڑی۔ اس

معرکہ آرائی میں شہاب الدین کو شکست ہوئی۔ اب جائے مغر کوئی نہیں تھی۔ اس نے اپنے ہاتھی گھوڑے اور خزانہ وغیرہ چھوڑ کر جنگل کی طرف بھاگنے میں عافیت ڈھونڈی۔ بد قسمتی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ابھی وہ راستے میں تھا کہ اسے قراہیگ اور سلطان عثمان خاں نے گھیر لیا۔

اس مرد مجاہد نے جم کر مقابلہ کیا لیکن دونوں لشکروں سے یہ ایک وقت جنگ نے اسے مشکل میں ڈال دیا۔ اگرچہ اس کا لشکر تعداد میں کم تھا لیکن وہ برابر لڑتا رہا لیکن جب ایک وقت وہ آیا کہ اس کے ساتھ صرف 100 سپاہی رہ گئے تو وہ

پریشان ہو گیا۔ وہ خراسان کی سرحد کے قریب تھا کہ اسے اندھ خود قلعے کا خیال آیا جو خالی پڑا تھا اور خراسان میں شامل تھا۔ وہ اپنے سو سپاہیوں کے ساتھ بھاگ کر اس قلعے میں داخل ہو گیا اور دروازے بند کر لیے۔ اس کے سو سپاہی مختلف

برجوں میں بیٹھ گئے تاکہ اگر دشمن فصیلوں پر چڑھنے کی کوشش کرے تو وہ اسے مار پھاڑ سکیں۔

اب کیفیت یہ تھی کہ عثمان خاں، قراہیگ اور خوارزم شاہ کے لشکر قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ دو دن گزرنے کے بعد خوارزم شاہ قلعے پر حملہ کرنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اندر صرف سو سپاہی ہیں، وہ کتنی دیر

مقابلہ کریں گے۔ عثمان خاں اس مقابلے کے خلاف تھا، اس نے مخالفت کی۔

”جب شہاب الدین نے خود کو قلعہ بند کر لیا ہے تو ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ اس کے سو سپاہیوں پر حملہ کریں۔“

”ہم سو سپاہیوں پر حملہ نہیں کر رہے ہیں۔ شہاب الدین کو گرفتار کر رہے ہیں۔“ خوارزم شاہ نے کہا۔

”وہ گرفتار ہونے والا نہیں۔ لڑتے لڑتے جان دے دے گا اور اس کا نتیجہ تمہیں معلوم ہے؟ جب قطب الدین ایک جوہندوستان میں اس کا نائب ہے اور غزنی میں اس کے نائبوں کو خبر ہوگی تو غزنی، غور اور ہندوستان سے لشکر آئیں گے اور ہمیں تمہیں نہیں کر کے رکھ دیں گے۔“

”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں ہم واپس ہو جائیں۔“

”کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ اگر اس وقت ہم نے شہاب الدین کو چھوڑ دیا تو وہ ہم پر حملہ ضرور کرے گا۔“

”اس کے لیے میں حاضر ہوں۔ میں قلعے کے اندر جاتا ہوں اور شہاب الدین سے صلح کی بات چیت کرتا ہوں۔“

خوارزم شاہ انتقام کی بات سن کر گھبرا گیا۔ سوچنے لگا

غزنی تادہلی

اگر کسی وقت شہاب الدین نے یا اس کے نائبین نے اس کا علم کر دیا تو عثمان خاں کی مدد کو نہیں آئے گا اور وہ اکیلا ہالہ کرنے سے قاصر ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ اس وقت صلح کر کے معاملہ رفع دفع کر لیا جائے۔

عثمان خاں اپنے چند چاقوؤں کے ساتھ قلعے کے اندر گیا اور شہاب الدین سے غلطی کی معافی چاہی۔ شہاب الدین بھی اس وقت اتنا بے بس تھا کہ زیادہ بحث نہ کر سکا اور صلح پر تیار ہو گیا اور یوں یہ معاملہ منٹ گیا۔

سلطان نے چند دن اس قلعے میں قیام کیا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کے ساتھ کوئی چال نہیں چلی گئی ہے۔ لشکر واقعی محاصرہ اٹھا کر چلے گئے ہیں تو وہ قلعے سے نکلا اور غزنی چلا گیا۔

ابھی وہ غزنی سے کچھ فاصلے پر تھا کہ اسے یہ وحشت ناک خبر ملی کہ اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس کے ایک غلام ایلو گز نے غزنی پر قبضہ کر لیا ہے۔

شہاب الدین اپنے غلاموں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ ایک غلام کی یہ حرکت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے ہر چند چاہا کہ قلعے میں داخل ہو لیکن ایلو گز نے اجازت نہ دی اور اپنے آقا سے جنگ کرنے پر کمر باندھ لی۔ اس وقت شہاب الدین کے پاس مناسب لشکر نہیں تھا لہذا اس نے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور ملتان کی طرف چلا گیا۔ یہاں اس نے ایک زبردست فوج تیار کر کے غزنی کا رخ کیا۔

اس عرصے میں ایلو گز کو اپنی نمک حرامی کا احساس ہو گیا تھا یا پھر وہ شہاب الدین کے ساتھ لشکر کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ بات کچھ بھی ہو۔ اس مرتبہ وہ شہاب الدین کے خلاف صف آرا نہیں ہوا بلکہ غلاموں کی طرح نہایت عاجزی سے شہاب الدین کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی غلطی کی معافی چاہی۔ شہاب الدین کی اعلیٰ طرفی تھی کہ اس نے اسے معاف کر دیا۔

غزنی میں داخل ہوا اور سلطنت کے کاموں میں داخل ہو گیا۔

ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ قروم کی شکایتیں اس کے ارہار میں پہنچنے لگیں۔ اس لادین قروم نے مسلمانوں کا جینا ہر کر دیا تھا۔ لوٹ مار کا ایسا بازار گرم کیا تھا کہ کسی کی جان مال محفوظ نہیں تھی۔ وہ ان شکایتوں کو درگزر کرتا رہا لیکن اب شکایتوں کے اہار لگ گئے تو اس نے کمروں کو سبق

لے لے کر ارادہ کر لیا۔ ان شکایتوں میں وہ مظلوموں کی

آہوں اور سسکیوں کو سن سکتا تھا۔ اس نے لشکر تیار کیا اور غزنی سے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قطب الدین ایک کو بھی خط لکھ دیا کہ وہ بھی مغرب کی طرف سفر کرے۔ دونوں لشکر جب آپس میں مل جائیں گے تو اس سرکش قوم کی بیخ کنی کر دی جائے گی۔

دہلی سے قطب الدین بھی آ گیا۔ شہاب الدین کھردوں پر حملہ آور ہوا اور قتل و غارت گری کا وہ بازار گرم کیا کہ اس قوم کو اس کے کیے کی خوب سزا مل گئی لیکن ظاہر ہے پوری قوم کا صفایا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کھر جو در دراز کے علاقوں میں آباد تھے محفوظ رہ گئے۔

کمروں کے ایک قبیلے کے امیر نے ایک متقی پرہیز گار مسلمان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائے تو شہاب الدین اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اس مسلمان نے جواب دیا۔ ”میں اس امر کا یقین دلاتا ہوں کہ بادشاہ تجھے اس عالم میں دیکھ کر بہت خوش ہوگا اور اس کو ہستان کی حکومت تیرے ہی سپرد کر دے گا اور تجھے یہاں کا خود مختار حاکم مان لے گا۔“

”تو پھر میں مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔“

اس مسلمان بزرگ نے اس امیر کی خواہشات ایک خط میں تحریر کر کے یہ خط سلطان کے پاس پہنچ دیا۔ سلطان اس وقت لاہور میں تھا۔

سلطان شہاب الدین نے ایک مرصع کمر بند اور گراں بہا خلعت امیر کے لیے بھجوائی اور اسے اپنے دربار میں طلب کیا۔ کمروں کا یہ امیر شہاب الدین کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ شہاب الدین نے بزرگ مسلمان کی سفارش پر اس کے نام کو ہستانی علاقوں کی فرماں روائی کا فرمان جاری کر دیا۔ اس امیر نے وطن واپس آ کر اپنی قوم کے بڑے حصے کو مسلمان کر لیا لیکن بعض وہ بھی تھے جو اس لعنت سے دور رہے۔

ایک علاقہ ترابہ تھا جو غزنی اور پنجاب کے درمیان کوہستانی علاقے میں واقع تھا۔ اس نے اس علاقے پر حملہ کیا۔ یہاں تقریباً چار لاکھ غیر مسلموں نے مذہب اسلام قبول کیا۔ شہاب الدین نے چند روز لاہور میں قیام کرنے کے بعد غزنی کا رخ کیا۔ وہ اس وقت بہت مطمئن اور شاداں نظر آ رہا تھا۔ اس نے تمام ضروری کام نمٹا لیے تھے۔ غزنی سے لے کر دہلی تک اس کی حکومت تھی۔ اس کا نائب قطب الدین ایک نہایت وقاداری اور خوش اسلوبی سے تمام کام سرانجام دے رہا تھا۔ ہر طرف امن تھا۔ اس نے تمام دشمنوں کی

قلم

ایم اے راحت

وہ جو خوابوں اور خواہشوں کو زنجیر کرنا چاہتی تھی ایک ایسے سفر پر چل نکلی جس میں پڑاؤ تو بے شمار تھے مگر منزل کوئی نہ تھی اس کا حسن بھی ایسا ہی کرشمہ ساز تھا کہ ہر اک موڑ پر اس کی پُرفریب معصومیت ایک ماتم بپا کردیتی مگر دھیرے دھیرے بھنور کو جیسے قرار سا آجاتا... پھر اگلے موڑ پر ایک اور آندھی... ایک اور گردباد اور پھر اس کے حسن کی وہی کرشمہ سازیاں... وہی ایک لمبی مسافت۔

سائے کے نقاب میں تنہا پالنے والی

ایک حیرت کی ہوشیاریاں



زہریلا سمجھا جاتا ہے، حماقت ہے۔ سانپ کاٹ لیتا ہے، انسان تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے لیکن عورت کاٹتی ہے..... الامان، الحفیظ! انسان ہنستا رہتا ہے، خواب دیکھتا ہے، خود کو سنوارتا ہے۔ اپنی حیثیت سے آگے بڑھ جاتا ہے اپنی شخصیت سے بھلک جاتا ہے۔ بھیک مانگتا ہے، چوری کرتا ہے

آپ جانتے ہیں، روئے زمین پر سب سے خوفناک جاندار کون ہے؟
لاکڑیاں..... نرم و نازک، بے ضرر، محبوب، محبوب سی نظر آتی ہیں، دل موہ لینے والی مخلوق، جانداروں میں سب سے خوفناک شے ہے۔ حشرات الارض میں سانپ کو سب سے

حیرت ختم ہوتی اور وہ حرکت میں آتے یہ کھرترک غلاموں اور بادشاہ پر ٹوٹ پڑے۔ سلطان کو یہ موقع ہی نہ مل سکا کہ قریب رہی کھوار اٹھاتا۔ ان کھروں نے ترک غلاموں کے علاوہ سلطان شہاب الدین کا بھی خاتمہ کر دیا۔ کہتے ہیں سلطان کے جسم پر چھروں کے بائیس گہرے زخم آئے تھے۔

یہ سانحہ ایسا تھا کہ لشکر کی عجیب حالت تھی۔ ان کے سامنے ان کا بادشاہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور وہ کچھ نہ کر سکے۔

اس وقت سلطان کا ایک وزیر معبد الملک جوتانی لشکر میں موجود تھا۔ اس نے لشکر کو سنبھالا اور سلطان کی لاش لے کر غزنی کی طرف روانہ ہوا۔

سلطان کی لاش غزنی پہنچی تو غزنی اور غورستان سوگ میں ڈوب گیا۔ سلطان کے کوئی اولاد نہ رہے تھی۔ اس کی یادگار میں صرف ایک بیٹی تھی۔ اس بیٹی کو دفن کرنے کے لیے اس کی زندگی ہی میں سلطان نے ایک مقبرہ بنوا دیا تھا۔ سلطان کو اسی مقبرے میں دفن کر دیا گیا۔

مورخین کا بیان ہے کہ غزنی کا خزانہ بے شمار اشیائوں سے معمور تھا۔ بہت سے دوسرے جواہرات کے علاوہ خزانے میں پانچ سو من الماس بھی تھے۔

وہ جب تک رہا شریعت کا پابند رہا۔ وہ اگرچہ خود مختار حکمران تھا لیکن عالموں اور اولیاء کی محبت میں بیٹھنے کو وہ اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا۔

اس نے غزنی کی حکومت کی ابتدا سے لے کر شہادت تک 35 سال سے کچھ زیادہ کے عرصے تک فرماں روائی کی۔ اس کو خدا نے اولاد نہ دی تھی۔ وہ اپنے غلاموں کو اپنے بیٹے کہتا تھا۔ ان بیٹوں نے اس کی لاج رکھ لی۔ بادشاہوں کے بیٹے ہوتے ہیں جو اس کی فتوحات کو قائم رکھتے ہیں، اس کے غلاموں نے بادشاہی کی اور اس کی محبت کو رانگاں نہیں جانے دیا۔ ان میں سے ایک قطب الدین ایک بھی تھا۔ اس کی کرم گستری اور سخاوت کی ایسی شہرت تھی کہ اسے لکھ بخش کہا جانے لگا تھا۔

سلطان کے غلاموں میں سے قطب الدین کے علاوہ چار دیگر غلاموں نے بھی ہندوستان پر حکومت کی اور سلطان شہاب الدین کے نام کو زندہ رکھا۔ سلطان شہاب الدین 602ھ میں شہید ہوا۔

سرکوبی کر دی تھی۔ جو چھوٹے چھوٹے واقعات ہوتے رہتے تھے انہیں سنبھالنے کے لیے اس کے امیر بہت تھے جنہیں وہ چھوڑے جا رہا تھا۔

اس نے لاہور سے نکل کر دریائے سندھ کے کنارے پر پڑاؤ کیا۔ اس مقام کو برہمیک کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ہر طرف خیمے سج گئے۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔

کھروں کی قوم میں سے چند افراد اس وقت شہاب الدین کے لشکر کے ساتھ چل رہے تھے۔ یہ وہ تھے جن کے عزیزوں کو سلطان نے قتل کیا تھا اور وہ خود گھر سے بے گھر ہو گئے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ سلطان کے لشکر نے دریائے سندھ کے کنارے پڑاؤ کیا ہے تو وہ بھی رک گئے اور قریب کے جنگل میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ ان کا منصوبہ پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ بس ضروری تفصیلات طے کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کر لیا۔ کام از حد خطرناک تھا لیکن وہ جان پر کھیلنے کا عزم کر چکے تھے۔

”اگر ہم مارے بھی گئے تو اب کون سے زندہ ہیں۔ اس بد بخت بادشاہ نے ہمارے عزیزوں کو تہ تیغ کیا ہے! ہم گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔“ یہ لوگ منصوبے کے مطابق اگلے دو دنوں تک جنگل میں چھپے رہے۔ تیسرے دن انہوں نے جب دیکھا کہ لشکر کوچ کی تیاری کر رہا ہے۔ خیمے اکھاڑے جا رہے ہیں۔ سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ غزنی پہنچنے کی خوشی میں کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہے تو وہ جنگل سے باہر نکلے۔ فراش سراپردہ اتار رہے تھے کہ ایک کھر آگے بڑھا اور خنجر مار کر دربان کو زخمی کر دیا۔ اس کے زخمی ہوتے ہی ایک شور مچ گیا۔ کھروہاں سے ہٹ گیا۔ سلطان شہاب الدین کے جس قدر محافظ تھے وہ دوڑتے ہوئے آئے اور زخمی دربان کو سنبھالنے میں لگ گئے۔ سب ادھر مشغول ہوئے تو ان کھروں کو موقع مل گیا۔ وہ آزادانہ شاہی خیمے میں گھستے چلے گئے۔

سلطان کے تمام محافظ زخمی دربان کی چیخیں سن کر باہر کی جانب دوڑ پڑے تھے۔ سلطان کے پاس اس وقت صرف دو ترک غلام تھے جو سلطان کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کھروں کی تعداد بیس تھی۔ ان سب کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ ترک غلاموں اور شاہی خود بادشاہ کی سمجھ میں بھی نہ آ سکا کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیوں آئے ہیں۔ جتنی دیر میں ان کی

تاریخ فرشتہ۔ تاریخ طبری۔ تاریخ فیروزی شاہی

اور اسے خوش رکھتا ہے۔ سانپ کے منہ میں دوڑے ہوئے دانت ہوتے ہیں، جن کا تعلق ان کے حلق میں موجود ہرکی تھیلی سے ہوتا ہے۔

ان دانتوں کے درمیان میں باریک سوراخ ہوتے ہیں۔ جس وقت سانپ کاٹتا ہے تو آہستہ سے ٹھوم جاتا ہے۔ زہر کی تھیلی دیتی ہے اور اس سے زہر کے چند قطرے دانتوں کے خول سے گزر کر انسان کے زخم میں اتر جاتے ہیں۔

نتیجہ یہ کہ جسم میں زہر پھیل جاتا ہے۔ کچھ کا ڈنک ہوتا ہے۔ جس سے وہ جسم کے کسی حصے میں سوراخ کر کے حسب توقیف زہر بخش دیتا ہے۔ لیکن عورت، سر کے بالوں سے لے کر پیروں کے ناخنوں تک مختلف ہتھیاروں سے آراستہ ہوتی ہے۔ شاعروں نے عورت کے بالوں کو گھٹاؤں، ہادلوں سے تشبیہ دی ہے۔ کچھ نے انہیں زنجیر و سلاسل کہا ہے۔ بے شمار ان بالوں کے بیچ زخم میں پھنس کر آج تک آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ درحقیقت یہ عورت کا ابتدائی ہتھیار ہے۔ بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ اس خوفناک جاندار نے ہتھیاروں کا استعمال بھی بدل لیا ہے۔

اس کے بعد پیشانی کو شاعر حضرات نے جاند سے تشبیہ دی۔ پھر ابرو پر بات آئی اور انہیں بلا تردید خنجر تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے بعد سب سے خوفناک ہتھیار آتا ہے آنکھیں، تیز، کٹار، خنجر جیسے ہتھیار پرانے ہیں۔ اب تو انہیں راکٹ، میزائل بلکہ سام میزائل سے تشبیہ دینی چاہیے۔ اس ہتھیار کا توڑ آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔ پھر ناک، ہونٹ، ٹھوڑی، گردن، ہر ہتھیار اپنی جگہ مکمل ہے، کس کس سے بچیں گے۔

سائنس دانوں نے آسمان کی وسعتیں ناپی ہیں۔ زمین کی گہرائیاں تلاش کی ہیں لیکن اس بھی سی مخلوق کے سینے میں دھڑکتے ہوئے گوشت کے لوتھڑے کی تفصیل آج تک کوئی نہ بتا سکا۔ عورت کے دل کی گہرائی ناپنے والے آلات آج تک تیار نہ ہو سکے۔ میری اطلاع میں عورت کے سر کے بال حساس راڈار ہوتے ہیں۔ وہ شکار کی آمد کی اطلاع دیتے ہیں۔ ابرو، شکار پر ہلکی شیلنگ کرتے ہیں، آنکھیں اس کی ساخت کا جائزہ لے کر اس پر ناکارہ کرنے والے میزائل بھیجتی ہیں۔ ہونٹ اسے مسکراہٹ کی نظر نہ آنے والی شعاعوں میں جکڑتے ہیں اور شکار بہ آسانی اس کے دل کی گہرائیوں میں گر کر تباہ ہو جاتا ہے۔

آپ شاید میری بات کو تسلیم نہ کریں لیکن میرا تجربہ یہی ہے۔ عورت مٹی کی ہانڈی میں لکڑی کی ڈوٹی سے دال چلا رہی ہو یا آسمان کی وسعتوں میں ہوائی جہاز، ہر جگہ یکساں

ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں شانہ خان کی مثال دوں گا۔

جی ہاں..... میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میرے تجربات وسیع ہیں، میں نے ایک ایسا پیشہ اپنا رکھا ہے جس میں بھانت بھانت کے خطرناک لوگوں سے واسطہ پڑنا رہتا ہے۔ ہاں تو میرا تجربہ یہ ہے کہ عورت جرائم پیشہ بھی ہو تو سہ آہستہ بلکہ چار آہستہ ہوتی ہے جس کا ثبوت شانہ خان موجود ہے اور ہم سب کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ..... سینٹرل انٹیلی جنس بورڈ کے انسپکٹر زوار پاشا سے بھی میری شناسائی ایسی ہی تھی جیسے دوسرے پولیس افسروں سے۔ وہ بھی مجھے پسند نہیں کرتا تھا لیکن میرا دوست بھی تھا۔ اکثر اس نے مجھے بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھلایا ہے۔ اپنی کار میں لیے لیے گھوما ہے۔ اپنے ہاں کی تقاریب میں بھی بلاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میری ناک میں بھی رہتا ہے۔ میں اس کے خلوص پر اعتماد کرتا ہوں، اس کی محبت کا قائل ہوں۔ اس کے اخلاق کی تعریف و توصیف بھی کرتا ہوں لیکن اس سے چوکتا بھی رہتا ہوں اور اپنا کوئی کمزور پہلو اس کے سامنے نہیں آنے دیتا۔ چنانچہ اس روز صبح دس بجے کے قریب اس کی خوبصورت کار اس بلڈنگ کے سامنے رکتی دیکھ کر میں چونکا جس میں میرا خوبصورت دفتر ہے۔ زوار پاشا سرکاری ملازم ہے۔ معروف آدمی ہے اور اپنا وقت بلاوجہ ضائع نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کی آمد بے مقصد نہیں ہو سکتی۔

میں سنبھل گیا۔ اس کے راستہ طے کرنے سے قبل میں نے پچھلے چند روز کا بھرپور جائزہ لیا۔ میں ایسی کوئی حمانت تو نہیں کر بیٹھا جو قابل گرفت ہو، کسی معاملے میں اسے میرے بارے میں کوئی کلیوٹو نہیں مل گیا لیکن تقریباً پچھلے ایک ماہ کے دوران تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جو قابل گرفت ہو۔ میں بے مقصد و وسوسوں کا قائل نہیں ہوں چنانچہ ماضی کا جائزہ لے کر میں مطمئن ہو گیا۔ ”آجاء..... زوار! کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

اور اسی وقت میری میز پر رکھے ہوئے انٹرکام پر اشارہ موصول ہوا۔ ”بیج دو۔“ میں نے کی آن کر کے کہا اور اسے آف کر دیا۔

یقیناً میری سیکرٹری میرے اس اعتماد پر حیران رہ گئی ہوگی۔ بہر حال زوار پاشا اندر آ گیا۔ حسب معمول ایک زوردار سلام مارا۔ اپنے چوڑے سخت ہاتھ میں میرے ملائم ہاتھ کو مسلا اور بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ پولیس کیپ

۱۱ / اپریل / ۲۰۱۲ء کوئی اور مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”کالی“

”کالی“ میں نے انٹرکام کی آن کر کے کہا اور پھر اسے آف کر دیا۔

”کیسی چل رہی ہے؟“ اس نے بھاری آواز میں پوچھا۔

”بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہے۔ چار جنک کے لیے بھیجی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں گاڑی کی نہیں زندگی کی بات کر رہا ہوں۔“ زوار پاشا نے کہا۔

”اوہ..... زندگی بغیر پیہوں کے چلتی ہے۔ جیسی بھی چلے غنیمت ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”میرے سامنے فلسفی مت بنا کرو، سمجھے۔“ زوار پاشا نے میز پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔

”بہتر ہے۔“ میں نے سہم کر کہا اور میز پر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ آنکھوں شیشہ کافی مضبوط تھا۔ ورنہ اس سے قبل زوار سات عدد شیشے توڑ چکا تھا۔ شیشہ بچ جانے پر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ میرے دفتر میں پولیس والوں کی ہر جارحیت جائز تھی جسے میں بخوبی سمجھتا تھا۔

زوار پاشا اپنی مردانگی پر مسکرانے لگا اور پھر میرے زنا نے پن پر ہی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے بڑے احترام سے تصویر اٹھائی اور اپنے سامنے رکھ کر اسے دیکھنے لگا۔ ایک ”سلیک“ لڑکی تھی۔ قدرت نے اسے تمام ہتھیار فیزیکی سے بخشے تھے۔

”مبارک ہو زوار پاشا! تمہارا انتخاب لا جواب ہے، خدا آپ کی جوڑی سلامت رکھے۔“ میں نے غلوص دل سے کہا۔

”بد دعا مت دے یار، اس سے شادی کر کے موت کے منہ میں جانا ہے کیا۔“ زوار پاشا نے اداسی سے کہا۔

اور میں زور زور سے کھانسنے لگا۔ غلطی ہو گئی تھی لیکن خطا میری نہیں تھی۔ زوار پاشا اس سے قبل بھی تین چار لڑکیوں کی تصویر دکھا کر مجھ سے رائے لے چکا تھا۔ ہر لڑکی کے بارے میں وہ یہی کہتا تھا کہ بس وہ اس سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہے۔ وہ بھی اس پر مر مٹی ہے اور یہ بھی ہلاک ہو گئے ہیں۔ پھر جب وہ دوسری تصویر لے کر آتا۔

پہلی لڑکی کے بارے میں بتاتا کہ وہ تو جنگلی تھی، وہ میرے معیار کی نہ تھی۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں پولیس افسر ہوں تو اس نے ایک مل فیجر سے شادی کر لی، وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ میں اس نئی تصویر کے بارے میں بھی یہی سمجھا تھا اور ڈر رہا تھا کہ آج بھی زوار پاشا میز پر دوسرا گھونسا رسید نہ کر دے، شیشہ موتا ضرور تھا لیکن تین گھونٹوں سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

پھر جب میں نے زوار پاشا کو اداس دیکھا تو دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور بولا۔ ”بد دعا کیوں، زوار پاشا؟“ ”اگر میں نے اس سے شادی کر لی تو آنکھوں میں خود کشی مجھے کرنا پڑے گی۔“

”اوہ.....“ میں نے بہ ظاہر حیرت سے کہا لیکن میرا دل، گڑگڑا کر خدا سے دعا کر رہا تھا کہ زوار پاشا اس سے شادی ضرور کر لے تاکہ یہ شیشہ تو سلامت رہ جائے۔

”کیا سمجھے؟“ زوار پاشا نے مجھے گھورا۔

”نہیں سمجھ سکا زوار پاشا۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”اس کے سات شوہر خود کشی کر چکے ہیں؟“ ”اوہ۔“ میں سنبھل گیا۔ میں نے فور سے تصویر دیکھی، حسین خدو خال، زیادہ عمر بھی نہ تھی۔ سیاہ بکھرے بکھرے بال، موٹی آنکھیں، ماڈرن، ایک گارڈن چیئر پر بیٹھی کسی سے مو بائل فون پر بات کر رہی تھی۔ شاید زوار پاشا مبالغے سے کام لے رہا تھا، اس کے چہرے سے تو سات شوہروں کا تجربہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

”کیا تم درست کہہ رہے ہو زوار.....؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”سو فیصدی درست۔“ زوار پاشا فرمائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اس کے سات شوہر مر چکے ہیں اور اب اس نے آنکھوں شادی کی ہے۔“

”ساتوں شوہروں نے خود کشی کی ہے؟“ ”اس سے شادی خود کشی کے مترادف ہے۔“

”کیوں؟“ ”اس لیے کہ اس کے بعد مرنا لازمی ہے۔“

”ہوں.....“ میں نے گہری سانس لی۔ زوار پاشا میرے لیے کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو لیکن اس کی کہانی دلچسپ ہے۔

”اس وقت میں تمہارے پاس اسی سلسلے میں آیا ہوں۔“ زوار پاشا نے کہا۔

”بہر و چشم، حکم دیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس کا نام شانہ خان ہے۔“ ”خان اس کے آخری شوہر کا نام ہے..... میرا مطلب ہے کوئی خانی۔“ میں نے درمیان میں دخل دیا۔

”شاید باپ کا نام ہو یا شاید پہلے شوہر کا ہو یا پھر اس کا پورا نام بھی ہو۔ اس بارے میں، میں کچھ معلوم نہیں کر سکا۔“

”ٹھیک ہے، آگے.....“

”ہوں..... اچھا یہ بتاؤ۔ تم نے گولڈسٹی کا نام سنا ہے؟“

”شاید.....“ میں نے کہا۔

”وہ بلا شرکت غیرے مالک ہے اس کی۔ اس لحاظ سے تم اسے ارب پتی کہہ سکتے ہو۔“

”یقیناً۔“ میں نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔ ”غالباً یہ دولت اس کے شوہر چھوڑ کر مرے ہوں گے۔“

”ہرگز نہیں۔“ زوار پاشا پھر غرایا۔ ”اس نے آج تک کسی مالدار آدمی سے شادی نہیں کی۔ معمولی قسم کے لوگوں سے شادی کر کے انہیں امیر ترین شخص بنادیتی ہے۔ سب کچھ ان کے سپرد کر دیتی ہے اور پھر وہ اسے منافع دے کر مر جاتے ہیں۔“

”منافع دے کر.....؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں منافع دے کر..... اور پولیس آج تک اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ اس کے کئی شوہروں کی موت کے الزام میں دوسرے کئی لوگوں کو سزا دی ہو چکی ہیں، ایک بھی شوہر قدرتی موت نہیں مرا۔ لیکن وہ بے قصور ثابت ہوتی ہے اور اس کے شوہر کے بیسے کی رقم اسے مل جاتی ہے، کئی بیسے کپنیاں پولیس سے مل کر اور اپنے ذرائع سے اس کے خلاف تحقیقات گرا چکی ہیں لیکن ناکام رہی ہیں اور اس کی دولت میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ تیس ماہ قبل اس نے کرکٹ کے ایک کھلاڑی سے شادی کی ہے۔ آج کل وہ اس کے ساتھ عیش کر رہا ہے، موت سے بے خبر ہو کر اور اس کی زندگی کا بیسہ پانچ کروڑ روپے کا ہے۔ یہ بیسہ شادی سے چار ماہ قبل کرایا گیا تھا اور اس کا بھاری پریمیم باقاعدگی سے ادا ہو رہا ہے جبکہ اس کرکٹ کی سالانہ آمدنی بھی اتنی نہیں ہے کہ وہ ایک ماہ کا پریمیم بھی ادا کر سکے۔“

”خوب..... ظاہر ہے کہ ادائیگی شانہ خان ہی کر رہی ہوگی۔“

”یقیناً وہ رقم لگا رہی ہے، رقم کمانے کے لیے۔ کسی کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

”وہ کاٹھ کا لٹوا اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچ رہا۔“

”اس کے شوہر کی بات کر رہے ہو؟“

”ہاں.....“

”بے وقوفی کی بات ہے۔ تصویر کو غور سے دیکھو! کافی خوب صورت ہے۔“ تصویر سے زیادہ حسین۔ حسین بیوی

بے پناہ دولت جسے مل رہی ہو وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ کرکٹ اس پر جان دیتا ہے۔ ایک شخص نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ہاتھ پائی پر آمادہ ہو گیا اور پھر جب پولیس بھی اس عورت کو بے گناہ قرار دیتی ہے تو پھر کوئی دوسرا اس پر شک کر کے اپنی مصیبت کو دعوت کیوں دے گا۔ وہ اس الزام میں دو گروہوں پر مقدمے کر چکی ہے۔“

”خدا کی پناہ۔“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔ چند سیکنڈ اس عجیب و غریب کہانی پر غور کرتا رہا، پھر میں نے چونک کر زوار پاشا کو دیکھا۔ ”لیکن آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں، زوار پاشا؟“

”ہاں..... اب مطلب کی بات پر آ جاؤ۔ وہ دولت مند ہے، اس کے تعلقات وسیع ہیں۔ بغیر کسی ثبوت کے اس کے خلاف سرکاری طور پر تحقیقات بھی نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات سب جانتے ہیں لیکن جب سے اس کرکٹ نے شانہ خان سے شادی کی ہے، بیسہ کپنی کو تشویش لاحق ہو گئی ہے۔ بیسہ کپنی کے ارکان نے براہ راست پولیس سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ ظاہر ہے، وہ کیا رپورٹ کر سکتے ہیں اور رپورٹ کر کے بھی بے وقوف گردانے جاتے۔ چنانچہ کپنی کے ایک نمائندے نے ذاتی طور پر مجھ سے ملاقات کر کے اس سلسلے میں کام کرنے کی پیشکش کی۔“

انہوں نے مجھے 10 لاکھ روپے کی آفر کی ہے، جو بری نہیں ہے۔ ایک لاکھ روپے ایڈوائس دیے گئے اور میں اس ایک لاکھ میں سے پچاس ہزار اور پوری رقم میں سے پانچ لاکھ تمہارے حوالے کرنے آیا ہوں۔“

”اوہ.....“ میں نے گہری سانس لی اور گردن جھکا کر زوار پاشا کے خلوص پر غور کرنے لگا۔ یہ ظاہر اس پیشکش میں کوئی فریب نہیں تھا۔ یوں بھی آج مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔ پانچ لاکھ روپے کم نہیں ہوتے اور پھر پچاس ہزار ایڈوائس لیکن معاملہ بھی اتنا ہی میز حاتھا، وہ عورت جو آسانی سے سات شوہروں کو ہضم کر چکی ہے معمولی عورت نہ ہوگی اور پھر اس انداز میں کہ اس کے بارے میں ذرا بھی شک نہ کیا جاسکا ہو۔

”آپ نے اس سلسلے میں کیا سوچا ہے؟ شانہ خان.....“

”دراصل یہ ذاتی معاملہ ہے، سرکاری طور پر میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یوں بھی میں صرف ایک آدمی ہوں لیکن اس کے باوجود میں نے ابتدائی کام مکمل کر لیا ہے، جسے میں اس وقت تمہارے سامنے پیش کروں گا جب تم اس

نام پر آمادگی کا اظہار کرو گے۔“ زوار پاشا کافی پینے لگا اور ہم اس معاملے پر غور کرتے رہے۔

پھر میں نے گردن اٹھا کر کہا۔ ”زوار پاشا..... کیا آپ مجھے انسان سمجھتے ہیں؟“

”کیوں؟“ زوار پاشا چونک کر بولا۔

”میری بات کا جواب دیں۔“

”صورت سے تو آدمی ہی لگتے ہو۔“ زوار پاشا نے مذاق کر کے خود ہی قہقہہ لگایا۔

”درست ہے، چنانچہ سات شوہروں کو بلا ڈکار ہضم کر جانے والی کے خلاف ثبوت حاصل کرنے میں اگر میں بھی ناکام رہوں، تو تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں کامیاب ہونے کی پوری کوشش کرنے کے بعد بھی ناکام رہوں تو میری کیا سزا ہوگی؟“

”کچھ نہیں۔“ زوار پاشا سنجیدگی سے بولا۔ ”اس کے باوجود پانچ لاکھ تمہارے ہوں گے۔ کیونکہ بیسہ کپنی کے نمائندے سے بھی میری یہی بات ہوئی ہے۔ ہاں ہم کوشش پوری پوری کریں گے اور کامیابی کے بعد ہمیں مزید ایک لاکھ انعام ملے گا جس میں سے آدھے حسب معاہدہ تمہارے ہوں گے۔ چنانچہ دونوں صورتوں میں فائدہ ہے۔ سودا برا نہیں ہے لیکن کام ایمانداری سے کرنا ہوگا۔“

”تو آپ کے خیال میں اس پیشکش کو قبول کرنے میں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”کوئی نہیں ہونا چاہیے۔“

”چنانچہ منظور۔“ میں نے کہا اور زوار نے ایک ایماندار تاجر کی طرح سے پچاس ہزار کے نوٹوں کی گڈی میرے سامنے ڈال دی۔ میں نے شکریے کے ساتھ گڈی اٹھا کر جیب میں ٹھونس لی۔

”میرے ساتھ چلو۔ اب تک میں نے جو تحقیقات کی ہے، وہ تمہارے حوالے کر دوں۔ آج سے یہ کیس تم ڈیل کرو گے اور میں تمہاری ہر قسم کی مدد کروں گا۔“

میں نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد میں زوار پاشا کے ساتھ گاڑی میں اس کے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں، میں نے کہا۔

”اگر ہم اس کے بارے میں کوئی ثبوت مہیا نہ کر سکے زوار پاشا تب بھی اتنا تو کر سکتے ہیں کہ پانچ کروڑ کے اس چیک کو گمشدہ نہ ہونے دیں۔“

”کیا مطلب؟“ زوار پاشا کچھ نہ سمجھ کر بولا۔

”مطلب یہ کہ اس کرکٹ کو اس وقت تک کسی حادثے

سے بچائیں، جب تک وہ شانہ خان کی شوہریت میں ہے۔“

”ہاں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن اس طرح تو ہمیں پوری زندگی ہی مصروف رہنا پڑے گا۔ ظاہر ہے وہ اس وقت تک کیوں چھوڑے گی جب تک اس کا چیک کیش نہ ہو جائے۔“

”ممکن ہے، اس دوران کسی طرح اس کھلاڑی کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی زندگی کو خطرہ ہے اور پھر یہ بھی نہ سہی، کم از کم اس کے ساتھ پیش آنے والے کسی حادثے کا صحیح تجزیہ تو کیا جاسکتا ہے۔ اس حادثے کی بنیاد میں ممکن ہے شانہ خان کے سامنے نظر آجائیں۔“

”بالکل درست۔“ زوار پاشا اچھل پڑا اور کار سڑک پر لہرانے لگی۔ ”یقیناً۔“ اس نے کار کے اسٹیرنگ کو کسی مجرم کی گردن کی طرح مروڑتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم اس کے خلاف کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور حاصل کر لو گے۔ تم سامنے کی طرح ان دونوں کے پیچھے رہو۔“

میں گردن ہلانے لگا، پھر تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔

”مجھے اس کے ساتوں شوہروں کی موت کی تفصیل درکار ہے۔“

”گڈ..... دیری گڈ..... بالکل میرے انداز میں سوچ رہے ہو، میں نے بھی انہی لائنوں پر کام کیا ہے۔ میں نے یہ تفصیل حاصل بھی کر لی ہے۔“ اور میں نے دل ہی دل میں زوار پاشا کی ذہانت کو پر زور الفاظ میں داد دی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم زوار پاشا کے خوبصورت آفس میں پہنچ گئے تھے جہاں اس نے مجھے جوابی کافی پلائی اور پھر ایک لمبی چوڑی فائل نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ اس فائل میں شانہ خان کے شوہروں کی تصویریں، ان کا شجرہ نسب ان کی درونک موت کا حال تفصیل سے موجود تھا۔

میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اس میں سے ایک سگریٹ سلگا لیا اور پھر تفصیل سے فائل پڑھنے لگا۔ زوار پاشا کا کہنا بالکل درست تھا۔ ان شوہروں کی تفصیل پولیس رپورٹ کے ساتھ موجود تھی۔

شانہ خان کا پہلا شوہر اب سے پانچ سال قبل چند مجرموں کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا تھا۔ وہ ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ ایک دوپہر بینک سے ملازموں کی تنخواہوں کا کیش لے کر آ رہا تھا کہ لٹیروں کے ایک ٹولے نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس سے کیش چھین لیا گیا اور اسے کوئی مار دی گئی۔ اس وقت شانہ کی شادی کو صرف چار ماہ ہوئے تھے اور اکاؤنٹنٹ نے صرف دو ماہ قبل زندگی کا بیسہ کرایا تھا۔ مگر اس

بیسے کی رقم پچاس لاکھ روپے تھی۔

ایک اکاؤنٹ کو پچاس لاکھ کا بیمہ کرانے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ اس کی پوری تنخواہ سے بھی پریمیم کی رقم پوری نہ ہوتی تھی۔ یہ سوال اس کی کروڑ پتی بیوی سے کیا گیا تو اس نے جواب دیا۔

بیمہ اس کے شوہر کا تھا اور خود اس کی حیثیت معمولی نہیں ہے۔ اس کا شوہر باغیچہ تھا اور اسے اپنی کمائی کھانا چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنی ملازمت جاری رکھی ورنہ اسے اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

بات سچ نکلی۔ شانہ خان پر شبہ نہ کیا جاسکا اور پھر وہ مجرم بھی پکڑے گئے جنہوں نے واردات کی تھی۔ شانہ سے ان کا کوئی تعلق نہ نکلا۔ انہیں سخت سزائیں ملیں اور شانہ کو پچاس لاکھ روپے نقد..... شوہر کی موت کے بعد شانہ نے اپنے چھوٹے سے ہوٹل کو از سر نو تعمیر کرایا اور..... گولڈسٹی۔ وجود میں آگیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کنسٹرکشن کمپنی کے منیجر سے شانہ کا معاشرتی بھی چل نکلا جو گولڈسٹی بنواری تھی اور اس نے گولڈسٹی کا افتتاح شانہ نے اپنے شوہر کے ہاتھوں کرایا جو کنسٹرکشن کمپنی کا منیجر ہی تھا اور جس کا بیمہ ایک کروڑ کا تھا۔

ابھی شانہ کے ہاتھ دوبارہ پیلے ہوئے صرف چھ ماہ گزرے تھے کہ انجینئرنگ کمپنی کے منیجر صاحب کار کے حادثے کا شکار ہو گئے۔ ان کا ڈرائیور اور وہ دونوں اس ٹرک کے نیچے دب گئے تھے جس سے کار کا حادثہ ہوا تھا۔ ٹرک ڈرائیور نشے میں تھا۔ پولیس نے بیمہ کمپنی کے ایما پر لاکھ سرمار لیکن ڈرائیور شانہ کو پہچانتا بھی نہ تھا۔ ماہرین نے کار چیک کی جو بالکل صحیح حالت میں تھی۔

چنانچہ شانہ کو ایک کروڑ مل گئے اور صرف ایک سال بعد اس نے تیسری شادی رچالی۔ میں نے پوری فائل پڑھ لی۔ ساتوں شوہروں کی موت سے شانہ کو تقریباً 10 کروڑ مل چکے تھے اور اگر اسے بیسے کی رقم نہ ملی ہوتی تو کسی طور اس پر شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا بلکہ ایک طرح سے وہ ہمدردی کی سسٹن تھی۔ اس کے شوہروں کے دوستوں کے بیانات موجود تھے۔ جن میں اس کے شوہروں نے دوستوں سے اپنی وفا پرست بیوی کی شان میں زمین آسمان کی قلابے ملائے تھے۔ کوئی آدمی یہ بات نہ کہہ سکا کہ شانہ کے کسی شوہر کی موت میں اس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

اس جیسی وفا پرست بیویاں تو شوہروں پر زندگی بھر نچھاور کر دیتی ہیں نہ کہ انہیں قتل کر دیں۔ تمام کے تمام لوگوں کی موت انوکھے حادثوں سے ہوئی تھی جنہیں ناگہانی کے علاوہ

اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ صرف ایک بات مشکوک تھی، شانہ کے شوہر اس سے شادی سے قبل بھاری رقم کے بیسے کیوں کرا لیتے تھے جبکہ ان کی حیثیت وہ نہیں ہوتی تھی یا شانہ سے شادی کرتے وقت انہیں اپنی موت کا خیال کیوں نہیں آتا تھا؟ لیکن اس شک کو یقین کا درجہ کوئی نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے پوری فائل پڑھ لی۔ میں زوار پاشا کا ہم خیال تھا۔ میں نے غور سے کر شانہ کی تصویر دیکھی۔ ”یہ آخر کون سا جادو کرتی تھی“ اپنے شوہروں پر۔

زوار پاشا میری شکل دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے فائل بند کی تو وہ سنبھل گیا۔ ”کیا خیال ہے؟“ اس نے فوراً سوال وار دیا۔

”بالکل درست زوار پاشا..... یہ عورت درحقیقت بے حد چالاک اور مکار ہے۔“

اور زوار پاشا مسکرانے لگا۔ ”اور اس مکار عورت سے تمہیں ہی مرنا ہے۔“

”پوری کوشش کروں گا لیکن اس کے لیے مجھے تمہاری خاص مدد درکار ہوگی۔“

”ہاں..... ہاں..... بے تکلفی سے کہو.....“

”تعلقات والی عورت ہے۔ ممکن ہے میری کسی مداخلت سے برا فروخت ہو کر میرے خلاف کوئی اقدام کرے۔ اس وقت آپ کو میری حفاظت کرنا ہوگی۔“

”کسی قانونی چکر کی طرف سے تم بے فکر ہو جاؤ۔“

”ٹھیک ہے، باقی چکروں سے میں خود نمٹ لوں گا۔“

میں نے کہا اور میری اور ہماری بات چلی ہو گئی۔

میں نے زوار پاشا سے شانہ خان کے مکان کا پتہ لیا۔ باقی چیزوں کی مجھے چنداں ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ میں زوار سے اجازت لے کر واپس چل پڑا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے دفتر پہنچ گیا۔

اب میں مصروف تھا، کافی معقول رقم کا کیس تھا اور مجھے اس پر محنت کرنا تھی۔ معاملہ ایک آدمی کی زندگی بچانے کا تھا اور اگر اس کی زندگی نہ بھی بچ سکے تو کم از کم اس کی موت میں شانہ خان کا ہاتھ تلاش کرنا تھا۔ چنانچہ میں اپنی شہرہ آفاق میز پر بیٹھ کر اس کیس کے تانے بانے بننے لگا، اس میں اپنی مدافعت کی ترکیبیں سوچنے لگا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں سائے کی طرح شانہ خان اور اس کے شوہر کے پیچھے لگ جاؤں گا۔

میں اسے جان بہار، رونق محفل، آسمان سے اتری ہوئی حور تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن بہر حال حسین تھی اور کسی بھی

لوہاں کو آہیں بھرنے کے لیے مجبور کر سکتی تھی۔ اس وقت گہرے معانی رنگ کی ساڑی میں ملبوس تھی۔ بالوں میں لہلہ بھول لگے ہوئے تھے۔ اس سادہ سے حسن میں وہ قیامت نظر آرہی تھی۔

آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ میں بھی انسان ہوں، جنس مخالف میں میرے لیے بھی وہی کشش ہے جو دوسروں کے لیے..... ہاں احتیاط لازم ہے اور جس نے احتیاط نہ کیا مارا گیا۔ چنانچہ میں نے بھی شانہ خان کو پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا اور ایک بات کم از کم سمجھ گیا۔ اس عورت کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود اسے اس قدر ظالم اور سنگدل نہیں سمجھا جاسکتا۔ شاید اس کے تمام شوہر اس کے الہڑپن پر مر رہے تھے اور سب کچھ بھول کر افواہیں اڑانے والوں کو اس حق سمجھنے لگتے تھے۔ اس کی ادائیں معصوم تھیں اس کے چہرے سے بھولپن برستا تھا۔ اس کے کسی بھی انداز سے فریب کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ اور جب ہوٹل کی بالائی منزل سے چھریرے بدن کا ایک خوبصورت نوجوان نیچے اترتا تو میں نے اس کی آنکھوں میں گہری محبت دیکھی۔ وہ پیار بھری نگاہوں سے آنے والے کو دیکھ رہی تھی۔ یہی اس کا شوہر تھا، نیا شوہر۔ یہی اس کا کروڑوں کا چیک تھا۔ وہ اسے محبت بھری نگاہوں سے نہ دیکھتی تو پھر کسے دیکھتی۔ کرکٹر اس کے قریب پہنچ گیا، اس نے محبت سے بیوی کا ہاتھ تھاما۔ ہوٹل میں اس وقت رقص ہو رہا تھا۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی چوبی فرش پر رقص کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔

میری ڈیوٹی شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں ان سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو کر ان پر نگاہ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، پھر ایک میز پر ایک ادا لڑکی نظر آ گئی۔ نجانے اس بے چاری کو کسی نے رقص کے لیے کیوں نہیں کہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کا قد بہت چھوٹا تھا، رنگ بھی کالا تھا جسے اس نے چھپانے کی کوشش تو بہت کی تھی لیکن یہ میک اپ کا سامان بنانے والی کمپنیاں بھی بس مفت کے پیسے بخورتی ہیں۔ یہ خوب صورت لڑکیوں کو مزید خوب صورت تو بنا سکتی ہیں لیکن کسی سیاہ رنگ کو چھپانے کے لیے انہوں نے کوئی موثر چیز ایجاد نہیں کی۔ بہر حال مجھے اس کے کالے رنگ اور چھوٹے قد سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ مجھے تو بس رقص کرنا تھا۔ چنانچہ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

”کیا آپ کی ٹانگ میں تکلیف ہے؟“ میں نے اور دی سے پوچھا۔

”جی.....“ وہ چونک پڑی اور پھر اس نے حیرانی سے

اپنے پاؤں دیکھے۔ ”جی نہیں تو؟“ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”تب پھر آئیے، رقص کریں۔“ میں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھونچکا رہ گئی تھی۔ پھر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہم دونوں بھی چوبی فرش پر پہنچ گئے۔ میں اپنی ہم رقص کے ساتھ ان کے قریب پہنچ گیا۔ رقص کے دوران میں صرف شانہ خان کو گھورتا رہا۔ کیا گڑبڑ ہے، کیا واقعی آج تک صرف اتفاقات ہوتے رہے۔ کیا ان شوہروں کی موت میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے، اتنے لوگ مر گئے۔ ایک بھی ایسا نہیں جس کے بیسے کی رقم معمولی ہو، پھر یہ لڑکی بغیر شوہر کے بھی تو رہ سکتی ہے۔ اسے اتنی شادیاں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

یا پھر ممکن ہے، اس کی پشت پر کوئی اور ہو جو اسے اس کام پر مجبور کرتا ہو۔ وہ..... یہ خیال خاصا وزنی معلوم ہوا۔ مجھے اس طرف بھی نگاہ رکھنی ہوگی۔ یقیناً زوار پاشا اور دوسرے لوگوں نے اس انداز میں نہیں سوچا ہوگا۔ ہو سکتا ہے، اس گروہ کے ہی لوگ ان شوہروں کے قاتل ہوتے ہوں۔ لیکن ایک اور بات تھی جس نے میرے اس خیال کی تردید کر دی۔ اگر گروہ ہے بھی تو اس کے افراد خود ان لوگوں کو قتل نہ کرتے ہوں گے کیونکہ ایک بھی کیس ایسا نہ تھا، جس میں قاتل پکڑے نہ گئے ہوں یا پھر اس کے شوہر قدرتی موت..... میرا مطلب ہے حادثے کی موت مرے تھے اور یہ حادثے صرف ان کی اپنی حماقت سے ہوئے تھے۔

بہر حال گروہ کے امکان پر نگاہ رکھنی ہوگی۔ ایک بات صاف تھی۔ وہ یہ کہ شانہ خان اپنے کسی بھی شوہر کو کسی پوشیدہ مقام پر قتل نہیں کرے گی بلکہ جب بھی مارے گی کھلے عام مارے گی، تاکہ دوسرے لوگ اس موت کے گواہ ہوں اور اب تو وہ پولیس اور بیمہ کمپنیوں کی نگاہ میں مشکوک بھی تھی۔ اب تو وہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گی جو اس کے لیے پریشانی کا باعث ہو۔

چنانچہ ان کی تنہائیوں میں میری ضرورت نہیں تھی۔ ہاں پبلک مقامات پر میں ان دونوں کے ساتھ ضرور رہوں گا اور خاص طور سے اس کے شوہر کے ساتھ اور میں نے یہی کیا۔ پورے چھ دن سے میں ان کے پیچھے لگا ہوا تھا اور اب ایک بات مجھے پریشان کرنے لگی تھی۔ شانہ خان کی اس نئی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ کیا ضروری ہے کہ وہ اپنے اس نئے شوہر کو جلد ہی قتل کرنے یا کرانے کا فیصلہ کر

سکے۔ اس کی زندگی طویل بھی ہو سکتی ہے، پھر میں کب تک اس کے پیچھے لگا رہوں گا؟ لیکن اپنی میز پر زوار پاشا کے خوفناک گھونٹے بھی مجھے گوارہ نہ تھے۔ مزید کچھ دن گزر گئے۔ زوار پاشا سے دن میں تین چار بار موبائل فون پر بات ہو جاتی تھی۔

یہاں تک کہ پورا ماہ گزر گیا۔ میرے پاس چند چھوٹے چھوٹے کیس آئے۔ جنہیں میں نے کچھ وقت نکال کر ڈیل کیا لیکن میرا ذہن آج کل، شانہ خان میں ہی الجھا رہا۔ اور یہ نئے مبینے کی تیسری تاریخ تھی۔ گہما گہمی کے دن جب لوگوں کی جیبوں میں پیسے ہوتے ہیں۔ چھٹی کا دن تھا۔ مختلف تفریح گاہوں میں بھیڑ مچ گئی۔ شانہ خان اپنی لمبی چوڑی سرسبز میں سلورمون آئی ہوئی تھی۔

میں تو حیثیت ہی چوکیدار کی رکھتا تھا۔ سلورمون میں عام انسانوں کا داخلہ ممنوع تھا، لیکن ایسی ہی ایک جگہ جانے میں مجھے دقت پیش آئی تھی اور میں نے اس کی شکایت زوار پاشا سے کی تھی، چنانچہ زوار پاشا نے اپنی ذاتی کوشش سے میرے لیے ایک کارڈ بنا دیا تھا جو وزارت داخلہ کی طرف سے جاری ہوا تھا۔ اس کارڈ کے ذریعے میں کسی بھی جگہ بے دھڑک داخل ہو سکتا تھا۔ میری حیثیت ایک سوشل محافظ کی سی تھی۔

چنانچہ سلورمون کے منیجر نے کارڈ دیکھ کر مجھے خوش اخلاقی سے اندر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس سلورمون کے منتظمین اس لیے عام لوگوں کو یہاں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ بڑے آدمیوں کی تفریح میں خلل نہ پڑے۔

آپ نے یورپی ساحل بھی دیکھے ہوں گے۔ جہاں مختصر لباس میں چھپکلیاں جگہ جگہ پڑی نظر آتی ہیں۔ ان چھپکلیوں میں نہ دلکشی ہوتی ہے، نہ جاذبیت لیکن سلورمون میں عریاں ہونے والے جسم اور کہیں عریاں نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کی دلکشی باقی رہتی ہے۔ بہر حال عریانیت ہی ان کی نگاہوں میں بڑائی ہے، بڑے ہونے کی دلیل۔

جب دعوت نگاہ ہو تو اہل نگاہ کو کیا اعتراض۔ میں بھی سلورمون کے حسین سونگ پول کے کنارے کنارے چہل قدمی کرنے لگا جہاں بڑے لوگ سن باتھ لے رہے تھے۔ شاید ان کے مکانوں میں دھوپ نہیں آتی تھی۔ یہ جہیل بھی قدرتی نہیں تھی بلکہ سلورمون کی خوبصورتی بڑھانے کے لیے بنائی گئی تھی، خاصی گہری تھی اور دل والے ہی اس میں نہاتے تھے۔

میں نے شانہ خان اور اس کے کرکٹر شوہر کو بھی اسی طرف آتے دیکھا اور میں حسب معمول ان کے پیچھے چل

پڑا۔ ان دونوں کو آج تک میرے تعاقب کا علم نہیں ہو سکا تھا اور بہر حال یہ میرا کمال تھا۔ ورنہ زوار پاشا جیسے لوگ پانچ لاکھ روپے دینے پر کیوں تیار ہو جاتے۔ اس وقت تو میں ان کے بہت ہی قریب تھا، چنانچہ ان دونوں کی گفتگو کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ شانہ کہہ رہی تھی۔

”تیرے والے مردوں کے جسم بڑے سڈول ہوتے ہیں کیا تم تیرا جانتے ہو؟“

”کیوں نہیں؟“ کرکٹر صاحب کی آواز سنائی دی۔

”مجھے یقین تھا کچھ بھی ہو، تیرا ضرور آنا چاہیے۔“

در اصل مرد میں کچھ صفات نہ ہوں تو وہ مرد کہلانے کا مستحق نہیں ہے اور تیرا کی بھی انہی صفات میں سے ایک ہے۔“

”بے شک ڈارلنگ!“ کرکٹر صاحب نے جواب دیا۔

”اوہ..... دیکھو..... اس نے کتنی خوب صورت ڈائیو لگائی ہے۔“ اس نے جلدی سے ایک مرد کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں۔“

”کیا تم اتنی بلندی سے ڈائیو کر سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں!“ کرکٹر نے سینہ پھلا کر کہا۔

”تب چلو..... اس کو نے میں چلیں، یہاں رش بہت ہے۔ تم مجھے ڈائیو کر کے دکھاؤ۔“

”آؤ.....!“ کرکٹر صاحب نے کہا اور وہ دونوں جہیل کے ایک پرسکون گوشے کی طرف چل پڑے۔ اس طرف بہت کم لوگ تھے۔ اب میرا ان کے پیچھے جانا مناسب نہ تھا اس لیے میں نے ان سے کٹ کر ایک لمبا چکر لیا اور کافی دور سے ان کی طرف پہنچا۔ لیکن اب بھی میرا ان سے کافی فاصلہ تھا۔

میں نے کرکٹر کو لباس اتارتے دیکھا۔ نیچے ہاتھ تک انڈرویز موجود تھا۔ پھر وہ ڈائیونگ اسٹینڈ پر پہنچ گئے۔

شانہ محبت بھری نگاہوں سے اس کے سڈول جسم کو دیکھ رہی تھی۔ کرکٹر صاحب قدرے بدحواس نظر آ رہے تھے، میں نے ان کے جسم کو ہولے ہولے کانپتے ہوئے بھی محسوس کیا لیکن شانہ خان مسکرا مسکرا کر ان کی ہمت بڑھا رہی تھی، چنانچہ انہوں نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

لیکن جس انداز میں چھلانگ لگائی گئی تھی، اسے دیکھ کر میں چونک پڑا، یقیناً یہ کسی تیراک کی چھلانگ نہیں تھی۔ وہ بالکل اناڑی معلوم ہوتا تھا۔ جہیل گہری تھی اور اناڑی تیراک اس میں نہیں تیر سکتا تھا..... اور پھر میرے ذہن میں تیزی سے ایک خیال آیا۔ اسے ڈائیو لگانے کی ترغیب شانہ نے ہی

لگی تھی کہ اسے ایک حسین طریقہ.....! کسی بھیل کے تحت میں نے جلدی سے لباس اتار لیا۔ ہم..... ہم..... ہم..... ہم..... لیکن انڈرویز ضرور تھا۔ میں نے دور سے جہیل میں چھلانگ لگا دی۔

کرکٹر اوندھے سیدھے پاؤں مار رہا تھا اور شانہ طرہ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ونڈرفل ڈارلنگ..... تم تو بہت اچھے تیراک ہو، اور تک جاؤ۔“

”مم..... مم..... مم.....!“ کرکٹر صاحب کی ڈوبتی آواز سنائی دی، کچھ دوسرے لوگ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”کیا بات ہے، ڈارلنگ..... کیا تم مذاق کر رہے ہو؟“ شانہ نے ہانک لگائی، لیکن میرے جسم میں بجلیاں بھر گئی تھیں۔ کرکٹر صاحب زندگی کی آخری جدوجہد کر رہے تھے کیونکہ میں نے پانی میں چھلانگ لگا دی لہذا میں بہ مشکل انہیں ساحل تک لاسکا تھا۔ ان کی حالت سخت ابتر تھی اور شانہ بھی بدحواس نظر آ رہی تھی۔

”آپ کو تیرنا نہیں آتا تھا تو جہیل میں چھلانگ کیوں لگائی تھی صاحب!“ ایک شخص نے تسخرانہ انداز میں کہا۔

”نہیں..... بس پانی میں اترنے کے بعد..... طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔“ کرکٹر صاحب نے اس عالم میں بھی سچ بولنے سے گریز ہی کیا۔ میری طرف کسی نے بھی توجہ نہ دی۔ نہ شانہ اور اس کے شوہر نے میرا شکریہ ادا کیا۔ چنانچہ میں خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

شانہ نے اسے موت کی ترغیب دی تھی، یقیناً وہ تیراک نہیں تھا لیکن شانہ خان نے اسے آمادہ کرنے کے لیے پہلے تیرا کوں کی تعریف کی تھی پھر اس کے بدن کو سراہا تھا اور نہ تیرنے والوں کو احمق گردانا تھا۔

اب ایک مالدار بیوی کا غریب شوہر اگر اس کے معیار پر پورا نہ اترتا تو اسے شوہر بننے کا کیا حق تھا۔ چنانچہ غریب کرکٹر سوئی پر چڑھ گیا تھا، کون شانہ کو مورد الزام ٹھہرا سکتا تھا۔

اس کے ہوش و حواس درست تھے۔ اس نے کئی آدمیوں کے سامنے ڈائیو اسٹینڈ پر چڑھ کر جہیل میں چھلانگ لگائی تھی۔ کوئی الٹھی بات نہیں تھی۔ دوسرے لوگ بھی بتا رہے تھے۔ اگر وہ اب کرکٹر جاتا تو شانہ خان رونے پٹنے کے علاوہ اور کیا کر سکتی تھی، کون اسے مورد الزام ٹھہرا سکتا تھا۔

نکل کرنے کا حیرت انگیز طریقہ..... اوہ میرے

ایہ شیطانی مخلوق..... یہ شیطان صفت عورت کس قدر

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

چالاک ہے۔ یقیناً اگر آج میں نہ ہوتا تو یہ پھر بڑھ ہو گئی ہوتی اور بیمہ کمپنی دیوالیا.....! زوار پاشا کے لیے میرے پاس بہترین رپورٹ تھی۔ چنانچہ میں نے جلدی سے لباس پہنا۔ دوسری طرف کرکٹر صاحب بھی لباس پہن رہے تھے اور شانہ خان ایسی بدحواس نظر آ رہی تھی جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ اس کا پیارا شوہر ہاتھ سے جاتے جاتے رہ گیا تھا۔

پھر وہ دونوں سلورمون سے باہر نکل گئے۔ میں نے بھی اپنی کار سنبھالی اور زوار کے گھر روانہ ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ فی الحال کرکٹر صاحب کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ تاوقتیکہ وہ دوبارہ مردانگی دکھانے کے قابل نہ ہو جائیں۔

زوار پاشا گھر پر موجود تھا۔ بن سنور کر کہیں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔

”سناؤ بھی کیسی چل رہی ہے؟“ انہوں نے مخصوص انداز میں پوچھا۔

”گرم، گرم خبر ہے۔ زوار صاحب!“ میں نے وبے ہوئے جوش سے کہا اور زوار پاشا اچھل پڑے۔

”کیا.....“ انہوں نے ہولنوں کے سے انداز میں پوچھا۔ ”کیا وہ بھی مر گیا.....؟“

”نہیں..... سچ گیا!“ میں نے جواب دیا۔

”ارے مگر کیسے..... نیٹھو تو سہی..... جلدی بتاؤ.....“

زوار پاشا نے بے تاب سے کہا اور میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے زوار پاشا کو ”الف“ سے لے کر ”ے“ تک پوری تفصیل سنائی۔ زوار پاشا کا بھاڑ سامنے کھلا ہوا تھا۔

پوری کہانی سننے کے بعد اس کا منہ اس طرح بند ہو گیا جیسے پوری کہانی حلق سے اتارنے کے بعد ننگے کی کوشش کر رہا ہو۔

”اب بتاؤ..... اب بتاؤ.....“ وہ بولا۔ ”اس طرح تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ الوکا چرند خود مرنا چاہ رہا ہے۔ کون روک سکتا ہے، کیسے روک سکتا ہے، کچھ سوچو میرے بار!..... آج تم نے اسے بچا لیا کل کیا کرو گے؟ اس طرح تو وہ کسی طور جان دے سکتا ہے۔“

”ہاں..... زوار پاشا یہ قتل کرنے کا بالکل نیا انداز ہے۔ ایسے کسی حادثے کو ہم کیسے روک سکتے ہیں؟“

”سوچو..... کچھ سوچو..... تم بہت کچھ کر سکتے ہو.....“

اور ہاں پانچ ہزار کی رقم اور مل گئی ہے۔ چنانچہ ڈھائی ہزار تمہارے۔“

”آپ کہیں تو میں اس کرکٹر سے ملاقات کر کے اسے ایسی کسی حرکت سے باز رکھوں؟“

”کچھ نہ ہوگا۔ اس طرح تو کچھ نہ ہوگا صاحب! وہ سچ

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

بھی کیا تو..... بات بن جائے گی لیکن وہ کجبت آزاد رہے گی۔
مجھے تو اس کے بارے میں ثبوت درکار ہے۔“
”ہوں.....“ میں سوچنے لگا۔ پھر میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں زوار پاشا! اس بار میں اس کی گفتگو ٹیپ کرنے کی کوشش کروں گا۔“ میری آنکھوں میں زوار پاشا کی جیب سے نکلنے والی نوٹوں کی گڈیاں گھوم رہی تھیں۔ بہر حال میں اپنا کام ایماندارانہ طور سے کر رہا تھا اور اگر میں نہ ہوتا تو..... تو یقیناً بھائی کرکٹر..... کیش ہو گئے ہوتے۔“
”ہاں، یہ عمدہ ترکیب ہے، لیکن کیا تم اس سے اس قدر قریب رہ سکو گے کہ اس کی گفتگو ٹیپ کر سکو؟“
”کوشش کروں گا۔ ویسے آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے اپنا کام بہ خوبی سرانجام دیا ہے ورنہ.....“
”میں جانتا ہوں، مگر ہم اس بد بخت کو کیا کریں جو مرنا ہی چاہتا ہے۔ وہ خوب صورت بلا پھر اسے مرنے کے لیے تیار کر لے گی؟“ زوار نے پر خیال انداز میں کہا اور میں بھی سوچ میں پڑ گیا۔ درحقیقت کرکٹر کی موت تو لازمی تھی اور یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا جتنا ہم سوچ رہے تھے۔ نہ زوار پاشا کچھ کر سکتا تھا اور نہ میں..... اور نہ بیمہ کمپنی کے ارکان۔ اگر شتانہ خان پر الزام لگاتے تو وہ جگ عزت کا دعویٰ کر دیتی جبکہ پولیس بھی اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں کر سکی تھی۔ سب ہی مجبور تھے۔ میں کرکٹر کے باڈی گارڈ کے فرائض کب تک سرانجام دے سکتا تھا۔ اس کی تو پوری زندگی کو خطرہ تھا کیونکہ وہ شتانہ خان کا سب سے قیمتی شکار تھا۔
بس ضرورت اس بات کی تھی کہ شتانہ خان کوئی حماقت کر بیٹھے، اسی طرح کام بن سکتا تھا۔
”یاد دلایا۔“ بہر حال اس سلسلے کو ہمیں ہی دیکھنا ہے، زوار پاشا نے ہے؟“
”فیپ ریکارڈر کے بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے؟“
”میں نے سوچا تھا لیکن آپ کا یہ خیال درست ہے۔ اس کے اس قدر نزدیک کیسے رہا جاسکتا ہے۔“
”دہی تو میں کہہ رہا تھا۔ بہر حال تم کوشش جاری رکھو اور جیسا مناسب سمجھو کرو۔“
”بہتر ہے، مجھے اجازت دیں زوار پاشا!“ میں نے کہا اور اجازت مل جانے پر باہر نکل آیا۔
پچاس ہزار وصول ہو گئے تھے، وہ بھی ایک پولیس آفیسر سے جو کم نہ تھے، اس پورے سال میں اتنا قیمتی کیس کوئی اور نہیں ملا تھا۔ دراصل ہمارا ملک غریب ہے، بالدار لوگ اپنے معاملات خود ہی آپس میں طے کر لیتے ہیں۔ کچھ کم

باز زیادہ۔ درمیانے طبقے کے مسائل ایسے نہیں ہوتے جن میں وہ کسی پرائیویٹ جاسوس کی بددلیس اور لیس بھی تو ادائیگی کہاں سے کریں۔ اس لیے یہ رقم خاصی دلکش تھی۔
دوسرے دن اپنے دفتر آنے کے بعد میں نے ڈاک وغیرہ دیکھی۔ سیکریٹری سے کسی نئے کیس کے بارے میں پوچھا۔ کوئی نہیں آیا تھا۔ ملازموں کی پیشگی تنخواہیں دیں۔ اس کے بعد میں اپنی ڈیوٹی پر نکل گیا۔
شانہ خان اپنی کوٹھی پر تھی۔ اس کا اندازہ اس کی کار سے ہوتا تھا۔ میں بھی اس کی کوٹھی سے زوار دور ٹھہر گیا دن وہیں گزارا، شام کو وہ کلب گئی تو کاٹھ کا لوسا تھا اور رات گئے واپس آئی۔
ایک ہفتہ مزید گزر گیا۔ کوئی کام نہیں بن سکا تھا۔ دوسرے ہفتے کا پہلا دن سنسنی خیز تھا۔ اس دوپہر کو شتانہ خان خاصی بنی غصی گھر سے باہر نکلی۔ شوہر بھی ساتھ تھا۔ اس بے چارے کو اور کوئی کام تو تھا نہیں، بس دن بھر گھر میں رہنا ہوٹل چلے جانا یا پھر بیوی کے ساتھ گھومنا اس کا معمول بن گیا تھا۔
ہاں تو اس دوپہر کو شتانہ خان آسمانی رنگ کی حسین ساڑی میں ملبوس، قیامتیں سمیٹے اپنے شوہر نامدار کے ساتھ نکلی۔ چنانچہ ان کی کار کے پیچھے میرا چھڑا بھی دوڑنے لگا۔ آج ان کا رخ شہر سے باہر کی طرف تھا۔
میری چھٹی حس گنگنانے لگی۔
کوئی گڑبڑ..... کوئی گڑبڑ..... اور میں چاق و چوبند ہو گیا۔ کہاں جا رہے ہیں یہ لوگ نجانے کہاں کا ارادہ ہے؟ پھر کافی طویل فاصلہ طے کر کے جب ان کی کار ”سنہری جام“ کلب کی ذیلی سڑک پر مڑی تو میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہاں ڈرائیونگ کے شوقین لوگ آتے تھے۔ کلب کے ایک بہت بڑے علاقے میں کار ریس کا انتظام کیا تھا۔ ڈرائیونگ کے شوقین کلب سے کاریں حاصل کر کے شریٹیں لگا کر ریس لگاتے تھے اور یہ ریس کافی خطرناک ہوتی تھی۔ اکثر لوگ یہاں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ میرے ذہن میں چھٹا کا سا ہوا۔ کیا کرکٹر صاحب بھی ریس میں حصہ لیں گے.....؟ ہو سکتا ہے شتانہ خان نے انہیں تیار کر لیا ہو۔
”ویری گڈ..... اچھا آئیڈیا ہے مگر اب میں کیا کروں، سوائے اس کے کہ خود بھی اس میں حصہ لوں اور اس گدھے کی حفاظت کی کوشش کروں؟“
کار کلب کے کپاؤنڈ میں کھڑی ہو گئی۔ شوقینوں کا ہجوم تھا، ترقی پذیر ملک تھا۔ ترقی پسند لوگ ہر نئی تفریح کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ چنانچہ رینگ کلب خوب چل رہا تھا۔

ان لاکھوں اور لڑکے چست لباس پہنے رینگ ہیملٹ پہنچے اور میں چارہ تھے۔
شانہ خان اپنے شوہر کے ساتھ سی ویو میں جا بیٹھی۔ میں نے ان سے کافی دور ایک گوشے کا انتخاب کر لیا تھا۔ ان لوگوں نے ایک مشروب طلب کیا اور میں نے بھی ہیرے سے کالی کے لیے کہہ دیا۔ یہاں سے ریس میں حصہ لیں والے صاف نظر آتے تھے۔ بڑے پیہوں والی بچی کاریں دوڑ رہی تھیں۔ دیکھنے والوں کی تالیاں گونج رہی تھیں۔ ذرا سی لغزش جیتروے اڑا سکتی تھی لیکن لوگ تفریح کے لیے زندگی کی بازی لگائے ہوئے تھے اور جب لڑکیاں تک کاریں دوڑا رہی تھیں تو پھر کرکٹر صاحب کیسے بیٹھے رہتے۔
تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ لوگ یہاں بیٹھے رہے پھر ریس آپریٹر، ریس میں حصہ لینے والوں کے آرڈر بک کرنے آیا اور میں نے شانہ کو اسے اشارہ کرتے دیکھا۔ شانہ نے اسے آرڈر نوٹ کرایا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ کرکٹر صاحب سوئی پر چڑھ گئے تھے اور پھر آپریٹر میرے پاس آیا تو میں نے بھی اسے ریس میں حصہ لینے کا آرڈر نوٹ کر دیا۔
چند منٹ کے بعد اناؤنسمنٹ ہوئی اور بہت سے لوگ اٹھ گئے ان میں شانہ اور اس کا شوہر بھی تھا۔ میرے رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے رینگ لباس پہنا اور ہیملٹ لگا یا اور چند منٹ کے بعد قطاروں میں کھڑی کاروں کے قریب پہنچ گئے۔ شانہ دیکھنے والوں کے ساتھ جا کھڑی ہوئی اور کرکٹر صاحب ریس کا لباس پہنے اس نمبر کی کار کی طرف بڑھ گئے جس نمبر کا لباس پہنے ہوئے تھے، ان کی کار کا رنگ سبز تھا اور میں پیلے رنگ کی کار میں تھا۔ ان کی کار کا نمبر گیارہ تھا اور میں اکیانوے نمبر کی کار کا مالک تھا۔ تیاریاں مکمل ہو گئیں اور میں جل تو جلال تو پڑے کہ اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ میں نے کار چیک کی، ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ ایسا نہ ہو کہ اسے بچانے کی کوشش میں، میں ہی اللہ کو پیارا ہو جاؤں۔ ہاں..... زندگی کا کیا بھروسہ، قدرت ایسے ہی دلچسپ تماشے کرتی ہے۔
اس خیال سے میرا دل لرز گیا۔ عام حالات میں زندگی کی بازی لگانے کا شوقین نہیں تھا۔ شاید پوری زندگی اس لفٹاک راستے پر کار دوڑانے کا تصور بھی نہ کرتا، لیکن اس وقت معاملہ دوسرا تھا۔
”ادبہ.....“ اگر یونہی لکھی ہے تو کون ٹال سکتا ہے۔ آرام، آرام سے کھیلوں گا۔ مجھے کون سا ریس جیتنے کا شوق ہے۔ صرف اس گدھے پر نگاہ رکھنی ہے جو ایک بار جان بچنے

کے باوجود نہیں سنبھلا۔“
بالآخر ریس شروع ہو گئی۔ کرکٹر صاحب کی کار گولی کی طرح قطار سے آگے نکلی۔ درحقیقت اس نے شاندار پک اپ لیا تھا۔ اگر وہ مشاق ڈرائیور ہے تو پھر میرا تردد بیکار ہے کیونکہ بہر حال دوسرے لوگ ریس میں حصہ لے رہے ہیں۔ میں کرکٹر صاحب سے کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ بہر حال میں بھی چل رہا تھا۔ کرکٹر صاحب پہلے راؤنڈ میں بیوی کے سامنے سے گزرے اور شانہ خان نے پر جوش تالیاں بجائیں، اس کے بعد انہیں بیوی سے جدا ہو جانا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ تمام کر دوسرا ہاتھ ہلایا اور پھر یہ مشکل ایک کار سے نکلنے سے بچے اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔
یہ اناڑی پن کا ثبوت تھا۔ ایک عمدہ پک اپ لے لینا کوئی بڑی بات نہیں لیکن ریس جاری رکھنا مہارت پر مبنی تھا اور انہوں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کار جس طرح آگے بڑھائی تھی، وہ ان کے اناڑی پن کا ثبوت تھا۔ اگر دوسرا کھلاڑی اپنی کار نہ بچا لیتا تو تصادم لازمی تھا بہر حال میں نے اپنی کار ان کے پیچھے لگا دی۔
کرکٹر صاحب کالی تیز رفتاری سے جا رہے تھے اور میں ان سے ایک مخصوص فاصلہ برقرار رکھ رہا تھا، لیکن دوسرے لوگ یہ احتیاط کیوں رکھتے۔ ماہر ڈرائیور خوفناک انداز میں کاریں دوڑا رہے تھے۔ ہم بہت دور نکل آئے اور پھر پہلا خوفناک موڑ آیا۔ جہاں زمین بھی ناہموار رکھی گئی تھی۔ ”ہوشیار“ میرے ذہن نے نعرہ لگا یا اور میں نے فاصلہ کم کرنا شروع کر دیا۔ کرکٹر صاحب اسی خوفناک موڑ کو دیکھ کر بدحواس ہو گئے، انہوں نے التماسیدھا اسٹیرنگ گھمانا شروع کر دیا اور ایک بار ان کی کار کے میں اتر گئی۔ گرد کا طوفان برپا ہو گیا اور وہ اس میں غروب ہو گئے۔ دوسرے لوگ اپنی زندگی بچا کر نکل گئے تھے لیکن کرکٹر صاحب کو ابھی ہوش نہیں آیا تھا۔ انہوں نے کار پھر سڑک پر چڑھا دی اور آگے بڑھ گئے۔
”لعنت ہے.....“ میرے ذہن نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ پاگل آدمی نہ جانے کیوں زندگی کا دشمن بنا ہے اور اب ہم دوسرے خوفناک موڑ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس موڑ کے دوسری طرف چٹانیں تھیں جن سے ٹکرا کر کاریں تباہ ہو سکتی تھیں۔ شوہر نامدار کی کار آگے بڑھی لیکن اس بار انہوں نے حاضر دماغی سے کام لیا تھا۔ وہ سست رفتاری سے موڑ سے گزرے تھے لیکن اس طرح ان کے نمبر غائب ہو گئے تھے اور اب آخری کاروں میں ہم دو ہی تھے گویا میرا نمبر سب سے آخری تھا۔ لیکن مجھے اس بات کی کیا پروا

ہوسکتی تھی۔ موڑ سے بہ خیریت گزرنے کے بعد انہوں نے رفتار پھر تیز کر دی۔ یہاں تک کہ تیسرا موڑ آ گیا۔ یہ موڑ بھی بے حد خطرناک تھا۔ اس پر سڑک پتلی تھی اور اس کے کنارے پر کھائیاں تھیں خاصی گہری کھائیاں لیکن یہ صرف حرف آخر نہیں تھا۔ چھٹے موڑ پر تو اتنی گہری کھائیاں تھیں کہ زندگی کا سوال ہی نہیں تھا۔

کھائیاں دیکھ کر کرکٹر صاحب کے اوسان خطا ہو گئے۔ انہوں نے رفتار پھرست کر دی۔ دوسری کاروں کا نام و نشان نہیں تھا اور اب مارکیٹ میں صرف دو دانے رہ گئے تھے۔ یعنی میں اور وہ..... کرکٹر صاحب نے انتہائی ست رفتاری سے موڑ طے کرتے ہی کار کچے پر اتار دی اور پھر میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ میری روح تک خوش ہو گئی تھی، شاید خدا نے اسے عقل دے دی۔ چنانچہ میں بھی اس کے قریب ہی رک گیا۔

وہ مجھے دیکھ کر جھپٹے ہوئے انداز میں مسکرایا اور پھر چونک پڑا۔

”ارے آپ..... آپ تو وہی ہیں۔“ اس نے کہا۔
”ہاں..... میں بھی آپ کو پہچان گیا۔ میری اور آپ کی ملاقات سوئنگ پول میں ہوئی تھی۔“

”جی ہاں..... جی ہاں..... پھر میں آپ کو تلاش ہی کرتا رہ گیا تھا۔ اس دن تو آپ میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئے تھے۔ نہ جانے آپ کہاں چلے گئے تھے۔ میں آپ کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکا۔“

”مجھے اس کی حاجت نہ تھی۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اپنا فرض پورا کر کے چلا گیا تھا۔“

”خوب ملاقات ہوئی اس وقت..... آپ بھی اس کھیل میں نئے شوقین ہیں شاید؟“

”جی ہاں.....“ میں نے گہری سانس لی۔

”میں نے بھی پہلی بار ایسے خوفناک راستوں پر کارروائی کی ہے۔ اگلے موڑ تو اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوں گے۔“

”کہیں زیادہ۔“

”اب تو ہم کوئی نمبر بھی نہ لے سکیں گے؟“

”یقیناً۔“

”پھر کوشش کرنے سے کیا فائدہ.....؟ میرا خیال ہے،

واپس چلیں؟ کوئی بہانہ کر دیں گے کہ کار خراب ہو گئی تھی؟“

”کیوں نہ تھوڑی دیر گفتگو رہے محترم.....!“

”ضرور..... ویسے میری بیوی میری منتظر ہوگی۔“

”گستاخی نہ ہو تو کچھ عرض کروں.....؟“

”فرمائیے.....!“
”وہ اب آپ کی منتظر نہ ہوں گی۔ انہیں یقین ہو گا کہ اب تک آپ کسی کھائی میں گر کر ہلاک ہو چکے ہوں گے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”وہ آپ کی موت کی اطلاع کی ضرور منتظر ہوں گی۔“

”نہ جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”آپ مجھے اجازت دے چکے ہیں کہ میں جو چاہوں کہوں۔“

”مگر کہنا کیا چاہتے ہیں آپ.....؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”اس سے قبل آپ نے کبھی ریس میں حصہ لیا ہے؟“

”کبھی نہیں۔“

”پھر آج یہ جرات کیسے کی.....؟“

”اوہ..... وہ..... میری بیوی کی خواہش تھی۔“

”اور اس دن سوئنگ پول والی جھیل میں نہانے کی خواہش بھی آپ کی بیوی نے کی تھی۔“

”ایں..... نہیں..... وہ تو..... وہ تو میں خود.....!“

”جبکہ آپ تیرنا بھی نہیں جانتے تھے؟“

”ہاں..... معمولی سی مشق تھی۔“

”میری خواہش ہے کہ ٹھنڈے دل سے میری باتیں

سنیں، آپ کی بیوی آپ کو ہلاک کرنا چاہتی ہے۔“

”اوہ..... آپ بھی وہی فضول بکواس کریں گے جو

دوسرے کر چکے ہیں۔“

”دوسرے کون؟“

”میرے دوست وغیرہ..... ان کا خیال ہے کہ شانہ

فراڈ ہے۔ وہ شادی اس لیے کرتی ہے کہ اسے شوہروں کے

بیسے کی رقم مل جائے، لیکن میں کہتا ہوں کہ اس نے کسی کو

ہلاک نہیں کیا ہے، سب اتفاقی موت مرے ہیں۔“

”آپ بھی اس دن سوئنگ پول پر اتفاقی موت

مر جاتے اور اگر آج خدا آپ کو عقل نہ دیتا تو آج بھی آپ

کسی موڑ پر کسی گہری کھائی میں جا پڑتے کیونکہ آپ ایک مشاق

ذرا نیور نہیں ہیں۔“

”دیکھیے جناب، آپ جو بھی ہوں میں آپ سے

درخواست کروں گا آپ میری بیوی کے بارے میں کچھ نہ

کہیں۔ پتا نہیں لوگ دولت مندوں کے اتنے دشمن کیوں

ہو جاتے ہیں۔ ایک عالم میری بیوی سے دشمنی پر آمادہ ہے

لیکن میں اس کا شوہر ہوں۔ اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ

بے حد نفیس عورت ہے۔ اسے اپنی نحوست کا احساس ہے اور

بھل اوقات وہ اس بات پر گھٹنوں روتی ہے کہ لوگ اسے

اٹھا لیتے ہیں۔“

”صرف ایک بات بتا دیجیے جناب۔“ میں نے

لہجہ سے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اس پر گہری پالش ہے اور

مہمانے بچانے کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ وہ مجھے ناگواری کے

انداز میں دیکھ رہا تھا۔

”آپ کی بیگم نے آپ کا اتنا قیمتی بیہ کیوں کرایا ہے؟“

”آپ ذلیل ہیں..... کہنے ہیں۔“ وہ فغان

ہو جائیے..... اگر آپ میرے اوپر احسان نہ کر چکے

ہوتے..... تو..... تو.....“ وہ غصیلے انداز میں خاموش ہو گیا اور

میں صبر و سکون سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

”خدا آپ پر رحم کرے۔“ بالآخر میں نے ٹھنڈی

سانس لی اور پھر اپنی کار آگے بڑھالے گیا۔ دوسری کاریں

شاید پانچویں موڑ سے گزر رہی تھیں، لیکن میں درمیانی راستے

سے واپس پلٹ پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس پہنچ گیا۔

میں تنہا ہی نہ تھا۔ دوسری بہت سے کاریں واپس آگئی تھیں

جن میں زیادہ تر لڑکیاں تھیں۔ تیسرے موڑ سے گزرنے کے

بعد ان کی ہمت جواب دے گئی تھی اس لیے میری طرف کسی

نے خاص توجہ نہ دی۔ میں نے بل ادا کیا اور لباس اتار کر

واپس سی ویو پہنچ گیا۔

اور سی ویو سے میں نے شانہ خان کو دیکھا۔ وہ پتھر کے

بت کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی

تاثرات نہ تھے۔ شاید وہ قسمت کے فیصلے کی منتظر تھی اور پھر

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد کرکٹر صاحب درمیانی سڑک پر

آتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے شانہ خان کو چوٹکتے ہوئے

دیکھا اور پھر اس کی گردن لٹک گئی۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ آج وہ پھر نا کام

رہی لیکن اب کچھ کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں اس

حالاک عورت کا طریقہ کار سمجھ گیا تھا۔ وہ کسی طور نہیں بچس سکتی

تھی۔ کرکٹر ہوش و حواس میں تھا۔ اپنی مرضی سے ریس میں

شریک ہوا تھا۔ اگر وہ کسی حادثے کا شکار ہو جاتا، تو شانہ پر گیا

بات آسکتی تھی.....! پھر ایسی عورت کو بھانسا کسی قدر مشکل تھا۔

مجھے یہ بھی یقین ہو گیا کہ اس کا کوئی گروہ نہیں ہے۔ اس کا

طریقہ کار ایسا ہے کہ اسے کسی گروہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کاش

کرکٹر بتا دیتا کہ وہ بیہ کرائے پر کیسے تیار ہوا تھا؟

کافی دیر تک وہ لوگ یہاں رہے۔ شانہ خان کے

پہرے سے اب کوئی احساس نہیں فیک رہا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر

وہر سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ کرکٹر صاحب

میرے بارے میں نہ بتا دیں۔ وہ محتاط ہو جائے گی۔ لیکن

بہر حال میں یہ نہ معلوم کر سکا کہ اس سلسلے میں اس نے کچھ

بتایا یا نہیں۔ پھر جب وہ واپس چل پڑے تو میں نے بھی وہ

علاقہ چھوڑ دیا۔

اور پھر رات کو میں نے زوار پاشا کو اس سلسلے میں

اطلاع دی۔

”تمہاری کارکردگی اطمینان بخش ہے، مسٹر شاہد جیل

لیکن میں نے آج بیہ کمپنی والوں سے بات کی تھی۔ اس طرح

ہم کب تک باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔

اس عورت کو بھانسا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بے وقوف

شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔ بہر حال تم اپنا کام جاری رکھو

میں اس سلسلے میں کچھ اور سوچوں گا۔“

”اد کے.....!“ میں نے کہا۔

”اور ہاں..... ایک لاکھ کا چیک اور مل گیا ہے، تمہارا

حصہ کل پہنچ جائے گا۔“

”شکریہ زوار پاشا!“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

بہر حال مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ چنانچہ اس نیک انسان

نے دوسرے دن پچاس ہزار روپے بھجوا دیے۔ میں نے اپنا

کام جاری رکھا لیکن اب میں کافی احتیاط رکھتا تھا۔ کرکٹر

صاحب مجھے پہچانتے تھے، ممکن ہے انہوں نے بیگم صاحبہ

سے بھی مجھ بے وقوف کا تذکرہ کر دیا ہو جو خواہ مخواہ انہیں ان کی

بیوی سے بدظن کر رہا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ اس دوران مجھے ایک اور کام مل گیا۔

میری توجہ اس طرف سے کم ہو گئی۔ زوار پاشا بھی شاید بور

ہو گیا تھا۔ مگر میں انہیں فون پر بتاتا کہ میں غافل نہیں

ہوں۔ چنانچہ اس شام جو کچھ ہوا۔ وہ میرے سامنے ہی

ہوا..... اور میں آپ کو بتانے جا رہا ہوں۔

ایک دفاعی ادارے کی طرف سے ایک عظیم الشان

مینا بازار لگایا گیا تھا۔ ہر خاص و عام کو داخلے کی اجازت تھی۔

داخلہ ٹکٹ معمولی تھا اس لیے مینا بازار کچھ بھرا ہوا تھا۔

میں شانہ خان کا تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ شانہ اور اس کا

کرکٹر شوہر بھی مینا بازار میں گھوم رہے تھے اور میں ان سے

زیادہ دور نہیں تھا۔ اس وقت اتفاق سے میری نگاہ شانہ پر ہی

گئی جب میں نے اسے کسی کو دیکھ کر مسکراتے دیکھا۔ میں نے

چونک کر دیکھا..... لیکن وہ مجھے نظر نہ آ سکا جسے دیکھ کر وہ

مسکرائی تھی۔ میرے ذہن میں بہت سے شبہات جاگ اٹھے

اور میں اس پر کڑی نگاہ رکھنے لگا۔ تھوڑی دور چل کر شانہ

پھر مڑی، اس بار اس نے کسی کو زبان چڑا دی تھی۔

انداز بہت دلکش اور دل لہانے والا تھا اور میں نے خطرناک شکل کے اس پہلوان نما آدمی کو مسکراتے دیکھا جس نے سلک کا کرتہ اور پیلے رنگ کا لاجپاتہ رکھا تھا۔ چہرے سے ہی غنڈا اور خطرناک نظر آتا تھا۔ کتنی مونچھوں کے نیچے اس کی مسکراہٹ بہت خطرناک تھی، بات میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ پھر میں نے پہلوان کو آنکھ مارتے دیکھا۔ شانہ خان پھر مسکرا دی تھی اور اس کے بعد جو دردناک مناظر سامنے آئے ان میں کرکڑی موت اور میرا خانہ خراب شامل تھا.....!

مجھے اسپتال آئے ہوئے تقریباً سات دن گزرے تھے کہ ایک دن سیاہ لباس میں ملبوس کوئی خاتون میرے کمرے میں داخل ہو گئی۔ ان کے ہاتھوں میں پھول تھے اور ان کے پیچھے ایک نرس پھولوں کی نوکری اٹھائے ہوئے تھی۔ میں نے ان خاتون کی شکل دیکھی اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ شانہ خان تھی۔ چہرے پر غم کے سائے، آنکھوں میں سوگوار۔ ہونٹ خشک خشک۔ وہ میرے قریب پہنچ گئی۔

”کیسے ہیں شاہد جمیل صاحب!“ اس نے پوچھا۔
”مم..... میں نے آپ کو پہچانا نہیں خاتون۔“ میں نے بہ مشکل خود پر قابو پا کر کہا۔
”میرا نام شانہ خان ہے۔ میں وہی ہوں جس پر آپ نے دو دفعہ احسان کیا تھا اور میری دفعہ آپ زخمی ہو گئے۔“
”اوہ.....“ میرے منہ سے نکلا۔
”میں آپ کا شکر یہ ادا کرنے آئی ہوں۔“
”لیکن آپ کو میرے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟“ میں نے کہا۔

”میں نے معلومات حاصل کی تھیں۔“ اور میں خاموش ہو گیا۔ وہ کافی دیر میرے پاس بیٹھی رہی اور پھر وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی اور میرے ذہن میں پھل چمک گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے اور اب وہ میرے اوپر طنز کرنے کے لیے آئی تھی۔
لیکن دوسرے روز وہ پھر آ گئی۔ پھل اور پھول لائی تھی۔ اس روز وہ پہلے سے بھی زیادہ دیر میرے پاس بیٹھی رہی۔ اس نے اپنے نرم و نازک ہاتھ سے میری پیشانی بھی دبائی تھی، بیس دن تک میں اسپتال میں رہا اور وہ روز آتی رہی۔ اب اس کے ہونٹ مسکرا نے لگے تھے۔ آنکھیں محبت برسانے لگی تھیں اور میں بوکھلاہٹ میں مبتلا ہو گیا تھا۔
پھر جب میں اسپتال سے ڈسچارج ہوا۔ اس دن وہ

میرے ساتھ میرے گھر تک گئی۔ میرے حواس بحال نہ تھے۔ میری سیکریٹری بھی میرے ساتھ تھی، گھر کے دروازے پر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں ایسا پریشان تھا کہ اس سے گھر میں آنے کے لیے بھی نہ کہہ سکا اور وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ تیسرے روز سے میں نے پھر باقاعدہ اپنے دفتر جانا شروع کر دیا اور جس روز میں پہلے دن دفتر گیا، اسی دن مجھے اس کا فون ملا۔
”آپ تو آواز بھی نہیں پہچانیں گے۔“ اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”آپ شانہ خاتون ہیں۔“
”جی ہاں۔ بڑے بے مروت ہیں آپ۔ تین دن گزر گئے، خبر بھی نہیں لی۔ آج میں آپ کے آفس آر ہی ہوں۔“
”تشریف لائیے۔“ میں نے کہا اور اسی دن دوپہر کو وہ میرے آفس پہنچ گئی۔
”یا اللہ! یہ کیا چاہتی ہے۔ کیا سلسلہ ہے؟“ میں پریشانی سے سوچ رہا تھا۔
”بس دل آپ کی طرف کھینچتا ہے شاہد صاحب! آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی۔“
”ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“

”میں بہت غمزدہ ہوں، شاہد صاحب! لوگ میرے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اڑاتے ہیں۔ میرا مرجانے کو دل چاہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، کیا نہ کروں۔ پولیس والے الگ پریشان کر رہے ہیں۔ مجھ غم کی باری پر میرے شوہر کے قتل کا الزام لگا رہے ہیں حالانکہ قاتل پکڑا گیا ہے۔ یعنی گواہ موجود ہیں لیکن وہ مجھ سے اس کا تعلق پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“
”جی۔“ میں نے کہا۔
”لیکن مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔ میں بے گناہ ہوں، دیکھتی ہوں وہ مجھے کب تک پریشان کریں گے۔ ہاں، مجھے ایک ہمدرد کی ضرورت ہے۔ ایک ساتھی کی تلاش ہے، لیکن کون میرا ساتھی بننا پسند کرے گا؟“ وہ گردن جھکا کر سسکیاں لینے لگی اور پھر اس نے اچانک اٹھ کر میرے سینے پر سر رکھ دیا۔

”مجھے سہارا دیجیے شاہد جمیل صاحب! مجھے سہارا دیجیے ورنہ یہ ظالم دنیا مجھ سے میری زندگی چھین لے گی۔“
اور میرا دل چاہا کہ سچ سچ اسے سہارا دے دوں لیکن مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے وہ اخبار ناچنے نظر آئے جن میں میری موت کی اطلاع چھپی ہوئی ہوگی۔ چنانچہ میں تھوک نکل کر

”مال میں نے اسے خود سے جدا نہیں کیا۔ وہ کافی دیر آتی رہی۔“
میری طرف سے اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ بہر حال کافی عرصہ بعد وہی رعبی پھر دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی اور میں گم کی سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ کرنا تھا، مجھے کچھ کرنا تھا۔
پھر جب وہ دوسرے دن آئی تو میں کافی پریشان تھا لیکن اس دن اس کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ لباس تو سادہ تھا لیکن چہرے پر کاری ٹپک رہی تھی، مجھے پریشان دیکھ کر وہ سنجیدہ ہو گئی۔
”کیا بات ہے شاہد صاحب! آپ پریشان ہیں؟“
”کچھ نہیں..... شانہ صاحب! بس وہ.....“

”مجھ سے چھپائیں گے۔“ اس نے آگے بڑھ کر میری گردن میں بائیں ڈال دیں اور میں اس کی بے باکی پر حیران رہ گیا۔ اس نے چہرہ میرے قریب کر کے کہا۔
”بات کیا ہے، آپ کو میری قسم!“
”بس کچھ مالی پریشانی ہیں، کچھ لوگوں کو.....“ اور اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
”اتنی سی بات تھی اور آپ نے مجھ سے کہا نہیں۔“
”مگر شانہ صاحبہ.....“

”کچھ نہیں..... یہ لیجیے۔ یہ آپ کو رکھتا ہوں گے، ورنہ میں زندگی بھر آپ سے نہ ملوں گی۔“ اس نے اپنا پرس خالی کر دیا۔ تقریباً ستر ہزار روپے تھے۔
”اس کے علاوہ جتنے پیسوں کی ضرورت ہوئے لیں۔“
”بس آپ کچھ کہیں گے نہیں ورنہ میں.....“
”شکر یہ شانہ صاحب! آپ نے میرے اوپر جوا احسان کیا ہے اسے کبھی نہ بھولوں گا۔“ میں نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کے لیے زندگی حاضر ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے اس کی خاطر مدارات کی اور جب وہ چلی گئی تو میں نے دل کھول کر قہقہہ لگایا۔
دوسرے دن تقریباً بارہ بجے وہ آئی۔ میرے دفتر میں میں خوبصورت بنے کھیل رہے تھے۔
”ارے یہ کس کے بچے ہیں؟“ وہ چونک کر بولی۔
”اوہ..... شانہ صاحبہ۔ میری بیوی میکے سے واپس آ گئی ہے۔ آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ آئیے کئی دن۔“
”میں بہت پیاری لڑکی ہے، آپ اس سے مل کر خوش ہوں گی۔“
”تنت..... نت..... تو یہ آپ کے بچے ہیں؟“
”ہاں..... چلو..... گلو بیٹا..... آئی کو سلام کرو۔“ میں نے ایک بچے سے کہا اور بچے نے سیلیوٹ مار دیا۔ اس کا رنگ

اڑا ہوا تھا۔ آنکھوں میں عجیب سی ایرانی سمٹ آئی تھی، پھر اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔
”آپ سے معذرت کرنے آئی تھی، شاہد جمیل صاحب۔ کچھ ضروری کام ہیں اس لیے آج نہ رک سکوں گی، خدا حافظ!“

”خدا حافظ.....“ میں نے زور سے کہا اور وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔ میں اور میری سیکریٹری پیٹ پکڑ کر ہنس رہے تھے۔
”بس اب تم اپنے بھائی کے بچوں کو واپس پہنچا دو ورنہ یہ پورے دفتر کا ستیاناس کر دیں گے۔“ میں نے سیکریٹری سے کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔

میں زوار پاشا کے پاس موجود تھا۔ ایک طرف میری سیکریٹری بھی موجود تھی۔ زوار میرا بیان لینے کے لیے مضطرب تھا۔
”کیسے ہو شاہد جمیل؟“
”آپ کی دعائیں ہیں زوار صاحب! کیا کرکٹر.....؟“
”ہاں..... وہ مارا گیا..... اس کے قاتل کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

”کیا اس کا تعلق شانہ خان سے ظاہر ہوا؟“
”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا..... وہ دور دراز کے ایک دیہات سے آیا ہوا تھا اور ایک خطرناک غنڈا تھا، تین بار کا سزا یافتہ..... کل ہی یہاں پہنچا تھا۔“
”اس نے کیا بیان دیا.....؟“ میں نے پوچھا۔
”کچھ نہیں موقع پر ہی پکڑا گیا ہے، کہہ رہا تھا، اس آدمی نے اس سے ہاتھ پائی کی تھی جبکہ اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔“
”اوہ..... زوار صاحب..... میں نے شانہ کو اسے متوجہ کرتے دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔“
”تم کسی کی مسکراہٹ پر پابندی تو نہیں لگا سکتے۔“
”مگر وہ.....“

”بے کار ہے۔ تمام کوششیں کر لی گئی ہیں۔ بہر حال میں نے سوچا کہ تم کوئی کام کی بات بتا سکو..... ویسے شانہ خان نے تمہارا ذکر بہت اچھے انداز میں کیا ہے۔ وہ بہت غمزدہ ہے لیکن اس نے تمہاری خیریت بھی پوچھی ہے۔ تم نے پہلے بھی اس کے شوہر کی مدد کی تھی۔“
میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ ”بے شک وہ ایک چالاک مجرم ہے اور یہ کیس بھی میرے ناکام کیسوں میں سے ایک ہے۔“ میں نے سوچا۔ میرے بازو کی ہڈی میں فریکچر تھا اور بھی کئی جگہ چوٹیں آئی تھیں۔ زوار پاشا تو چلا گیا..... اب مزید کہنے کو کچھ نہ رہا تھا البتہ میری سیکریٹری روز آتی ہے۔

کشکول

انوار سدیقی

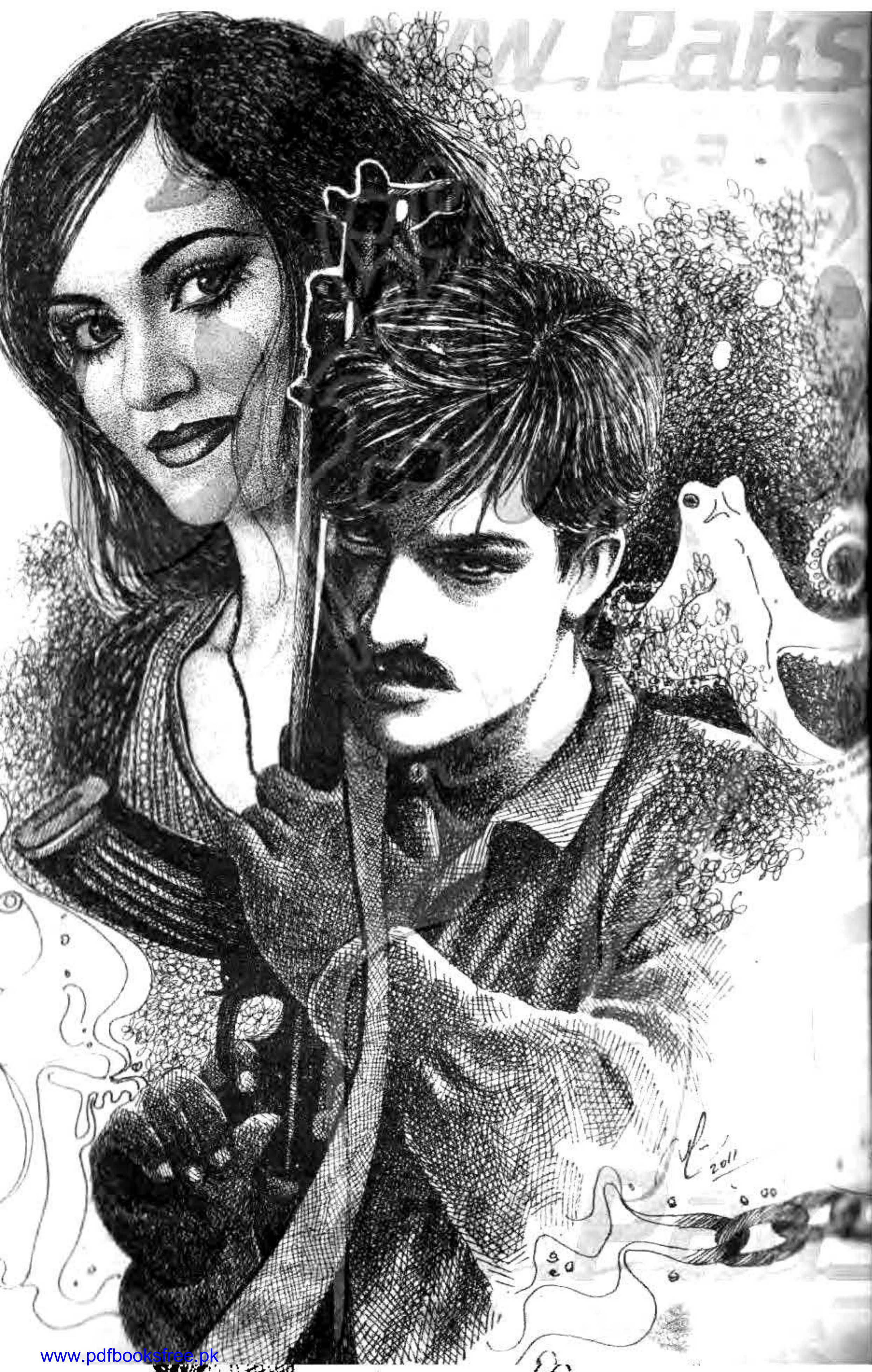
انگلیز طویل قریب



زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش رہا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبیہی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ افسانہ کا خلاصہ

محبت کی یہ داستان نوشہرہ کے لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا انا پرست باپ سردار سرفراز خان طبقاتی فرق کی وجہ سے اپنے بیٹے کی محبت کا مخالف ہے۔ لیاقت اپنی چاہت، فرہم سے شادی کر کے کراچی آ جاتا ہے۔ باپ مخالف مگر اس کی ہمدردی۔ یہ جوڑا کراچی کی ایک مٹی آبادی میں گل خان اور اس کی بیوی زینہ کے ساتھ مشترکہ طور پر کرائے کے مکان میں قیام کرتا ہے، مکان سے متصل قبرستان میں فرہم ایک ہندو عامل پر تاب گھوش کو برہنہ حالت میں پر اسرار عمل و رقص کرتے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہے اسی دوران لیاقت حسین کو ایک قبر سے نکل گیا ہوا نیو مٹا ہے وہ اللہ کا نام لے کر اس عمل کو ختم کر دیتا ہے۔ لیاقت ملازمت کے لیے پریشان تھا کہ راہ میں ایک جلتے مکان سے جان پر گیل کر ایک عورت کو نکال لانے پر اس کے بیٹے کے ذریعے اسے سیٹھ عثمان کے ہاں ملازمت مل جاتی ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی سزا جیلر بیگم بہت سنجیدہ ہوئے ہمدرد انسان اور کامیاب بزنس مین ہیں جبکہ فتح حامد بہ ظاہر



ان کا رفتی مکرور حقیقت حریف سے اور اپنے دست راست افضل خان کے ذریعے اپنے مخالفین کو نقصان پہنچانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ دوسری جانب لیاقت حسین جسے ایک نابینا بزرگ کی جانب سے ایک ماورائی قوت یعنی ہزاروں مسر آگیا ہے جو مشکل وقت میں اس کے کام آتا ہے لیکن لیاقت حسین کو اس کے متعلق کوئی اور اک نہیں ہے اسی پر اسرار قوت کے باعث وہ ہر بار شیخ حامد کے منصوبوں کو ناکام بنا دیتا ہے۔ میڈم رونی ایک دولت مند بیوہ ہے جو اپنے شوہر کی حادثاتی موت کے بعد بڑے اور ساجی مصروفیات میں شامل ہوئی ہے اور شوہر کی موت کا انتقام لینا چاہتی ہے اور اسی سلسلے میں شیخ حامد کے دست راست افضل خان سے راہ رسم بڑھاتی ہے اس کے علاوہ شیخ حامد جو کہ مالیا کا سرغنہ ہے اور کوڈرڈ بلیک ٹائیکر کے تحت کئی خفیہ سرگرمیوں میں ملوث ہے، اس کے آفس کی ایک دور شہنم بھی بگ باس کے خلاف میڈم جیسے ہی مخالف جذبات رکھتی ہے اور اپنی ماں کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ لیاقت حسین کے علاوہ سینہ عثمان کا ایک پولیس آفیسر دوست ڈی ایس پی سراج بھی اس کا مددگار ہے جو کہ ایک ایماندار افسر ہے اور افسر اعلیٰ عظیم احمد کا قابل اعتماد ہے۔ شیخ حامد میڈم کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے افضل خان کو استعمال کرتا ہے اور شراب کے نشے میں شہنم بے ہوش کی حالت میں میڈم کی قابل اعتراض تصاویر حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن شہنم وقت پر ایک پر اسرار کال کے سبب وہ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ متعدد مواقع پر لیاقت حسین شیخ حامد کے آڑے آتا رہا۔ لہذا وہ لیاقت حسین کا دشمن بن گیا اور اسے مجبور کرنے کے لیے فرحین کو اغوا کر لیتا ہے لیکن یہاں بھی لیاقت حسین اپنے ہزاروں کے ذریعے کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ ناکامی کے بعد بگ باس شیخ حامد افضل خان کو سخت عتاب کا نشانہ بناتا ہے۔ دوسری جانب شہنم میڈم رونی سے ملتی ہے اور شرک مقصد کے لیے تعاون کی درخواست کرتی ہے۔ اسی دوران اعلیٰ افسر عظیم احمد ریٹائر ہو جاتا ہے اور آغا منظور اس کی جگہ لیتا ہے جو کہ ایک کرپٹ افسر ہے لیکن میڈم رونی کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ردوبدل کے نتیجے میں نیڈی ایس پی لودھی تعینات ہوتا ہے جبکہ ایس پی کے مہدے پر اور کنزیب جو ان کرتا ہے جو کہ ایک ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ سراج حکمت عملی کے تحت در پردہ شیخ حامد سے تعلقات استوار رکھتا ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا کی کال سراج کو موصول ہوتی ہے جس میں وہ اپنی خود کشی کی اطلاع دیتی ہے اور اپنی ایک خفیہ تحریر کے متعلق بتاتی ہے جو اس نے سراج کے نام لکھی ہے جس میں کچھ افکاشات کیے گئے ہیں۔ سراج پریشان ہو جاتا ہے کہ موبائل پر اس کے فہرذ کچھ کرکٹ حامد اس سے برکت ہو جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا، حامد نے سراج کو حوہ چھکانے کے لیے اس کی بیوی صبا کو اغوا کر لیا لیکن اس بار پھر لیاقت حسین کے ہزاروں نے اس کو شش کو ناکام بنا دیا۔ صبا شہنم کی موت کی تحقیقات کے لیے اور بگ باس سے تفتیش کرتا ہے شیخ حامد انسپٹر لودھی کے ذریعے جو اس کا گمشدہ ہے منصوبہ بندی کرتا ہے۔ سینہ عثمان لیاقت حسین کو اپنے یہاں ہی انگلی میں رہائش دے دیتا ہے جبکہ فرحین بھی اپنے علاقے کا ایک چکر لگا کر آتی ہے اور وہاں کا احوال لیاقت حسین کو بتاتی ہے۔ دوران تفتیش انسپٹر دانش سراج کو ایک اہم فائل کے متعلق بتاتا ہے، دوسری جانب شیخ حامد سخت مشتعل ہو کر انسپٹر لودھی کی ملی بھگت سے بلیک ٹائیکر کے ذریعے تھانے پر حملہ کر کے انسپٹر دانش کو قتل کر دیتا ہے اور تھانے کا تمام ریکارڈ جلا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔ جبکہ افضل خان اسپتال سے فارغ ہو کر بے یار و مددگار مایوسی کے عالم میں خود کشی کے بارے میں سوچتا ہے کہ اسے شہنم اپنے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ لے جاتی ہے۔ شہنم بگ باس کے زیر اثر اسی کی ہدایت پر افضل خان کو اپنے فلیٹ میں لاتی تھی اور اس کا مقصد آخری چال کے طور پر شیخ حامد کے مخالفین کو استعمال کرتا تھا۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو اغوا کر لیا جاتا ہے جہاں ہزاروں بچ کر اسے آزاد کر لیتا ہے۔ اور بگ باس سراج سے مل کر باہمی اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ شیخ حامد کے گھر پر حملہ ہوتا ہے اور وہ چار بھائی باہر ہو کر انسپٹر لودھی سے باز پرس کرتا ہے اور ایک سے حریف رستم علی آغا خانی کا کردار سامنے آتا ہے۔ مذکورہ حملہ بین الاقوامی ایجنٹ رکھنے والی سیون اسٹار سسٹم نے اپنے ایجنٹ ہاشم اینڈ پینی اور مقامی گینگسٹر جہانگیر بٹ عرف جگا کی مدد سے کیا تھا۔ شیخ حامد اپنی سکرٹری کنول سے خفیہ شادی کا فیصلہ کرتا ہے۔ ہاشم بھی بگ باس سے ذاتی خاصیت رکھتا ہے اور اسی سلسلے میں جگا سے ملتا ہے جبکہ شہنم افضل خان کو بگ باس کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اس کے دشمن رستم علی کے خلاف کارروائی پر آمادہ کرتی ہے اور بگ باس کے مخصوص طریقہ کار کے مطابق رستم علی کی اپنی بیوی کے ساتھ نازیبا تصاویر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اس کے مستقبل کا فیصلہ ابھی نہیں کیا گیا۔ ایس پی اور کنزیب نے لودھی کو تھانے پر حملے کی پاداش میں معطل کر دیا۔ سیون اسٹار کے ایجنٹ ہاشم نے ڈوماکے ذریعے بگ باس کے سب سے اہم مہرے بلیک ٹائیکر کو ختم کر لیا تو اس نے شیخ حامد کو ایک بڑا دھچکا لگا۔ سراج نے عثمان صاحب سے کچھ مہرے کے لیے لیاقت حسین کی خدمات حاصل کیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے گرو ادا علی سے ملاقات کرتا ہے جو کہ ایک سابق پولیس آفیسر اور تاحال ایک بہت اثر رسوخ کا حامل ہے اور جہانگیر بٹ کی ملکی تربیت اسی کے ذریعے ہوئی ہے۔ جگا اس ملاقات کے بعد جب اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو ایک شخص کو دیکھ کر چونک گیا جس سے ناکرے کے نتیجے میں چند افکاشات سامنے آئے۔

*** اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے ***

”اس وقت کہاں جا رہے ہو استاد۔ ابھی تو تم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا؟“

”میرا ذکر زبان پر مست لانا۔“ لودھ نے سرسراتے لہجے میں تحکمانہ انداز اختیار کیا تو جگا کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ کسی ایسی طلسماتی سچویشن سے پہلے بھی دو چار نہیں ہوا تھا۔ بدروحوں اور جن بھوتوں کے بارے میں اس نے صرت پر اسرار کہانیاں سنی یا پڑھی تھیں لیکن اس وقت وہ سچ سچ کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے پٹی پٹی نظروں سے

لودھ کو دیکھا جو اسے نظر آ رہا تھا لیکن شاید دروازے پر موجود شخص اسے نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ اسی شش وچ کی کیفیت میں مبتلا تھا جب لودھ نے اسے یہ دستور سیاٹ آواز میں مخاطب کیا۔ ”اپنے ساتھی سے کہو کہ تم اس وقت کسی اہم کام سے تنہا نہیں جا رہے ہو۔ یہ تاکید بھی کرو کہ تمہارے سارے آدمی بھی اس جگہ سے ایک گھنٹے کے اندر اندر جدھر سینگ سائیں نو دو گیارہ ہو جائیں ورنہ وہ بھی لیٹے میں آجائیں گے۔“

کشکول

کا داہن مفلوج ہو رہا تھا، اس کی چھٹی حس بھی کام میں تھی۔ دماغ میں صرف ایک جملہ صدائے بازگشت گونج رہا تھا۔ ”جو کچھ کہا جا رہا ہے اس پر عمل کرنے میں کام لو۔ ہوتا ہمیشہ وہی ہے جو اوپر والے کو منظور آگئے۔“ تن بہ تقدیر خود کو حالات کے حوالے کرنے کی لہجہ لہجہ، وہ خائف نہیں تھا لیکن ناپیدہ اور پر اسرار قوتوں سے گھرا ہوا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ لودھ کے بارے میں اس نے فوری طور پر ایک گھنٹے کے اندر وہ جگہ عالی کرنے کی تاکید کی پھر..... اپنے ساتھی کی تمام باز پرس کو دلا ہوا لودھ کے ساتھ قدم ملاتا۔ مکان سے باہر آ گیا۔

”استاد، اس وقت کہاں جا رہے ہو؟“ باہر موجود گارڈ نے بھی اسے تعجب سے دیکھا۔ ”ہم نے تمہارے ڈرائیور کو دہانے گاڑی لانے کو بولا تھا، ابھی تو.....“

”ایک ضروری اطلاع کے پیش نظر فوری جانا پڑ رہا ہے۔“ جگا نے گارڈ کو بھی ٹالتے ہوئے کہا۔ ”میں کوئی ٹیکسی پکڑوں گا۔“

عمارت سے نکل کر وہ سڑک پر آیا تو ایک خالی ٹیکسی بھی نظر آئی جن کے ڈرائیور نے لودھ کو دیکھا تو اطمینان کا سانس لیتا ہوا باہر آ گیا۔ ”مولا کا کرم ہے جو تم آگئے۔“ ڈرائیور نے لودھ کو مخاطب کیا۔ ”میں سمجھا تھا کہ آج پھر کوئی چوٹ دے گا۔ پہلے بھی ایک دو موقع پر سواری سامنے کے دروازے سے گئی اور پچھلے راستے سے پھوٹ گئی۔ میں ناپتا رہ گیا۔“

جگا پر پھر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ لودھ جسے دگا کے آدمی بھی نہیں دیکھ سکے تھے، ٹیکسی ڈرائیور کو کس طرح نظر آ گیا؟ کیا وہ بھی اسی قبیلے کا پر اسرار فرد تھا؟

”فکر مت کرو۔“ لودھ نے مسکرا کر کہا پھر جگا کے ماتھے پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں اجرت کے ماتھے انعام بھی ملے گا۔“

”آپ کو میرا بات برا لگا ہو تو معاف کر دینا صاحب۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھالتے ہوئے لہجہ سے کہا۔ ”جو مسافر گولی دے کر نکل جائے، میں اس کو بھی دل سے معاف کر دیتا ہوں۔“

ٹیکسی چل پڑی، جگا کا ذہن یہ دستور سننا تار ہا، اس وقت وہ جن حالات سے دوچار تھا وہ طلسم ہوشربا کی کہانیوں سے زیادہ ناقابل فہم تھے۔ اس کی نظریں بار بار لودھ کی طرف اٹھ رہی تھیں جو بڑا پرسکون نظر آ رہا تھا۔ جگا کے ذہن میں بے شمار سوالات گھٹن گھٹن ہورہے تھے لیکن کوشش کے باوجود وہ لودھ سے ان سوالوں کے بارے میں کوئی استفسار نہیں

کر سکا۔ بیس منٹ بعد جگا کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا، لودھ نے ٹیکسی کو سروس روڈ کی دوسری جانب اس سڑک پر رکنے کو کہا جہاں سروس روڈ عبور کر کے وہ بنگلا تھا جہاں جگا کو دوپہر کے کھانے کے بعد آنا تھا۔ لودھ نے ٹیکسی سے نیچے اتر کر ایک بڑا نوٹ ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھا۔ کسی رقم کی واپسی کا انتظار کیے بغیر جگا کا ہاتھ تمام کر سروس روڈ پر آ گیا، جگا کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ قدم ملا کر بڑھتا رہا۔ بنگلے سے کچھ دور رک کر لودھ نے جگا کو پھر خوابیدہ انداز میں مخاطب کیا۔

”جو کچھ تم نے دیکھا یا سنا اس کے بارے میں اپنی زبان بندی رکھنا۔ کھوج لگانے کی کوشش کی تو خود بھی اس طرح کم ہو جاؤ گے کہ اپنا سراغ بھی نہ پاسکو گے۔“

”کیا میں اپنے محسن کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟“ جگا نے ہمت کر کے سوال کیا۔ اس سے زیادہ کچھ بوجھنے کی ہمت بھی نہ کر سکا۔

”صرف ایک نام ذہن میں محفوظ کر لو جہانگیر بٹ۔“ لودھ نے جگا کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر ٹھوس آواز میں کہا۔ ”ڈیپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج، اگر اس کی طرف سے کبھی کوئی حکم ملے تو انکار کرنے کی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا۔ میں کون ہوں؟ یہ بات بھول جاؤ۔ میری ہدایت کا خیال رکھنا، جو کچھ ہو گیا اسے بھی زبان پر نہ لانا ورنہ بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

جگا ڈی ایس پی سراج کا نام سن کر چونکا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ لودھ سے کچھ معلوم کرنا وہ کسی چھلاوے کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جگا کا ذہن چکر اکر رہ گیا۔ وہ گینگ لیڈر تھا، موت سے آنکھیں ملا کر مسکرانے کا عادی تھا لیکن غیر مرئی اور جن بھوت کی قوتوں سے لڑنا کسی کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ جگا کے ذہن میں لودھ کے لیے کسی مافوق الفطرت ہستی کا ابھرنے والا تصور بھی اتنا اثر انگیز تھا کہ وہ سرسای کیفیت کا شکار ہو گیا۔ اس کے مساموں سے سینے چھوٹنے لگے، جسم اس طرح کپکپانے لگا جیسے سردی لگ کر بخار آ رہا ہو۔ ذہن پر اچانک طاری ہونے والی خوف و دہشت کی علامتیں بتدریج بڑھنے لگیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا پورا وجود بخار کی شدت سے پھنکا جا رہا ہو۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے مہیب اندھیرے رقص کرنے لگے۔ قدموں پر کھڑا رہتا دھواں ہو رہا تھا۔ اسی کیفیت میں لڑکھڑاتا ہوا وہ دس بارہ قدم آگے بڑھا تو اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ اس کا مطلقہ ہوا نظروں کے سامنے تھا۔ گیٹ پر موجود گارڈ نے دگا کو دیکھا

رائل سنبھال ہوا چگا کی طرف لپکا لیکن چگا کی سرسای کیفیتوں نے اس کا توازن بگاڑ دیا۔ سنبھلتے سنبھلتے بھی وہ ڈمگتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا، نظروں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا اور اس کا ذہن دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

وہ کتنی دیر بے ہوشی کی کیفیت سے دو چار رہا، چگا کو یاد نہیں تھا۔ گزرے وقت کا ایک دھندلا سا احساس اسے اس وقت ہوا جب دوبارہ اس کے پوچھل پوچھوں میں زندگی کی رمتی پیدا ہوئی۔ اس کی نظریں گھڑی پر پڑیں، کامل پانچ گھنٹے بعد اس کی گھنٹن کو ذرا سہارا ملا تھا پھر..... اس نے دوبارہ آنکھ بند کرنا چاہیں تو ایک مانوس آواز نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر داہنی جانب دیکھا، اس کا خاص ماتحت اس کے سامنے گھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔

”جسہیں اچانک یہ کیا ہو گیا استاد.....؟ تم میں خبر کیے بغیر ادھر کب اور کس طرح آ گئے؟ کسی کو خبر بھی نہیں دی۔“

”میرے سب..... سب ساتھی تو..... خیریت سے ہیں؟“ جگانے ڈوبے ذہن کی جگانے کی خاطر رک رک کر سوال کیا۔

”اے کا شکر ہے استاد تمہارے کہنے پر اگر ہم نے عین وقت پر ٹھکانا خالی کرنے میں ذرا دیر کی ہوتی تو سب مارے جاتے۔“

”وہ..... وہ میں نہیں..... وہ..... وہ.....“ جگانے تھم تھم کر کچھ کہنا چاہا لیکن پراسرار نوادار کے تنبیہی جملے کانوں میں گونجے تو اس نے جلدی سے آنکھیں موند کر خاموشی اختیار کر لی۔

❦❦❦

پوش علاقے کے اس نئے بلاک میں چار سو اور چھ سو گز کے پلاٹس کو دو حصوں میں منقسم کر کے جدید طرز کے بڑے خوبصورت اور دیدہ زیب ون یونٹ بنائے گئے تھے، نچلے حصے میں کچن، ڈرائنگ، ڈائننگ کے علاوہ ایک بیڈروم اور مختصر سالانہ ڈنچ بھی تھا۔ اوپری حصے میں دو کشادہ روم اور ایک اسٹڈی کے علاوہ خوبصورت ٹیرس بھی نکالا گیا تھا جہاں شام کے وقت کھلی فضا میں بیٹھ کر بیرونی ماحول سے لطف اندوز ہوا جاسکتا تھا، پارک کے دنوں میں بھی یہ ٹیرس اپنے مکینوں کے لیے دل بستگی کا موقع فراہم کرتا تھا۔ اسی علاقے میں لب سڑک سے ایک بلاک چھوڑ کر وہ شاندار بنگلا بھی تھا جس میں کنول اور اس کی ماں ایک روز قبل شفٹ ہوئے تھے۔ کنول اس نئی رہائش گاہ میں آنے کے بعد بہت خوش تھی جسے اسی کے نام سے خریدایا گیا تھا۔ اسے وہاں کوئی اہتمام نہیں

کرنا پڑا۔ ضرورت کی ہر شے وہاں پہلے سے موجود تھی، خوبصورت فرنیچر سے آراستہ بیڈروم اور کچن کے علاوہ بیرو حصے میں ایک مختصر سالانہ بھی تھا جو ڈرائنگ روم کے پردے ہٹانے کے بعد نظر آسکتا تھا۔ ٹیرس پر بیٹھنے کے لیے بھی اسی اور قیمتی ایزی چیئر موجود تھیں، آسائش و آرام کا ہر وہ سامان جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا وہاں پہلے سے موجود تھا۔ گیٹ پر باوردی گارڈ بھی تعینات تھا، ایک نئی کار بھی موجود تھی۔

کنول کسی شوخ تیلی کی طرح پورے گھر کے ایک ایک گوشے میں اڑتی پھر رہی تھی، کبھی وہ بیڈروم کی سجاوٹ دیکھتی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے جاگتے میں کوئی حسین خواب دیکھ رہی ہے۔ ٹیرس پر جاتی تو ساحل سمندر کی سمت سے چلنے والی، بھگی ہواؤں کی مہک اس کے ذہن میں نئی تازگی پیدا کر دیتی، جدید سامان سے لیس کچن میں جاتی تو ایسا لگتا جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ مختصر سالانہ پر جاتی تو مہکتے پھولوں کی خوشبو اس کا استقبال کرتی بیرونی دروازے پر آ کر وہ ڈیوٹی گارڈ کو چوری چوری دیکھتی تو اسے احساس ہوتا کہ وہ تحفظ اسے مل گیا ہے جس کے نہ ہونے سے اس کے باپ کو بھرے بازار میں بیدردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ پارکنگ میں موجود گہرے مردن کلر کی گاڑی دیکھتی تو اسے اپنے اچانک قد آور ہو جانے کا خیال بھی آتا۔ صرف ایک دن کے الٹ پھیر میں جیسے اس کی کایا ہی پلٹ کر رہ گئی تھی۔

ایک گھنٹے سے وہ اپنے نئے آشیانے کے ایک ایک حصے میں چکراتی پھر رہی تھی۔ جب تھک ہار کر ڈرائنگ روم میں آ کر ذرا سنانے کے لیے بیٹھی تو اس کی نظر اپنی ماں پر پڑی جو قریب ہی کھلے شیشے کے دوسری جانب بنے لان کے ایک پودے کو ٹھنگی باندھے دیکھنے میں مصروف تھی۔ وقت نے اس کے چہرے کو ضرور کلا دیا تھا لیکن اس کے..... نفوش اب بھی اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ حسن کی وہ متحرک صورت بھی بے حد حسین اور پرکشش بھی رہی ہوگی۔ کنول ماں کے چہرے پر سنی سنجیدگی دیکھ کر چونکی، ایک لمحے تک دور بیٹھی اس کی نظروں کا تعاقب کرتی رہی پھر اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔ ماں نے اس کی طرف توجہ دی تو وہ اس کی گود میں سر رکھ کر بڑے لاڈ سے صوفے پر دراز ہو گئی، ماں کی نظروں میں جماعتکتے ہوئے پوچھا۔

”کیا بات ہے ماں۔ کیا تمہیں اپنا یہ چھوٹا سا پر سکون ٹیرس پسند نہیں آیا؟“

کشکول

”ہاں زیادہ تر کسی کے ٹیرس پر ہی کرتی ہیں۔“ وہ میں کہہ گئی پھر کنول کی دلجوئی کی خاطر بات بدل کر ”تمہاری خوشی میں میری خوشی بھی ہے لیکن کچھ باتیں ہیں جو آج بھی مجھے پریشان کر دیتی ہیں۔ عورت کے سر اُلٹا ہوا سا نہایت نہ ہوتو.....“

”پلیز ماں.....“ کنول نے چل کر کہا۔ ”میں نے ہمیں محفوظ رہنے کی خاطر ہی سب کچھ کیا ہے۔“

ماں نے کنول کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”ماں سے کچھ نہیں کہا۔“

”یہاں کی ہر چیز بلا شرکت غیرے صرف اور صرف میرے نام ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟“

”وقت بڑا عالم ہوتا ہے کنول۔ حالات جب طوفان کا روپ اختیار کرتے ہیں تو عورت کی کمزوری اس کے منہ اور تھپڑوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔“

”جسہیں کس بات کا خوف ہے.....؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”اپنے اس ماضی کا جو ایک مرد کے چلے جانے سے لمس و خاشاک کی طرح تباہ ہو گیا تھا۔“

”ان ہی حالات کو دوبارہ سنوارنے اور بنانے کی خاطر میں نے بھی حالات سے مجبوراً سمجھوتا کیا ہے۔“

”کنول.....“ ماں نے اسے تجربے کار نظروں سے دیکھا۔ ”یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ کیا تجھے یہ رشتہ پسند نہیں ہے؟“

”تم نے بھی اسے صرف میری خاطر منظور کیا ہوگا؟“

اس نے ماں کو دیکھتے ہوئے عجیب لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے بھی اپنی ملازمت عزیز تھی، دولت اور مرد کے آگے کوئی کمزور عورت اکیلے کچھ نہیں کر سکتی۔ میں خوشی سے ہاں نہ کرتی تو حالات میری نظریں جھکا دیتے۔ بہت سے خطروں کو بہت قریب سے دیکھنے کے بعد ہی میں نے فیصلہ کیا تھا۔ نہ کرتی تو بھی وہی ہوتا جواب ہوگا۔“ وہ نظریں جھکا کر روانی میں بولتی رہی۔ ”فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت مجھے بغیر قیمت کے راند دیا جاتا۔ میری زندگی پر بد چلن اور آوارہ ہونے کا ٹھپا لگ جاتا۔ اب ایک کاغذ کے ٹکڑے پر دو گواہوں کی موجودگی میں جو کچھ ہوگا اس پر قانون یا مذہب کے ٹھیکے دار اٹھائیں نہیں اٹھا سکیں گے۔ حالات سازگار نہ رہے تو تمہاری طرح مجھے بھی صرف بیوگی کا روگ لگ جائے گا۔“

”کنول.....“ ماں نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

”یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟“

”دعویٰ جو ہے۔“ اس نے نظریں اٹھا کر ماں کے

چہرے پر چلتے نظرات کو دیکھا پھر زبردستی مسکرا کر بولی۔ ”عمروں کے فرق سے کچھ نہیں ہوتا ماں۔ عزت کا بھرم قائم رہے یہی سب سے بڑی بات ہے۔“

”تو چاہے تو اب بھی انکار کر سکتی ہے۔“ ماں نے اس کی باتوں کی گہرائی سمجھتے ہوئے بھی اس کی دل جوئی کی خاطر ٹھوس لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ہم جس طرح بھی ہوا بری بھلی گزار لیں گے۔ پہلے بھی حالات کی گردش برداشت کر رہے تھے۔ اب بھی کسی نہ کسی طور زندگی گزر جائے گی لیکن تیری خوشیاں مجھے زیادہ عزیز ہیں۔“

”اسی طرح تمہارا سایہ بھی میرے لیے سب سے بڑی نعمت ہے، میں اس نعمت سے محروم نہیں ہونا چاہتی۔“

”کیا مطلب.....؟“ ماں نے کنول کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”جان بوجھ کر انجان نہ بنو ماں.....“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر گھڑی ہو گئی۔ دل پر جبر کر کے جواب دیا۔ ”کل کسی نے میری خاطر مجھے باپ کے سائے سے محروم کر دیا تھا۔ اب بھی کوئی میری خاطر مجھے تمہارے سائے سے محروم کر دے گا۔ تاریخ بھی اسی طرح اپنے آپ کو دہرائی رہی ہے۔“

”میں سمجھی نہیں..... کیا میری بیوگی کے پیچھے بھی.....“

”پلیز ماں.....“ اس نے تڑپ کر ماں کو تکی نظروں سے دیکھا۔ ”اپنی زبان پر قابو رکھو..... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، جو کچھ بیت گیا، جو کچھ ہو رہا ہے دیکھتی جاؤ اور ماں کی زبان سے بیٹی کے حق میں نیک دعائیں کرتی رہو۔ اسی میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔“

ماں جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی جب باہر کنول نے اپنے گیٹ پر ایک سیاہ رنگ کی بڑی گاڑی کورکتے دیکھا، گاڑی کو دیکھ کر دروازے پر تعینات گارڈ بھی انٹینشن پوزیشن میں آ گیا۔ کنول کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، اس نے ماں کو اشارہ کیا تو وہ لپک کر نیچے والے کمرے میں چلی گئی۔ کنول نے دوبارہ گیٹ کی سمت دیکھا، شیخ حامد کو گاڑی سے اتر کر اندر آتا دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنی بیگلی پلکیں خشک کر کے ایک دل آویز جہم اپنے گداز ہونٹوں پر سجایا۔ دل کی دھڑکوں کو سنبھالتی ڈرائنگ سے نکل کر شیخ حامد کے استقبال کی خاطر مرکزی دروازے پر آ گئی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے مسکراتی نظروں سے اس کا استقبال کیا۔

”تمہیں یہ چھوٹا سا گھر پسند آیا.....؟“ شیخ حامد نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”یہ میری توقع سے کہیں زیادہ حسین اور دلفریب ہے۔“ اس نے دل پر جبر کر کے جھوٹ بولا۔

”ہوگا لیکن تم میرے لیے اس سے زیادہ حسین ہو۔“ اس نے کنول کو کمر میں ہاتھ ڈال کر خود سے قریب کر لیا پھر ذرا تکلف سے دبی زبان میں سوال کیا۔

”تمہاری ماں کہاں ہیں.....؟“

”ادھر ہی تھیں۔ آپ کے آنے کی وجہ سے کمرے میں چلی گئیں۔“

شیخ حامد نے جواب میں کنول کا ہاتھ تمام کراہ پر جانے والی بیڑھیوں کا رخ کیا، وہ اس کے ساتھ قدم ملا کر میڑھیوں میں بٹے کرتی ہوئی بلندی کی طرف جانے لگی۔ اوپر ایک بیڈروم میں پہنچ کر شیخ حامد نے اسے اپنی آغوش میں سیٹھ لیا۔ کنول کی گہری جھیل نما خوبصورت آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر اس کے ہونٹوں کا طویل بوسہ لیتے ہوئے بستر پر نیم دراز ہو گیا۔

کنول اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ وہ شیخ حامد کو بڑی والہانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی جب شیخ حامد نے سرسرا تے لہجے میں سوال کیا۔

”ہمارے درمیان یہ عارضی دوری آج رات ختم ہو جائے گی لیکن..... میری بات یاد رکھنا، ہا قاعدہ نکاح کے بعد بھی تمہیں اور تمہاری ماں کو زبان بند رکھنی پڑے گی، جب تک میں اجازت نہ دوں۔“

”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔“ کنول نے پرامتد لہجے میں جواب دیا۔

”نکاح سے پیشتر میں تم سے پھر کھل کر ایک سوال کرنے آیا ہوں۔ تم اس شادی پر خوش تو ہو؟“

”خوش نہ ہوتی تو اس وقت اس چھت کے نیچے نہ ہوتی۔“

”تمہاری ماں نے کسی مجبوری کا سودا تو نہیں کیا؟“

”آپ کا کیا خیال ہے؟“ اس نے بات ٹالنے کی خاطر شیخ حامد کو غور نظروں سے دیکھا۔

”میں..... میں تمہارے ساتھ کسی مجبوری کا سودا نہیں کرنا چاہتا۔“ جواب کمرے اور بے ہاک انداز میں دیا گیا۔ ”تم میری حیثیت اور شاید میری طاقیت سے بے خبر بھی نہ ہوگی۔ اگر مجھے محض وقت گزارنا ہوتا تو شاید اس وقت تم مجھ سے نظریں ملا کر بات نہ کر رہی ہوتیں۔“

”آپ..... آپ اب بھی ایسی ہی پوزیشن میں ہیں۔“ کنول نے ہونٹ چباتے ہوئے تدریجی سنجیدگی سے جواب دیا پھر نظریں جھکا لیں۔

”تم نے اپنی ماں کے سلسلے میں میری بات کا جواب نہیں دیا؟“

”انہوں نے سب کچھ میری مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی زندگی گزار چکی ہیں اور اب مجھے بھی اپنی زندگی گزارنے کا اختیار ہے۔“ کنول نے کچھ سوچ کر اپنی بات جاری رکھی۔ ”مجھے اپنے ہارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے لیکن..... ایک ہار کسی نے مجھے ماڈل گرل کا پروفیشن اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس میدان میں غیر متوقع کامیابی حاصل کر سکتی ہوں۔“

”پھر..... تم نے اس کی بات ماننے سے گریز کیوں کیا.....؟“ شیخ حامد نے اسے معنی خیز انداز میں سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”اس لیے کہ میں لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بننا چاہتی تھی۔“

”اسی لیے میں نے بھی تم سے کھیلنا مناسب نہیں سمجھا۔“ شیخ حامد نے دوبارہ اسے اپنی آغوش میں سیٹھ لے کر بڑی گرجوٹی سے کہا، کچھ دیر تک دونوں کی بیگی بیگی سانسیں آپس میں گڈمڈ ہوتی رہیں پھر کنول نے کچھ پانی آواز میں کہا۔

”رات آنے میں زیادہ دیر نہیں ہے، اس کے بعد آپ کو مجھ پر ہر طرح کا اختیار ہوگا۔“

”بھینٹیں گس.....“ شیخ حامد نے اسے اپنے گلے میں سے آزاد کرتے ہوئے مسکرا کر دیکھا۔ ”اچھا کیا جو تم نے مجھے بروقت نوک دیا۔“

کچھ دیر بعد وہ کنول کے ساتھ پیچھے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ کنول اس کے کہے بغیر ماں کو سامنے لے آئی، شیخ حامد سنبھل کر بیٹھ گیا، اس نے کنول کی ماں کو ایک نظر پر غور دیکھا پھر رکی طور پر ان سے بھی وہی سوال کیا جو کنول سے کر چکا تھا۔

”میں نے اپنی بیٹی کو آزادی دی تھی تو اس پر مجھے اعتماد بھی تھا۔“ کنول کی ماں نے دل پر پتھر رکھ کر اپنی مرضی کے خلاف کہا۔ ”آپ نے کنول کو اپنا لے کا فیصلہ کیا ہے وہ بھی ہم پر ایک احسان ہی ہے۔“

”آپ شرمندہ کر رہی ہیں۔“ شیخ حامد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب اجازت چاہوں گا۔ رات کو دوبارہ حاضر ہوں گا۔“

کنول اس کو چھوڑنے دروازے تک آئی پھر واپسی پر اس نے ماں کو بتا دیا کہ رات اس کا اور شیخ حامد کا نکاح

ککشکول

ہا ہل سے ہو جائے گا۔ یہ اطلاع دیتے وقت اس کی خوب صورت آنکھوں میں جو حسرت ابھری وہ ایک ماں کی نظروں میں ادھل نہ رہ سکی۔

مہریرے بدن اور درمیانہ قد والا سیاہ فام ہاشم جس کا حسن جنوبی افریقا کے ایک غیر مہذب علاقے سے تھا۔ اس وقت بڑا مہذب اور بردہار نظر آ رہا تھا، وہ اس وقت جس میک اپ میں تھا اس سے یہی گمان ہوتا تھا اس کا تعلق ویسٹ انڈیز کے کسی نوآبادی علاقے سے ہوگا، فریج کٹ ڈاڑھی اور آنکھوں پر قلمی کے اضافے نے اس کی اصلیت کو اس حد تک تبدیل کر دیا تھا کہ وہ میک اپ کرنے کے بعد خود بھی اپنی مہارت پر ششدر رہ گیا۔ حلیہ کی وہ تبدیلی اس کے لیے نامزد پر تھی۔

سیون اسٹار کی طرف سے خطرناک مگر چمکے کا کرپا کرم کرنے کی اجازت ملنے کے بعد وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ انعام لینا اس کی سرشت میں شامل تھا۔ شیخ حامد کے گروں نے جس طرح اسے ایک موٹے پر فریب کر لیا تھا وہ اس کی زندگی کا سب سے خوفناک دن تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ دشمن کے ہاتھوں سے زندہ بچ سکے گا، پھر بھی اس نے است نہیں ہاری تھی۔ اسے یقین تھا کہ موت برحق ہے اور اس کے لیے جو وقت ملے کر دیا جائے وہ اٹھ ہوتا ہے، چنانچہ آخری وقت تک موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا اس کی زندگی کا درس اصول تھا، اسی اصول کے تحت اس نے اپنے انوار کرنے والوں کے ساتھ کوئی جدوجہد نہیں کی تھی، کسی موقع کی تلاش میں وہ ان کے ساتھ خاموشی سے اس جگہ تک جلا گیا تھا جہاں لوچن شہباز گڈس فرانسپورٹ کے ایک مخصوص شخص کی رہان کھلوانے کی خاطر اس پر قہر ڈ ڈگری کا اذیت ناک سپر استعمال کر رہا تھا۔ وہ ہاشم کو دہاں اچانک دیکھ کر بکلا گیا تھا۔ خود ہاشم نے بھی یہی سوچا تھا کہ اس نے وہاں ہا کر کسی غلط فہمی کا ثبوت نہیں دیا تھا لیکن ان حالات میں بھی اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ اس نے ایک ایسا آزمودہ نسخہ استعمال کیا کہ لوچن بھی تھلا کر بہ ظاہر اس کا دشمن نظر آنے لگا۔ دشمن بھی ایک لمحے کو خوش فہمی کا شکار ہو گئے۔ اسی خوش فہمی سے لاکھ افکار لوچن نے، جو مارشل آرٹ کا ماہر تھا بڑی دور اندیشی سے ہادی کا رخ پلٹ دیا تھا۔ ہاشم نے اس موقع پر ملے کر لپکا تھا کہ وہ شیخ حامد کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کی فریب بھی ان ہی بنیادوں پر ہوئی تھی کہ آخری سانس تک دشمن کے سامنے ڈٹے رہو۔ وہ سیون اسٹار کا پابند نہ ہوتا تو وہ اپنی فریب میں کوئی مناسب پلاننگ کر کے اپنے دشمن کو

مار دیتا یا خود مر جاتا لیکن وہ معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا لیکن شیخ حامد کے مکان پر کامیاب حملہ اور اسے پوری طرح ہراساں کرنے کی پلاننگ میں کامیاب ہو جانے کے بعد سیون اسٹار کی طرف سے بھی گرین سگنل مل گیا تھا۔ یہ بھی ہدایت ملی تھی کہ کام اس طرح کیا جائے کہ کوئی رسک نہ ہو مگر حالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا تو ہاشم نے اپنے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کر ڈالی۔

کشمیر فرنیچر کے خفیہ کمرے میں جگہ سے ملاقات کے بعد واپسی کے وقت اسے ایک چہرہ نظر آ گیا جسے وہ پہلے بھی اپنے ہوٹل کے آس پاس منڈلاتا دیکھ چکا تھا۔ فوری طور پر اس وقت ہاشم نے یہی سمجھا تھا کہ شاید اس وقت بھی اس کا تعاقب کیا جا رہا ہوگا۔ اپنے اس شہجے کو دور کرنے کی خاطر اس نے دو روز تک ہوٹل کے کمرے سے باہر نکلنے کی غلطی نہیں کی۔ ڈوما کو سیون اسٹار کا حوالہ دے کر اس نے مشتہ آوی کی گمرانی پر مامور کر دیا تھا۔ پھر جب متعلقہ حکموک آدمی کی طرف سے اس کا شہر یقین میں بدل گیا تو اس کے ذہن میں ایک مصلحت نے سر اُبھارا۔ راستے کی ان چھوٹی موٹی رکالوں کو بھی دور کر دیا جائے جو اس کے، شیخ حامد کے درمیان کوئی دشواری پیدا کر سکتی تھیں۔

اپنے پروگرام کے تحت اس نے ڈوما سے یہی کہا تھا کہ کسی طرح مشتہ شخص کو قابو کر لیا جائے۔ اس طرح وہ اس کی رہان کھلوا کر اور بہت سی کام کی باتیں بھی معلوم کر سکتا تھا مگر..... ڈوما کے مجبوری ظاہر کرنے کے بعد اس نے جلد ہادی میں یہی فیصلہ کیا تھا کہ مطلوبہ شخص کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ یہ حکم اگر وہ اپنی ذاتی حیثیت میں دیتا تو شاید ڈوما اس کی تعمیل میں کسی نہ کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی کرتا چنانچہ کچھ لمحوں کے لیے اس نے مو بائل کا رابطہ منقطع کیا پھر اسے دوبارہ کال کر کے یہی کہا کہ..... ”سیون اسٹار کی طرف سے بھی گرین سگنل ملا ہے کہ کانٹا درمیان سے نکال دیا جائے۔“

ڈوما کو ضروری ہدایت دینے کے بعد ہی اس نے فوری طور پر ہوٹل سے نکلنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ ڈوما نے بھی اسے یہی مشورہ دیا تھا چنانچہ ہاشم نے نہ صرف ہوٹل تبدیل کر دیا بلکہ اپنا حلیہ بھی اس مہارت سے بدلا کہ خود بھی اپنے آپ کو شناخت نہ کر سکا۔

اس وقت وہ کسی ہوٹل کے بجائے ایک پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس کے ایئر کنڈیشنڈ روم میں بیٹھا پیش آنے والے حالات پر غور کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ہا بار ایک خیال

ابھر رہا تھا۔ جتنی جلد ممکن ہو، بڑے مگر مجھ کا کر یا کرم بھی کر دیا جائے۔ سانپ کو آستین میں پالنا اور دودھ پلانا بھی اس کے اصولوں کے خلاف تھا۔ دوسرا ایک خیال یہ بھی کسی خطرے کا احساس دلا رہا تھا کہ اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سیون اسٹار کا مخصوص کوڈ استعمال کرنے میں بھی جلد بازی کا مظاہرہ کر ڈالا تھا۔ اگر وہ خود رابطہ قائم کر کے صورت حال کی وضاحت کر دیتا تو یقین ممکن تھا کہ سیون اسٹار کی جانب سے بھی اس کی تجویز سے اتفاق کیا جاتا لیکن اس نے جلد بازی میں ڈوما کو از خود سیون اسٹار کے ہائی بھر نے کا یقین دلانے کی بھول کی تھی۔ ان حالات میں بھی یہ ضروری تھا کہ وہ مزید وقت ضائع کیے بغیر اپنے دشمن سے اپنا حیا ب کتاب برابر کر لے جس کی اجازت اسے بہر حال مل چکی تھی۔ وہ ان ہی باتوں پر غور کر رہا تھا جب موبائل نے ڈائریٹ کرنا شروع کیا۔ اسکرین پر ڈوما کے نمبر دیکھ کر اس نے موبائل آن کر کے کانوں سے لگا لیا۔

وہ کچھ دیر شش و پنج میں جتلا رہا، ایک ٹاپے کو اس کے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا کہ زندگی بچانے کی خاطر سارے معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر پہلی فلائٹ سے فرار ہو جائے لیکن اس نے اس بزدلانہ خیال کو خود ہی ترک کر دیا۔ وہ جس پیٹے سے منسلک تھا اس میں موت اور زندگی دونوں کا دار و مدار اصول پسندی پر تھا۔ اس نے معاہدے کی خلاف ورزی حالات کے پیش نظر ضروری سمجھی تھی لیکن بہر حال سیون اسٹار سے اجازت نہیں لی تھی۔ اس نے فرار کا ابھرنے والا خیال روکر کے سیون اسٹار سے رابطہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ تین گھنٹیوں کے بعد دوسری جانب سے کال۔ سیو کی گئی۔

کشکول

کہتا لیکن دل میں اسے اس کا احساس ضرور ہوتا۔
وہ سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کر رہی تھی۔ اگر اس نے
افضل خان کے ساتھ مل کر بگ باس کے خلاف کوئی خفیہ
منصوبہ بنانے کی ضرورت پر غور نہ کیا ہوتا تو اور بات تھی لیکن
اب وہ دوسرے زاویے سے تمام پہلوؤں پر غور کر رہی تھی۔
اس پوزیشن میں بھی نہیں تھی کہ اپارٹمنٹ والی آفر کو کسی بہانے
رد کر دیتی۔ بگ باس انکار سننے کا عادی نہیں تھا۔ شبنم کی جو
کمزوری تصویر کی شکل میں اس کی تحویل میں تھی، اس نے شبنم
کو کسی آخری قدم سے بھی روک رکھا تھا۔ اگر وہ کسی موقع سے
فائدہ اٹھا کر بگ باس کو ٹھکانے بھی لگاتی تو تصویریں سامنے
آجانے کی صورت میں پولیس پھانسی کا پھندا اسی کے گلے
میں ڈال دیتی۔ ایک تباہ عورت ہونے کی وجہ سے بھی وہ اتنا
بڑا قدم اٹھانے کا ریسک نہیں لے سکتی تھی۔

جنگلاتوں میں ایک بستیوں جنگ بستیوں کا بے مثال مجموعہ

جون 2012ء
فیضانِ اسلامیہ

مجاہد اعظم

قلب و روح کو گرامینے والی رسولِ حیات، گرنہ پر بھی تو قتل ہو جائے گا

لرزیدہ یورپ

ایک طوفان کی طرح اٹھنے والے لوگوں کی گزشتہ جن کا خوف آج بھی باقی ہے

قاتل حیرو

ان ماسخ ساز قاتل کی حدود آج بھی یورپ میں شہر آکا حال ہے

کھانی مصبت کی

دکھ اور درد کی عبارت، ایک ایسی سچ بیانی جسے آپ بھول نہ سکیں گے

آج ہی خود کی ایک مثال برآمد ہونے کی تلاش

ایک ایسا شمارہ
جسے آپ معذرت نہ کریں
ضروری سمجھیں گے

Designed : Imtiaz

شبیم کی ذاتی معلومات کے مطابق، افضل خان کے اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد اس کے فلیٹ میں کچھ مدت قیام کی اطلاع بھی پولیس کے ریکارڈ پر آ چکی تھی۔ اب بگ باس نے اسے پھر افضل خان کو اپنے ساتھ رکھنے کا حکم دیا تھا جس سے وہ انکار نہیں کر سکتی تھی لیکن یہ ضرور سمجھ رہی تھی کہ بگ باس نے اس کے گرد جو جال بچھایا تھا اس میں وہ پوری طرح پھنس چکی تھی۔ اب اس دلدل سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ افضل خان کو صورت حال سے مکمل طور پر آگاہ کرنے کے بعد مکمل کر یہ بھی ظاہر کر دیتی کہ اس نے اپنی آزادی کے لیے کیا پلان بنایا ہے۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ خود افضل خان کے سینے میں بھی دفن گرم راکھ کے اندر کوئی ایسی چنگاری ضرور دہنی ہوگی جو بھڑک کر شعلہ بننے کا موقع تلاش کر رہی ہوگی۔ ممکن ہے وہ اپنے طور پر غلط اندازہ قائم کر رہی ہو لیکن بہر حال وہ اس اندھے جوئے کو کھیلنے پر مجبور تھی۔ اسی غرض سے اس نے ایک خطرناک رسک لیتے ہوئے اپنے ذاتی منصوبے اور اس کے مکمل پلان کو مختصر آٹاپ کر کے اپنے پرس میں ڈال لیا تھا اور اس وقت اشار ان ہوٹل کی طرف جارہی تھی جہاں بگ باس کی اطلاع کے مطابق افضل خان مقیم تھا۔ اس اطلاع کی فراہمی کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ افضل خان سے مل کر بگ باس کے منصوبوں کے مطابق اپنا کردار ادا کرے۔

”اسٹار ان ہوٹل“ جاتے وقت بھی شبیم کے ذہن میں اس کے ذاتی منصوبے کے مختلف پہلو کھیل رہے تھے۔ تاکا کی صورت میں اس کا حشر اس کی توقع سے کہیں زیادہ بھیانک ثابت ہوتا۔ وہ افضل خان کی جس مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا سوچ رہی تھی۔ افضل خان بھی اسی صورت کو استعمال کر کے بگ باس کی نظروں میں سرخرو ہونے پر غور کر سکتا تھا۔ بہر حال شبیم اس کے لیے بھی پوری طرح آمادہ تھی، وہ جانتی تھی کہ ”بلا سنڈ“ پتوں پر جیت کا انحصار کرنے والے اکثر بازی بری طرح ہار بھی جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں بار بار ”نورسک، نوکیم“ کا فارمولا بھی کسی نیون سائن بورڈ کی طرح جل بھج رہا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں محو تھی جب ایک سنگل پر رکنے کے بعد اس کی نظر ”عقی شیشے“ پر پڑی۔ گہرے سرخ رنگ کی وہ جیب جسے سرسری طور پر پیچھے آتا دیکھ چکی تھی اس بار اس کے ذہن میں خطرے کا سنگل بن کر ابھری۔ بگ باس نے بھی اسٹار ان ہوٹل اور افضل خان سے ملنے کا مشورہ دیتے وقت کہا تھا کہ وہ کسی ممکنہ تعاقب کے خطرے کو نظر انداز نہ کرے۔ کسی اہم

ماتحت کے مارے جانے کے بعد بگ باس بھی خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ ”وہ کون تھا؟“ شبیم کو اس کی خبر نہیں تھی لیکن وہ اس جیب کو پہلے بھی کئی موقعوں پر دیکھ چکی تھی جو ڈہنی سپرنٹنڈنٹ لودھی کی ملکیت تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ لودھی بھی عتاب میں ہے اور بگ باس بھی اس سے خوش نہیں ہے۔ ایسی صورت میں لودھی کا اس کے تعاقب میں آنا معنی خیز ہی تھا۔

شبیم نے ایک لمحے کو سوچا کہ وہ افضل خان کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دے لیکن پھر کسی خیال سے اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم جاگ اٹھا۔ سنگل کھلتے ہی شبیم نے ایک دو موڑ کاٹنے کے بعد مذکورہ جیب کو پیچھے آتے دیکھا تو اپنے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی۔ اسٹار ان ہوٹل جانے کے بجائے وہ اس کے قریب واقع ایک تین منزلہ سہرا اسٹور میں چلی گئی۔ یہ ظاہر وہ خود کو لاعلم ظاہر کر رہی تھی لیکن اس نے جیب کو کچھ فاصلے پر رکھتے دیکھ لیا تھا، ایک دکان سے کاسیٹک کے ایک دو آئٹم خریدتے وقت اس نے لودھی کو بھی اندر آتے دیکھ لیا۔ اپنے خیال کی تصدیق کی خاطر وہ دیدہ و دانستہ سہرا اسٹور کی تیسری منزل پر لفٹ کے ذریعے چلی گئی جہاں چھ دو منزلوں کے مقابلے میں کم رش ہوتا تھا۔ ایک دو اسٹالوں پر وقت گزارنے کے بعد وہ جنرل اور میڈیکل سامان فروخت کرنے والی دکان پر رکی تو لودھی بھی اسی کاؤنٹر پر آ گیا، اس نے دکان کے سیکڑ مین سے ایک انجکشن طلب کرنے کے ساتھ ہی اس طرح شبیم کی طرف دیکھا جیسے وہ ملاقات محض ایک اتفاق ہو۔

”ہیلو.....“ اس نے روایتی انداز میں شبیم کو پوری توجہ سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہاں کیا لینے آئیں؟“

”ایک ضروری دوا لینی تھی جو کہیں اور نہیں مل رہی تھی۔“ شبیم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کر رہی تھی کہ ممکن ہے بگ باس کا کوئی سادہ لباس والا بھی لودھی یا اس کی نگرانی پر مامور ہو۔

”حیرت ہے۔“ لودھی نے اس بار ڈہنی زبان میں بے تکلفی کا اظہار کیا۔ ”جو خود کئی امراض کا علاج ہو کیا وہ بھی کسی دوا کی ضرورت کی محتاج ہو سکتی ہے؟“

”کبھی کبھی وقت اور حالات انسان کو مجبور کر دیتے ہیں۔“ شبیم نے کئی کے بجائے جان بوجھ کر مسکرا کر جواب دیا۔ وہ اس بات کی تصدیق کرنا چاہتی تھی کہ لودھی کے تعاقب کرنے کا خیال کہیں اس کا وہم نہ ہو۔

”یہ بات بھی مجھے ہضم نہیں ہوئی اس لیے کہ آپ

ککشکول

”بم کہتے کہتے لودھی نے اپنا جملہ کسی فوری خیال سے اچھڑا دیا۔

”آپ خاموش کیوں ہو گئے.....؟“ شبیم نے اسے اپنے کی ٹھان لی۔

”اس لیے کہ ایک بار دفتر میں آپ نے میرے ساتھ ایک انداز اختیار کیا تھا۔“

”اور.....“ شبیم نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”دفتر میں ہم بندشیں بھی ہوتی ہیں جس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور سنا ہے، آج کل آپ کی لائف کیسی گزر رہی ہے.....؟ سنا ہے کہ آپ کو.....“ اس بار شبیم نے بھی دیدہ و دانستہ جملہ مکمل چھوڑ دیا۔

”ٹھیک سنا ہے آپ نے۔“ لودھی نے اس کے قریب ہوتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ایس پی اور بگ باس نے ذاتی رنجش کی وجہ سے اپنے اثر و رسوخ استعمال کر کے مجھے معطل کرادیا ہے۔“

”کیا.....؟“ شبیم نے چونک کر بڑی خوبصورت اداکاری کرتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔ ”کیا آپ کی طرف سے کسی نے جوابی کارروائی نہیں کی؟“

”اس میں بھی کچھ مصلحت ہے..... ایس پی نے مجھ سے دشمنی مول لے کر خود اپنے پیروں پر کلبازی مار لی ہے..... وہ بھی کچھ دنوں کا سہمان ہے، اس کا تبادلہ ہو جانے کے بعد حالات پھر سازگار ہو جائیں گے۔“

لودھی کا مطلوبہ انجکشن لایا گیا تو گفتگو کا سلسلہ ٹھپ ہو گیا۔ شبیم نے بھی اپنا بل ادا کیا۔ دونوں ایک ساتھ وہاں سے ارادے سے ملے تو لودھی نے ایک جگہ رک کر کہا۔ ”اس وقت آپ سے اتفاق یہ ملاقات ہوگئی تو ایک ضروری کام بھی یاد آ گیا۔“

”حیرت ہے۔“ شبیم نے اسی کا جملہ واپس کرتے ہوئے شوخی سے کہا۔ ”جو خود دوسروں کے کام آتا ہوا سے کیا کام پیش آ سکتا ہے؟“

”میں اپنی ذاتی اور نجی حیثیت میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔“ خلاف توقع لودھی نے بھی ہوگی آواز میں کہا۔ ”اس وقت اگر آپ میرے کام آجائیں تو میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“

”خیریت.....؟“ شبیم نے اسے ٹھوٹتی نظروں سے دیکھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ لودھی اس سے کیا درخواست کرے گا، اس کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ لودھی نے ایک لمحے ال کے بعد عاجزی سے کہا۔

”بم کہتے کہتے لودھی نے اپنا جملہ کسی فوری خیال سے اچھڑا دیا۔

”آپ خاموش کیوں ہو گئے.....؟“ شبیم نے اسے اپنے کی ٹھان لی۔

”اس لیے کہ ایک بار دفتر میں آپ نے میرے ساتھ ایک انداز اختیار کیا تھا۔“

”اور.....“ شبیم نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”دفتر میں ہم بندشیں بھی ہوتی ہیں جس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور سنا ہے، آج کل آپ کی لائف کیسی گزر رہی ہے.....؟ سنا ہے کہ آپ کو.....“ اس بار شبیم نے بھی دیدہ و دانستہ جملہ مکمل چھوڑ دیا۔

”ٹھیک سنا ہے آپ نے۔“ لودھی نے اس کے قریب ہوتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ایس پی اور بگ باس نے ذاتی رنجش کی وجہ سے اپنے اثر و رسوخ استعمال کر کے مجھے معطل کرادیا ہے۔“

”کیا.....؟“ شبیم نے چونک کر بڑی خوبصورت اداکاری کرتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔ ”کیا آپ کی طرف سے کسی نے جوابی کارروائی نہیں کی؟“

”اس میں بھی کچھ مصلحت ہے..... ایس پی نے مجھ سے دشمنی مول لے کر خود اپنے پیروں پر کلبازی مار لی ہے..... وہ بھی کچھ دنوں کا سہمان ہے، اس کا تبادلہ ہو جانے کے بعد حالات پھر سازگار ہو جائیں گے۔“

لودھی کا مطلوبہ انجکشن لایا گیا تو گفتگو کا سلسلہ ٹھپ ہو گیا۔ شبیم نے بھی اپنا بل ادا کیا۔ دونوں ایک ساتھ وہاں سے ارادے سے ملے تو لودھی نے ایک جگہ رک کر کہا۔ ”اس وقت آپ سے اتفاق یہ ملاقات ہوگئی تو ایک ضروری کام بھی یاد آ گیا۔“

”حیرت ہے۔“ شبیم نے اسی کا جملہ واپس کرتے ہوئے شوخی سے کہا۔ ”جو خود دوسروں کے کام آتا ہوا سے کیا کام پیش آ سکتا ہے؟“

”بم کہتے کہتے لودھی نے اپنا جملہ کسی فوری خیال سے اچھڑا دیا۔

”آپ خاموش کیوں ہو گئے.....؟“ شبیم نے اسے اپنے کی ٹھان لی۔

”اس لیے کہ ایک بار دفتر میں آپ نے میرے ساتھ ایک انداز اختیار کیا تھا۔“

”اور.....“ شبیم نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”دفتر میں ہم بندشیں بھی ہوتی ہیں جس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور سنا ہے، آج کل آپ کی لائف کیسی گزر رہی ہے.....؟ سنا ہے کہ آپ کو.....“ اس بار شبیم نے بھی دیدہ و دانستہ جملہ مکمل چھوڑ دیا۔

”ٹھیک سنا ہے آپ نے۔“ لودھی نے اس کے قریب ہوتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ایس پی اور بگ باس نے ذاتی رنجش کی وجہ سے اپنے اثر و رسوخ استعمال کر کے مجھے معطل کرادیا ہے۔“

”کیا.....؟“ شبیم نے چونک کر بڑی خوبصورت اداکاری کرتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔ ”کیا آپ کی طرف سے کسی نے جوابی کارروائی نہیں کی؟“

”اس میں بھی کچھ مصلحت ہے..... ایس پی نے مجھ سے دشمنی مول لے کر خود اپنے پیروں پر کلبازی مار لی ہے..... وہ بھی کچھ دنوں کا سہمان ہے، اس کا تبادلہ ہو جانے کے بعد حالات پھر سازگار ہو جائیں گے۔“

لودھی کا مطلوبہ انجکشن لایا گیا تو گفتگو کا سلسلہ ٹھپ ہو گیا۔ شبیم نے بھی اپنا بل ادا کیا۔ دونوں ایک ساتھ وہاں سے ارادے سے ملے تو لودھی نے ایک جگہ رک کر کہا۔ ”اس وقت آپ سے اتفاق یہ ملاقات ہوگئی تو ایک ضروری کام بھی یاد آ گیا۔“

”حیرت ہے۔“ شبیم نے اسی کا جملہ واپس کرتے ہوئے شوخی سے کہا۔ ”جو خود دوسروں کے کام آتا ہوا سے کیا کام پیش آ سکتا ہے؟“

”میں اپنی ذاتی اور نجی حیثیت میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔“ خلاف توقع لودھی نے بھی ہوگی آواز میں کہا۔ ”اس وقت اگر آپ میرے کام آجائیں تو میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“

”خیریت.....؟“ شبیم نے اسے ٹھوٹتی نظروں سے دیکھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ لودھی اس سے کیا درخواست کرے گا، اس کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ لودھی نے ایک لمحے ال کے بعد عاجزی سے کہا۔

”بم کہتے کہتے لودھی نے اپنا جملہ کسی فوری خیال سے اچھڑا دیا۔

”آپ خاموش کیوں ہو گئے.....؟“ شبیم نے اسے اپنے کی ٹھان لی۔

”اس لیے کہ ایک بار دفتر میں آپ نے میرے ساتھ ایک انداز اختیار کیا تھا۔“

”اور.....“ شبیم نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”دفتر میں ہم بندشیں بھی ہوتی ہیں جس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور سنا ہے، آج کل آپ کی لائف کیسی گزر رہی ہے.....؟ سنا ہے کہ آپ کو.....“ اس بار شبیم نے بھی دیدہ و دانستہ جملہ مکمل چھوڑ دیا۔

”ٹھیک سنا ہے آپ نے۔“ لودھی نے اس کے قریب ہوتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ایس پی اور بگ باس نے ذاتی رنجش کی وجہ سے اپنے اثر و رسوخ استعمال کر کے مجھے معطل کرادیا ہے۔“

”کیا.....؟“ شبیم نے چونک کر بڑی خوبصورت اداکاری کرتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔ ”کیا آپ کی طرف سے کسی نے جوابی کارروائی نہیں کی؟“

”اس میں بھی کچھ مصلحت ہے..... ایس پی نے مجھ سے دشمنی مول لے کر خود اپنے پیروں پر کلبازی مار لی ہے..... وہ بھی کچھ دنوں کا سہمان ہے، اس کا تبادلہ ہو جانے کے بعد حالات پھر سازگار ہو جائیں گے۔“

لودھی کا مطلوبہ انجکشن لایا گیا تو گفتگو کا سلسلہ ٹھپ ہو گیا۔ شبیم نے بھی اپنا بل ادا کیا۔ دونوں ایک ساتھ وہاں سے ارادے سے ملے تو لودھی نے ایک جگہ رک کر کہا۔ ”اس وقت آپ سے اتفاق یہ ملاقات ہوگئی تو ایک ضروری کام بھی یاد آ گیا۔“

”حیرت ہے۔“ شبیم نے اسی کا جملہ واپس کرتے ہوئے شوخی سے کہا۔ ”جو خود دوسروں کے کام آتا ہوا سے کیا کام پیش آ سکتا ہے؟“



ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔
”تمہیں دیکھ کر مجھے طارق معظم یاد آتا ہے۔“
دوست نے کہا۔ ”مگر طارق معظم تو مجھ میں ذرا بھی
مشابہت نہیں رکھتا۔“
پہلے دوست نے کہا۔ ”کیوں نہیں رکھتا۔ اس نے بھی
تمہاری طرح مجھ سے پانچ سو روپے ادھار لیے ہوئے
ہیں۔“

☆☆☆

ایک بچہ بیمار ہو گیا۔ اس کا باپ اسے ڈاکٹر کے
باس لے گیا۔ ڈاکٹر نے بچے کے سینے پر آلہ رکھتے ہوئے
کہا۔ ”بیٹا، دس تک گنتی گنو۔“
بچہ سن کر بچہ گھبرا گیا اور باپ سے کہنے لگا۔ ”آپ ۲
کہہ رہے تھے کہ اسپتال لے جا رہا ہوں۔ ۲ آپ ۲
اسکول میں لے آئے ہیں۔“

نہیں رہیں تو یہ بھی خدا کی مصلحت ہوگی۔ جب بھی تمہارے
ذہن میں کوئی تجویز، کوئی نیا خیال ابھرے۔ مجھے ایک
دوست کی حیثیت سے ضرور بتا دینا۔ ”سراج نے اسے ٹیلیفون
سے باور کرانے کی کوشش کی۔ ”ہم دونوں برائیاں کو ۲ سے
اکھاڑ پھینکنے کی خاطر کام کر رہے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھو کہ سیدھے
اور سچے راستے پر چلنے والوں کے لیے کانٹوں سے گزرنا بھی
ایک آزمائش ہوتی ہے۔ میرے علاوہ عثمان بھی تم پر اعتماد کرتا
ہے۔ ذہن پر کوئی بوجھ نہ محسوس کرو، تم ڈیڑھ گھنٹے کہاں
رہے؟ یہ بھی یاد کرنے کی کوشش نہ کرو، آنے والا وقت ہم
دونوں کی خود رہنمائی کر دے گا۔“

”آپ کی بڑی مہربانی صاحب جو اتنا خیال رکھتے
ہیں مگر ایک درخواست میری بھی قبول کریں۔“ لیاقت حسین
نے درخواست کی۔ ”میں آپ کے کمرے کے کھانے کے
کہیں باہر بیٹھا ہوں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“
”ٹھیک ہے۔“ ”سراج نے اس کی امانت
محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس کا بھی بندہ ہوں۔“
لیکن اب تم دوبارہ کسی ذہنی کشش کا شکار نہ ہو
نہیں کر دے گا۔“

لیاقت حسین بہ دستور ذہنی طور پر اہل

”میں نے آپ کی غیر موجودگی میں کمرے میں بیٹھا
آپ کو سنا تھا۔“ لیاقت حسین نے کسمسا کر کہا۔ ”آپ
میں دیے ہوئے وہ میری توقع سے زیادہ ہے صاحب
میں دیکھیں گے۔“
آپ برائے نامیں تو میں کمرے کے بجائے باہر کرسی ڈال کر
”میں زیادہ سکون محسوس کروں گا۔“
”صرف اسی لیے تم ڈیڑھ گھنٹے تک سوچ و چار کرنے
کی خاطر کہیں چلے گئے تھے؟“

سراج نے پہلی بار اس کی غیر حاضری کے سلسلے میں غلطی
کا اظہار کیا تو لیاقت حسین نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا
پھر، تعجب کی خاطر جب اس نے دفتر میں لگی دیوار گیر گھڑی
پر نظر ڈالی تو اس کے چہرے پر ایک انجانی پریشانی سی طاری
ہو گئی، وہ ڈیوٹی کانسٹیبل سے دس پندرہ منٹ کا کہہ کر چھل
قدمی کے ارادے سے نکلا تھا۔ سراج کی غیر موجودگی میں اس
کے کمرے میں بیٹھنے سے اسے گھٹن ہو رہی تھی۔ اس کا ذاتی
خیال تھا کہ وہ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ عرصہ باہر نہیں رہا تھا
لیکن گھڑی دیکھنے کے بعد اس کا ذہن بھی چکرا کر رہ گیا۔ کچھ
دیر تک وہ اسی کیفیت سے دوچار رہا پھر اس نے سراج کی
جانب دیکھ کر بڑی عاجزی سے درخواست کی۔

”صاحب۔۔۔۔۔ ایک بات عرض کروں اگر آپ برائے
نامیں۔“

”کہو۔۔۔۔۔“ سراج نے اس کے چہرے کی بدلتی کیفیت
دیکھ کر دریافت کیا۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو؟“
”آپ مجھے دماغ کا علاج کرنے والے کسی ڈاکٹر
کو۔۔۔۔۔“

”لیاقت حسین۔۔۔۔۔“ سراج نے اس کا جملہ کاٹ کر
تیزی سے کہا۔ ”اس سے پیشتر بھی جو باتیں تمہارے ساتھ
ہو چکی ہیں ان کو مت کریدو۔ زیادہ الجھو گے تو بات اور
خراب ہو جائے گی اور۔۔۔۔۔ یہ بھی یاد رکھو کہ میں نے تمہیں
ساتھ لاتے وقت کیا کہا تھا۔“

”وہ تو مجھے یاد ہے صاحب لیکن میرے ساتھ بار بار
ایسا کیوں ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟“ لیاقت حسین نے الجھ کر جواب
دیا۔ ”آپ کی اور بڑے صاحب کی بات اور ہے لیکن
دوسرے ان باتوں پر یقین نہیں کریں گے۔ کہیں پھنس گیا تو
آپ کو بھی میری وجہ سے پریشانی ہوگی۔“

”پریشان مت ہو۔۔۔۔۔ صرف اتنا یاد رکھو کہ میں تمہیں
دوست سمجھتا ہوں اور خدا کی رحمانی قوتیں بھی در پردہ تم سے
کچھ نیکی اور بھلائی کے کام کر رہی ہیں۔ تمہیں جو باتیں یاد

سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اب چلتی ہوں، ہو سکتا ہے کہ میں
دو چار دنوں بعد اسی اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونا پڑے جو بھی
تمہارے پاس تھا۔“
شبہم نے جاتے وقت اپنا پرس کھول کر نایب شدہ خط
نکالا پھر اسے فرش پر گراتے ہوئے لیے لیے قدم اٹھاتی چلی
گئی۔ افضل خان نے اس کے جانے کے بعد کاغذ کا بہ ظاہر
بے کار صفحہ کھول کر تفصیل سے پڑھا تو اس کی آنکھوں میں کسی
ایسے آدم خور درد سے جیسی چمک ابھری جو اپنے کسی پسندیدہ
شکار پر جمپٹ پڑنے کے لیے پوری طرح تیار ہو۔ اس نے
نایب شدہ مضمون کو کئی بار تفصیل سے پڑھا پھر پہلی فرصت
میں اسے جلا کر اس کی راکھ و اش بین میں بہا دی۔

لیاقت حسین کے سلسلے میں سراج کی پریشانی بڑھتی
جاری تھی۔ ڈیوٹی کانسٹیبل کے بیان کے مطابق وہ دس پندرہ
منٹ میں واپسی کا کہہ کر کہیں قریب ہی کسی فوری ضرورت
کے لیے گیا تھا لیکن ڈیڑھ گھنٹہ گزر جانے کے بعد بھی وہ
واپس نہیں آیا تھا۔ وہ اچانک کہاں اور کیوں چلا گیا؟ تھوڑی
دیر کا کہہ کر جانے کے باوجود اس کی واپسی کیوں طول پکڑتی
جاری تھی؟ سراج ان ہی سوالات کے بارے میں غور کر
رہا تھا جب لیاقت حسین انتہائی پرسکون حالت میں دروازہ
کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی
پریشانی یا الجھن کے تاثرات نہیں تھے۔ سراج اسے ٹوٹی
نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیاقت حسین کے بارے میں چونکہ
وہ کچھ پراسرار باتوں سے بھی واقف تھا اس لیے اس نے کسی
جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لیاقت حسین اس کی اجازت
حاصل کر کے بیٹھ گیا تو سراج نے سادگی سے پوچھا۔

”کہاں چلے گئے تھے لیاقت حسین؟ میں بڑی دیر
سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔“

”دس منٹ کے لیے تو گیا تھا صاحب۔“ لیاقت حسین
نے معصومیت سے جواب دیا۔ ”آپ کو ضرورت تھی تو
موبائل پر حکم دیدیتے، میں واپس آ جاتا۔“

سراج شپٹا کر رہ گیا۔ لیاقت حسین کے جواب میں
کوئی اداکاری، تصنع یا بناوٹ نہیں تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ
اس کی واپسی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہی ہوئی تھی۔

”میرے کانسٹیبل کا کہنا ہے کہ تم کسی فوری ضرورت کا
کہہ کر گئے تھے۔“ سراج نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”جب
دفتر میں تمام سہولتیں موجود ہیں تو تمہیں کہیں اور جانے کی کیا
ضرورت تھی؟“

”میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تمہاری سفارش پر مجھے
آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع مل گیا۔“
”آئندہ بھی ملتا رہے گا۔ بشرطیکہ تم مایوسی کا شکار
ہونے کے بجائے عقلمندی سے کام لو۔“

”میرے لیے کوئی نیا حکم۔۔۔۔۔؟“
”ایک اہم خبر سنانا چاہتی ہوں۔“ شبہم نے افضل
خان کو نظروں کے مخصوص اشاروں سے کچھ سمجھاتے ہوئے
جواب دیا۔ ”بگ باس تمہارے گھڑی اپارٹمنٹ کو جدید
انداز میں ٹھیک کر رہا ہے۔“

”کیا میں اس خواب پر یقین کر لوں؟“ جواب میں بہ
دستور حیرت اور تعجب کا اظہار کیا گیا تھا۔
”ہاں۔۔۔۔۔ لیکن کچھ ترمیم کے ساتھ۔“ شبہم نے ٹھوس
آواز میں کہا۔ ”یہ ہم دونوں کی کارکردگی کا ملا جلا انعام
ہوگا۔“

”میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔؟“
”میرے ایک سوال کا مکمل کر صاف کوئی سے جواب
دو۔ کیا تم میرے ساتھ رہنا کو ادا کر دے گے؟“
”یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں۔“ افضل خان
نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”کیا بگ باس کو میرا اور تمہارا ایک
ساتھ رہنا کو ادا ہوگا؟“

”اس کا اشارہ نہ ہوتا تو میں اس موضوع پر زبان
کھولنے کی جرأت بھی نہ کرتی۔ اب تم کیا کہو گے؟“
”میرا خیال ہے کہ میرے پاس تمہارے کسی
مشورے پر عمل کرنے کے علاوہ فی الحال کوئی آپشن بھی
نہیں ہے۔“

”مجھے تمہارا جواب پسند آیا۔“ شبہم نے دیدہ و دانستہ
اپنی برتری کا اظہار کیا۔ ”تم کو شاید ایک طویل عرصے تک اسی
انداز میں ری ایکٹ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد بھی
سب کچھ باس کی مرضی پر منحصر ہوگا۔“

”میں جانتا ہوں۔ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اگر بگ
باس نے آڑے وقت میں میرا ہاتھ نہ تھاما ہوتا تو شاید میں
بہت پہلے قانونی شکنجے میں الجھنے کے بعد زندگی کی بازی ہار چکا
ہوتا۔“ افضل خان نے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح
اعتراف کیا۔ ”میں اس احسان کو زندگی کی آخری سانسوں
تک فراموش نہیں کر سکتا، خواہ حالات کیسے ہی ہوں۔“

”میں تمہارے اس احساس کو بگ باس کے کانوں
تک پہنچانے کی کوشش ضرور کر دوں گی۔“ شبہم نے اٹھتے
ہوئے کہا۔ ”باس کا رد عمل کیا ہوگا اس کے بارے میں یقین

وجود کے سنائے میں ابھی تک ڈیڑھ گھنٹے کی گمشدگی کا معما چکرارہا تھا۔ وہ سراج کے پر خلوص مشورے کا کوئی مناسب جواب دینے پر غور کر رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی، سراج نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا، دوسری جانب سے ایس پی اورنگ زیب کی آواز سنائی دی۔

”آپ اس وقت مصروف تو نہیں ہیں؟“

”جب آپ نے دوست اور بھائی کہا ہے تو پھر اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟“ سراج نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”آپ حکم دیں۔۔۔۔۔“

”روہیل کھنڈنای سوسائٹی میں واقع ڈریم فل گیسٹ ہاؤس میں پہنچنے کی کوشش کریں، میں بھی دفتر سے روانہ ہو رہا ہوں۔“

”خیریت تو ہے۔۔۔۔۔؟“ سراج نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”ایک غیر ملکی باشندے نے خودکشی کر لی ہے۔ مرنے سے پیشتر اس نے متعلقہ تھانے کو اپنے اقدام کی اطلاع بھی دی تھی۔“

سراج نے فوری طور پر اپنی کرسی چھوڑ دی۔ اس نے لیاقت حسین کو بھی جیلے کو کہا۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں یہی خیال ابھرا تھا کہ ممکن ہے لیاقت حسین کے ڈیڑھ گھنٹے غائب رہنے کا کوئی تعلق اس خودکشی کے واقعے سے بھی ہو۔ آدھے گھنٹے کے اندر وہ ڈریم فل گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے جہاں متعلقہ تھانے کی پولیس کے علاوہ کچھ لوگوں کی بھیڑ بھی نظر آرہی تھی، لیاقت حسین کو گاڑی میں بیٹھا رہنے کی تاکید کر کے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اندر گیا، ایک سب انسپکٹر نے مطلوبہ کمرے تک اس کی رہنمائی کر دی جہاں اس وقت ایس پی اورنگ زیب کے علاوہ پولیس سرجن بھی موجود تھا۔ متعلقہ تھانے کا سب انسپکٹر بھی سراج کے ساتھ ہی اندر چلا گیا۔

لاش اس وقت ہیڈروم سے ملحقہ ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر آڑھی ترچھی پڑی تھی۔ مرنے والے کے چہرے پر یہ ظاہر کسی تشدد یا کٹکٹ کے آثار بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ پولیس سرجن نے بھی لاش کو ہاتھ لگائے بغیر اسی بات کا اظہار کیا تھا کہ خودکشی کرنے والے نے اپنی مرضی سے کی ہے۔ سراج کے علاوہ اورنگ زیب کا ذاتی تجربہ بھی یہی کچھ کہہ رہا تھا لیکن فنگر پرنٹس اٹھائے جانے اور لاش کے پوسٹ مارٹم کے بغیر کوئی یقینی نتیجہ اخذ نہیں جاسکتا تھا۔ علاقہ چونکہ اورنگ زیب کا تھا اس لیے ضروری تھا کہ جائزہ لینے کے بعد دوسری ٹیموں کو بھی اندر آ کر کارروائی کرنے کی اجازت دے۔ خود سراج کو لے کر ایک طرف چلا گیا۔

”آپ کا کیا اندازہ ہے۔۔۔۔۔؟“ اس نے سراج نے دریافت کیا۔

”یہ ظاہر بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرنے والے نے ذاتی فیصلے کے بعد ہی خودکشی کی ہوگی لیکن ہم دوسرے شبہات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے کسی نے اس اقدام کے لیے مجبور کیا ہو۔“ سراج نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”مجبوری کا خیال میرے ذہن میں اس لیے آیا کہ اگر اس خودکشی میں صرف مرنے والے کے ذاتی ارادے کو دخل ہوتا تو اسے تھانے کو فون کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کمرے سے پھوٹنے والا تلفن دو تین روز میں خود دوسروں کو باخبر کر دیتا۔“

”آئی ایگری وڈ یولیکن ہمیں اس غیر ملکی کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنی ہوگی کہ یہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ کس پروفیشن سے منسلک تھا اور اس گیسٹ ہاؤس میں کس مقصد سے ٹھہرا تھا؟ کیا آپ ذاتی دلچسپی لے کر یہ معلومات میری خاطر حاصل کر سکیں گے؟“

”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے یہ ذمہ داری از خود مجھے سونپ دی ورنہ میں کسی وجہ سے خود بھی ان باتوں کی کھوج لگانے کی کوشش ضرور کرتا۔“

”کوئی خاص وجہ۔۔۔۔۔؟“ اورنگ زیب نے سراج کو نڈلتی نظروں سے دیکھا۔

”مجھے آج رات آپ کے ساتھ ڈنر کا پروگرام یاد ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک میں آپ کو کچھ ضروری معلومات اور بھی فراہم کر سکوں۔“

”ٹھیک ہے، ویسے بائی دادے۔۔۔۔۔ کہیں آپ اس معاملے میں بھی آکنوئس کا ہاتھ تو نہیں محسوس کر رہے ہیں؟“

”ہو بھی سکتا ہے۔“ سراج نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”ممکن ہے کہ رات تک میں اپنے ذرائع سے مزید کچھ

اہم باتیں معلوم کر لوں۔“

ضروری کارروائی کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے سے پیشتر سراج نے اورنگ زیب کی اجازت سے دو تین زادویوں سے مرنے والے کی تصویر کا کلوز اپ اپنے موبائل میں محفوظ کر لیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کی واپسی ممکن ہوئی۔ گاڑی ڈرائیو کرتے وقت بھی اس کے ذہن میں فتح حامد کا خیال بار بار ابھر رہا تھا جس کے سلسلے میں اورنگ زیب نے دبی زبان میں اس خودکشی کے شبہ کا ایک خیال ظاہر کیا تھا۔ جگا کے سلسلے میں میڈم روبی کی فون کال بھی بلا مقصد نہیں رہی ہوگی؟ ممکن ہے کہ اس کال کا بھی سراسر نے والے سے ملتا ہو؟ سراج کو علم تھا کہ میڈم روبی نے بھی اپنے تحفظ کی خاطر کچھ ایسے چہروں کا انتخاب کر رکھا ہے جو فتح حامد اور اس کے درمیان ڈھال کا کام انجام دے سکیں۔ ایک موقع پر سراج کے استفسار پر میڈم نے دبی زبان میں اس کا اقرار بھی کیا تھا اور بھی بے شمار باتیں تھیں جو اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے وہ گاڑی میں لیاقت کی موجودگی کو یکسر فراموش کر چکا تھا جس کا احساس اسے لیاقت حسین کی آواز سن کر ہوا۔

”کیا بات ہے صاحب؟ ہم جہاں آئے تھے وہاں کوئی واردات ہوئی تھی؟“

”او۔۔۔۔۔ ہاں۔“ سراج نے چونک کر جواب دیا۔ ”ایک غیر ملکی نے خودکشی کر لی ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس نے خودکشی سے قبل تھانے کو باقاعدہ اس کی اطلاع بھی دی تھی۔“

”ان فرنگیوں کے رنگ ڈھنگ بھی نرالے ہوتے ہیں صاحب۔“ لیاقت حسین نے ایک عام بات کی۔ ”یہ کسی نہ کسی طرح ہر معاملے میں اپنی برتری اور گوری سی رنگت کے اندر چھپے عیبوں کا اظہار کرنے میں بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔“ سراج نے اس تبصرے پر کوئی جواب نہیں دیا۔ دفتر پہنچ کر اس نے دوبارہ مرنے والے کا ذکر چھیڑ دیا پھر سوچی سمجھی اسکیم کے پیش نظر اس نے مرنے والے کے کلوز اپ بھی لیاقت حسین کو دکھائے لیکن وہ ان تصویروں کو دیکھ کر نہ چونکا، نہ کسی بات سے اس کا اظہار ہوا کہ اس نے مرنے والے کو کبھی نہیں دیکھا بھی ہو۔ البتہ تصویر پر نظر ڈالنے کے بعد اس نے اٹھا ضرور کہا تھا۔

”یہ کوئی فرنگی تو نہیں ہے صاحب۔۔۔۔۔؟“

”یہ ظاہر تمہارا اندازہ درست ہے مگر جب تک لاش کی پھاڑ کی تفصیلی رپورٹ نہ آجائے کچھ یقین سے نہیں کہا

کشکول جاسکتا۔“

”کیا لاش کا کوئی دالی وارث بھی سامنے نہیں آیا۔“ لیاقت حسین نے کسماکس کر پوچھا۔ ”ہوٹلوں میں یا کہیں کرائے پر رہنے والوں کا بھی کوئی نہ کوئی پتا ٹھکانا تو تحریری شکل میں ضرور ہوتا ہوگا۔“

”تمہارا خیال درست ہے، خودکشی کرنے والے نے خود کو سیاح بتایا تھا اور اپنی ضروری دستاویز بھی گیسٹ ہاؤس والوں کو دکھائی تھیں۔ پولیس نے وہ تمام ثبوت اور مرنے والے کے کمرے سے اس کی سفری دستاویزات اپنی تحویل میں لے لی ہیں۔ وہ کون تھا؟ کب یہاں آیا تھا اور کہاں کہاں ٹھہرا تھا؟ اس کی تفتیش کے بعد ہی تمام معلومات حاصل ہو سکیں گی۔“

لیاقت حسین نے کوئی مزید سوال نہیں کیا۔ سراج بھی کچھ ضروری کالیں کرنے میں مصروف ہو گیا، لیاقت حسین نے مرنے والے کی تصویر دیکھنے کے بعد کوئی ایسا تاثر ظاہر نہیں کیا تھا جس سے سراج کے شبہ کی تصدیق ہو سکے۔

لوچن اس وقت ساحل سمندر کی ایک ہٹ کی بالائی منزل پر صرف ایک برائے نام نیکر پہنے چاروں خانے چت لینا سن باتھ لے رہا تھا جب اس کے موبائل پر سنگٹل آنا شروع ہوئے۔ اس وقت وہ پوری طرح اپنے شغل سے لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن اسے بہر حال موبائل کی طرف توجہ دینی پڑی جس پر ڈوما کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔“ لوچن نے برا سامنہ بنا کر موبائل آن کر لیا۔

”کہاں سے بات کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ ڈوما نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”چھت کے اوپر اور آسمان کے نیچے آنکھ بند کیے سن باتھ لے رہا ہوں۔ تم نے اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ ڈوما کی سرسراتی آواز ابھری۔ ”تمہیں شاید نئی صورت حال کا علم نہیں ہے۔“

”درست خیال ہے تمہارا۔“ لوچن نے بے پردگی کا مظاہرہ کیا۔ ”میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ زیادہ روگ پالنا میرے اصول کے خلاف ہے۔“

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے ہوٹل کی رہائش ترک کر کے ایک واقف کار فیملی کے ساتھ عارضی طور پر ایڈجسٹ کر لیا ہے۔“

”وہاں کوئی خوبصورت لڑکی بھی ہوگی۔“ لوچن نے

اسے چھوڑنے کی کوشش کی۔ ”مخاطب ہی رہنا۔ پہلے بھی تمہاری ٹائٹ کلب کی ڈانس فرینڈ کو سیون اسٹار نے چوبیس گھنٹے کی مہلت میں بیک نوپولین کرادیا تھا۔“

”اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ سیون اسٹار کوئی الحال آم کھانے سے مطلب ہے، بیڑ گننے کا وقت اس کے پاس بھی نہیں ہے۔“

”اب تک کتنے پیک حلق کے نیچے اتار چکے ہو؟“

لوچن نے سیون اسٹار کے حوالے پر در یافت کیا۔

”میں اس وقت پوری طرح ہوش و حواس میں ہوں۔“ ڈومانیے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”کیا تم کچھ دیر کے لیے سنجیدگی سے میری بات نہیں سن سکتے؟“

”سن رہا ہوں لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ مجھے کسی گرل فرینڈ کے بجائے سن باتھ زیادہ عزیز ہے اس لیے زیادہ وقت نہیں دے سکوں گا۔“

”تمہاری مرضی۔ مگر شاید ہاشم کے بارے میں سن کر تم کو بھی سن باتھ سے منہ موڑنا پڑ جائے۔ سنجیدگی سے سنو، ہاشم اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“

”وہاٹ.....“ لوچن کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اس نے تیزی سے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا حادثہ پیش آ گیا ہے؟“

”حادثہ نہیں مائی ڈیئر..... سیون اسٹار کے حکم پر اس نے سرخ کیسول چبا کر نجات حاصل کر لی ہے۔“ ڈومانیے بات جاری رکھی۔ ”اس حکم کی تعمیل نہ کرتا تو شاید اسے موت کے گھاٹ اتارنے کا فرض بھی مجھے ادا کرنا پڑتا۔ کچھ دیر پہلے ہی ہاشم کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اٹھوا لیا گیا ہے۔“

”اسے کس جرم کی سزا دی گئی ہے.....؟“

جواب میں ڈومانیے مختصر تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”سیون اسٹار نے فوری طور پر تمہارے لیے بھی یہی حکم جاری کیا ہے کہ کسی ایسی جگہ پناہ تلاش کرو جہاں پولیس تم تک نہ پہنچ سکے۔“

”لیکن ہاشم کی ایک غلطی کی سزا ہم کو کیوں دی جارہی ہے؟ میرا یا تمہارا اس کی غداری سے کیا تعلق ہے؟“

”نہ سہی لیکن..... ہاشم کا پاسپورٹ اور ضروری سامان پولیس کی تحویل میں ہے..... پولیس کی تفتیش کا دائرہ وسیع ہوا تو ہمارے نام بھی لسٹ پر آ سکتے ہیں اس لیے کہ جس فلائٹ سے ہم یہاں پہنچے تھے اس کے فرسٹ کلاس کے مسافروں میں ہماری بدھیبھی سے کوئی اور مسافر نہیں تھا۔ ہم دونوں کا نام بھی جہاز کے مسافروں کی فہرست پر موجود ہوگا۔“

”تم شاید ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہاشم.....“ لوچن کچھ کہتے کہتے رک گیا، اب تک اس کے ذہن میں یہی شبہ تھا کہ ہاشم ہی کسی عورت کو استعمال کر کے سیون اسٹار کے کوڈ کے ذریعے ان کو کمانڈ کر رہا تھا لیکن اس کی موت کی اطلاع نے اس شبہ کی تردید کر دی تھی۔

”خاموش کیوں ہو گئے.....؟“ ڈومانیے تجسس کا اظہار کیا۔ ”کیا تمہیں ابھی تک یہی گمان ہے کہ میں نشے کی حالت میں ہوں؟“

”ڈومانیے.....“ لوچن نے اس کا جملہ نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے بول چال۔ ”کیا تم مجھے اس شخص کا حلیہ بتانا پسند کرو گے جسے ہاشم نے سیون اسٹار کا کوڈ استعمال کر کے ٹھکانے لگانے کا حکم دیا تھا۔“

جواب میں ڈومانیے اسپورٹس کار والے کا جو حلیہ بیان کیا اسے سن کر لوچن دوبارہ چونکا۔ اسے فوری یاد آ گیا کہ ہاشم سے اس کا آتنا سامنا کچھ دنوں پیشتر اس وقت ہوا تھا جب وہ جگا سے ملنے کشمیر فرنیچرز پر گیا تھا، واپسی پر ہاشم نے دلی زبان میں اس کا ذکر بھی کیا تھا۔ لوچن ابھی یکے بعد دیگرے اس کی اور ہاشم کی موت کی کتنی سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا جب ڈومانیے اسے سرسراتی آواز میں مخاطب کیا۔

”سیون اسٹار کا حکم ہے کہ ہمیں کچھ دنوں کے لیے ذاتی طور پر بھی خود کو پولیس کی نظروں سے بچانا ہے اس لیے فوری طور پر ہمیں بھی کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش کا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے اس وقت تمہیں یہی اطلاع دینے کا فرض ادا کیا ہے۔ اب تم چاہو تو سن باتھ لیتے رہو۔“

دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ لوچن نے ساحلی علاقے سے فوری واپسی میں بڑی عجلت کا مظاہرہ کیا۔ اس کا ذہن بدستور ہاشم اور حادثے میں ہلاک ہونے والے کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ جگا کا خیال بھی ان دونوں کے ساتھ ہی لوچن کو الجھا رہا تھا۔

امداد علی نے جس پٹانے پر اپنا کالا دھندلا پھیلا رکھا تھا اس کے بعد اسے ملازمت کی ضرورت بھی نہیں تھی چنانچہ اس نے ایک جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر وقت سے پیشتر ہی پولیس کی ہیڈ کوارٹر سے گلو خلاصی حاصل کر لی تھی لیکن وہ اب بھی من گھڑنے کی خاطر پرانے دوستوں اور ساتھیوں سے رابطہ رکھتا تھا تاکہ حالات سے پوری طرح باخبر رہے۔ اسے شیخ حامد کے بارے میں بھی خاصا کچھ معلوم تھا لیکن وہ دوسروں کے معاملے میں ناگ الجھانے کے اصول کے

کشکول

ل۔ ق۔ خود شیخے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر ہتھ پھرا چھالنا اس کے نزدیک بلاوجہ کے خطرات کو دعوت دینے کے برابر تھا لیکن جگا کی بات اور تھی۔

جگا جسے اس کے مراسم بہت دیرینہ تھے اسے یہ بھی علم تھا کہ جگا نے بڑے کینڈلے کے بد معاشوں کی پشت پناہی کر کے اپنی ٹیم مضبوط بنا رکھی تھی لیکن وہ بھی بلاوجہ کے گھٹ و خون کا عادی نہیں تھا البتہ اس نے دوسرے اڈے پر لوگوں پر اپنی مدحاک ضرور بٹھا رکھی تھی۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ شیخ حامد سے کمر لے سکتا تھا لیکن بلاوجہ کسی کے ساتھ الجھنا اس کے اصول کے خلاف تھا۔ امداد علی نے بھی اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ کم از کم شیخ حامد سے الجھنے کی کوشش کبھی نہ کرے۔ اسی نے حالات کے پیش نظر جگا کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ اسپورٹس کار والے کے حادثے کے بعد کچھ دنوں کے لیے زیادہ محتاط ہو جائے اس لیے کہ مرنے والا شیخ حامد کا دست راست تھا اور شیخ حامد کسی بھی مشتبہ آدمی کو بخشنے کا عادی نہیں تھا۔

امداد علی ایک پرانے دوست کی حیثیت سے بھی جگا کا خیال رکھتا تھا۔ ہفتے میں ایک دو بار اس کی خیریت بھی معلوم کرتا رہتا تھا۔ کبھی جگا بھی اس سے رابطہ کر کے اس کا حال احوال دریافت کرتا رہتا تھا۔ دونوں کے درمیان خاصا پرانا راز نہ تھا۔ خاص طور پر جگا اس کا احسان مند تھا جس نے آڑے وقت میں بھی اس کے ساتھ دوستی نبھانے میں بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا۔ اسے جہانگیر بٹ سے جگا بنانے میں امداد علی کا ہاتھ تھا۔ جگا، امداد علی سے کوئی بات چھپانے کا مادی نہیں تھا۔ زیادہ تر مشورے بھی اسی سے لیتا تھا، امداد علی کے ذریعے اسے خاص طور پر پولیس کے ٹھکے کے بارے میں خاص خاص خبریں ملتی رہتی تھیں۔

جگا ہر آڑے وقت میں امداد علی سے اپنی الجھنیں شیر کرنے کا عادی تھا لیکن پراسرار نووارد کی ملاقات کے بارے میں اس نے ابھی تک زبان نہیں کھولی تھی۔ وہ ماورائی کہانیوں پر یقین نہیں رکھتا تھا لیکن جو کچھ اس نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا اسے فراموش کر دینا بھی اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ نووارد کا احسان مند بھی تھا۔ اگر اس نے ہر وقت جگا اور اس کے آدمیوں کو آنے والے خطرے سے باخبر نہ کیا ہوتا تو شاید جگا اور کچھ خاص ساتھی اسی عمارت کے لپے میں دفن ہو جاتے جسے دھماکے سے اڑا یا گیا تھا۔ وہ دھماکا مرنے اور کس مقصد کے تحت کیا تھا اس کے بارے میں جگا کو صرف شیخ حامد پر شبہ تھا لیکن یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ

اس کا اندازہ درست ہی ہو۔ ممکن تھا کسی دوسرے گروہ کے سرغنہ نے حالات سے فائدہ اٹھا کر جگا کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی ہو اور بھی بہت سے امکانات تھے۔

بہت دیر سے وہ اسی کتنی کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا جب اس کا خاص کارندہ اس کی ہدایت پر اس کے پاس پہنچ گیا، اس کے چہرے پر ابھی تک دھماکے سے پیدا ہونے والے تاثرات موجود تھے۔

”ہماری نفری کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟“ جگا نے اس سے تفصیل جاننے کی خاطر پوچھا۔

”نہیں استاد..... تمہاری بروقت اطلاع نے نفری کو تو بچالیا لیکن اس عمارت میں ہمارا کچھ سامان ضرور ضائع ہو گیا۔“

”انسان زندہ رہے تو سامان بھی دوبارہ جمع کر لیتا ہے۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ، صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ کس سر پھرے نے جگا کے ساتھ بلاوجہ دشمنی مول لینے کی کوشش کی ہے۔“

”کئی نام ذہن میں کلبلا رہے ہیں استاد لیکن ابھی یقین سے کسی ایک کی طرف انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی۔“

”اطمینان سے معلوم کرو لیکن یہ خیال رہے کہ ہماری خاموشی دشمن کو اور مغرور بھی کر سکتی ہے۔“

”تم فکر نہ کرو استاد..... میں نے ایک دو کھوجی لگائے ہیں۔ جس نے بھی اپنی موت کو دعوت دی ہے وہ زیادہ دنوں تک چھپر میں نہیں رہ سکے گا۔“

”باقی لوگ کہاں ہیں.....؟“

”میں نے انہیں دوسرے ٹھکانوں پر ادھر ادھر بانٹ دیا ہے۔ ہمارا فی الحال کسی ایک جگہ زیادہ تعداد میں رہنا بھی مناسب نہیں ہے۔“

جگا کچھ سوچ رہا تھا کہ اس کے موبائل پر قہر قہر اہٹ ہوئی۔ امداد علی کا نام دیکھ کر اس نے موبائل آن کر لیا۔

”سننا ہے تمہارے کسی ٹھکانے کو اڑا دیا گیا ہے؟ سب خیر تو ہے؟“

”اتفاق ہی سمجھو جو ہم نے دھماکے سے کچھ دیر پہلے وہاں سے کوچ کر لیا تھا اور نہ.....“

”تمہارا دھیان کس کی طرف جا رہا ہے؟“

”اوسان ٹھیک ہو جائیں تو اس پر غور کریں گے۔“ جگا نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”تمہاری کیا اطلاع ہے؟“

”میرا شبہ اسی ولدالحرام کی طرف ہے جس کا خاص الخاص بندہ شکار کیا گیا تھا۔“ امداد علی نے کہا۔ ”آج بھی ایک

گر ماگرم تازہ لاش پولیس کے ہاتھ لگی ہے میں تمہیں اسی کے بارے میں تفصیل بتانا چاہتا ہوں۔“

جگا بڑی سنجیدگی سے دوسری جانب سے فراہم کی جانے والی تفصیل سن رہا۔ امداد علی نے گیسٹ ہاؤس سے ملنے والی لاش کا جو حلیہ بیان کیا وہ جگا کے لیے نیا تھا لیکن جب اس کے سیاہ قام غیر ملکی ہونے کے بارے میں معلوم ہوا تو جگا چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

”یار امداد علی..... تمہارے مخبر نے کیا بتایا ہے مرنے والے کے بارے میں؟“

”صرف ایک بات اہم ہے.....“ دوسری طرف سے جواب ملا۔ ”پولیس نے مرنے والے کا جو پاسپورٹ قبضے میں لیا ہے اس کی تصویر خود کشی کرنے والے کی شکل سے نہیں ملتی..... ہو سکتا ہے کہ اس نے میک اپ کیا ہوا ہو۔ ابھی ہکی اطلاع نہیں ملی، لاش کا پوسٹ مارٹم ہو جائے تو چہرے مہرے کا بھید بھی کھل جائے گا۔“

”پاسپورٹ پر کوئی نام تو ہوگا.....؟“ جگا نے کرید کی۔

”جو کچھ میرے ہاتھ لگا ہے اسے اتفاق ہی سمجھو۔“ امداد علی نے جواب دیا۔ ”ایس پی اورنگ زیب کے علاوہ ڈی ایس پی سراج بھی ساتھ ساتھ نظر آئے تھے۔ حالانکہ دونوں کا علاقہ الگ الگ ہے لیکن آج کل دونوں بہت کھل مل رہے ہیں۔ یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ نیا ایس پی بھی خاصی پہنچ والا ہے۔ اسی لیے اس نے شیخ حامد سے پنکا بھی لے رکھا ہے۔“

”ڈی ایس پی سراج کے بارے میں تمہاری ذاتی رائے کیا ہے؟“ جگا نے سوال کرنے کے بعد بات بناتے ہوئے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ وہ اصول کا پابند اور فرض شناس آفیسر ہے؟“

”میرا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ پولیس کی اگاڑی پچھاڑی سے انسان جتنا دور رہے اتنا ہی بہتر ہے۔ تم خاص طور پر سراج کے لیے کیوں معلوم کر رہے ہو؟“

”یوں ہی۔“ جگا نے پھر بات کول کرنے کی کوشش کی۔ ”پچھلے دنوں میرا ایک واقف بے گناہ رگڑے میں آگیا تھا۔ تفتیش کے بعد سراج ہی نے اسے ذاتی فیصلے پر چھوڑ بھی دیا تھا۔“

”میں بھی دو تین مہینے اس کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔ دوسروں کے مقابلے میں وہ بہر حال زیادہ انصاف

پسند ہے۔“

کچھ دیر تک امداد علی اور جگا کے درمیان مشترکہ امور پر گفتگو ہوتی رہی پھر جگا نے کہا۔

”گیسٹ ہاؤس سے جس کی لاش ملی ہے اس کا نام کسی طرح معلوم ہو سکے تو مجھے ضرور بتانا۔“

”کوئی خاص بات معلوم کرانی ہے؟“

”ہاں.....“ جگا نے سیاہ قام ہاشم کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”اگر گیسٹ ہاؤس میں ملنے والی لاش اسی کی ہے تو پھر اس میں بھی شیخ حامد ہی ملوث ہوگا۔“

”کیوں؟ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہو؟“

”جس روز اسپورٹس کار کے حادثے میں مرنے والا

میری فرنیچر والی دکان پر آیا تھا اسی روز ہاشم بھی مجھ سے ملا تھا۔ وہ کسی دوسری پارٹی کے لیے کام کر رہا تھا۔ تمہاری اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ شیخ حامد کی رہائش پر حملہ کرانے کی خاطر ہاشم نے چار بندے مجھ سے بھی حاصل کیے تھے۔“ جگا نے پوری تفصیل دہراتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”بڑا کھرا اور معاملے کا پکا بندہ تھا۔“

”کیا اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کس پارٹی کے لیے کام کر رہا تھا؟“

”نہیں.....“

”پھر یہ معاملہ بھی کھنگالنا پڑے گا۔“ امداد علی نے سنجیدگی سے اظہار خیال کیا۔ ”کھوج لگانا ہوگا کہ دوسری پارٹی کون ہے جو شیخ حامد جیسے خطرناک آدمی سے ہتھ لڑا رہی ہے؟“

”بندہ سر سے کفن ہاندھ لے تو طوفان کا منہ بھی پھیر سکتا ہے۔“ جگا نے پھریری لے کر جواب دیا۔ ”میں بھی زیادہ دنوں تک چھین چھپائی کا کھیل جاری نہیں رکھ سکتا لیکن تم سے مشورہ کرنے کے بعد میں شیخ حامد کو بھی دیکھ لوں گا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔“

”جلد ہاڑی سے کام نہ لیتا۔“ امداد علی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اگر اس کی نوبت آہی گئی تو پھر میں بھی تیرے ساتھ ہی شانہ بشانہ رہوں گا۔ کچھ چھوٹا موٹا قرض مجھے بھی منانا ہے۔“

”یہ ہوئی نا بات..... ایک اور ایک مل کر ہم گیارہ ہو جائیں گے۔“ جگا نے خوشی کا اظہار کیا پھر اس نے دوبارہ ہاشم کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے کہا۔

”تو فکر نہ کر..... میں مرنے والے کا نام بھی معلوم کرنا ہوں، کل تک بتا سکوں گا..... رب را کھا۔“

”رب رکھا.....“ جگانے موبائل آف کیا پھر اپنے ساتھی سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔

دارا رستم علی کو بیرون ملک سے تعلیم مکمل کر کے واپس آئے تقریباً ڈیڑھ سال گزر چکے تھے لیکن پانچ سال تک وہاں کے ماحول نے اس کے ذہن پر جو گہرے نقوش مرتب کیے تھے اس کا اثر ابھی تک اس کے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ وہاں کی تہذیب اسلام کے منافی ضروری لیکن وہاں کا رہن سہن، اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی، صاف ستھرا ماحول اور خاص طور پر قانون کی بالادستی نے اس قدر متاثر کیا تھا کہ وہ ابھی تک اسے بھول نہیں سکا تھا۔ وہاں قانونی معاملات میں جج اور جیوری جو فیصلہ کرتے اس میں چھوٹے بڑے کی تیز سے بالاتر ہو کر صرف جرم کی نوعیت اور اس کی شدت کو دیکھا جاتا تھا۔ اسی کے مطابق فیصلہ بھی سنا دیا جاتا تھا۔ وہاں کسی قسم کی سفارش یا رشوت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ اس ملک کے باشندوں کے علاوہ دوسرے ممالک کے بڑے بڑے سفارت کاروں کو بھی کم از کم جرائم اور اس کے سد باب کے سلسلے میں کوئی رعایت نہیں دی جاتی تھی، قانون کے فیصلے کا معیار سب کے لیے یکساں تھا۔

دارا نے وہاں کئی وارداتوں کی تفصیل اخبارات اور ٹیلی وژن پر بھی دیکھی اور پڑھی تھی سب سے تعجب اسے ایک ایسے کیس میں ہوا جہاں ایک ملک کے فرماں روا کو بھی جو کئی اعتبار سے اس ملک پر فوقیت رکھتا تھا، اپنے ایک شہزادے کے سلسلے میں بھی قانون کے سامنے زبان کھولنے اور کسی قسم کا احتجاج کرنے سے گریز کرنا پڑا۔ قانون کے ذمے داروں نے محض ایک ہفتے کی سماعت کے بعد واردات میں ملوث شہزادے کو عمر قید کی سزا سنائی تھی۔ اس کیس میں ملوث شہزادے نے بھی یہ سوچ کر اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا کہ جو ملک کئی معاملات میں اس کے باپ کے سامنے سر جھکائے کھڑا رہتا تھا، اس کے ساتھ یقیناً اپنی مجبوری کے تحت رعایت سے کام لے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ قانون کا فیصلہ شہزادے کے باپ کو بھی تسلیم کرنا پڑا لیکن..... وہی دارا اب اپنے ملک میں حکومت کو ہر سال کروڑوں کانگس ادا کرنے کے بعد بھی ایک ایسے معاملے میں بے بس تھا جہاں ایک مشتبہ کاروباری حریف نے اس کے باپ کو اس کی اپنی چھت کے نیچے اپنے شکاری کتوں کے ذریعے زبان بند رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی ایک گھریلو ملازمہ کو گولی مار کر زخمی کر دیا گیا تھا جسے علاج کی خاطر بھی چوری چھپے ایک اسپتال میں داخل کر لیا

گیا۔ وہ ملازمہ قانون کے لیے ایک اہم اور ناقابل تردید ثبوت تھی لیکن سینٹر رستم علی آغا خانی جو چیئرمین آف کامرس کا نائب صدر تھا وہ بھی اس جرم یا مجرموں کے خلاف زبان کھولنے سے خوفزدہ تھا، قانون تو دور کی بات تھی، اس نے خود دارا اور اس کی جرمین نژاد بیوی روشنا کو بھی اس معاملے کی کوئی بھینک نہیں لگنے دی تھی۔ دودھ کی مکھی ہی کی طرح الگ رکھنا مناسب خیال کیا تھا۔

اس وقت بھی دارا کے ذہن میں روشنا کی زبانی سنی ہوئی کہانی گونج رہی تھی۔ اس نے اپنے ذرائع سے اس بات کی تصدیق بھی کرائی تھی کہ اس کی گھریلو ملازمہ گلابا بھی ایک اسپتال میں زیر علاج تھی جہاں اس کے مرض کی نوعیت کو دوسرا رنگ دیا گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اگر کوئی لگنے والی کہانی سامنے آجاتی تو پولیس اور قانون کے ٹھیکیدار اسپتال کو اس بات کا ذمے دار ٹھہراتے تھے کہ انہوں نے قانون کے علم میں لائے بغیر اسے داخل کیوں کیا؟ دارا کے لیے یہ قانون بھی انوکھا تھا۔ اس نے دنیا کے جو ممالک دیکھے تھے وہاں کے اسپتالوں کا قانون اس سے مختلف تھا، وہاں انسانی جان کو سب سے پہلے بچانا ڈاکٹروں کا اولین فرض تھا۔ پولیس کو اس کی نوعیت سے آگاہ کرنا قانونی حیثیت رکھتا تھا۔

دو روز سے وہ اسی ابھمن میں گرفتار تھا۔ ایک دو بار اس نے باپ سے بھی مکمل کربات کرنے کی کوشش کی لیکن کئی وجوہ سے خون کا گھونٹ پی کر چپ رہا مگر یہ بات اسے پریشان کر رہی تھی کہ جو کاروباری حریف آج اس کے باپ کو غیر قانونی حرکت سے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر رہے تھے۔ کل اسے بھی اپنا ہدف بنانے سے گریز نہ کرتے۔ اسی خیال کے پیش نظر آج وہ ایک آخری فیصلہ کر کے باپ کے پرسنل آفس میں آیا تھا لیکن رستم علی کو ایک اہم میٹنگ میں جانا تھا اس لیے وہ اسی کمرے میں بیٹھ کر حالات کا جائزہ لے رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی، اس نے غیر اختیاری طور پر ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ عام حالات میں وہ باپ کی کال ریسیو کرنے کے اصول کے خلاف ہی تھا۔

”ہیلو.....“ اس نے ماؤتھ پیس میں حسب معمول ایک رٹا ہوا جملہ دہرایا۔ ”رستم علی گروپ آف انڈسٹریز.....“

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے گلابا کی خاطر بھی دور اندیشی سے کام لیا۔“ دوسری جانب سے کسی نے بازاری لب و لہجہ میں اپنی برتری ظاہر کرنے کی خاطر بڑی دنگ آواز میں کہا۔ ”آئندہ بھی اس بات کا خیال رکھنا کہ تم اب اس

مال میں نہیں ہو کہ زبان کھول سکو۔ دوسری شکل تم بھی ہاتھ ہو کہ جو ثبوت حاصل کیے گئے وہ تمہیں کسی کو منہ مالنے کے بجائے خود کشی پر مجبور کر دیں گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”تم.....“ دارا نے تیز لہجے میں جواب دینا چاہا لیکن ہفت کسی فوری خیال سے خود پر قابو پاتے ہوئے پسپائی کا اہم اذ اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اب تم کیا چاہتے ہو.....؟“ ”صرف ان کاروباری معاملات میں کسی کو گتے کی طرح تمہاری خاموشی جن کے بارے میں تمہیں ایسا کرنے کا حکم دیا جائے۔“ اس بار بھی تعجبک آمیز انداز میں کہا گیا۔ ”کیا ہم فون کے بجائے آٹے ساٹے بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے؟“ دارا نے اپنی رگوں میں کھولتے ہوئے خون کی شدت پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”تم نے غلط اندازہ لگا یا رستم علی..... میں وہ نہیں بول رہا جو تم سمجھ رہے ہو؟“

”پھر..... تم کون ہو.....؟“ ”باس کے حکم پر دم ہلانے والا ایک ادنیٰ خادم..... جو زبان چلانے کے علاوہ باس کے حکم پر اپنی کپٹی پر پستول رکھ کر لہلی دبانے سے بھی کبھی دریغ نہیں کرتا۔“ دوسری جانب سے بولنے والے کا لب و لہجہ سرد و سفاک ہو گیا۔ ”جو کہا کیا ہے..... اسی پر تم بھی دم ہلاتے رہو۔ زبان کھولنے یا کوئی چال چلنے کی غلطی کی تو پھر تمہارے بیٹے اور اس کی خوبصورت بیوی کا نمبر بھی آسکتا ہے۔“

دارا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اسے جس بات کا خطرہ تھا وہ بات مکمل کر اب اس کے سامنے آ رہی تھی۔ اس نے پہلو بدل کر تھملائے ہوئے کہا۔ ”ایک بات تم بھی یاد رکھو، بات اگر دارا یا روشنا تک پہنچی تو پھر میں بھی برداشت نہیں کروں گا۔“

”کیا کرو گے آغا خانی.....؟“ خشک انداز میں سوال کیا گیا۔ ”اب خود کشی کرنے کے موا تمہارے پاس اور کیا آپشن رہ گیا ہے؟“

”جب انسان مرنے کی ٹھان لے تو پھر وہ اپنے ساتھ دوسرے کو ختم کر دینے یا کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔“ دارا نے اس بار بھڑک کر جواب دیا۔ ”میں سینہ عثمان نہیں ہوں جو تمہارے سامنے ہتھیار ڈال گیا۔“

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے.....؟“ ”میں تم جیسے پالتو، دم ہلانے والوں سے بات نہیں کر سکتا۔“ دارا نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”اپنے بگ باس سے کہو

کہ مجھ سے براہ راست بات کرے۔“ ”تمہیں یہ جسارت بھی مہنگی پڑے گی۔“ دوسری جانب سے دھکے چھے انداز میں ایک وارنگ دینے کے ساتھ ہی لائن منقطع کر دی گئی۔ دارا کا پورا وجود سلگ اٹھا۔ بات اب اس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ وہ باپ کے کمرے سے اٹھ کر اپنے دفتر میں آ گیا۔ اپنے ذرائع سے اس نے یہ معلوم کرانے کی کوشش کی کہ کچھ دیر قبل آخری بار کس نمبر سے رستم علی کے نمبر کو کال کیا گیا تھا۔ جواب اس کی توقع کے عین مطابق تھا، مذکورہ کال کسی پبلک بوتھ سے کی گئی تھی۔

دارا کا ذہن اس وقت اس قابل بھی نہیں رہا تھا کہ پرسکون انداز میں دفتری امور کو دیکھتا، اس کے ذہن میں ”شیخ حامد“ کا نام کسی نیون سائن کی طرح خطرے کی علامت بن کر بار بار جل بھڑکتا رہا تھا۔ اس کے پاس حالات کی روشنی میں صرف تین آپشنز تھے۔ پہلا یہ کہ روشنا کے ذریعے جو کچھ معلوم ہوا تھا اور ماں نے بھی جس انداز میں اصل باتیں چھپانے کی خاطر ایک فرضی کہانی سنائی تھی اسے یکسر ذہن سے نکال دینا۔ صرف اپنے کام سے کام رکھنا لیکن..... رستم علی کی واحد اولاد ہونے کے رشتے سے یہ بات اس کے لیے ممکن نہیں تھی۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ باپ سے مکمل کربات کرنا اور وہ بات معلوم کرنے کی کوشش کرنا جس کے منظر عام پر آنے کے بعد..... فون کرنے والے کی دھمکی کے مطابق رستم علی زبان کھولنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، کسی کو منہ دکھانا بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ ایسا کیا ثبوت تھا جس کے سامنے آجانے کے بعد اس کا باپ زندگی پر موت کو ترجیح دیتا؟ تیسرا راستہ یہ تھا کہ دارا ذاتی طور پر ان معاملات کی چھان بین کر کے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا یا پھر..... خاموشی سے باپ کو حالات کے رحم و کرم پر تنہا چھوڑ کر خود روشنا کے ساتھ ہمیشہ کے لیے بیرون ملک چلا جاتا۔ تا دیر وہ ان تمام ممکنہ آپشنز پر غور کرتا رہا پھر اس نے ایک آخری فیصلہ کر لیا۔ اپنی ذاتی حیثیت میں مشتبہ فرد کو کھوج لگا کر پردہ سے باہر لانا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا فیصلہ۔ اس اہم فیصلے کی روشنی میں اس نے اپنے ایک پرانے جگر دوست عاطف سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

عاطف دارا کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا اور چار ماہ پیشتر ہی فوج سے بحیثیت میجر ریٹائر ہوا تھا۔ اس کی ریٹائرمنٹ میں اس کی عمر کا نہیں بلکہ ایک حادثے کا دخل تھا جس کے بعد اسے تمام اعزازات اور تمغہ شجاعت سے نوازنے کے بعد ریٹائر کیا گیا تھا۔ میجر عاطف ایک نڈر، بے خوف اور فرض

شاس آفسر تھا، اپنی ذہانت، کارکردگی اور بڑے باپ کا بیٹا ہونے کے سبب اعلیٰ حلقوں میں اس کا اثر و رسوخ بھی تھا۔ عاطف اور دارا کی ہر دس پندرہ دن بعد ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں، ان ملاقاتوں میں وہ ہمیشہ بے تکلف دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے دنیا جہان کی باتیں کرتے تھے۔ میجر عاطف..... ریٹائر ہونے کے دو ماہ بعد ہی ایک اور صدمہ بھی لاحق ہوا تھا، اس کی محبوب بیوی جسے وہ بے پناہ چاہتا تھا اچانک ہارٹ ایکٹ کا شکار ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اس سانحے کے بعد دارا برابر اس کا غم بٹانے کی اپنی ہی ہر ممکن کوشش کرتا رہا تھا، روشنائی بھی دارا کا بھرپور ساتھ دیا تھا جس کی وجہ سے میجر عاطف نے جلد ہی اپنے غم کو دل کے نہاں خانوں تک محدود کر لیا۔

دارا نے ایک آخری فیصلہ کر کے اسی وقت عاطف کو کال کیا پھر اسی شام دفتر سے اٹھ کر وہ سیدھا عاطف کے پاس چلا گیا۔ اس موقع پر اس نے روشنا کو ساتھ لیتا مناسب نہیں سمجھا۔ عاطف سے بہت دیر تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ عاطف بھی اس کے ساتھ کھل مل کر باتیں کر رہا تھا لیکن پھر اچانک اس نے دارا کو سنجیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو تم نے آج کسی خاص وجہ سے روشنا کو ساتھ لانا مناسب نہیں سمجھا۔“

”مجھے خوشی ہے کہ تمہاری مطلوبہ ذہانت ابھی تک برقرار ہے۔“

”کوئی خاص مسئلہ درپیش ہے؟“ عاطف نے بہ دستور سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ہاں..... لیکن ایک شرط ہے۔“ دارا نے کسماکر جواب دیا۔ ”تم اس کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔ روشنائی بھی نہیں۔“

عاطف نے اقرار میں گردن کو جنبش دی، وہ دارا سے تفصیل جاننے کا منتظر تھا۔ دارا نے کچھ توقف کے بعد اسے پوری تفصیل سنائی۔ جو فون کال ریسیو ہوئی تھی اس کے بارے میں بھی بتا دیا۔ گلابو کے سلسلے میں روشنائی جو معلومات فراہم کی تھیں وہ بھی دہرا دیں۔ اپنا منصوبہ بغیر کسی ترمیم کے بیان کر دیا۔ عاطف پوری توجہ سے سن رہا تھا کچھ توقف کے بعد بولا۔

”تم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ مجھے پسند آیا۔ حالات کے پیش نظر انکل کو تنہا چھوڑ دینا تمہیں زیب بھی نہیں دے گا۔“

”ایک بات اور.....“ دارا نے کہا۔ ”بہتر ہوگا کہ تم کوئی ایسا مشورہ دو کہ میں بھی منظر عام پر نہ آؤں۔ مجھے اپنی

فکر نہیں لیکن دشمن روشنا کو بھی اپنا ہدف بنا سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر شاید میں کسی بھی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر کچھ بھی کر گزروں گا۔“

”ریلیکس۔“ عاطف نے دارا کو سمجھایا۔ ”جلد ہاڑی اور جذبات پر اگر انسان کی گرفت کمزور پڑ جائے تو پھر وہ کوئی جنگ نہیں جیت سکتا، میں تمہاری تمام باتوں کو سمجھ رہا ہوں۔ تم فی الحال سامنے نہیں آنا چاہتے تو نہ آؤ لیکن ایک بار دشمن کے بارے میں یقین ہو جانے کے بعد تمہیں یا انکل کو بہر حال سامنے آنا پڑے گا۔“

”یو آر رائٹ“ دارا نے ہونٹ چہاتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر ضرورت پڑے تو پھر میں ڈیڑے کے بجائے خود سامنا کرنے سے پیچھے بھی نہیں ہوں گا۔“

”تمہیں اس بات کا شبہ کس حد تک ہے کہ شیخ حامد ہی ہمارا وائڈ کرمل..... ہے؟“ عاطف نے بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”نوے فیصد۔“ دارا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”ڈیڑے سے دو شتر وہ ہائمر ڈسینٹ مشن کو بھی میدان سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر چکا ہے۔“

”اوکے..... پہلے اسی کو چیک کرائے لیتے ہیں۔“ میجر عاطف نے بڑے سکون سے کہا پھر اپنا موبائل اٹھا کر کسی کے نمبر شیخ کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہو جانے کے بعد اس نے موبائل کا مائیک آن کر دیا تاکہ دارا بھی تفصیلی گفتگو سن سکے۔

”ہیلو..... ڈاٹ، ڈاٹ، دن فور آن دی لائن۔“ دوسری جانب سے کسی نے ٹھوس آواز میں مخصوص کوڈ نمبر سے اپنی شناخت کرائی۔

”اٹ از آپریشن حمرٹی سکس۔“ عاطف نے بھی کوئی مخصوص ریفرنس دیا۔

”ہیلو سر..... کیسے یاد کیا خادم کو.....؟“ اس بار بے تکلفی کے ساتھ بڑے مہذب انداز میں پوچھا گیا۔

”تمہاری ضرورت پیش آگئی ہے۔ کام ٹاپ بیکرینٹ نوٹیت کا ہے اس لیے میں نے تمہیں تکلیف دینے کے لیے.....“

”تو فار میٹل سر.....“ عاطف کی بات کاٹ کر کہا گیا۔

”میں اب بھی آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتا۔ آپ کام بتائیں۔“

”ایک مشتبہ شخص کی نقل و حرکت واپس کرنی ہے۔“ عاطف نے سنجیدگی سے مطلب کی بات کی۔ ”ایک ہفتے بعد تمہاری رپورٹ کے بعد ہی کوئی فائل آپریشن کا فیصلہ کروں

ککشول

۱۔ میرا ذاتی ہی کام سمجھنا۔“

”آپ نام اور پتا بتا دیں سر..... میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“

جواب میں عاطف نے شیخ حامد کا نام اور دیگر ضروری کوائف بتانے کے بعد کچھ دیر کی جملے ادا کیے پھر کال منقطع کر دی۔

”کون تھا.....؟“ دارا نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ہے ایک کماٹروڈ کا سب سے ذہین آدمی.....“

عاطف نے جواب دیا۔ ”کسی وجہ سے آج بھی میری بے حد عزت کرتا ہے۔ اس کے لیے ایک ہفتے کی مہلت بھی بہت ہوگی۔ اتنا ہا صلاحیت ہے کہ کسی سب میرین کے پندے میں سوراخ کرنے کا کام انجام دینے میں بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔“

”گلابو کے سلسلے میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟ کہا میں کسی اور شخص سے اس کی زبان سے سچ اگلوانے کی کوشش کروں۔ ہو سکتا ہے وہ اس شخص کی کچھ نشاندہی کر سکے جس کی گولی نے اسے موت اور زندگی کی کشمکش سے دو چار کر دیا تھا۔“

”یہ دے داری بھی میرے اوپر چھوڑ دو۔ پولیس کے جھگے کے کچھ سینئر آفسرز سے بھی میری سلام دعا ہے۔“ عاطف نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ بھی ڈاٹ، ڈاٹ ون فور کی طرح میری عزت کرتے ہیں۔ بکنے والے لوگ بھی نہیں ہیں۔“

دارا نے عاطف کا جواب سن کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد ان کے درمیان کچھ دوسرے موضوعات پر کھل کر ہنسی مذاق کی بے تکلفانہ باتیں شروع ہو گئیں۔ دارا کو محسوس ہو رہا تھا کہ عاطف سے اپنی پریشانی ہانپنے کے بعد اس کے ذہن سے جیسے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔

شیخ حامد اس وقت اپنے مخصوص ساؤنڈ پروف کمرے میں بیٹھا دوسرا پیگ مٹم کر رہا تھا۔

عام حالات میں وہ دفتر میں بیٹے پلانے کے خلاف تھا لیکن..... آج وہ خلاف معمول بہت خوش تھا، اس کی نظریں بار بار کنول کے کمرے کے اس دروازے کی جانب اٹھ رہی تھیں جو اس وقت بند تھا۔ دفتر کے لوگوں کو اس بات پر حیرت تھی کہ کنول نے اچانک ملازمت سے استعفیٰ کیوں دے دیا ہے؟ بات بھی قابل توجہ تھی کہ بگ باس نے وہ استعفیٰ منظور کس طرح کر لیا؟ سب ہی محسوس کر رہے تھے کہ کنول ایک حسین اور اہم گنہگار تھی اور شیخ حامد اس قسم کی حسین لڑکیوں کو آسانی سے اپنے جال سے نکلنے کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا۔ ایسا

صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب وہ اس ہیرے کی تراش خراش سے بھی پوری طرح سیر ہو کر اپنی پیاس بجھالے اور دل کی حسرتیں اچھی طرح پوری..... ہو جائیں۔ کنول کو اس نے جو خاص مراعات دے رکھی تھیں، وہ بھی اس سے پہلے کسی اور خاتون ور کر کو حاصل نہیں تھیں۔ پھر، کنول کا اچانک ملازمت ترک کر دینا اور بگ باس کی خاموشی۔ دونوں ہی ایسے سوال تھے جن کا جواب دفتر کے لوگوں کے لیے تعجب خیز تھا مگر وہ اس بارے میں صرف دل ہی دل میں سوچ سکتے تھے، زبان نکھولنے کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔

شیخ حامد کا دفتری اوقات میں شراب نوشی کرنا بھی خلاف معمول تھا۔ خود شبنم بھی ساؤنڈ پروف کمرے میں قدم رکھتے وقت چونکی تھی۔ اس کے اپنے ذہن میں بھی کچھ خطرات نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ ”ہو سکتا ہے اس شراب نوشی کا خمار اسی کی ذات پر سر دھوتا۔“ یہ تصور ہی اس کے لیے کسی بھونچال سے کم نہیں تھا لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے قدموں واپس لوٹ جاتی۔ اس لیے اس کی عزت کا بھرم بھی ”مخرب اخلاق تصویروں“ کی شکل میں شیخ حامد کے پاس محفوظ تھا۔ وہ جبراً مسکراتے ہوئے آکے بڑھی۔ شیخ حامد نے اسے مسکرا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر ایک چسکی لے کر کنول کے بند دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے عجیب انداز میں بولا۔

”آج تم خلاف معمول زیادہ میک اپ اور ٹپ ٹاپ کنڈیشن میں نہیں ہو.....؟ کوئی خاص وجہ ہے؟“

”صبح آنکھ دیر سے کھلی تھی اس لیے موقع نہیں ملا۔“

”مجھے اطلاع مل چکی ہے کہ تم نے کل کا دن کن مصروفیات میں گزارا تھا۔“ شیخ حامد نے شبنم کے خدو خال پر ایک اچھتی نظر ڈال کر کہا۔

”آپ نے نہ بلایا ہوتا تو میں خود رپورٹ دینے آتی۔“

”کوئی خاص بات.....؟“

”میں نے افضل خان کو پوری طرح کھجال کر دکھا لیا ہے۔“ شبنم نے سنبھل کر کہا۔ ”وہ اب اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ آپ کے کسی حکم سے انکار کر سکے۔ میں نے اسے اپارٹمنٹ میں ساتھ رہنے والی بات بھی بتا دی۔ اس نے کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔“

”ہوں.....“ شیخ حامد نے ایک گھونٹ لیتے ہوئے شبنم کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔ ”اسے دکھ تو ہوا ہوگا کہ اب اس اپارٹمنٹ میں اس کی حیثیت وہ نہیں ہوگی جو پہلے تھی۔“

ماہنامہ سوری ڈائجسٹ



مئی 2012 کی کرناٹ
نئے شمارے کی بات
نئی ہنگامہ خیزیاں

اننگ و سٹنگ

پروہ سیمین تھسرتی، گلی اور رنگت کھیرتی پستلیاں کے پیچھے
کلاسز خوف و ہشت میں بچی مسلا شاید کی لہو رنگستان

مغرب کے نرالی انداز

مغربی نیکیا کی تہذیب اور حول کی عکاسی اور محبت کی پزیردہ ناقابل فراموش کہانیاں

گرک ڈاٹ

پروہ چاند نکال کے ایک منزل کی جانب گزرنے لگا اقلدی کی سلسلے دار کہانی

لنگار

طاہر جلودی مغل کے جلاوطن کی ایک جھلک زینت دلاں لاہور کے سنگ

سرواز کی کہانیاں

جذبات احساسات میں پھسل پڑنے والی طرز کی سنسنی

خیز کہانیاں جو تیر آپ کو حصار میں رکھیں گی

چنی
نکتہ
چنی
آپ کے تہرے
مشورے
اور نئی دلیپ باتیں
کشمکش

کنول کے ملازمت چھوڑنے کے سلسلے میں دفتر
میں گماچہ میگوئیاں ہو رہی ہیں.....؟“ شیخ حامد نے شبیم کی
اٹھال گراسے ٹوٹی نظروں سے دیکھا۔

”سب خاموش ہیں، کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا
اگن..... بہ ظاہر یہی اندازہ ہوا ہے کہ سب کو اس بات پر
حیرت ہی ہو رہی ہے۔“

”کیوں.....؟ اس میں حیرت اور تعجب کی کیا بات
ہے؟“

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ شبیم نے جان
بچانے کی کوشش کی۔

”مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا بھی انسان کی سرشت اور
فصلت میں شامل ہے۔ تم اپنی ہی مثال لے لو۔“ شیخ حامد
نے کینٹینی بدل کر شبیم کے سر اپار پر نظر ڈالی۔ ”کیا تم اس پوزیشن
میں ہو کہ میری کسی بھی خواہش سے انکار کر سکو؟“

”نہیں..... نہیں۔“ شبیم ہٹکا کر رہ گئی۔

”وجہ.....؟“

”میری ایک غفلت یا کمزوری آپ کے پاس محفوظ
ہے.....“ اس نے نظریں جھکا کر صاف گوئی سے جواب دیا۔

”میں اپنی زندگی کو موت کے حوالے تو کر سکتی ہوں لیکن.....
انکار نہیں۔“

”یو آر۔ رائٹ۔“ شیخ حامد نے فاتحانہ مسکراہٹ سے
کہا پھر ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ”کنول کے سلسلے میں مجھ سے
ایک چوک ہو گئی۔ اس سے پیشتر کہ میں اس کے پرکرتا وہ
اتھ سے نکل گئی، میں اب بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ اسے
اپنے قدموں میں جھکا سکوں لیکن مجھے اپنی ریپوٹیشن کا زیادہ
خیال ہے۔“

شبیم نے نظریں اٹھا کر بگ باس کو دیکھا لیکن کوئی
جواب نہیں دیا۔

”قارگٹ دس ٹاپک..... یہ بتاؤ کہ افضل خان سے
ملاقات کے دوران تم نے اور کیا محسوس کیا؟“

”یہی کہ اب وہ آپ کے اشاروں پر اپنے گلے میں
چالسی کا پسند اڈالنے سے بھی انکار نہیں کرے گا۔“

”اور کچھ.....؟“

”ایک بات اور بھی ہے باس۔“ شبیم نے ڈھپنی
مہر شڈنٹ لودھی کے بارے میں غور کرتے ہوئے بڑی
صاف گوئی سے اس کی ملاقات کا پورا احوال بھی سنا دیا۔ شاید
بگ باس بھی یہی کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ شبیم کو شبہ تھا کہ اس کا
عاقب بھی ضرور کیا گیا ہوگا۔

دائبریشن نے شیخ حامد کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ اس
نے اسکرین پر نظر آنے والے نمبروں کو دیکھ کر موبائل اٹھا کر
کانوں سے لگا لیا۔ بے حد سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”کیا رپورٹ ہے.....؟“

”باس..... ڈی ایس پی اور ایس پی میں آج کل کچھ
زیادہ ہی ٹکٹے لگی ہے۔ ہاشم کے معاملے میں بھی دونوں بڑی
سرگرمی دکھا رہے ہیں۔“

”اس کی موت کی پشت پر کس کا ہاتھ ہے.....؟“

”اس نے خودکشی نہ کی ہوتی تو ہم نے اس کا قصہ
پاک کر دیا ہوتا لیکن یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ.....“

”نان سنس!“ شیخ حامد نے جھلا کر کہا۔ ”جتنا پوچھا گیا
ہے صرف اس کا جواب دو۔“

”سوری باس..... میں نے آدمی پیچھے لگا دیے ہیں۔
جس نے ہم سے پہلے شکار کر لیا ابھی اس کا کھوج نہیں ملا
لیکن.....“

”دوسرے باسٹرڈ کی کیا رپورٹ ہے؟“ اس بار بھی
دوسری طرف سے پورا جملہ سننے بغیر سوال کیا گیا۔

”ہم نے وہ پورا ٹھکانا ہی اڑا دیا تھا مگر وہاں سے کوئی
لاش نہیں ملی۔“

”پھر..... تمہاری اس کارکردگی پر کیا انعام دیا
جائے؟“ شیخ حامد کا لہجہ ایک دم ہی خطرناک ہو گیا۔

”ہم کوشش کر رہے ہیں باس..... بہت جلد اس کا
سراغ بھی لگالیں گے۔“ دوسری طرف سے عاجزی کا اظہار
کیا گیا۔ ”ہمارے لوگ پوری طرح محتاط اور چوکس تھے،
مطلوبہ آدمی کیسے اور کس طرح نکل گیا یہ بات.....“

”ریش.....!“ شیخ حامد نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے
سفاک لہجے میں کہا۔ ”میں پر اسرار کہانیاں سننے کا عادی نہیں
ہوں۔ تمہیں صرف دو روز کی مہلت اور دی جا رہی ہے۔“

”رائٹ سر.....“

”جو لوگ سر جوڑ رہے ہیں، انہیں بھی اب ایک ہلکے
شاک کی ضرورت ہے۔ اس بات کا خیال رہے کہ بات مرہم
ہٹی سے گزر کر قبرستان تک نہ پہنچے۔“

”سمجھ گیا باس.....“

”آج رات کے لیے جو ہدایت دی ہے اس کا خیال
رکھنا۔“ شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا پھر موبائل
آف کر دیا۔

”باس.....“ شبیم نے ہمت کر کے دبی زبان میں
پوچھا۔ ”کیا میں کسی کام آسکتی ہوں؟“

شبیم نے کسمسا کر دبی زبان میں جواب دیا۔ ”میں
نے اس پر فی الحال یہ ظاہر کیا ہے کہ اس اپارٹمنٹ کو سننے
سرے سے فرنشڈ کرا کے ہم دونوں کو مشترکہ طور پر بہ طور حسن
کار کردگی، انعام دیا گیا ہے۔“

شیخ حامد نے کسی رد عمل کا اظہار کرنے کے بجائے شبیم
کو وضاحت طلب نظروں سے گھورا۔

”سوری سر.....“ شبیم نے پہلو بدل کر کہا۔ ”میں
نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ کچھ دنوں ساتھ رہ کر افضل
خان کو قریب سے چیک کروں اور..... خود کو اس طرح پوز
کروں کہ اسے خود بھی میری حیثیت کا اندازہ ہو جائے۔ اس
کے بعد وہ جس رد عمل کا مظاہرہ کرے گا وہ ہمارے لیے
زیادہ کارآمد ہوگا۔“

”گڈ.....“ شیخ حامد نے اس بار خشک لہجے میں اسے
سراہنے کے ساتھ ساتھ تنبیہ بھی کی۔ ”تمہاری یہ پالیسی
زیادہ کارآمد ہو سکتی ہے لیکن آئندہ محتاط رہنا۔ مجھ سے مشورہ
کیے بغیر آئندہ بھی ایسی غلطی نہ کرنا۔“

”اوکے۔ باس!“ شبیم نے شپٹا کر اپنی غلطی کا
اعتراف کر لیا۔

”افضل خان کی دم کچھ سیدھی ہوئی یا نہیں؟“

”ایسی ویسی.....“ شبیم نے سنجیدگی سے کہا پھر افضل
خان کے وہ آخری جملے لفظ بہ لفظ دہرائے جو اس نے بگ
باس کے سلسلے میں اور اس کی ساجھ مہربانیوں کا بہ طور خاص
ذکر کرتے ہوئے کہے تھے۔

شیخ حامد نے ایک بار پھر..... کن آنکھوں سے کنول کے
بند دروازے کی جانب دیکھا۔ گلاس میں ہنسی لال پری کو
ایک ہی گھونٹ میں حلق کے نیچے اتارا پھر شبیم کی آنکھوں میں
جھانکتے ہوئے بولا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا اس کے جلوں کے اندر
تمہیں کسی دامنہ والے سانپ کا خیال نہیں آیا جو ایک طرف
خطرہ دیکھ کر بڑی عیاری سے دوسرا رخ اختیار کرتا ہے۔“ شیخ
حامد نے سرسراہی آواز میں کہا۔ ”محبت اور جنگ میں بھی ہر
قسم کے حربے استعمال کرنے کو جائز سمجھا جاتا ہے۔“

”اس شبہ کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن..... اگر
افضل خان نے ایسا کیا تو وہ اس کی زندگی کا آخری دن.....“

”یہ سوچنا میرا کام ہے جان من.....“ اس بار شیخ حامد
نے شبیم کو مختصر نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ان نظروں میں
ایک بیکے ہوئے شرابی کے لڑکھڑاتے قدم دیکھ کر ہی شبیم کو
پھریری آگئی لیکن اسی وقت سامنے رکھے ہوئے موبائل کی

”تمہارا کیا مشورہ ہے لودھی کے سلسلے میں؟“
 ”ہم کسی کو شکار کرنے کی خاطر یہ طور چارابھی استعمال کر سکتے ہیں۔“ شبیم نے ہچکچا کر جواب دیا۔
 ”گڈ..... مجھے تمہارا یہ مشورہ پسند آیا۔“ اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا پھر شبیم کے قریب آ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر جس بے ہاکی سے جھک کر اس کے گال کو چومادہ شبیم کے خون میں نفرت کی لہر دوڑانے کے لیے کافی تھا۔ وہ ذرا سی کسماسکی تو شیخ حامد نے اس کے گالوں پر چنگی لیتے ہوئے کہا۔ ”ڈونٹ وری سوٹ ہنی..... مجھے اپنا وعدہ یاد ہے، میں ایک حد سے تجاوز نہیں کروں گا۔“
 ”باس.....“ شبیم نے وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ایک سوال کر سکتی ہوں؟“
 ”پوچھو..... لیکن، اس بات کا خیال رہے کہ تمہارا سوال میرے لیے ناقابل برداشت نہ ہو۔“

”آج خلاف معمول، آپ نے دفتر میں.....“
 ”سے نوشی کیوں کی؟“ شیخ حامد نے خود ہی اس کا جملہ پورا کیا پھر بے تکلفی سے اس کے شانوں کو دباتے ہوئے بولا۔
 ”کچھ باتیں راز کی بھی ہوتی ہیں جن کو زبان تک لانا بھی مناسب نہیں ہوتا، مثلاً تمہارا اپنا ہی راز..... جو میری مٹی میں بند ہے۔“
 شبیم ایک بار پھر کسماسک کر رہ گئی۔ دس منٹ بعد ساؤنڈ پروف کمرے سے نکلے وقت بھی اس کے دل میں بگ باس سے نفرت اور حقارت کا سیلاب رہ رہ کر اندر رہا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ذہن کے گوشے میں کلبلا رہا تھا کہ شیخ حامد بار بار اس دروازے کی سمت کیوں دیکھ رہا تھا جہاں کنول بیٹھا کرتی تھی۔ وہ دروازہ تو کنول کے استغنیٰ نے اس پر بند کر دیا تھا؟

❦❦❦

سیاہ فام ہاشم کے پاسپورٹ کے اندراجات نے سراج کی بہت ساری مشکلات حل کر دیں۔ ایئر کمپنی کی مٹی فیسٹ کے ذریعے یہ بات بھی اس نے نوٹ کی تھی کہ مذکورہ فلائٹ سے صرف تین غیر ملکی مسافر فرسٹ کلاس میں آئے تھے جن میں سے ہاشم خود بھی کر چکا تھا۔ سراج نے مذکورہ فلائٹ کی ایئر ہوسٹس سے بھی ملاقات کی جس نے یہ بات بڑے یقین سے کہی تھی کہ خود بھی کرنے والے نے ایک دوسرے جانیئر مسافر لوچن سے بھی کچھ دیر مکمل کر بات چیت کی تھی لیکن تیسرا مسافر اس میں شریک نہیں ہوا تھا۔ تینوں مسافروں کی نشستیں ایک دوسرے سے دور دور تھیں اور یہ ظاہر وہ پہلے سے ایک دوسرے سے واقف نہیں لگتے تھے۔

ہاشم کی تفصیلی رپورٹ کے علاوہ سراج کے ذہن میں میڈم کی شخصیت بھی خاصی اہمیت اختیار کر چکی تھی۔ شیخ حامد کے گھر پر ہونے والے حملے کے بارے میں میڈم نے مکمل کر اقرار نہیں کیا تھا لیکن اتنا ضرور کہا تھا کہ پاؤں کے نیچے دبی ہوئی چیونٹی بھی پلٹ کر کاٹنے کا اختیار رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ میڈم نے جگا کے بارے میں بھی جن معلومات کا اظہار کیا تھا انہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ اسپورٹس کار میں جس شخص کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا وہ بگ باس کا خاص آدمی تھا جس کی موت کے بعد جگا بھی بگ باس کی لسٹ پر آ گیا تھا۔ یہ بھی بڑے وثوق سے کہا تھا کہ جس روز اسپورٹس کار والے کو گولی ماری گئی تھی اس سے دو روز قبل وہ جگا کے خفیہ ٹھکانے پر دیکھا گیا تھا جس کی وجہ سے جگا کی زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ میڈم نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اس موقع پر قانون جگا کو تحفظ دے تو وہ بہت کارآمد بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ جگا کے علاوہ میڈم نے افضل خان کے بارے میں بھی یہ بات کی تھی کہ وہ تین چار روز انڈر گراؤنڈ رہنے کے بعد ہوٹل اسٹار ان میں نظر آیا تھا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر سراج کے ذہن میں کچھ اہم سوالات کا ابھرتا قدرتی امر تھا۔ میڈم روپی کو جگا جیسے گینگ لیڈر اور اسپورٹس کار میں مرنے والے کی خفیہ ملاقات کا علم کس طرح ہوا؟ وہ جگا کو کس وجہ سے تحفظ فراہم کرنے کا مطالبہ کر رہی تھی؟ جگا سے میڈم کا کیا تعلق تھا؟ اسے اسپورٹس کار میں گولی کا نشانہ بننے والے کے بارے میں یہ یقین کس طرح ہوا کہ وہ بگ باس کا دست راست تھا؟ اس کے علاوہ میڈم نے کہا تھا کہ وہ ایک دور دراز میں کچھ اہم معلومات بھی فراہم کرے گی۔ کیا ان معلومات کا تعلق ہاشم کی خودکشی سے بھی ہو سکتا تھا؟ اور اگر ایسا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میڈم کسی نہ کسی طور ہاشم سے بھی واقف تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ہاشم کے علاوہ لوچن اور جہاز کے تیسرے مسافر سے بھی بے خبر نہ ہو؟ اور بھی بہت ساری باتیں سراج کے ذہن میں ابھر رہی تھیں۔ خاص طور پر میڈم کا بگ باس کے بارے میں ایک جملہ رہ رہ کر سراج کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ ”آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ مگر مجھ سے میرے مراسم کس قسم کے ہیں؟“

سراج نے ذاتی طور پر جگا کے بارے میں بھی اپنے خاص کارندوں سے یہ بات معلوم کر لی تھی کہ وہ بھی موقع محل دیکھ کر کہیں انڈر گراؤنڈ ہو گیا ہے۔ ایک مکان کو دھماکے سے اڑا دیے جانے والی واردات کی اطلاع بھی سراج کو مل چکی

ککشول

ہی۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ مکان کے بلے سے کسی انسانی لاش کے کوئی باقیات بھی نہیں ملے تھے۔ پھر، اس دھماکے کا مقصد کیا تھا؟

شام تک وہ ذہنی طور پر الجھا رہا۔ پھر نہا دھو کر فریش ہونے کے بعد اس نے اورنگ زیب کے گھر ڈنر پر جانے سے پہلے میڈم روپی کو کال کرنا بھی ضروری سمجھا۔

”اس وقت کیسے یاد کیا؟“ دوسری جانب سے میڈم کی مانوس آواز ابھری۔

”میں اس وقت آپ سے اپنی سرکاری حیثیت میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ سراج نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”اگر ممکن ہو تو میں آپ کے ساتھ تعاون سے گریز بھی نہیں کروں گی۔“ میڈم روپی نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

”آپ جگا کو اور اسپورٹس کار میں مرنے والے کو کس طرح جانتی ہیں؟“

”ویری سیمپل.....“ میڈم نے سنبھل کر کہا۔ ”اگر بگ باس کا کوئی نمائندہ جگا سے ملے اور اس کی خدمات حاصل کرنے کی خاطر پلاننگ کر سکتا ہے تو یہ حق دوسروں کو بھی حاصل ہے۔“

”آپ کی ذاتی اطلاع کے لیے بتا دوں کہ آج ایک غیر ملکی نے بھی ڈریم فل نامی گیسٹ ہاؤس میں زہر کھا کر خودکشی کر لی ہے۔“ سراج نے کچھ سوچ کر ایک ٹرمپ کارڈ استعمال کیا۔

”میں نہیں سمجھی کہ آپ یہ بات میری اطلاع کی خاطر کیوں دے رہے ہیں؟“ میڈم نے ساٹ لہجے میں حیرت کا اظہار کیا۔ ”ضروری تو نہیں کہ پولیس کی طرح میں بھی شہر میں ہونے والے تمام حادثات کا باقاعدہ ریکارڈ رکھوں۔“

”کیا آپ نے بھی کسی حوالے سے لوچن، ہاشم یا ڈوما کا نام بھی سنا ہے؟ یہ تینوں غیر ملکی ایک ہی فلائٹ سے یہاں آئے تھے۔“

”آئے ہوں گے لیکن میں ان کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

”آپ نے جس جگا کو قانونی تحفظ دینے کی بات کی تھی، وہ بھی کچھ دنوں سے انڈر گراؤنڈ ہے۔“ سراج نے تھملا کر کہا۔

”میرا خیال ہے کہ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ اسپورٹس کار میں مارا جانے والا دور دراز قبل جگا سے ملا تھا اور بگ باس اسے بھی مشکوک سمجھ کر قابل عتاب سمجھ رہا ہے۔ اسی

صورت میں جگا کی روپوشی کو میں اس کی دانش مندی ہی قرار دے سکتی ہوں۔“

”آپ نے کچھ نئی اطلاعات فراہم کرنے کی بھی بات کی تھی؟“

”ضروری تھی لیکن اب مجھے اس کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ اس وقت آپ اپنی سرکاری حیثیت میں بات کر رہے ہیں جبکہ میں نے آپ کو ہمیشہ اپنا ہمدرد اور محسن ہی سمجھا ہے۔ اب بھی سمجھتی ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ اب میری اور آپ کی دوبارہ ملاقات ناممکن ہو گئی ہے۔“ سراج نے خود کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔

”اس میں ہم دونوں کے لیے کچھ نئے خطرات پیدا ہونے کا امکان بھی ہے۔ بہر حال، اگر آپ سرکاری حیثیت میں حکم دیں گے تو میں انکار بھی نہیں کروں گی۔“

”اوکے، میں آپ کو دوبارہ فون کروں گا۔“ سراج نے الجھ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر وہ لیاقت حسین کے ساتھ ایس پی اورنگ زیب کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ فوری طور پر دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد حاصل ہونے والی معلومات اورنگ زیب کے علم میں لانا ضروری سمجھ رہا تھا۔ پچیس منٹ بعد وہ اورنگ زیب کے ساتھ اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تمام معلومات بڑی وضاحت سے بیان کر رہا تھا۔ میڈم روپی کا ذکر کرتا اس نے جان بوجھ کر مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”شکر یہ سراج۔“ اورنگ زیب نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”آپ نے ایک دن میں ہی جو معلومات حاصل کر لیں وہ بہت اہم ہیں لیکن کیا آپ کو اسپورٹس کار میں مرنے والے اور ہاشم کی خودکشی میں بھی کوئی تعلق نظر آتا ہے؟“

”ہو بھی سکتا ہے مگر ابھی بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔“

”آکٹوپس کو کس حد تک ان وارداتوں میں ملوث سمجھا جاسکتا ہے؟“ اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا۔ ”اسپورٹس کار والے کی موت اس کے کھاتے میں نہیں ڈالی جاسکتی۔“ سراج نے جواب دیا۔ ”وہ اسی کا خاص آدمی تھا لیکن سیاہ فام ہاشم کی موت کا معما ابھی تک پوری طرح حل نہیں ہوا۔ بہر حال یہ اسپورٹس کار والے کی موت کا رد عمل بھی ہو سکتا ہے۔“

”گڈ.....“ اورنگ زیب نے سناٹائی انداز میں

جواب دیا۔ ”میں بھی ان ہی امکانات پر غور کر رہا ہوں لیکن خودکشی والی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر آکٹوپس کا ہاتھ ہوتا تو پھر سیاہ فام کو اتنے سکون کے بجائے کسی نہ کسی اذیت ناک مرحلے سے گزار کر موت کے حوالے کیا جاتا۔“

”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا کہانی سناتی ہے؟“ سراج نے پوچھا۔

”موت کسی سریع الاثر زہر کا نتیجہ ہے۔ ہم نے جن حالات اور پوزیشن میں لاش کو دیکھا اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مرنے والے نے کسی وجہ سے از خود ہر پینے کی ٹھان لی تھی ورنہ وہ آخری وقت ٹیلی وژن سے لطف اندوز نہ ہو رہا ہوتا۔“

”میں آپ کے خیال سے متفق ہوں۔ میں نے ایک دو آدمیوں کو کوچن اور ڈوما کی تلاش کا کام بھی سونپ دیا ہے، ممکن ہے ان میں سے کسی کے ہاتھ آجائے کے بعد خودکشی کی کوشش سمجھانے میں آسانی ہو۔“

ایس بی اورنگ زیب ایک لمحے خاموش رہا پھر اس نے سراج کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”جگا کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟“

”میں سمجھا نہیں۔“ سراج، جگا کے حوالے پر چونکا پھر سنبھل کر بولا۔ ”پولیس ریکارڈ کے مطابق اسے ایک گینگ لیڈر ہی ظاہر کیا گیا ہے لیکن وہ صرف ایک بار گرفتار ہوا تھا، اس کی سزا بھی اسے مل چکی ہے، اس کے بعد وہ ہمارے ریکارڈ کے حوالے سے کسی معاملے میں ملوث نہیں پایا گیا۔ ہو سکتا ہے پولیس کے محکمے کی کچھ کالی بھیڑیں بھی اس کا تحفظ کر رہی ہوں۔“

”میں نے آج جگا کی فائل کو بہت غور سے پڑھا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ مجرم نہیں تھا۔ جس معاملے میں اسے سزا ملی، وہ اس کا صحیح طور پر دفاع بھی نہیں کر سکا۔“ اورنگ زیب نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ ”کوئی بھی سزا یافتہ مجرم ہمارے معاشرے میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا اس لیے اپنی معاشی پریشانی دور کرنے کی خاطر اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑتا ہے۔“

سراج کے ذہن میں میڈم کی باتیں صدائے بازگشت بن کر گونجنے لگیں۔ اس نے بھی جگا کے بارے میں ایسے ہی تاثرات کا اظہار کیا تھا اور اب اورنگ زیب جیسا ٹھوس کردار کا حامل ایک ذمہ دار پولیس آفیسر بھی ان ہی خطوط پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔

”آپ نے جو رائے قائم کی ہے میں اس سے انکار

نہیں کروں گا لیکن موجودہ معاملات میں جگا.....“

”کا تعلق بھی کسی نہ کسی زاویے سے ہو سکتا ہے۔“ اورنگ زیب نے سراج کے جملے کو اپنی سوچ کے مطابق آگے بڑھاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ آکٹوپس جگا کی پشت پناہی کر رہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس پارٹی نے آکٹوپس کے مکان پر حملہ کر دیا تھا۔ جگا کے آدمی اس کے لیے کام کر رہے ہوں، دونوں ہی صورتوں میں جگا کا نام درمیان میں لیا جاسکتا ہے۔“

”دوسری پارٹی کون ہو سکتی ہے؟“ سراج نے جان بوجھ کر انجان بننے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ کے ذہن میں کوئی نام ہے؟“

”ہاں.....“ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ”ایک پارٹی تو آپ کے کلاس فیلو سیٹھ عثمان کی بھی ہو سکتی ہے جسے آکٹوپس کے سامنے اپنی شرافت کی وجہ سے گھٹنے ٹیکنے پڑے لیکن..... میں نہیں سمجھتا کہ سیٹھ عثمان جیسا نیک اور سہل پسند کاروباری شخص کوئی غلط اقدام اٹھانے کے بارے میں سوچ بھی سکتا ہو۔ کل تک میرے ذہن میں یہی ایک نام تھا مگر آج ایک نام اتفاقاً میری لسٹ پر اور آ گیا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“ سراج نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ پہلے ہم ڈنر کے ساتھ انصاف کر لیں پھر باقی باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔“

کھانے میں اورنگ زیب نے خاص اہتمام کیا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس نے ہلکے پھلکے مذاق اور تفریح کی باتیں کیں۔ کھانے کے بعد اس نے کولڈ کافی کا اہتمام موسم کی مطابقت سے کیا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ ڈائننگ روم میں آئے تو اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔

”میرے ملازم نے اس آدمی کو نظر انداز نہیں کیا جو آپ کے ہمراہ آیا تھا۔ کیا وہ آپ کا ملازم، میرا مطلب ہے کہ پرائیویٹ ڈرائیور یا کوئی اعتماد والا آدمی ہے۔“

”وہ سیٹھ عثمان کا ڈرائیور ہے، میں نے اسے دس بارہ روز کے لیے اپنے پاس بلالیا ہے۔“ سراج نے کہا پھر اس نے دبی زبان میں لیاقت حسین کے بارے میں کچھ باتیں بھی اورنگ زیب کو بتا دیں۔

”حیرت انگیز۔“ اورنگ زیب نے سراج کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”کیا آپ کو یقین ہے کہ لیاقت حسین کے سر پر کسی مہربان جن یا کسی پہنچے ہوئے بزرگ کا سایہ ہے؟“

”میں اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا

کشکول

میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا وہ یقیناً آپ کے دلچسپ لوگوں میں سے کسی ایک کی تائید ضرور کرتا ہے۔“

”ہو بھی سکتا ہے اس لیے کہ خدا کے معجزے ہر دور میں کسی نہ کسی طور رونما ہوتے رہتے ہیں جنہیں ہماری موتی نظریں تسلیم نہیں کرتیں۔ میں آپ کے مشاہدوں سے بھی رہنمائی کروں گا۔“

”ڈنر سے قبل آپ نے کسی دوسری پارٹی کا ذکر کیا تھا۔“

”اج نے موضوع بدل کر اصل مقصد کی طرف آنے کی کوشش کی۔“

”کیا عثمان کے علاوہ کوئی اور نام بھی سامنے آیا ہے؟“

”ہاں.....“ اورنگ زیب نے مسکرا کر دوستانہ انداز میں جواب دیا۔ ”کھانے کے بعد اگر ہم کچھ دیر ساحل پر

پہل قدمی کر لیں تو کیا حرج ہے؟“

”اچھا خیال ہے۔“ سراج نے بے تکلفی سے کہا۔

”ساحل کا سکون بخش ماحول ہم لوگوں کے لیے کسی ٹانگ سے کم بھی نہیں ہے۔“

”ویل سیڈ یہ بہت مناسب ہے۔“ اورنگ زیب جواب دینے کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ سراج بھی اس کے ساتھ باہر آ گیا جہاں دونوں کی گاڑیوں کے علاوہ ڈرائیور بھی موجود تھے۔ اورنگ زیب نے لیاقت حسین سے بڑی محبت کے ساتھ مصافحہ کیا پھر اس نے سراج ہی کی گاڑی میں باہر جانے کو ترجیح دی۔

اس وقت رات کے دس کا عمل رہا ہو گا۔ اورنگ زیب گے کہنے پر لیاقت حسین نے ساحل کی طرف جانے والا راستہ اٹھالیا۔ ساحل پر پہنچ کر اورنگ زیب بڑی دیر تک سراج کے ساتھ چہل قدمی کرتا رہا۔ سراج کو اس کی بے پروائی پر حیرت آگئی تھی لیکن اورنگ زیب بے فکر نظر آ رہا تھا۔ ایک لمبا چکر لگا کر گاڑی کی طرف واپس آتے وقت اورنگ زیب نے سراج کے دل کا چور پکڑتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے آپ اس وقت ماحول سے لطف اندوز ہونے کے بجائے کسی اور بات سے فکرمند ہیں؟“

”میں انکار نہیں کروں گا۔“ سراج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”آکٹوپس کا زور بھی سمندر کے آس پاس زیادہ چلتا ہے اور میں آپ کو باخبر بھی کر چکا ہوں کہ ہمارے مشترکہ دشمن کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھانے سے دریغ نہیں کریں گے۔“

”اور میں نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ آپ کے ذہن میں ڈیوٹی جوائن کرنے سے پیشتر ہی میں نے اپنی سکیورٹی کا عقول بندوبست کر لیا تھا۔“ اورنگ زیب نے بے پروائی سے کہا۔ ”اس وقت بھی کچھ مخصوص لوگ آکٹوپس کی طرف

سے پوری طرح چوکس ہوں گے۔ ویسے موت اگر لکھ دی گئی تو اس کے مقرر کردہ وقت اور جگہ کو کوئی بھی نہیں ٹال سکتا۔“

تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہ گاڑی میں بیٹھ کر دوبارہ شہر کی جانب روانہ ہوئے۔ سراج نے ایک بار پھر دوسری پارٹی کا ذکر چھیڑا تو اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہم اس وقت اسی پارٹی کے ایک ذہنی کی عیادت کے لیے چل رہے ہیں، فی الحال ہمیں سب کچھ اُن آفیشلی کرنا ہے۔ یہ کام ایک دیرینہ دوست نے مجھے سونپا ہے، آپ کی اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ وہ بھی سیٹھ عثمان کی طرح ایک شریف آدمی ہے لیکن غالباً آکٹوپس نے کسی طور اسے بھی اپنے چنگل میں دبوچ لیا ہے۔“

نصف رات گئے اورنگ زیب کی ہدایت پر لیاقت حسین نے ایک نجی اسپتال کے مرکزی دروازے پر گاڑی روکی تو ایک گارڈ قدم اٹھاتا ہوا قریب آ گیا۔

”اندر پارکنگ کی اجازت نہیں جناب اس لیے.....“

گارڈ اپنا جملہ پورا نہیں کر سکا۔ ”اورنگ زیب نے اپنا مخصوص شناختی کارڈ نکال کر اسے دکھایا تو وہ سلام کرتا ہوا اگلے قدموں واپس لوٹ گیا۔ گیٹ کھولا گیا تو لیاقت حسین نے گاڑی اندر لے جا کر پارک کر دی۔ اس وقت اسپتال میں زیادہ رش نہیں تھا۔ اورنگ زیب سراج کے ساتھ قدم بڑھتا ہوا سیدھا بڑے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا جو ایک لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ کسی مریض کے بارے میں ڈسکس کر رہا تھا۔

”فرمائیے۔“ ڈاکٹر نے اورنگ زیب کو مہذب لہجے میں مخاطب کیا۔

”آپ فارغ ہو لیں..... ہمیں آپ سے کچھ ضروری معلومات کرنی ہیں۔“

معلومات کے حوالے پر بڑے ڈاکٹر نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر دو تین منٹ بعد لیڈی ڈاکٹر کو فارغ کرنے کے بعد اس نے دوبارہ اورنگ زیب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”ہم بھی عوام ہی کے خادم ہیں۔“ سراج نے اس بار اپنا کارڈ نکال کر ڈاکٹر کو دکھایا پھر اورنگ زیب کا تعارف بھی مخصوص انداز میں کرایا۔ ”مائی سینئر آفیسر۔“

”مجھے خوشی ہوگی اگر آپ حضرات کے کسی کام آسکا۔“

”ہمیں آپ کے پرائیویٹ روم نمبر تھری ہنڈریڈ ٹو کی مریضہ کے بارے میں کچھ معلومات درکار ہیں۔“

اورنگ زیب نے ڈاکٹر کو گہری نظروں سے دیکھا۔

اولاد کو روپیہٹ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ دس لاکھ بہت بڑی رقم تھی۔ ہمارے نہ جانے کتنے مسائل حل ہو سکتے تھے۔ ہم ایک چھوٹا موٹا فلیٹ لے سکتے تھے، کرائے سے جان چھڑا سکتے تھے۔ نہ جانے کتنے ارمان، کتنی خواہشیں ان دس لاکھ میں پوشیدہ تھیں۔

میری بیوی اس دوران میں چلنے لے کر آگئی تھی۔ میں نے چائے کا کھونٹ لے کر برا سامنہ بناتے ہوئے فوزیہ کی طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے آج اس میں چینی نہیں ڈالی؟“

”چینی ہو تو ڈالوں۔“ فوزیہ نے کہا۔ ”دکاندار نے صاف منع کر دیا ہے۔ کہہ رہا تھا جب تک پچھلے پیسے نہیں ملتے، مزید کوئی چیز نہیں دوں گا۔“

بعض اوقات ادب کے پرانے شاہکار سنے پیرائے دے جاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک روسی کہانی ہے۔ لیکن میں اس کہانی کو نہیں ارہا بلکہ اس کے نئے پہلو کو دیکھ رہا ہوں جو آج کی صورت میں ہے۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ واقعہ خود میرے ساتھ پیش آیا ہے۔ ویسے یہ آپ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

اخبار میں ایک بہت پیارے بچے کی تصویر چھپی تھی جس کے نیچے لکھا تھا۔ ”تلاش کشدہ“ اور تلاش کرنے والے کو لاکھ روپے انعام دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ بچہ کسی امیر گھرانے کا تھا۔ اسی لیے اس لاکھ لاکھ کا انعام تھا ورنہ غریب بے چارے تو اپنی کم شدہ

لب ساحل ایک بیا سے جوڑے کی حقائق کا قصہ

مادر پر شا کر پنا اگرچہ ایک خوبی سہی مگر... ہر ایک اس کا متحمل ہی تو نہیں۔ دوسروں کے رستے پر چل کر انسان کبھی اپنی منزل نہیں پاسکتا۔ یہ حقیقت واضح ہے کہ دوسرے کے مال پر اپنا حق جتنا اخلاقی مہم ہے مگر... کیا کیا جائے کہ یہ دل بے ایمان ماننا ہی نہیں ہے۔

اینا بچہ

منظر امام

اپنے آفس کے لیٹر ہیڈ پر وہ تحریر بھی لکھ کر اورنگ زیب حوالے کر دی جس کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر کے کمرے سے نکل کر اورنگ زیب باہر جا لگا تو سراج نے پوچھا۔

”ہم یہاں کس مریض کی خاطر آئے تھے؟“

”سیٹھ رستم علی کی ایک خادمہ... گلابو، جسے گولی کے بعد یہاں داخل کرایا گیا ہے۔“ اورنگ زیب نے تفصیل بیان کی۔ ”میرے ایک پرانے دوست نے یہ اطلاع مجھے دے کر ضروری فیکٹش پر آمادہ کیا ہے۔“

”کیا ہم مریض کو کریدنے کی کوشش نہیں کریں گے سراج نے ایک قانونی نکتہ پیش کیا۔“ ہو سکتا ہے کہ وہ اس شخص کی نشاندہی کر دے جس نے گولی ماری تھی۔“

”وقت کی بربادی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوگا رستم علی نے گلابو کے سلسلے میں اپنے بیٹے اور بہو کو بھی ابھی تک اندھیرے میں رکھا ہے۔ جس نے واردات کی ہوگی وہ اپنے اصلی حلیے میں سامنے نہیں آیا ہوگا۔“

”آکٹوپس؟“ سراج نے اورنگ زیب کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھتے ہوئے مختصر کہا۔

”شاید...“

”لیکن ڈاکٹر کی تحریر...“

”رستم علی کی زبان سے سچ اگوانے کی ایک اہم کڑی ثابت ہوگی۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا پھر وہ سراج کے ساتھ آکر باہر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

لیاقت حسین اسٹیرنگ پر پوری طرح مستعد نظر آ رہا تھا۔ سراج اور اورنگ زیب کے درمیان رستم علی اور ذمی ہونے والی ملازمہ کی بات ہو رہی تھی جب لیاقت حسین نے اچانک اسٹیرنگ کو اس تیزی سے گھمایا کہ گاڑی دو پہیوں پر چرچا کر پھر سیدھی ہو گئی۔ اورنگ زیب اور سراج بھی توازن کو بیٹھے تھے پھر اس سے پہلے کہ سراج، لیاقت حسین سے کچھ پوچھتا، قریب ہی کہیں سے ایک دھماکا سنائی دیا۔ اگر کے بعد فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونجنے لگی۔ فائرنگ کا انداز ایسا ہی تھا جیسے دو مختلف پارٹیاں آپس میں ٹکرائیں اور دوسرے کو پسپا کرنے کی خاطر امداد حند گولیاں چلانے میں الجھ گئی ہوں۔ سراج کے منع کرنے کے باوجود لیاقت حسین ہیلڈ لائٹس بجھانے کے بعد دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اس پراسرار اور تھیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

”مریض کی حالت اب خاصی بہتر ہے، ہو سکتا ہے اسے کل یا پرسوں ڈسچارج کر دیا جائے۔“ ڈاکٹر نے کسمسا کر جواب دیا۔

”اسے کیا مرض لاحق تھا؟“

”اس کا داخلہ میرے ایک ماتحت ڈاکٹر نے کیا تھا۔“ ڈاکٹر نے ہونٹ چباتے ہوئے صاف گولی سے جواب دیا۔

”میں آپ سے حقیقت چھپانے کی کوشش نہیں کروں گا لیکن جس وقت وہ اسپتال لائی گئی تھی اس کے جسم سے خاصا خون بہہ چکا تھا۔ ہم پولیس کی کارروائی میں پڑتے تو اس کی جان کو خطرہ بھی لاحق ہو سکتا تھا، اس کے علاوہ جس شخص نے ہمیں فون کیا تھا وہ بھی ہمارے اسپتال کا ایک ذمے دار ٹرسٹی ہے اس لیے ڈاکٹر آن ڈیوٹی کو...“

”میں آپ کی مجبوری سمجھ رہا ہوں ڈاکٹر۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم اس وقت قانونی چارہ جوئی کی خاطر نہیں آئے ہیں۔ آپ سے ایک ضروری تعاون کی درخواست کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں آپ ایک تحریری رپورٹ خفیہ طور پر فراہم کر دیں کہ مریض کس حالت میں لائی گئی تھی اور آپ کے ڈاکٹر نے کس ٹرسٹی کے کہنے پر اسے اسپتال میں داخل کیا تھا؟“

جواب میں ڈاکٹر نے مسمی صورت بنا کر کہا۔ ”تحریر لکھ دینے کے بعد تو میں بھی گلے گلے پھنس سکتا ہوں۔“

”ایسا نہیں ہوگا... مجھے آپ کی پوزیشن کا خیال رہے گا، ویسے اگر میں چاہوں تو آفیشل بھی...“

”میرا وہ مطلب نہیں جناب جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“

ڈاکٹر اپنی کرسی پر پہلو بدلتے لگا۔ ”آپ جو کہیں وہ میں لکھ کر دینے پر آمادہ ہوں لیکن ذاتی طور پر میں اس مریض کے بارے میں...“

”ڈونٹ وری ڈاکٹر۔“ اورنگ زیب نے اسے تسلی دی۔ ”میں از خود بھی اس کارروائی کو خفیہ رکھنے کے حق میں ہوں۔ آپ کی تحریر کی ضرورت اس لیے درکار ہے کہ ہم کسی مجرم کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں اور... جس کے حکم پر مریض کو داخل کیا گیا، اس کی زبان کھلوانی بھی ضروری ہے۔“

”اس کا کیا قصور ہے؟“ ڈاکٹر نے حیرت سے دریافت کیا۔

”صرف اتنا کہ وہ کسی خوف کی وجہ سے اس شخص کا نام زبان تک لانے سے گریز کر رہا ہے جس کی وجہ سے ایک غریب اور بے قصور ملازمہ کو ان حالات کا شکار ہونا پڑا۔“

”آئی سی...“ ڈاکٹر نے طویل سانس لی پھر اس نے

”فوزیہ اس کم بخت سے کہو کہ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ صرف چھ مہینے سے پیسے رکے ہوئے ہیں اور اتنا شور کیے جا رہا ہے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے چھ مہینے کم ہوتے ہیں؟“ فوزیہ تنک کر بولی۔

”بہت کم۔۔۔۔۔۔ درانی صاحب کے تو پانچ سال سے پیسے نہیں دے سکا ہوں۔“

فوزیہ نے اب مزید کچھ کہنے کے بجائے اخبار اٹھا لیا۔ وہ بھی اس بچے کی تصویر دیکھ کر چونک اٹھی۔ ”کتنا پیارا بچہ ہے۔“

”ہاں فوزیہ اور اس کی دل کشی کی ایک وجہ دس لاکھ کا انعام ہے۔“

”اگر یہ بچہ ہمیں مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔“

”ہمیں تو اب تک خود اپنا بچہ نہیں مل سکا، کسی اور کا کہاں سے ملے گا۔“ میں نے کہا۔

میرا اشارہ بے اولادی کی طرف تھا۔ ابھی تک ہمارے یہاں اولاد نہیں ہو سکی تھی۔ فوزیہ کچھ کہنے والی تھی کہ باہر سے مہزی دالے کی آواز سنائی دی۔ ”آلو لے لو، پیاز لے لو۔“

”یہ بتائیں آپ کے پاس کچھ پیسے ہیں یا آج بھی مہزی ادھار لے لوں؟“ فوزیہ نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ آج بھی ادھار ہی پر رکھو۔“ میں نے کہا۔

فوزیہ بھناتی ہوئی چلی گئی میں پھر اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دو منٹ بعد ہی فوزیہ کی واپسی ہوئی تھی۔ وہ بہت پُر جوش دکھائی دے رہی تھی۔ شدت جذبات سے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ ”وہ۔۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔“

”کیا ہوا۔ کیا مہزی دالے نے کوئی ایسی سیدھی بات کہہ دی؟“

”نہیں۔ وہ۔۔۔۔۔۔ وہ بچہ۔۔۔۔۔۔“

”کون سا بچہ؟“

”یہ اخبار والا۔“ فوزیہ نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ ہمارے دروازے کے باہر کھڑا ہے۔“

”کیا۔۔۔۔۔۔!“ میں چونک اٹھا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”آپ خود چل کر دیکھ لیں یہ وہی بچہ ہے۔“

میں بھی جلدی سے باہر آ گیا۔ احتیاطاً میں اخبار بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ واقعی یہ وہی بچہ تھا، بالکل وہی۔ دروازے کے باہر چپ چاپ کھڑا تھا۔ وہ بچہ نہیں دس لاکھ کی رقم تھی جو ہمارے دروازے تک آ گئی تھی۔

”بیٹا کیا نام ہے تمہارا؟“ میں نے پیار سے اس کے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”خرم۔“ بچے نے دھیرے سے بتایا۔

اخبار میں بھی اس کا یہی نام لکھا تھا، خرم۔

”کتنا پیارا بچہ ہے۔“ میری بیوی نے کہا۔

”بیٹے کہاں رہتے ہو؟“

اس سے پہلے کہ بچہ کوئی جواب دیتا، فوزیہ بول پڑی۔ ”کیا کر رہے ہیں اسے اندر لے چلیں اگر کسی اور نے دیکھ لیا وہ بھی اپنا حق جتانے لگے گا۔“

فوزیہ کی بات مقبول تھی۔ میں اس بچے کا ہاتھ تمام اسے اندر لے آیا۔ بچہ بڑی سعادت مندی سے اندر آ گیا تھا۔

میں نے اسے صوفے پر بٹھا دیا تھا۔ ”ہاں بیٹے۔ اب بتاؤ کہاں رہتے ہو؟“ میں نے دوبارہ پوچھا۔

”وہ۔ اس طرف۔۔۔۔۔۔“ بچے نے ایک سمت انگلی سے اشارہ کر دیا۔

”دیکھا۔ ڈیفنس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔“ فوزیہ نے کہا۔

”فوزیہ اسے جلدی سے کچھ کھانے کو دو۔“

”بیٹے کیا کھاؤ گے؟“ فوزیہ نے پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

”آکس کریم۔“ بچے نے بتایا۔

”فوزیہ، تم اس بچے کو سنبھالو میں سامنے اسٹور سے آکس کریم لے کر آتا ہوں۔“

جب میں آکس کریم لے کر آیا تو اس وقت فوزیہ اسے حاتم طائی کی کہانی سن رہی تھی۔ اس کے تصور میں اس کے بچے کا باپ ہوگا، جو ہمیں دس لاکھ دینے والا تھا۔

بچے نے آکس کریم کھانا شروع کر دی۔

اس دوران اچانک محلے کا ایک بچہ اپنی بال ڈھونڈتے ہوئے کھلے دروازے سے اندر آ گیا اور اس بچے کو دیکھنے کے بعد اس نے شور شروع کر دیا۔ ”خرم تو یہاں بیٹھا ہے۔ تیرے ابو تجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”بیٹے کیا تم اس کو پہچانتے ہو؟“ میں نے اس بچے سے پوچھا۔

”جی ہاں اکل یہ ہمارے ماسٹر صاحب کا بیٹا ہے۔“

اس نے بتایا۔ ”اسی گلی کے موٹر پر رہتے ہیں۔“

وہ تو اتنا کہہ کر چلا گیا اور ہم دونوں میاں بیوی غصے سے اس بچے کو دیکھنے لگے جو بڑی بے پردائی سے آکس کریم

گلی میں لگا ہوا تھا۔

”چھین لو کم بخت سے آکس کریم۔“ میں نے بھنا کر کہا۔

”کیا فائدہ آدمی سے زیادہ تو کھا ہی چکا ہے۔“ فوزیہ نے کہا۔

”کال باہر کر داسے۔ ہم بھی اسے خواہ مخواہ لے کر بیٹھ گئے۔“

اسی وقت دروازے پر ہونے والی دستک نے ہمیں مالا دیا تھا۔ میں دروازے پر آیا تو ایک صاحب پریشان حال کھڑے تھے۔ ”جناب میرا نام ماسٹر غلام ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں صبح سے اپنے بچے کو ڈھونڈ رہا ہوں، نہ جانے کہاں ہلا گیا ہے؟ ایک بچے نے بتایا کہ وہ آپ کے گھر ہے۔“

”جی جناب! وہ سامنے بیٹھا آکس کریم کھا رہا ہے۔“ میں نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

”کیوں مذاق کر رہے ہیں جناب۔“ وہ بچے کو دیکھ کر بولا۔ ”ایک غریب استاد سے مذاق کرتے ہوئے آپ کو شرم آتی چاہیے۔“

”کیا مطلب؟“

”یہ میرا بچہ نہیں ہے جناب۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ کوئی اور ہے۔“

وہ دل گرفتہ سا واپس چلا گیا۔ میں جلدی سے فوزیہ اور بچے کے پاس آ گیا۔ ”مبارک ہو فوزیہ۔ یہ بچہ ماسٹر صاحب کا نہیں ہے۔“

”تو پھر کون ہو سکتا ہے؟“

”ظاہر ہے۔ یہ وہی ہے تصویر والا۔ اس بچے نے غلط بتایا تھا۔“

”اسی لیے تو میں بھی سوچ رہی تھی کہ اتنا شریف، اتنا مہذب بچہ اس محلے کا کس طرح ہو گیا۔“

”ارے اس کی پیشانی پر تو دولت مندی لکھی ہوئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اور ہے کتنا مہذب۔ کتنے سلیقے سے ساری آکس کریم کھا گیا ہے۔ بحال ہے جو ذرا سا بھی نیچے گری ہو۔“

”فوزیہ، ایسے گھرانوں کے بچے پھر ڈھونڈتے ہیں، انہیں باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی ہے۔“

”اب یہ بتائیں کہ اس کا کیا ہوگا؟“ فوزیہ نے پوچھا۔

”ہمارے فون نمبر بھی چھپا ہے آپ فون کر کے بتادیں کہ ان کا رہنا ہمارے پاس ہے۔“

”نہیں، ایسے لوگوں کو اس طرح اطلاع نہیں دیتے۔“

”میں خود جانا ہو گا لیکن ذرا سلیقے کی ڈرینگ کر لینا۔“

”ظاہر ہے اب اس طرح تو نہیں چلی جاؤں گی نا۔“ فوزیہ نے کہا۔ ”اور آپ بھی ذرا ڈھنگ سے چلیے گا۔ آپ کے پاس تو کوئی سوٹ بھی نہیں ہے۔“

”سنو۔۔۔۔۔۔ کیوں نہ میں اپنے لیے ایک نیا سوٹ خرید کر لے آؤں۔ دس بارہ سو میں مل جائے گا۔“

”پیسے کہاں ہیں آپ کے پاس؟“

”کرائے والے رکھے ہیں نا۔ ان ہی میں سے دے دوں گا۔“

”اور کر ایہ کہاں سے پورا ہوگا؟“

”حد کرتی ہو۔ جب دس لاکھ مل رہے ہیں تو کرائے کی کیا فکر کرنے لگیں۔ سب ہو جائے گا۔ بس میں سوٹ لے کر آتا ہوں۔“

”جلدی آئیے گا میں جب تک بچے کو سیلا دیتی ہوں۔“

مارکیٹ میرے گھر سے کچھ فاصلے پر تھی۔ اٹھارہ سو روپے کا بہترین سوٹ مل گیا تھا۔ میں جب سوٹ لے کر گھر پہنچا تو اب وہاں ایک دوسرا ڈراما کھڑا ہوا تھا۔

گھر میں محلے کی ایک عورت موجود تھی جو قسمیں کھا کر بتا رہی تھی کہ یہ آپازینب کا بیٹا ہے۔

”کون آپازینب؟“ میں نے جھلا کر پوچھا۔

”وہی جو کپڑے سکتی ہیں۔“ عورت نے بتایا۔ ”اسی طرح گھر سے نکل جاتا ہے۔ زینب کو بھی پردا نہیں ہوتی۔ جانتی ہے کہ لوٹ کر آئی جائے گا۔“

”تم بچپاتی بھی ہو یا یونہی بولے جا رہی ہو؟“

”یہ لو، اب کیا میں ادھی ہو گئی ہوں۔“ عورت نے کہا۔ ”دن بھر میں دس بار آنا جانا ہوتا ہے۔ ہزار دفعہ دیکھتی ہوں اس کو۔۔۔۔۔۔ چلو اچھا ہوا اب یہ تمہارے پاس آ گیا ہے۔ دو چار دن رکھنا اسے کھانا پلانا۔ بے چاری زینب کے یہاں تو بہت پریشانی ہے۔“

وہ عورت تو یہ آگ لگا کر چلی گئی جبکہ میں اپنا سر تمام کر رہ گیا تھا۔ ”یہ لو کرائے میں سے اٹھارہ سو بھی نکل گئے اس کمبخت کے چکر میں۔“

”میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ یہ بس یونہی فالتو ہے۔ خود سوچیں اچھی محنتی کا لڑکا اتنی دور پیدل چلتا ہوا یہاں کیوں آتا اور ذرا سونے کا انداز تو دیکھیں، لگتا ہے جیسے فٹ پاتھ پر سویا ہوا ہے۔ عادت ہو گئی نافٹ پاتھ پر سونے کی۔“

”اب یہ بتاؤ۔ کیا کرنا ہے؟“

”کرنا کیا ہے۔ میں آپازینب کو بلا کر لاتی ہوں، لے



شرارنی

محنت آزاد

شرارت اور ذہانت کا امتزاج... بلاشبہ زندگی کی رونق کو بڑھا دیتا ہے مگر... ہمیشہ ایسا ممکن نہیں۔ کبھی کبھی جب وار النما ہو جائے تو زندگی دائیہ پر بھی لگ سکتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے انہوں نے کسی کی نصیحت کو مذاق کا نشانہ بنایا اور خطرات کو کھیل تماشا سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا مگر... مصیبتیں انہیں نظر انداز نہ کر سکیں۔ وہاں کچھ تو ایسا تھا کہ ان کی سانسیں تھم گئی تھیں۔

اسپتے مرکز سے بٹنے والے چند شرارتی دوستوں کا ماجرا

”لو اب بھگتو۔“ فریڈی نے گھبرا کر سوکھے درخت کے تنے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ہم راستہ بھگ چکے ہیں۔ اب نئی مصیبت کا سامنا کرو۔“ اس کے لہجے سے گھبراہٹ اور پریشانی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ فریڈی کی بات تشویشناک تھی لیکن لیو ایر پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ اس نے بڑے سکون سے اس کی بات سنی اور پھر اپنی بیس بال کیپ اتار کر بڑے آرام سے ماتھے سے پینا صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”بھگنے کا تو سوال ہی نہیں

چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد فورڈ نے میرے پاس آ کر بہت ادا دیکھا کی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آہ تھی۔ ”ہماری قسمت ہی خراب ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں یہ سمجھا تھا کہ دس لاکھ مل جائیں گے تو کتنے کام نکل آئیں لیکن یہاں تو وہ بچہ حکیم کا بھتیجا نکل آیا۔“

”فورڈ، آسان روپیہ ہمارے لیے نہیں ہے۔“ میں ہو کر بولا۔ ”ہماری قسمت میں محنت مزدوری ہے اور ہمیں رات دن جھکنا پڑتی ہے۔“

”اب یہ تو سوچیں کہ کرائے کا کیا ہوگا؟“

”پتا نہیں۔ میں تو سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

دوسری شام کو حکیم صاحب پھر ہمارے گھر آ گئے۔ اپنے ساتھ مٹھائی کا ایک ڈبے لے کر آئے تھے۔ ”یہاں بھائی۔ ہماری طرف سے یہ مٹھائی۔“

”سمجھ گیا۔ اپنے بیٹے کے ملنے کی خوشی میں کھلا رہا تھا۔“

”بھائی۔ اب تم سے کیا چاہنا۔“ وہ شرارت بھرے انداز میں ہنس پڑے۔ ”وہ بچہ میرا بھتیجا نہیں تھا۔“

”کیا؟“ گلاب جامن میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گرم تھے۔ ”تو پھر کون تھا؟“

”ایک امیر گھرانے کا بچہ تھا جس کے لیے دس لاکھ انعام رکھا گیا تھا۔“ انہوں نے بتایا۔

”ذلیل کیونے۔ تو نے۔ تو نے دھوکا دیا ہمیں۔“ میری زبان سے مغلظات برآمد کرنے لگے۔

”یار۔ اب کچھ بھی کہتے رہو۔ مجھے تو دس لاکھ مل گئے۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا اور جلدی سے آگے بڑھ گئے۔

اس کے بعد میری اور فورڈ کی جو حالت ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ ”پریشان نہ ہو۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”خدا ہمیں کسی اور بھانے سے دے دے گا۔ یاد رکھو کہ ہمیں کام کرنا ہے۔ صرف کام۔“

ایک مہینے بعد فورڈ نے جب سبزی لے کر گھر واپس آئی تو بہت پر جوش دکھائی دے رہی تھی۔ ”شیش، ہمارے دروازے کے باہر ایک بہت پیارا سا بچہ کھڑا ہوا ہے۔“

”ہوگا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”یاد رکھ فورڈ۔ میں صرف اپنا ہی بچہ اس آئے گا، کسی اور کا نہیں چاہے وہ کچھ بھی ہو۔“

فورڈ نے شرما کر اپنی گردن جھکا لی تھی۔



جائیں گی اسے اٹھا کر۔“

لیکن فورڈ نے جب آپازینب کے یہاں سے واپس آئی تو بہت پر جوش ہو رہی تھی۔ ”سن لیا۔ یہ بچہ آپازینب کا نہیں ہے۔“

”کیا؟“

”ہاں اسی طرح کا آپازینب کا اپنا بچہ تو ان کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔“

اب یہ نئی کہانی سنیں۔ تقدیر ہمیں بار بار چانس دے رہی ہے اور ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ فورڈ نے کہا۔ ”اب اٹھائیں اسے اور لے چلیں یہاں سے ورنہ یہ پھر کسی اور کی اولاد نکل آئے گا۔“

”اچھا یہ بتاؤ۔ رات کا کھانا کس ہوٹل میں کھانا پسند کرو گی؟“

”اوہ پہلے پیسے تو مل جائیں پھر ایسی باتیں کرنا۔“

”پیسے تو اب مل ہی جائیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ وہی بچہ ہے اس کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ تم اس کے سونے کا انداز تو دیکھو، لگتا ہے جیسے کوئی فرشتہ سوراہا ہو۔“

ہم دونوں نے اپنے کپڑے بدلے۔ فورڈ نے ہلکا ہلکا میک اپ بھی کر لیا اور ہم ابھی روانہ ہونے ہی والے تھے کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔

”اب کون آ گیا؟“

”ہوگا کوئی۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔“

میں نے دروازہ کھولا تو حکیم صاحب کھڑے تھے۔ یہ کوئی حکیم نہیں تھے صرف ان کا نام حکیم تھا۔ انتہائی فضول قسم کے انسان۔ ”جی فرمائیں؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”بھائی صاحب۔ میرا بھتیجا آپ کے پاس ہے، براہ کرم اسے واپس کر دیں۔ غم نام ہے اس کا۔“

اب یہ سن کر میرے ارمانوں پر اس پڑ گئی تھی۔ ”آپس آ کر لے جائیں اس کم بخت کو۔“ میں نے جل کر کہا۔ ”اس وقت سویا ہوا ہے۔“ بہت ہی بے ہودہ بچہ معلوم ہوتا ہے۔

”جی جناب۔ ہم بھی اس سے عاجز آ چکے ہیں لیکن کیا کیا جائے۔ اپنا خون ہے، پیسہ تو نہیں سکتے۔“

”آپس آ کر لے جائیں۔“

میں حکیم صاحب کو لے کر سوئے ہوئے بچے کے پاس پہنچ گیا۔ ”خدا کا شکر ہے۔“ حکیم بچے کو دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہو گئے تھے۔ ”کب سے پریشان تھے اس کے لیے۔“

”اب سوچ کیا رہے ہیں لے جائیں۔“

حکیم صاحب نے بچے کو گود میں اٹھایا اور لے کر باہر

وقت مسٹر آر تھر سے بات کرنا چاہتا ہوں مگر تیری الوقت یہ ممکن

جون 2012ء

میں اب ہر حال تھا۔ اب وہ ایک نئے درخت کے سوئے ہوئے پتے پر
سینسپنس ڈائجسٹ

کیو ایر کی بات سن کر فریڈی نے سر اوپر اٹھایا اور سامنے

والے درخت کو تکتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم کہیں یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ وہ ڈاکو نہیں کہیں ہمارے قریب ہی موجود ہیں۔“ اس نے سرگھما کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت دور دور تک خاموشی کا راج تھا۔ مگر لیو ایر کی خدشہ بھری بات سے وہ سمجھا کہ ان کے ارد گرد خطرناک لوگ موجود ہیں۔

”یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہاں قریب میں خطرناک ڈاکو موجود ہیں یا نہیں۔“ لیو ایر نے سرد مہری سے جواب دیا۔ اور پھر سرگھما کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ میگا فون کا استعمال رہنے ہی دیتے ہیں۔“ فریڈی نے اچانک اپنی رائے بدل لی اور پھر سرگوشی میں کہنے لگا۔ ”ویرانے میں کچھ بھی ممکن ہے۔ اگر تمہیں اس علاقے میں خطرناک لوگوں کی موجودگی کا ذرہ بھر بھی یقین ہے، تب تو میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ وہ ہماری یہاں موجودگی سے باخبر ہوں۔“ یہ کہنے کے بعد فریڈی ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور بڑے غور سے سامنے دیکھنے لگا۔ وہاں پائین کا کافی اونچا درخت کھڑا تھا۔ البتہ زمین پر درخت کاٹے جانے کے کئی نشانات موجود تھے۔ جہاں بھی پائین کے درختوں کا جھنڈ رہا ہوگا، وہاں اب پشیل میدان نظر آ رہا تھا۔

”میں اس درخت پر چڑھ کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ ہمارے سوا یہاں کوئی اور تو موجود نہیں۔“ فریڈی نے انگلی سے اٹھوتے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لیو ایر سے کہا اور اپنی جیکٹ کی زپ کھول کر اسے اتارنے لگا۔ فریڈی نے بیگ سے رسی نکال کر کمر پر باندھی تاکہ آسانی سے درخت پر چڑھ سکے اور اگر خدا نخواستہ نیچے گرے تو اس کی وجہ سے زمین پر گر کر ہڈیاں تڑوانے سے بچ جائے۔

”جب تک میں اوپر چڑھتا ہوں تم جلانے کے لیے ادھر ادھر سے کچھ خشک ٹہنیاں جمع کرلو۔“ اس نے تیاری مکمل کر کے آگے بڑھنے سے پہلے لیو ایر کو ہدایت دی۔

”جلانے کے لیے لکڑیاں؟“ یہ سن کر اس نے حیرت سے کہا۔

”ہاں..... شام ہو رہی ہے اور اگر ہم اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے یہاں سے نہیں نکل سکے تو رات کو اسی جگہ کیمپ کریں گے۔“ فریڈی نے بھانپ لیا تھا کہ وہ اس کا منصوبہ سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ اسی لیے اس نے وضاحت کی۔

”بہت اچھا۔“ یہ کہہ کر لیو ایر نے چاروں طرف اس انداز سے دیکھا جیسے سب کچھ پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ ”ہمارے ساتھی یقیناً ہمیں ڈھونڈ رہے ہوں گے، ممکن ہے وہ تمہیں نظر آجائیں۔“ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا مگر اپنے کہے پر اسے خود

یقین نہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے ایسا نہ ہو۔ پھر بھی نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ بُرے وقت میں بُری بات سوچنا اچھی بات نہیں۔ کٹھن وقت میں انسان کو امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔

”ویسے میرا خیال ہے کہ ہماری تلاش میں کوئی نہیں ہوگا۔“ فریڈی نے کچھ ضروری چیزیں بیگ سے نکال چٹون کی جیبوں میں ٹھونٹتے ہوئے کہا۔ ”وہ سب یہی رہے ہوں گے کہ ہم یہاں سے فرار ہو کر سیدھے انکل ہاں ہی جائیں گے۔ ہمارے کئی ساتھی انکل نیڈ اور ان کی فارمنگ کے بارے میں جانتے ہیں۔ ہماری غیر موجودگی سے کوئی پریشان نہیں ہونے والا..... وہ یہ سمجھیں گے کہ ہم رات کو انکل نیڈ کے ہاں رک گئے ہوں گے۔“

”لیکن میں جانتا ہوں کہ ان کے ہاں تو ایک فون تک نہیں۔“ فریڈی کی بات سن کر اس کا دل ٹوٹ گیا تھا مگر یہ بھی وہ امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے حسبِ عادت پھر بحث شروع کر دی۔ ”ہمارے ساتھیوں کو سوچنا چاہیے کہ جن لوگوں کے گھر میں فون تک نہیں، اگر وہاں رات بھر ٹھہرتے ہیں تو ہمارے لیے بستر تک کا انتظام نہیں ہو پائے گا تو پھر کیسے.....“

”میرے انکل کی حد تک تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ فریڈی نے گلے میں دور بین لٹکاتے ہوئے کہا۔ ”مگر یہ ضروری نہیں کہ انکل نیڈ کے بارے میں جو کچھ تم جانتے ہو وہ ہمارے سب ساتھیوں کے علم میں بھی ہو۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ”میرا مشورہ مانو اور زیادہ خوش فہمی میں نہ رہو۔“

”یہ کس کی ہے۔“ لیو ایر نے انگلی سے اس کے گلے میں لٹکتی دور بین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ میرے دادا کی ہے۔ وہ بحری جہاز پر کھڑے ہو کر اس کی مدد سے سمندر میں دور دور تک دیکھا کرتے تھے۔“ فریڈی نے فخر سے کہا۔

”کافی وزنی لگتی ہے۔“

”پانچ پونڈ وزن ہے اس کا مگر ہے بہت طاقتور۔“ فریڈی نے کہا۔ ”اس سے دور دور کی چیزیں بھی صاف نظر آتی ہیں۔“

”تم درخت پر چڑھنے جا رہے ہو، اس کی ضرورت کس لیے؟“

”تاکہ اگر کچھ مطلب کی چیز نظر آئے تو اسے زیادہ قریب سے دیکھ سکوں۔“ فریڈی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ویسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارا میگا فون

خدارا © خدارا شوگرمریض ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی دقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور نا کارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبہ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوائیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0308-6627979
0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

ادراہی غائب ہو چکی تھی۔
ہاں دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک تو جیکٹ اور ڈینیم کی والا، جو لیوایر سے سوال کر رہا تھا۔ اس کی کمر سے سیٹ سے پستول نکال رہا تھا۔ دوسرا شخص تھا سرخ والا، جو اس کے ساتھ کھڑا لیوایر کو گھورے چارہا تھا۔
ابو اے ہیٹ سر پر اوڑھے ہوئے اُس خاموش شخص کے لہجے سے رائفل نکال رہی تھی۔ اُس کے لیے سرخ بال لاہرے تک پہلے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔
اُس نے ہاتھوں میں لکڑیوں کا ایک گٹھا اٹھا رکھا تھا۔ وہ بھی اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔
”میں..... میں..... وہ.....“ لیوایر نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر وہ کہہ نہ سکا۔ اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اُن کے سوالوں کا کیا جواب دے۔ اسی دوران سرخ بالوں نے نظریں گھما کر کیونوس کے تھیلے کی طرف دیکھا اور ہاتھوں تک اُس کا بغور جائزہ لینے کے بعد دوبارہ اُس پر گزریں گاڑ دیں۔
”ایک منٹ.....“ یہ کہتے ہوئے سرخ بالوں والے شخص نے لکڑیوں کا گٹھا زمین پر پھینکا۔ ”تم اس پر نظر رکھو۔ میں اگلا ہو کہیں اس کے ساتھ کوئی اور تو نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اُس نے کندھے سے رائفل اتار کر بولٹ چڑھایا اور جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ چند سیکنڈ تک وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر واپس اُن کی طرف آیا۔ ”لگتا ہے یہ اکیلا ہی ہے۔“ اُس نے لکڑیوں سے ارد گرد دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔
دوسری طرف لیوایر کی حالت بہت بری تھی۔ وہ بری طرح سہم چکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سخت خوفزدہ تھا کہ بیٹھے لہجے اچانک کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اس بیابان میں لے دے کر صرف فریڈی اس کا موٹس و غنوار تھا مگر اس وقت تو وہ بھی اس سے کافی دور تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے میں کسے تو کیا۔ جس انداز میں وہ دونوں اجنبی اہل کے سامنے آئے تھے، اس سے تو صاف ظاہر تھا کہ وہ اہل آدمی تو ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ دونوں بد معاش تو اب ہار کی جان کے لیے خطرہ بن چکے تھے۔
سرخ بالوں والا شخص رائفل ہاتھ میں تھامے کافی دیر حیرتوں سے اطراف کا جائزہ لیتا۔ جب کئی منٹ گزر جانے کے باوجود وہ منہ سے کچھ نہ بولا تو اس کے ساتھی نے استفسار یہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اے..... اب ہم اس کا کیا کریں؟“
”بہت اچھا سوال کیا ہے تم نے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ

افادیت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ”کاش میں کسی موبائل ادھار مانگ لیتا۔“ وہ بڑبڑایا مگر پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ وہ کس سے موبائل مانگتا۔ وہ سوچ رہا تھا اور دل ہی میں لہجے طعن کیے جا رہا تھا کہ اکیسویں صدی کے دوڑ موبائل فون کے بغیر۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے اخباروں میں ہوتا ہے ”آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے۔“ تقریباً دس منٹ کے اندر اندر لیوایر نے خشک ٹھنڈے کا اچھا خاصا ڈھیر جمع کر لیا تھا۔ اس نے بیگ سے برش نکال کر ٹیمپ ساٹن کے لیے جگہ صاف کرنا شروع کی۔ 1 دوران اچانک اُس کی نظر سامنے جھاڑیوں پر پڑ گئی۔ وہ سرخ رنگ کی کوئی شے آہستہ آہستہ بل رہی تھی یا پھر لیوایر۔ اسے ہلکا ہوا محسوس کیا تھا۔ اس نے زمین کی صفائی چھوڑی اور جھاڑیوں پر نظریں گڑا دیں۔ وہ چند لمحوں تک کچھ نہیں سمجھ سکا کہ وہاں کیا ہے مگر اس کی چھٹی حس احساس دلا رہی تھی وہ کچھ خاص ہے، ویسے بھی انہیں ممکنہ طور پر اس جگہ پوری رازداری تھی۔ کچھ سوچ کر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ جھاڑیاں تقریباً دس بارہ فٹ کی دوری پر۔
لیوایر احتیاط سے چلتا ہوا وہاں تک پہنچا۔ وہ سرخ رنگ کا ایک بڑا سا رومال تھا، جس پر کوئی پاؤ ڈیڑھ پاؤ کے قریب جھانک رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑا سا خاکہ لگا ہوا تھا، جس کے اندر غالباً کچھ کھانے پینے کا سامان ہوگا۔ گھنٹوں کے بل زمین پر بیٹھ کر ان چیزوں کو دیکھنے لگا۔ سرخ رومال کیونوس کے ایک بڑے تھیلے کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ اس طرح کا رومال تھا جسے شوقین مزاج لوگ بل دے کر گھر میں باندھا کرتے ہیں۔ جیسے ہی اس تھیلے پر لیوایر کی نظر پڑی، وہ چونک گیا۔ تھیلے پر نیلے رنگ میں موٹے موٹے حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ ایک نام تھا۔ جیسے ہی لیوایر اسے پڑھا، لمحہ بھر میں خوف اور دہشت کی ملی جلی کیفیت باعث اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا اور حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ ”فرسٹ سٹیزن بینک۔“ لیوایر نے تھوک لگا کر گلے کو تر کیا اور منہ ہی منہ میں بدبویا۔
”اے لڑکے.....“ اچانک اس کے عقب سے کسی نے کرخت آواز میں پکارا۔ لیوایر کا دم نکل گیا۔ اس نے اپنے پیٹھے گردن موڑی۔

”تم سے پوچھ رہا ہوں۔“ ڈینیم کی جیکٹ اور جینز لیے قد کا درشت چہرہ شخص اس کے پیچھے کھڑا غصے سے ا دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ نے غصے سے کہا مگر لیوایر خاموش تھا۔ خوف کے مارے

بھی لے جا رہا ہوں، ممکن ہے اس کی بھی ضرورت پڑ جائے۔“ یہ کہہ کر اس نے بیٹری والا اسٹیکر اور مائیکروفون اٹھا کر پھوٹی ہوئی جیب میں اڑسنے کی کوشش کی۔
”ادہ.....“ لیوایر نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔
”دیکھو میں جا رہا ہوں اور تم ان سب چیزوں کا خیال رکھنا۔ کچھ گم نہ ہونے پائے۔“ اس نے درخت کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اسے تاکید کی۔ اس کا تھپلا اور کچھ دیگر چیزیں اس سوکھے تنے کے قریب زمین پر رکھی ہوئی تھیں جس پر لیوایر پریشان چہرہ بنائے بیٹھا تھا۔
کچھ ہی دیر بعد فریڈی اپنے ہاتھوں اور مانگوں کی مدد سے کسی رچھ کی طرح درخت کا تن پکڑ پکڑ کر دس فٹ اوپر تک پہنچ چکا تھا۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ اسکا ڈننگ میں درخت پر چڑھنے کی تربیت کتنے کام آتی ہے۔ اگر اس نے درخت پر چڑھنا نہ سیکھا ہوتا تو وہ دو چار فٹ اوپر بھی نہیں چڑھ سکتا تھا۔
دوسری طرف جلانے کے لیے خشک لکڑیاں جمع کرتے ہوئے اب لیوایر دل ہی دل میں فریڈی کی عقلمندی کا معترف ہو رہا تھا۔ اب وہ بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ انہیں ڈھونڈنے کوئی نہ نکلے اور ایسے میں اگر انہیں اس دیرانے میں رات بسر کرنا پڑتی ہے تو لکڑیاں نہ ہونے کی صورت میں رات بھر والا نہیں مل سکتا تھا۔ ایسے میں کوئی جنگلی درندہ انہیں نقصان پہنچا سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے مزید تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے درختوں کی بکھری خشک ٹھنڈیوں کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ ”ویسے یہ جگہ ٹیمپ ساٹن کے لیے بری نہیں۔“ اس نے لکڑیاں چنتے چنتے خود کھامی کی۔
”کاش یہ میرا آئیڈیا ہوتا۔“

لیوایر سوچ رہا تھا کہ کاش اس وقت اُن کے پاس موبائل فون ہوتا مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے والدین غریب ہیں اور چاہنے کے باوجود اُس کی خواہش پوری نہیں کر سکتے مگر فریڈی کی بات دوسری تھی۔ اس کے والدین خوش حال تھے۔ انہوں نے اسے موبائل فون بھی لے کر دیا تھا مگر چند ہفتے پہلے انہوں نے تنگ آ کر بطور سزا اس سے فون واپس لے لیا تھا۔ انہیں کئی بار شکایتیں موصول ہوئی تھیں کہ وہ لوگوں کو اپنے موبائل سے فون کر کے پریشان کرتا تھا۔ اب لیوایر سوچ رہا تھا کہ کاش فریڈی نے یہ غلطی نہ کی ہوتی تو وہ گھر والوں کو فون کر کے کب کی یہ اطلاع دے چکے ہوتے کہ وہ وادی میں راستہ ہنک گئے ہیں۔
لکڑیاں جمع کرنے کے دوران وہ بار بار موبائل فون کی

”تم سے پوچھ رہا ہوں۔“ ڈینیم کی جیکٹ اور جینز لیے قد کا درشت چہرہ شخص اس کے پیچھے کھڑا غصے سے ا دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ نے غصے سے کہا مگر لیوایر خاموش تھا۔ خوف کے مارے

بھی لے جا رہا ہوں، ممکن ہے اس کی بھی ضرورت پڑ جائے۔“ یہ کہہ کر اس نے بیٹری والا اسٹیکر اور مائیکروفون اٹھا کر پھوٹی ہوئی جیب میں اڑسنے کی کوشش کی۔
”ادہ.....“ لیوایر نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔
”دیکھو میں جا رہا ہوں اور تم ان سب چیزوں کا خیال رکھنا۔ کچھ گم نہ ہونے پائے۔“ اس نے درخت کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اسے تاکید کی۔ اس کا تھپلا اور کچھ دیگر چیزیں اس سوکھے تنے کے قریب زمین پر رکھی ہوئی تھیں جس پر لیوایر پریشان چہرہ بنائے بیٹھا تھا۔
کچھ ہی دیر بعد فریڈی اپنے ہاتھوں اور مانگوں کی مدد سے کسی رچھ کی طرح درخت کا تن پکڑ پکڑ کر دس فٹ اوپر تک پہنچ چکا تھا۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ اسکا ڈننگ میں درخت پر چڑھنے کی تربیت کتنے کام آتی ہے۔ اگر اس نے درخت پر چڑھنا نہ سیکھا ہوتا تو وہ دو چار فٹ اوپر بھی نہیں چڑھ سکتا تھا۔
دوسری طرف جلانے کے لیے خشک لکڑیاں جمع کرتے ہوئے اب لیوایر دل ہی دل میں فریڈی کی عقلمندی کا معترف ہو رہا تھا۔ اب وہ بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ انہیں ڈھونڈنے کوئی نہ نکلے اور ایسے میں اگر انہیں اس دیرانے میں رات بسر کرنا پڑتی ہے تو لکڑیاں نہ ہونے کی صورت میں رات بھر والا نہیں مل سکتا تھا۔ ایسے میں کوئی جنگلی درندہ انہیں نقصان پہنچا سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے مزید تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے درختوں کی بکھری خشک ٹھنڈیوں کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ ”ویسے یہ جگہ ٹیمپ ساٹن کے لیے بری نہیں۔“ اس نے لکڑیاں چنتے چنتے خود کھامی کی۔
”کاش یہ میرا آئیڈیا ہوتا۔“

لیوایر سوچ رہا تھا کہ کاش اس وقت اُن کے پاس موبائل فون ہوتا مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے والدین غریب ہیں اور چاہنے کے باوجود اُس کی خواہش پوری نہیں کر سکتے مگر فریڈی کی بات دوسری تھی۔ اس کے والدین خوش حال تھے۔ انہوں نے اسے موبائل فون بھی لے کر دیا تھا مگر چند ہفتے پہلے انہوں نے تنگ آ کر بطور سزا اس سے فون واپس لے لیا تھا۔ انہیں کئی بار شکایتیں موصول ہوئی تھیں کہ وہ لوگوں کو اپنے موبائل سے فون کر کے پریشان کرتا تھا۔ اب لیوایر سوچ رہا تھا کہ کاش فریڈی نے یہ غلطی نہ کی ہوتی تو وہ گھر والوں کو فون کر کے کب کی یہ اطلاع دے چکے ہوتے کہ وہ وادی میں راستہ ہنک گئے ہیں۔
لکڑیاں جمع کرنے کے دوران وہ بار بار موبائل فون کی

”تم سے پوچھ رہا ہوں۔“ ڈینیم کی جیکٹ اور جینز لیے قد کا درشت چہرہ شخص اس کے پیچھے کھڑا غصے سے ا دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ نے غصے سے کہا مگر لیوایر خاموش تھا۔ خوف کے مارے

آگے بڑھا اور لیو ایر کی بیس بال کیپ اتار کر جھاڑیوں کے قریب گھنٹوں کے بل بیٹھ گیا۔ ٹوپی کو الٹا کیا اور رومال پر رکھی بیڑیوں سے منگی بھر کے کیپ میں ڈالیں۔

لیو ایر بدستور گھنٹوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ خوف سے اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اب یہ دونوں بد معاش اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

”اٹھو..... اور اس درخت کے نیچے جا کر بیٹھ جاؤ۔“

سرخ بالوں والے نے کافی دیر تک اسے گھورنے کے بعد انگلی سے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔ یہ پائن کا وہی درخت تھا، جس پر فریڈی چڑھا بیٹھا تھا۔ سرخ بالوں والے کا حکم سنتے ہی وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور مرے مرے قدموں سے میدان کے واحد درخت کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے اور آگے بڑھتے ہوئے وہ محسوس کر رہا تھا کہ بس اب گرا کہ تب گرا۔ خوف سے اس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔

وہ چپ چاپ جا کر درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے نظر کھما کر دیکھا۔ سامنے سوکھے تنے کے ساتھ دونوں کے تھیلے رکھے تھے۔ سامنے جھاڑیوں کے قریب کھڑا سرخ بالوں والا ساری جنگلی بیڑیوں کو اس کی بیس بال کیپ میں بھر کر اب اس بڑے رومال کو پھاڑ کر پٹیاں بنا رہا تھا۔ دوسرا شخص لیو ایر پر نظریں رکھے کھڑا تھا۔ لیو ایر کی آنکھیں نم تھیں بلکہ ایک دو آنسو لڑھک کر اس کے گالوں پر آ جاتے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب تک ان اجنبیوں کی نظریں ان کے تھیلے کی طرف نہیں پڑی تھیں، جو سوکھے تنے کے قریب رکھے تھے۔ اگر وہ ان دو تھیلوں کو دیکھ لیتے تو شک میں مبتلا ہونا یقینی تھا کہ ایک لڑکا اور دو تھیلے..... یہ سوچے ہی اس کا خون خشک ہونے لگا۔ سرخ بالوں والے نے رومال کو پھاڑ کر لمبی لمبی پٹیاں بنائی تھیں اور اب انہیں کھینچ کر یقین کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ مضبوط ہیں یا نہیں۔ یہ دیکھتے ہوئے لیو ایر سوچ رہا تھا کہ کچھ دیر بعد وہ اس کی جانب آئے گا اور اس کپڑے سے اس کے دونوں ہاتھ پاؤں باندھ دے گا۔ اس کے بعد..... لیو ایر نے سر جھکا۔ وہ اس سے آگے مزید کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔

”دن ڈھلے تم سے ملاقات ہونے کا یقین تو نہیں تھا اجنبی لڑکے۔“ سرخ بالوں والا اس کے قریب آیا اور یہ کہتے ہوئے اس کے برابر بیٹھ گیا۔ ”اب اگر اتفاق سے ملاقات ہوئی مگر یہ تو ہمیں میزبانی کا موقع دو۔“ اس نے خباثت بھری مسکراہٹ لبوں پہ سجائی اور اشارے سے ہاتھ آگے

کرنے کو کہا۔ لیو ایر نے دونوں ہاتھ خاموشی سے بڑھادیے اور وہ اس کی کلاسیاں باندھنے لگا۔ ہاتھ باندھنے کے بعد وہ کچھ دیر تک اس کے برابر بیٹھا رہا اور بیس بال کیپ میں بھری جنگلی بیڑیاں دبانے دبانے کر کے رہا۔ سامنے، جھاڑیوں کے پاس اس کا ساتھی آگے جلا کوشش کر رہا تھا۔ لیو ایر دم سادھے بیٹھا رہا۔

”بیڑیاں کھاؤ گے؟“ اجنبی نے اس سے پوچھا اور خباثت بھرا ہتھلہ لگا یا۔ لیو ایر اور سہم گیا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کیا فریڈی نے اسے دیکھ لیا اگلے ہی لمحے اس نے اپنے خیال کو خود ہی مسترد کر دیا۔ نے خود دیکھا تھا کہ فریڈی تیزی سے اوپر چڑھتا جا رہا تھا جہاں پائین کی گھنی شاخیں تھیں۔ وہ عین درخت کے بیٹھا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ فریڈی اسے نیچے بیٹھا ہوا شاہ دیکھ سکے مگر ایسا کب تک ہوگا۔ جلد یا بدیر اسے درخت نیچے اترنا تو ہوگا۔ ویسے بھی اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سو لگا کہ اگر فریڈی نیچے پیش آنے والے تمام تر واقعات سے خبر ہے اور اس بے خبری میں وہ نیچے اتر آیا تو پھر کیا، اس سوال کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

لیو ایر کے متعلق اس کے دوستوں میں پہلے ہی یہ مشہور تھی کہ بہ ظاہر وہ جتنا عقلمند نظر آنے کی کوشش کرتا ہے، اس سے کہیں زیادہ بے وقوف ہے۔ جتنا وہ خود کو پرسکون مطمئن ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ اسے اتنی ہی جلد گھبرا جانے والا لڑکا تھا۔ اب اسے صرف لائق تھی کہ اگر فریڈی نے اسے اجنبیوں کے ہتھے چڑھتا دیا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا اور ایسا نہ کر سکا تو..... سوچ سوچ کر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ پہلے تو وہ مر اس وادی میں راستہ بھٹکتے تھے مگر اب تو وہ جرائم پیشہ لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ ایک دن میں تین مصیبتیں اُن کے نازل ہو گئی تھیں۔ پہلی مصیبت سزا تھی، دوسری مصیبت کی صورت میں انہوں نے خود مول لی اور اب یہ اُفتاد۔ سرخ بالوں والا کچھ دیر اس کے قریب بیٹھا رہا اور پھر بتا دیا کہ، خاموشی سے اٹھا اور اپنے ساتھی کی طرف چل دیا۔

رات کا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ دن کی نسبت اس وقت فضا میں خشکی بڑھ چکی تھی۔ اُن دونوں بد معاشوں نے آ جلانے کے بعد خاکی لفافے سے کچھ نکالا اور کھانے لگے اگرچہ وہ اس سے تھوڑے فاصلے پر تھے، لیکن وہ خود کھا رہے، مروت میں بھی لیو ایر سے نہ پوچھا۔ ایک تو بے چارے دن بھر کا بھوکا، دوسرا گھنٹوں پیدل چلتا رہا۔ اب انہیں کما

لیو ایر کے پیٹ میں چوہے دوڑے تو منہ میں رال کا پھر آیا۔ وہ دونوں پیٹ پوجا سے فارغ ہوئے تو زمین پر لیٹ گئے۔ ڈینم کی جیکٹ والا تو سویا ہوا نظر آ رہا تھا مگر سرخ بالوں والا بدستور جاگ رہا تھا۔ اس کی نظریں اب لیو ایر پر گزری تھیں۔ ایک تو چاندنی رات اوپر سے آگ آگ لگتا والا..... دودھیا چاندنی اور سرخ روشنی میں وہ اس ایک دوسرے کو صاف دیکھ سکتے تھے۔

فریڈی اب تک درخت کے اوپر چھپا بیٹھا تھا۔ لیو ایر دیکھ رہا تھا کہ اگر کاڈیوائے حلیہ والے یہ دونوں بد معاش دیکھے، بھی فریڈی نیچے اترے گا۔ اب تک اُس کے نیچے نہ آنے کے سبب لیو ایر کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ ان دونوں کو لپک چکا ہے۔ وہ جان گیا ہے کہ نیچے لیو ایر کے سر پر مصیبت کا ان سا پہاڑ ٹوٹ گیا ہے۔ سرخ بالوں والا اب تک جاگ رہا تھا۔ اگر یہ رات بھر یونہی جاگتا رہا تو..... یہ خیال آتے ہی اس کا دل تیزی سے دھڑک کر رہ گیا۔

معاملہ لیو ایر کی سمجھ میں آچکا تھا۔ وہ دونوں ڈاکو تھے، انہوں نے چند روز پیشتر سٹیشن بینک لوٹا تھا۔ اگرچہ نی وی در اخبارات کی خبر تھی کہ وہ دونوں ڈاکو ڈکیتی کے بعد جنوب کی سمت دیران پہاڑوں کی طرف فرار ہو گئے تھے۔ پولیس لوگوں وہاں تلاش کر رہی تھی مگر یہ دونوں مزے سے اس کے ماننے پڑے ہوئے تھے۔ لیو ایر سوچ رہا تھا کہ کس طرح یہ ظالم پوگیس تک پہنچے گی کہ دو بوائے اس کا ٹس راستہ بھٹک کر اپ ان دو ڈاکوؤں کے قیدی بن چکے ہیں۔

اُس کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے۔ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا اور جب تک فریڈی آکر اسے نجات نہ دلاتا، وہ یونہی دھماکتا مگر اس کے باوجود سرخ بالوں والے کو اس کے فرار ہار تھا۔ تب ہی وہ اپنے ساتھی کی طرح خرائے لینے کے ہار تھا۔ جاگ کر پھر ادے رہا تھا۔ آگ بجھنے لگی تو وہ اٹھا اور اس میں مزید لکڑیاں جھونک دیں۔ الاؤ پھر تیزی سے بھاگنے لگا۔ لیو ایر سمجھ گیا کہ وہ اسے آسانی سے چھوڑنے والا نہیں۔ اس کا دماغ تیزی سے چل رہا تھا مگر اس مشکل حالت کی کوئی ترکیب اسے نہیں سوجھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر رات یونہی گزر گئی اور دن نکلنے پر وہ آگے بڑھے تو اسے قتل کر کے جائیں گے یا یونہی بندھا چھوڑ دیں گے۔ اگر کوئی اتفاق سے یہاں آگیا تو اس کے ہاتھ پاؤں کھل کر رہا تو دلوادے گا ورنہ مشکل ہے۔ اب ان حالات میں اس بیابان میں لے دے کہ فریڈی ہی اس کی آخری کاروشن چراغ تھا۔

سرخ بالوں والا سر کے نیچے ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔ اس کی نظریں بدستور لیو ایر پر تھیں۔ آگ کسی حد تک بجھنے لگی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ اٹھا اور ادھر ادھر سے خشک لکڑیاں جمع کرنے لگا۔ جیسے ہی اس کی نگاہیں تھیں، لیو ایر نے سوچ غنیمت دیکھ کر سر اوپر اٹھایا اور منہ سے آواز نکالے بغیر اسے پیغام دیا۔ ”اب ہم کیا کریں؟“

اسے یقین تھا کہ فریڈی اگر اسے دیکھ رہا ہے تو اس کے ہونٹوں کو دیکھ کر پیغام سمجھ چکا ہوگا۔ ویسے بھی چاندنی رات میں وہ اسے اچھی طرح دیکھ سکتا ہوگا۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا ڈس کی تربیت عملی زندگی میں کتنے کام کی چیز ہے۔ کچھ ہی لمحوں میں فریڈی کا جواب بھی اسے مل گیا۔ یہ ایک خشک پائن کون پر ربر بینڈ سے لپٹا کاغذ تھا جو کوئی آواز پیدا کیے بنا ہی اس کی جمولی میں آن گرا تھا۔ سرخ بالوں والا ڈاکو بدستور اس کی طرف پشت کیے زمین پر سے خشک لکڑیاں چن چن کر الاؤ کے لیے جمع کر رہا تھا۔ لیو ایر نے سکھ کا سانس لیا کہ اس نے پائن کون گرتے نہیں دیکھا تھا۔

لیو ایر کو فریڈی کے پیغام کی صورت پہلی بار سکھ کا سانس ملا تھا مگر گود میں رکھے اس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس نے سامنے نظر ڈالی۔ وہ بدستور اس کی طرف سے غافل تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے ربر بینڈ ہٹا کر کاغذ کھولا۔ نہایت گندی وینڈر اٹنگ میں اس نے پیغام دیا تھا ”اس پر قابو پاؤ۔“

لیو ایر سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ ان دونوں نے کئی بار نی وی پر وہ فلم اکٹھے بیٹھ کر دیکھی تھی جس میں درخت کے نیچے ایک ڈاکو بیٹھا ہوتا تھا اور درخت پر چھپا ہوا چالاک اس پر چھلانگ لگا کر اسے قابو کر لیتا ہے۔ وہ سمجھا کہ فریڈی چاہتا ہے کہ کسی طرح وہ درخت کے نیچے آئے اور وہ فلمی سین ڈہرائے مگر یہ فلمی سچویشن نہیں، حقیقی زندگی تھی۔

فریڈی صرف چودہ برس کا لڑکا تھا، جس کا وزن بہ مشکل سو پونڈ ہوگا مگر یہ بد معاش نہایت ہٹے کٹے تھے۔ یہ دونوں مل کر بھی ان میں سے کسی ایک پر قابو نہیں پاسکتے تھے۔ اوپر سے اُن دونوں کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ ایسے میں لیو ایر کو محسوس ہوا کہ فریڈی جو سوچ رہا ہے، شاید وہ قابل عمل نہ ہو۔ اس نے بندھے ہاتھوں سے کاغذ کا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور کچھ دیر چبانے کے بعد نگل گیا۔

لیو ایر... ایک بار پھر پریشانی کا شکار تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر فریڈی نے ایسا کیا تو اس کے بعد کیا ہوگا۔ آیا وہ کامیاب ہو جائیں گے یا کوئی اُفتاد سر پر آن پڑے

کی۔ اب وہ تیرے دل سے دعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا ان بد معاشوں کے چنگل سے نکلنے کی کوئی سبیل پیدا کر دے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذہن میں اسکا ڈس ماسٹر کی ہر وہ ترکیب دہرائے جا رہا تھا جو مشکل وقت سے نکلنے کے لیے انہیں سکھائی گئی تھی مگر لاکھ کوشش کے باوجود اسے اب تک ایسی کوئی ترکیب یاد نہیں آئی جو درپیش صورت حال میں کارگر ثابت ہو سکتی تھی۔

آگ دوبارہ دھک اٹھی تھی اور سرخ بالوں والے کی نظریں ایک بار پھر اس پر جم گئی تھیں۔ اچانک اس کے ذہن میں بجلی کا کونداسا لپکا۔ ”کب تک یونہی.....“ لیو ایر نے دل ہی دل میں کہا۔ ”ابھی۔ یا پھر کبھی نہیں۔“ اچانک اس کے دل میں حالات سے مقابلہ کرنے کی تڑپ انگڑائی لے کر بیدار ہوئی۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اسے اپنے جسم میں نئی توانائی محسوس ہوئی تھی۔

”اے مسٹر.....“ لیو ایر نے سرخ بالوں والے کو پکارا۔ ”ذرا ادھر آؤ۔“

یہ سن کر سرخ بالوں والا کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ ”کیا بات ہے؟“ اس نے درخت لہجے میں کہا۔ لیو ایر نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کئی روز سے چھین کی نیند نہیں سوسکا ہوگا۔ البتہ اس کے سامنے کے خراٹوں کی آوازیں سنسان فضا میں گونج رہی تھیں۔

”یہاں چیونٹیاں ہیں۔“ اس نے کسماتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کئی جگہ کاٹ چکی ہیں پلیز.....“

”تو پھر.....“ اس نے بات کاٹتے ہوئے درخت لہجے میں کہا۔ ”یہاں ہر جگہ چیونٹیاں ہیں تو میں کیا کروں۔“ اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ لگ رہا تھا کہ اسے یہ گفتگو کم از کم اس وقت بالکل پسند نہیں آئی تھی جب کہ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ ویسے بھی اس کے جاگنے کا بنیادی سبب تو یہی مصیبت تھی، جس سے وہ اس وقت بات کر رہا تھا۔

”اب کیا کہوں، کیا کروں؟“ لیو ایر نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس شخص کو عین درخت کے نیچے تک تو لے آیا ہے مگر اب تک نہ تو فریڈی نے اس پر چھلانگ لگائی ہے اور نہ ہی اسے کوئی ایسی بات سوجھ رہی تھی جس سے وہ تھکے ماندے اس بد معاش کو مزید کچھ دیر تک یہاں درخت کے نیچے فریڈی کے ممکنہ نشانے

پر روک سکتا۔

اچانک سرخ بالوں والا زمین پر بیٹھ گیا اور غور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ”مجھے تو یہاں چیونٹیاں نظر نہیں آ رہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہوا۔ ”اے! تم کیا کرنا چاہو؟“ اس نے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

یہ سنتے ہی لیو ایر کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ واقعی وہ دور دور چیونٹیوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ یہ تو اس نے تو لڑائی تھی۔ ”اب کیا کہوں اسے۔“ اس نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا۔ اس کا چہرہ خوف میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس بنا سوچے سمجھے نظریں اوپر اٹھائیں اور درخت کی شاخوں طرف دیکھا۔ اگرچہ اس نے ہل بھر کے لیے اوپر کی طرف دیکھا تھا مگر سرخ بالوں والا تازہ گیا۔ اس نے فوراً بیلٹ آؤ ساپتول نکالا اور لیو ایر کے سر کی طرف تانتے ہوئے اوپر کی جانب دیکھا۔ وہ عین درخت کے نیچے تھا۔ اس کے چہرے سے تشویش کے آثار صاف جھلک رہے تھے۔ اسے سر کو اس کی پستول کی زد پہ دیکھ کر لیو ایر کے اوسان کھل ہو چکے تھے۔ وہ سخت سراسیمگی کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔

اچانک صورت حال نے پلٹا کھایا۔ اوپر سے پانچ نو وزنی، فریڈی کے کپتان دادا کی بھاری بھر کم دور بین ا کے سر پر گری۔ ایک تو بھاری دور بین، دوسرے وہ کافی اونچے سے نیچے گری تو اس کی شدت میں اور اضافہ ہو گیا۔ جیسے ہی وہ سرخ بالوں والے کے سر پر گری، وہ چکرایا اور پھر گھٹنوں کے مل زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بنا آواز کے زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ زمین پر ایک طرف پڑا تھا۔ اسی دوران اسے اپنے پیچہ درخت کے تنے پر کپڑوں کی سرسراہٹ اور کسی کے اتر کے آواز محسوس ہوئی اور پھر ہلکے سے دھب کی آواز آئی۔ لو بھر بعد فریڈی اپنے سونے شکاری چاقو سے اس کے ہاتھ پر بندھی بندشیں کاٹ رہا تھا۔ سرخ بالوں والا بے حس حرکت اس کے عین سامنے پڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی فریڈی نے ہاتھ پاؤں بندشوں سے آزاد ہوئے، دونوں نے مل کر سب سے پہلے اس بد معاش کا پستول قبضے میں کیا۔ ہاتھ پا باندھے اور پھر اسے گھسیٹ کر درخت کے دوسری طرف اندھیرے میں لے گئے۔ دونوں نے اس کے ہاتھ پاؤں اتنی مضبوطی سے باندھے تھے کہ وہ لاکھ لاکھ کوشش کرے تب تک نہ کھول پائے۔ وہ بد دستور بے ہوش تھا۔

”ایک مصیبت تو کم ہوئی۔“ فریڈی اس کام سے فار ہوتے ہی کھڑا ہوا اور لیو ایر سے کہا۔

”آدمی مصیبت..... آدمی وہ پڑی سو رہی ہے۔“ لیو ایر نے انگلی سے اس سمت اشارہ کیا، جہاں سے خراٹوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

”اسے دفع کرو اور جتنی جلد ہو سکے، یہاں سے بھاگ لو۔“ فریڈی نے سرگوشی میں ہدایت دی۔

ان دونوں نے جلدی جلدی اپنے تھیلے پیٹھ پر لادے مگر یہ ان کی بد قسمتی تھی کہ اگلے ہی قدم پر فریڈی کو زوردار ٹھوکر لگی اور نچے گر گیا۔ اس کے تھیلے کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے گرنے اور تھیلے سے چیزوں کے نکل کر باہر گرنے سے آواز ہوئی اور نہ جانے کیسے اس سوئے ہوئے شخص کی آنکھ اس ہلکی سی آواز سے کھل گئی۔ اس نے جلدی سے کروٹ لے کر برابر دیکھا اور اپنے سامنے کو نہ پا کر اس نے ہاتھ بڑھا کر رائفل اٹھائی اور ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بے یقینی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پورے چاند کی چاندنی تھی۔ لیو ایر کو یقین ہو گیا کہ اب پھر پکڑے گئے مگر اچانک گہرے سیاہ بادلوں کی ایک ٹکڑی نے چاند کو ڈھانپ لیا۔ وہ منظر جو لمحہ بھر پہلے دودھیا روشنی میں نمایا ہوا تھا، ہل بھر کے اندر مکمل تاریکی میں گم ہو گیا۔ اب فضا میں آگ کے بجتے الاؤ کی ٹمٹماہٹ ہی باقی تھی۔ ان دونوں کو یہ غیبی مدد لگی۔

خوف کے مارے لیو ایر کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لمحہ بھر میں چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آئے گا اور پھر ان کے دیکھے اور پکڑے جانے کا خطرہ یقینی ہوگا۔

لیو ایر اپنے تخیل میں دیکھ رہا تھا کہ اس میدان میں وہ ایک بد معاش اپنے سامنے کی مدد سے ان پر گولیاں چلا رہا تھا۔ وہ دونوں خاک و خون میں لت پت تڑپ رہے تھے۔ اور پھر کئی روز بعد ہی دی نیوز کا ستر لوگوں کو بتا رہی تھی:

”نوک کنٹری ہلز کی وادی سے دونو جوان بوائے اسکا ڈس کی مسخ شدہ لاشیں ملی ہیں جو چند روز قبل اپنے گروپ سے لاپتا ہو گئے تھے۔“

وہ دل ہی دل میں خدا سے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، اس کے دونوں گال آنسوؤں سے تر تھے۔ وہ زمین پر بے حس و حرکت اوندھے منہ اس انداز سے لیٹا تھا کہ جیسے وہ تربیت سے گزر رہے ہیں۔

”اے جم.....“ اچانک اندھیرے میں تیز آواز گونجی۔ ”یہ یہاں کیا ہو رہا ہے، کہاں ہو تم؟“ اس کی آواز سے خوف جھٹک رہا تھا۔ فریڈی اور لیو ایر کا اندازہ درست تھا۔ اپنے سامنے کو نہ پا کر وہ سخت پریشان تھا۔ ایک تو وہ گہری نیند سے

”لفظ لااب“

ایک عورت نے اپنے شرابی شوہر کو سدھارنے کے لیے ڈانٹ پھینکا اور لڑائی جھگڑے کا طریقہ چھوڑ کر محبت کا حربہ آزمانے کی ٹھانی۔ رات گئے اس کا شوہر نشتے میں دھت گھر آیا تو اس نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ اس کے جوتے موزے اتارے، اسے کھانا کھلایا۔ آرام سے بستر پر لٹا دیا اور اس سے پیار بھری باتیں کرنے لگی پھر اس نے شوہر سے کہا۔ ”پیارے اب تم سو جاؤ“ شوہر گھبرا کر بولا۔ ”یہاں اور میں؟ اگر میں ساری رات یہاں گزار کر گھر پہنچا تو میری بیوی مجھے کچا چبا جائے گی۔“

مرسلہ: راشد صغیر، لاہور

اٹھا تھا، اوپر سے اس کا ساتھی غائب تھا۔ ایسے میں انسان کے اوسان کو نارمل ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ فریڈی سوچ رہا تھا کہ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کرے، انہیں اس کی بے خبری اور غنودگی کا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

”اے جم..... کہاں ہو تم؟“ چند لمحوں تک جب اسے اپنے ساتھی کا کوئی جواب نہ ملا تو اس نے پھر چلا کر کہا۔ اس بار اس کی آواز میں خوف بھی صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔

چاند بدستور گھنے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ ہر طرف تاریکی اور ستائے کا راج تھا۔ اس کی پکار کے جواب میں بھی صرف خاموشی تھی۔ اچانک ایک زوردار آواز گونجی۔ ”اپنے ہتھیار چھینک دو، تم ہمارے نشانے پر ہو۔“

”کون ہو تم؟ اس کی خوف زدہ آواز سنائی دی۔“

”بکو اس مت کرو، اپنے ہتھیار چھینک دو ورنہ.....“

”گولی مت چلاؤ.....“ اس بد معاش کی ٹھکھائی ہوئی آواز گونجی۔

”تو جلدی کرو، ہتھیار نیچے چھینک دو۔“ گرج دار اور بارعب آواز گونجی۔ ”جلدی کرو ورنہ تو.....“

”پھینکنا ہوں۔“ اس نے کہا تو سبھی مگر رائفل کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ خوف زدہ تھا مگر پھر بھی رائفل نہیں پھینکنا چاہتا تھا۔

”جلدی کرو نہیں تو تمہاری کھوپڑی ہمارے نشانے پر ہے۔“

”مجھے گولی نہیں مار سکتے، تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔“
 اچانک اس کی آواز گونجی۔ ”اس اندھیرے میں.....“
 ”بکواس بند کرو، ہم نے انفراریڈ چشمہ پہنا ہوا ہے اور
 تمہاری پیشانی کے بیچوں بیچ ہم گولی مار سکتے ہیں۔“
 ”خدا کے لیے گولی نہ چلاتا۔“ وہ چلایا۔ اس بار اس کی
 آواز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ موت کے خوف سے سہم گیا
 ہے۔ اس کی آواز بھی لڑکھڑاہی تھی۔ اس نے راتقل اپنے
 قریب ہی پھینکی اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ”میں نے
 ہتھیار پھینک دیا ہے، خدا کے لیے.....“
 ”نہیں چلائیں گے گولی۔“ بارعب آواز نے قطع کلائی
 کی اور پھر ایک زور دار۔۔۔ تہقہ ستاکی دیا۔ ”اب گھٹنوں کے
 بل بیٹھ جاؤ، ہاتھ پیچھے کر دو اور گردن جھکا کر آنکھیں بند کر لو۔“
 ”اوکے۔“ وہ گردن جھکا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ ”جیسا
 تم کہو گے میں ویسا ہی کروں گا مگر خدا کے لیے، پلیز
 مجھے مارتا۔“ اس نے کانپتی آواز میں اپنی زندگی
 کی ہیک مانگی۔
 ”تم میرے ساتھی کے نشانے پر ہو۔“ رعب دار آواز
 نے اب اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”چپ چاپ بیٹھے،
 اپنے ہاتھ پاؤں بندھو اور نہ.....“
 ”اوکے۔“

ایک منٹ کے اندر اندر اس کی بھی مشکلیں کسی جاچکی
 تھیں۔
 دوسری طرف لیو ایر زمین پر اوندھے منہ پڑا، خدا سے
 معافیاں مانگ رہا تھا۔ خاموشی میں گونجنے والی بھاری اور
 رعب دار آواز نے اس کے جسم سے جان ہی نکال دی تھی۔
 اسے یقین ہو گیا کہ ان دو ڈاکوؤں کے دشمن بھی پہنچ چکے ہیں۔
 جیسے ہی چاند بادلوں کی اوٹ سے نکلے گا، وہ بھی دیکھ لیے
 جائیں گے۔ پھر گولیاں چلیں گی اور قصہ ختم۔
 ”اے لیو ایر اٹھو۔“ اچانک کسی نے سرگوشی کی۔ یہ
 فریڈی کی آواز تھی۔
 ”کیا ہوا؟“ اس نے بھرائی آواز میں بے یقینی سے
 پوچھا۔ ”فریڈی ہم مرنے والے ہیں۔“
 ”نہیں..... ہم بچ گئے ہیں۔“ اس نے جوش سے کہا۔
 یہ سنتے ہی لیو ایر جھٹ سے اٹھ بیٹھا۔
 ”کیا ہوا؟“
 ”میں نے اُس کو بھی باندھ دیا۔“ فریڈی نے کہا۔
 ”مجھے موبائل فون مل گیا۔“ فریڈی نے خوشی سے کہا۔
 ”کیا.....“ یہ سنتے ہی وہ چلاٹھا۔

اسی دوران بادلوں کی اوٹ سے چاند باہر نکل آیا۔
 ماحول ایک بار پھر روشن ہو گیا۔
 ”اٹھو، اسے بھی اس کے ساتھی کے برابر لٹا دیں۔“
 ”چلو۔“ یہ سنتے ہی لیو ایر جوش سے کھڑا ہو گیا۔
 جب وہ دونوں اسے گھسیٹ کر درخت کے تنے کے
 ساتھ لٹا رہے تھے تو اس کے سرخ بالوں دلہے ساتھی جم کو بھی
 ہوش میں آ گیا تھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے کرب ناک
 آواز میں کہا۔ لگ رہا تھا کہ اس کے سر پر لگی چوٹ کافی درد
 کر رہی تھی۔ ایک دو بار وہ تکلیف سے کرا رہا بھی تھا۔
 ”وہی، جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا۔“ لیو ایر نے خیر سے
 جواب دیا۔
 ”میں نے تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھتے ہی تلاشی لے
 ڈالی تھی۔“ فریڈی نے کھڑے کھڑے موبائل سے پولیس کی
 مددگار سروس کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ ”اب پولیس آئے گی،
 یہ تو جائیں گے ہی، ہم دونوں بھی یہاں سے نکل لیں گے۔“
 ”کیا تم پولیس کو فون کر رہے ہو۔“ یہ سنتے ہی ان
 دونوں نے بیک آواز کہا۔ ”تم ایسا نہ کرو، پلیز..... ہمیں چھوڑ
 دو۔ ہم تمہیں انعام میں بہت پیسے دیں گے۔“ جم نے
 پینکشن کی۔
 ”انعام تو ہمیں لینا ہی ہے مگر پولیس سے۔“ لیو ایر نے
 سینہ تان کر کہا۔
 ”کیسا انعام.....؟“ یہ سنتے ہی فریڈی نے چونک کر
 کہا۔
 ”یہی وہ ڈاکو ہیں جنہوں نے سٹیزن بینک لوٹا تھا اور
 لوٹی گئی رقم کا تھیلاد ہاں رکھا ہے۔“
 ”اوہ میرے خدا۔“ فریڈی نے چونک کر کہا۔ ”میں تو
 انہیں سیدھا سادہ معاشرہ سمجھا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ لیو ایر کی طرف
 مڑا۔ ”اور تم بھی یہ بات مجھے اب بتا رہے ہو۔“ اس کے لہجے
 سے ناراضی عیاں تھی۔
 ”بتانے کا موقع ہی کہاں مل سکا تھا۔“
 ”ارے ہاں.....“ اس نے اپنی غلطی مانتے ہوئے
 کہا۔
 ”اب چھوڑو، جلدی سے فون ملاؤ، سخت بھوک لگ رہی
 ہے۔“ لیو ایر نے کہا۔ ”پولیس آئے تو ہماری بھی جان
 چھوٹے۔“
 ”جان نہیں چھوٹی۔“ فریڈی نے شرارت سے کہا۔
 ”رات بھر پولیس کی شاباشیاں، ریڈیو کی وی اور اخبارات
 والوں کو انٹرویو بھی دینا ہے۔“ وہ کان سے موبائل لگائے

ہوئے تھا۔
 ”ہیلو.....“
 جیسے ہی مددگار پولیس سروس کا فون اٹینڈ ہوا، فریڈی
 نے پورا قصہ انہیں سنا دیا۔
 ”ہم نے تمہاری کال سے لوکیشن ٹریس کر لی ہے۔“
 دوسری جانب موجود پولیس افسر نے گرجوٹی سے کہا۔ ”تم
 آگ کا الاؤ روشن کر لو، تاکہ ہم تمہیں آسانی سے تلاش
 کر سکیں۔ بس ہم پندرہ بیس منٹ میں پہنچتے ہیں۔“ یہ کہہ کر
 اس نے مزید ہدایات دیں۔
 ”اوکے سرائی ہم انتظار کر رہے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے
 فریڈی نے فون بند کر کے جیب میں اڑس لیا۔ ”میں ان
 دونوں پر نظر رکھتا ہوں، تم الاؤ روشن کر دو۔“ اس نے لیو ایر کو
 ہدایت دی۔
 ”اب بھی وقت ہے.....“ جم نے کراہتے ہوئے کہا۔
 ”خاموش.....“ فریڈی نے ڈانٹا۔
 ”تم دو ہالٹ کے لڑکے.....“ اس نے نفرت سے
 زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔ ”چھوڑو گا نہیں۔“
 ”نہیں چھوڑنا۔“ فریڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”مگر یہ یاد رکھنا کہ ہم سے نمٹنے کے لیے پولیس تمہیں اتنی
 جلدی چھوڑنے والی نہیں۔“
 ”تم..... کیمنے لڑکے۔“
 ”بکواس نہ کرو۔“ اس دوران لیو ایر بھی پہنچ گیا تھا۔ اس
 نے بھی یہ سن لیا اور ڈانٹ کر کہا۔ ”تم جانتے ہو، ہم صرف دو
 لڑکے نہیں، دو بہادر بوائے اسکاؤٹس ہیں۔“ اس نے سینہ
 تان کر کہا۔
 ”ارے فریڈی..... وہ اتنی بھاری آواز کس کی تھی۔“
 لیو ایر اچانک اس کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”میری۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔
 ”مگر..... یہ تم نے کیسے کیا؟“
 ”تمہارا مانگیر.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ ”سوری
 لیو، وہ سب تمہارے میگا فون کا کمال تھا۔“
 ”دیکھا، کتنا کام آیا وہ۔“ یہ سن کر اس کا سینہ فخر سے اور
 پھول گیا۔ ”تم خواخوہ اس کی ہنسی اڑا رہے تھے۔“
 ”اب نہیں اڑاؤں گا۔“ فریڈی نے سنجیدگی سے جواب
 دیا۔ ”مجھے سو فیصد یقین ہے ہمارے اس کارنامے کے عوض
 اسکاؤٹ ماسٹر ہماری باقی سزا معاف کر دیں گے۔“
 ”واقعی..... ایسا ہوا تو ہمیں کیمنٹنگ کے بھائیوں
 میں کارکردگی دکھانے کا موقع مل جائے گا۔“ لیو ایر نے کہا۔

اسی دوران انہیں پولیس گاڑیوں کی آوازیں سنائی
 دیں۔ کچھ ہی دیر بعد تین پولیس گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس سے وہ
 جگہ روشن ہو رہی تھی۔ پولیس کے ساتھ ان کے اسکاؤٹ
 ماسٹر سر آر تھر بھی آئے تھے۔
 ”سر آپ.....“ انہیں دیکھتے ہی دونوں نے ہم زبان ہو
 کر کہا۔
 ”مجھے دوپہر کو ہی تمہارے فرار کا پتا چل گیا تھا۔“
 انہوں نے ہلکا سا مسکرا کر کہا۔ ”میں پولیس والوں کے ساتھ
 مل کر تمہاری تلاش کر رہا تھا کہ اسی دوران تمہارا فون بھی
 آ گیا۔“
 ”اوہ..... سوری سرائی۔“
 ”مگر کس لیے؟“
 ”وہ ہم نے آپ کے سلیپنگ بیگ میں چھوٹیاں.....“
 ”فی الحال بھول جاؤ اس بات کو۔“ انہوں نے پیار سے
 ڈانٹ کر کہا۔
 تھوڑی دیر میں دونوں ڈاکوؤں کو ہتھکڑیاں لگا کر پولیس
 گاڑی میں بٹھا دیا گیا تھا۔ ”اگر آپ ان بچوں کے بیانات
 کل کیپ سائڈ پر آ کر لے لیں تو کوئی حرج تو نہیں ہوگا۔“
 روانہ ہوتے وقت اسکاؤٹ ماسٹر نے شیرف سے
 کہا۔ ”دراصل یہ صبح سے بھوکے ہیں۔ رات کافی ہو گئی ہے
 اور کل صبح سے انہیں دوبارہ کیپ ٹرینگ جوائن کرنا ہے۔“
 ”کوئی بات نہیں، ایسا ہی کر لیں گے۔“ شیرف نے
 ہنستے ہوئے کہا۔ ”البتہ مجھے یقین ہے کہ ٹی وی اور اخبارات
 والے رات کو ہی آپ کے کیپ پہنچ جائیں گے۔“
 ”انہیں میں سنبھال لوں گا۔“ اسکاؤٹ ماسٹر نے مسکرا
 کر کہا۔
 ”جیسی آپ کی مرضی۔“ شیرف بھی مسکرا دیا۔ ”دے
 یہ ہیں دونوں بڑے بہادر۔“ اس نے ہاتھ سے دونوں کی
 طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”میری تربیت ملی ہے انہیں۔“
 ”مگر ہماری سزا.....“ فریڈی نے پوچھا۔
 ”اس کارنامے کے بعد معاف کر دی ہے۔“ اسکاؤٹ
 ماسٹر نے کہا۔ ”مگر آئندہ کوئی شرارت کرتے وقت یاد رکھنا
 کہ معافی کا اس جیسا سنہری موقع بار بار نہیں ملتا۔“
 فریڈی اور لیو ایر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا،
 آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے اور دونوں نے
 شرارتی مسکراہٹ لبوں پہ سجاتے ہوئے کہا۔ ”اوکے سرائی۔“

سجديات

ملک صندھيا

بعض اوقات سامنے کسی بات انسان کو اتنا الجھادیتی ہے کہ اپنی کم علمی کا احساس شرمندہ کر جاتا ہے... اور کبھی ایک نکتے سے پوری داستان ورق ورق بن کر کھل جاتی ہے۔ وہ بھی وہم و گمان کی بند گلیوں میں دوڑتے پھر رہے تھے کہ اچانک نئی سمت پر قدم پڑتے ہی تمام چہرے سامنے آ گئے۔ بات تو سیدھی سی ہے مگر سمجھ مشکل سے آتی ہے، پہلے مجرم جرم سے دوستی کرتا ہے پھر جرم حق دوستی ادا کرتے ہوئے اسے خود سے جدا نہیں ہونے دیتا... اسی فارمولے پر غور کرتے ہوئے جب ملک صاحب کی تفتیش کا دائرہ تنگ ہوا تو مجرم کے گلے میں پھندا بن کر انک گیا۔

شعبہ ۱: مہرون کے روپ میں ریزروں کی سنگ ولی کا قصہ

میں ایک روز حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے، میں نے برآمدے میں ایک پریشان حال عورت کو بیچ پر بیٹھے دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اسے صبح کون سی مصیبت پڑ گئی ہے جو تھانے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ میں اس سے کوئی بات کیے بغیر اپنے کمرے میں پہنچا اور ایک کاشییل کو اپنے پاس بلا لیا۔

”جی ملک صاحب!“ کاشییل وحید نے مجھے سیلوٹ کیا پھر یو لا۔ ”حکم.....!“

”یہ باہر برآمدے میں کون عورت بیٹھی ہوئی ہے؟“ میں نے کاشییل سے پوچھا۔ ”اس کے ساتھ کیا پریشانی ہے؟“

”ملک صاحب! یہ کافی دیر سے یہاں بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔“ کاشییل نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”بڑی دھمکی لگتی ہے جناب.....!“

”وہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”آخر وہ کون سا دکھ ہے جو اسے یہاں کھینچ لایا ہے؟“

”میں نے بہت کریدنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ کچھ بتانے کو تیار نہیں۔“ کاشییل وحید نے جواب دیا۔ ”کہہ رہی ہے، اپنی مشکل تھانے دار صاحب ہی کو بتائے گی۔ اگر آپ

کی اجازت ہو تو میں اسے اندر بھیجتا ہوں۔“

”اس نیک کام کے لیے بھلا اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ”اسے فوراً بھیج دو میرے پاس.....“

کاشییل ”جی ملک صاحب!“ کہہ کر چلا گیا اور اگلے ہی لمحے وہ مذکورہ عورت کے ساتھ میرے سامنے حاضر تھا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے وحید کو واپس جانے کے لیے کہا۔ پھر اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”بیٹھ جاؤ بی بی.....!“

وہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور امداد طلب نظر سے مجھ دیکھنے لگی۔ میں نے گہری نگاہ سے اس کا جائزہ لیا اور پوچھا۔

”بی بی! تمہارا نام کیا ہے؟“

”جی..... منگنی.....!“

”منگنی بی بی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ”مجھے بتایا گیا ہے کہ تم بہت پریشان ہو، آخر کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟“

”تھانے دار صاحب!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں اپنے جوان بیٹے کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔“

منگنی کھیت مزدوروں کی مدد سے اپنی نگرانی اور یعقوب کے تعاون سے کاشتکاری کے امور بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی۔

ان تمام تر معاشی و معاشرتی حالات میں منگنی کو اپنی بڑی بہن کبریٰ کا بڑا خیال تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان لوگوں کا گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا تھا اسی لیے وہ ان کی مدد کرتی رہتی تھی۔ اسی مقصد کی خاطر اس نے کل یعقوب کو پندرہ سو روپے دے کر کمال پور بھیجا تھا۔ کبریٰ کی بڑی بیٹی رضیہ کی شادی ہونے والی تھی۔ یہ پندرہ سو روپے رضیہ کے جہیز اور شادی کے دیگر اخراجات کے لیے تھے۔

کبریٰ اور منگنی کے درمیان بہن کے رشتے کے علاوہ بھی ایک اور رشتہ استوار ہونے جا رہا تھا۔ رضیہ سے چھوٹی بہن سلسلی کو منگنی نے اپنے بیٹے یعقوب کے لیے منتخب کر لیا تھا اور اس رشتے کے حوالے سے ان کی باقاعدہ گفتگو بھی ہو چکی تھی۔ شادی کا ارادہ ڈیڑھ دو سال بعد کا تھا۔ سلسلی اس وقت محض سترہ سال کی تھی، یعنی وہ یعقوب سے لگ بھگ دو سال چھوٹی تھی۔

اس دہری رشتے داری کی روشنی میں بھی میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ عین ممکن ہے، یعقوب اپنی ہونے والی سسرال ہی میں رات گزارنے کے لیے رک گیا ہو، مگر کے گھر کے چکر لگانے اور وہاں قیام کرنے کے لیے تو انسان خواہ خواہ بھی بہانے ڈھونڈتا ہے۔

۵۵۵

جس زمانے کا یہ واقعہ ہے، ان دنوں میں ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک چھوٹے سے قصبے شرف آباد کے قحطانی میں تعینات تھا۔ شرف آباد سے کمال پور لگ بھگ چھ میل کے فاصلے پر مغرب میں واقع تھا۔ ایک چھوٹی نہر شرفا غر بابیتے ہوئے ان دونوں گاؤں کو یکجہ کرتی تھی یعنی یہ دونوں گاؤں مذکورہ نہر کے کنارے پر واقع تھے۔ یہ نہر مشرق سے مغرب کی سمت رواں دواں تھی اور اسی نہر کے ساتھ ساتھ ایک کچا راستہ بھی بنا ہوا تھا جہاں تانگے، بیل گاڑیاں اور گھڑ سوار حسب ضرورت محو سفر رہتے تھے۔ ان دونوں گاؤں کو آپس میں ملانے کے لیے یہ واحد کچا راستہ تھا ورنہ ایک چھوٹا سا جنگل ان کے بیچ ادھر سے ادھر پھیلا نظر آتا تھا۔

میں جیسے ہی دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوا، منگنی ایک مرتبہ پھر قحطانی میں آن موجود ہوئی۔ اب کی بار وہ پہلے سے بھی زیادہ متشکر اور پریشان دکھائی دیتی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات کوئی اچھی خبر نہیں سنارہے تھے تاہم میں

مالگے بغیر ہی اس جہان سے اس جہان چلا گیا تھا۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ برکت علی نے اپنی اکلوتی اولاد کی بڑی مناسب تربیت کی تھی اور یعقوب اپنے والدین کا فرماں بردار تھا لیکن اس فرمان برداری کی روشنی میں یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ یعقوب پچھلی رات کسی بھی قیمت پر اپنی خالہ کے گھر نہیں رک سکتا تھا۔

منگنی ایک ماں تھی اور یعقوب اس کی اکلوتی اولاد۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ بیوہ بھی تھی۔ اس قسم کی مصیبت شناس عورتوں کی حساسیت بہت بڑھ جاتی ہے اور وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی بہت سنگین محسوس کرنے لگتی ہیں۔ اکلوتی اولاد ان کے جینے مرنے کا بہانہ بلکہ زندگی اور موت کی وجہ بن جاتی ہے جیسا کہ یعقوب کے معاملے میں منگنی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد چونکہ یعقوب ہی اس کی سوچ کا مرکز بن گیا تھا۔ اس لیے وہ اس کی خاطر مختلف نوعیت کے اندیشوں اور وسوسوں میں گھری ہوئی تھی اور یہ کوئی اجنبی بات نہیں تھی۔ ایک بیوہ ماں کو اپنی اکلوتی جوان اولاد کے لیے ایسے ہی جذباتی اور لگائیز انداز میں سوچنا چاہیے تھا۔

میں نے منگنی کو رخصت کرنے سے پہلے اس کی بہن کبریٰ کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کرنی تھیں مثلاً یہ کہ وہ منگنی سے عمر میں بڑی تھی اور اس کی ماں اللہ سات اولادیں تھیں۔ چار بیٹیاں، پھر ان سے چھوٹے تین بیٹے تھے۔ کبریٰ کا شوہر جان محمد ادھر کمال پور میں کرپانے کی ایک چھوٹی سی دکان چلاتا تھا جو بس ”ایویں“ سی چلتی تھی۔ جان محمد اس دکان سے جو کچھ بھی کماتا تھا، وہ نو افراد کا پیٹ پالنے کے لیے کافی نہیں تھا لہذا تنگ دستی اور مسرت نے ان کا گھر دیکھ رکھا تھا۔ بس، وہ لوگ جیسے تیسے گزارہ کر رہے تھے۔

کبریٰ کی نسبت اللہ تعالیٰ نے منگنی کو خوب نوازا رکھا تھا۔ اچھے وقتوں میں اس کی شادی ایک چھوٹے زمیندار سے ہو گئی تھی۔ برکت علی نامی اس زمیندار نے اپنی زندگی ہی میں منگنی کو بھی زمینداری سکھادی تھی۔ وہ ان تمام زمینی اور موسمی رازدوں سے واقف ہو گئی تھی جو زراعت کے شعبے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے برکت علی کی وفات کے بعد اسے ان مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا جیسا کہ عموماً عورتوں کو پیش آتی ہیں۔ برکت علی مرتے وقت اپنے لواحقین کے لیے ایک شاندار گھر اور پچیس ایکڑ زرعی، نہری زمین چھوڑ گیا تھا۔ گھر میں وہ تمام زرعی آلات بھی موجود تھے جو کسی بھی زمیندار کی انتہائی ضرورت ہوتے ہیں۔ جب سے

گلوگیر آواز میں بولی۔ ”میں نے جو کہہ دیا، بس کہہ دیا۔ وہ میرے کہے سے ایک سو تھی! ادھر ادھر نہیں ہلتا۔ میں نے بڑی سختی سے اسے تاکید کی تھی کہ چاہے کچھ بھی ہو اور کتنی بھی دیر ہو جائے، وہ رات کو ضرور واپس آئے۔ برکت علی نے مرتے وقت یعقوب کو ایک ہی نصیحت کی تھی کہ اسے میری بات ماننا ہے۔“ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی، دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں خشک کرنے کی کوشش کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”اگر ہر طرف خیریت رہتی تو یعقوب رات میں ضرور واپس آ جاتا۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرے بیٹے کے ساتھ کوئی نہ کوئی.....!“

وہ بولتے بولتے ایک مرتبہ پھر خاموش ہو گئی۔ غم کے یو جھ نے اس کی آواز کو گلے میں پھنسا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اس کی دلجوئی کرنے کی خاطر ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

”منگنی بی بی! میری بات دھیان سے سنو.....!“ وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔

”مجھے امید ہے کہ تمہارا بیٹا دوپہر تک واپس آ جائے گا۔“ اور اگر وہ دوپہر تک بھی نہ لوٹا تو.....؟“ وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

منگنی بی بی کی آنکھوں میں مجسم استفسار نے مجھے دل گرفتہ کر دیا۔ وہ ان لحاظات میں مجروح ممتا کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”اگر وہ دوپہر تک واپس نہ آیا تو پھر میں اپنے دو جوانوں کو ادھر کمال پور تمہارے بیٹے کی تلاش کے لیے بھیجوں گا۔ شام سے پہلے پہلے تمہیں کوئی اچھی خبر سننے کو ملے گی۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے قحطانی دار صاحب۔“ وہ دعائیہ انداز میں بولی۔

”اللہ تو سب کا بھلا ہی کرتا ہے.....“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم بھی فکر نہ کرو، انشاء اللہ! یعقوب خیر خیریت سے واپس آ جائے گا۔“

میں نے تسلی بخشی دے کر اسے رخصت کر دیا۔ میرے حساب سے یہ کوئی تشویش ناک بات نہیں تھی کہ یعقوب رات کو واپس نہیں آیا تھا۔ منگنی کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ یعقوب اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کی عمر اٹھارہ، انیس سال کے درمیان تھی۔ وہ کوئی ننھا بچہ نہیں تھا کہ کہیں کھو جاتا۔

یعقوب کا باپ برکت علی چند سال پہلے حادثاتی موت کا شکار ہو کر دوسری دنیا میں جا چکا تھا، کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ایک زہریلے سانپ نے اسے ڈس لیا اور بہ قول شخصے، وہ پانی

”اس پریشانی کا سبب کیا ہے.....“ میں نے پوچھا۔

”اور یہ بتاؤ کہ تمہارے جوان جہان بیٹے کا نام کیا ہے؟“

”یعقوب.....“ میرے بیٹے کا نام یعقوب ہے جی۔“

وہ غم زدہ لہجے میں بولی۔ ”وہ کل سے غائب ہے۔“

”غائب ہے..... کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”یعقوب کل صبح موضع کمال پور گیا تھا اور کہا تھا کہ رات کو واپس آ جائے گا۔ کل کا سورج غروب ہو گیا اور اب تو آج کا نیا سورج بھی طلوع ہو چکا ہے لیکن وہ ابھی تک واپس نہیں آیا.....“ لگاتی توقف کر کے اس نے اپنی سانس کو ہموار کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”میں نے ساری رات جاگ کر اس کی راہ دیکھی ہے اور صبح ہی صبح آپ کے پاس آ گئی ہوں۔ اب آپ ہی میرے بیٹے کی تلاش کے سلسلے میں کچھ کریں.....“

”وہ کمال پور کیا لینے گیا تھا؟“ میں نے پھر سے ہونے لہجے میں پوچھا۔

”ادھر کمال پور میں میری بڑی بہن رہتی ہے جس کا نام کبریٰ ہے۔“ منگنی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے یعقوب کے ہاتھ کبریٰ کے لیے کچھ رقم بھجوائی تھی۔“

”کتنی رقم؟“ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”پندرہ سو روپے!“ منگنی نے بتایا۔ ”اور ساتھ ہی میں نے اسے تاکید کر دی تھی کہ ہر قیمت پر وہ سورج غروب ہونے سے پہلے گھر واپس آ جائے لیکن ابھی تک.....“ بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

پندرہ سو یعنی ڈیڑھ ہزار روپے آج کل کے حساب سے ایک معمولی سی رقم ہے لیکن جس زمانے کی یہ کہانی ہے اس دور میں پندرہ سو روپے بہت بھاری رقم تصور کی جاتی تھی۔ ایک عام آدمی کی تنخواہ ساٹھ سے اسی یا زیادہ سے زیادہ سو روپے ہوا کرتی تھی اور بیس پچیس روپے میں کسی متوسط فیملی کے گھر میں مہینے بھر کا راشن بھرا جاسکتا تھا۔ اگر آج کل کے تناظر میں حساب کرنے بیٹھیں تو ایک محتاط انداز کے مطابق یہ رقم لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ روپے بنتی تھی۔

میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ”زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں منگنی بی بی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہارا بیٹا رات کو اپنی خالہ کے گھر ہی میں رک گیا ہو اور دوپہر تک واپس آ جائے۔“

”یعقوب نے آج تک میری بات رو نہیں کی۔“ وہ

نے فوراً اسے اپنے پاس بلا لیا۔

”صغریٰ بی بی! تمہارا بیٹا گھر آ گیا؟“

”اگر یعقوب واپس آ گیا ہوتا تو میں آپ کو اتنی ٹوٹی پھوٹی حالت میں نہ نظر آتی۔“ وہ دھمی لہجے میں بولی۔ ”تھانے دار صاحب..... آپ کچھ کرتے ہیں یا میں کمال پور جانے کی تیاری کروں؟“

یعقوب کی عدم واپسی نے اب تو مجھے بھی تشویش میں ڈال دیا تھا۔ میں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہم یہ دونوں کام کریں گے۔“

”دونوں کام!“ وہ ابھمن زدہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کون سے دونوں کام تھانے دار صاحب.....؟“

”کام نمبر ایک، تمہیں ضرور کمال پور جانا چاہیے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”کام نمبر دو، میں تمہارے بیٹے کی تلاش کے لیے اپنے بندوں کو دوڑاتا ہوں اور.....“ یہ دونوں کام ایک وقت میں اور ایک ساتھ ہی ہوں گے.....!“

”ایک ساتھ کیسے؟“ وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے دو آدمیوں کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر ابھی اور اسی وقت کمال پور جاؤ گی۔ سب سے پہلے یعقوب کو تمہاری بہن کبریٰ کے گھر میں چیک کیا جائے گا۔ مجھے امید ہے، وہ ادھر ہی مل جائے گا یا راستے میں بھی اس سے ملاقات ہو سکتی ہے۔“ میں نے تھوڑا توقف کر کے سوچتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔

”تمہارا بیٹا کس چیز پر بیٹھ کر کمال پور گیا تھا؟“

”وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کبریٰ کے گھر گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم اپنے گھر پہنچ کر تیاری کرو۔ تھوڑی دیر میں، میں اپنے بندوں کو ادھر ہی بھیجتا ہوں۔“

”اور اگر وہ.....“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ ”کبریٰ کے گھر میں بھی نہ ہوا تو.....؟“

”حوصلہ کرو صغریٰ.....!“ میں نے اس کی دل شکستی کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔ ”اللہ بہتری کرے گا۔ تم ہمت نہ ہارو، یعقوب کو کچھ نہیں ہوگا۔“

تاثرات کے ساتھ مجھے ہکتی رہی پھر ایک افسردہ سی سانس خارج کرنے کے بعد رخصت ہو گئی۔

صغریٰ کے جانے کے بعد میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اب تو مجھے بھی تشویش ہونے لگی تھی۔ اگر واقعی یعقوب کمال پور میں نہ ہوتا تو پھر پریشانی والی بات تھی۔ میں نے اسے ایس آئی شوکت علی اور کاشمیل خالد کو اپنے پاس بلا لیا، انہیں حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا پھر ضروری ہدایات کے ساتھ صغریٰ کی جانب روانہ کر دیا۔ پروگرام کے مطابق، وہ صغریٰ کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر کمال پور جاتے۔

دوپہر سے سہ پہر ہوئی، سہ پہر سے شام اور شام سے رات لیکن کمال پور جانے والوں میں سے کوئی بھی واپس نہیں آیا۔ اس زمانے میں موبائل فون تو ہوا نہیں کرتے تھے اور نہ ہی گاؤں دیہات کی سطح پر لینڈ لائن فون کا وجود نظر آتا تھا۔ اگر اس قسم کی کوئی سہولت میسر ہوتی تو میں فوراً ادھر کی خبر لے لیتا۔ سو، سوائے انتظار کے میرے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے یہ انتظار اختتام پذیر ہوا اور رات کے آٹھ بجے مجھے اپنے عملے کے افراد کی شکل نظر آئی۔ خالد اور شوکت علی نہ صرف ناکام و نامراد واپس آ گئے تھے بلکہ وہ اپنے ساتھ ایک بری خبر بھی لائے تھے۔

وہ گھوڑا جس پر سوار ہو کر یعقوب کمال پور گیا تھا اس کی لاش جنگل کے اندرونی حصے سے مل گئی تھی۔

میں ابھی تک انہی کی واپسی کے انتظار میں بیٹھا تھا ورنہ عام دنوں میں، میں اس وقت تک تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں جا چکا ہوتا تھا۔ میں نے ان دونوں کو فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا اور استفسار یہ نظر سے انہیں دیکھنے لگا۔

اے ایس آئی شوکت علی نے کہا۔ ”ملک صاحب! یہ تو کہانی ہی الٹ گئی ہے۔ ہمیں اس گھوڑے کی لاش جنگل کے اندرونی حصے میں پڑی ملی ہے، جس پر صغریٰ کا بیٹا سوار ہو کر یہاں سے کمال پور کی جانب روانہ ہوا تھا اور پھر کمال پور سے واپس اس طرف آیا تھا۔“

”اور صغریٰ کا جوان بیٹا یعقوب؟“

”اس کی کچھ خبر نہیں ملی۔“ شوکت علی کسمیر لہجے میں بولا۔ ”رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا، لہذا ہم نے جنگل کے اندر مزید آگے جانے کی کوشش نہیں کی۔ تلاش کا باقی کام کل صبح ہی ہو سکے گا۔“

”گھوڑے کی لاش جنگل کے کس حصے میں پائی گئی ہے؟“ میں نے تشویش بھرے انداز میں دریافت کیا۔

سیدھی بات

”لہوے دور واقع ہے۔“ شوکت علی نے جواب دیا۔ ”بس ہاں سمجھیں کہ جائے وقوعہ کمال پور کے مشرق میں زیادہ سے زیادہ ایک میل کے فاصلے پر ہوگا یعنی جب یعقوب کمال پور سے واپس شرف آباد کی طرف آ رہا تھا تو اس کے ساتھ کوئی ۱۰ فوٹگوار واقعہ پیش آ گیا ہوگا۔ گھوڑے کی لاش کو دیکھ کر تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے سوار کے ساتھ بھی کوئی اچھا سلوک نہیں ہوا ہوگا۔“

”تم کس بنا پر اتنے وثوق سے کہہ رہے ہو کہ جس گھوڑے کی لاش تمہیں جنگل میں پڑی ملی ہے وہ صغریٰ کے بیٹے یعقوب ہی سے تعلق رکھتا تھا؟“ میں نے اپنے ذہن میں مراٹھانے والے خدشات میں سے ایک کی تسکین کی خاطر پوچھ لیا۔

اس مرتبہ کاشمیل خالد نے جواب دیا۔ ”ملک صاحب! ہم راستے بھر صغریٰ سے کرید کرید کر سوال پوچھتے رہے تھے اور اس گفتگو کے دوران میں بار بار یعقوب کے گھوڑے کا بھی ذکر آیا تھا۔ صغریٰ نے مذکورہ گھوڑے کی جو نشانیاں ہمیں بتائی تھیں، وہ مردہ گھوڑا ان پر پورا اترتا ہے۔“ ”کمال پور میں ہم نے صغریٰ کی بہن اور بہنوئی سے بھی پوچھ گچھ کی ہے جناب!“ اے ایس آئی شوکت علی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”جہاں ان لوگوں نے یہ بتایا ہے کہ یعقوب کل سہ پہر میں کمال پور سے شرف آباد کے لیے روانہ ہو گیا تھا، وہیں اس کے گھوڑے کے بارے میں بھی ہمیں تفصیل فراہم کر دی ہے اور میں نے جس مردہ گھوڑے کا تذکرہ کیا ہے وہ سو فیصد وہی گھوڑا ہے جناب.....!“

”مثلاً.....!“ میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ ”اس گھوڑے کی ایسی کون سی نشانی بتائی گئی ہے جو یہ تصدیق کرتی ہے کہ وہی یعقوب کا گھوڑا ہے..... بلکہ یعقوب کا گھوڑا تھا، اب تو وہ گھوڑا لاش کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس کا مالک یعقوب بھی لا پتا ہے؟“

”جناب! دیگر چھوٹی بڑی نشانیوں کے علاوہ اس گھوڑے کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کی گردن میں بڑے بڑے سفید سوجیوں (منکوں) کی ایک مالا پڑی ہوئی ہے جو اس کی گردن کے ساتھ بالکل فٹ ہے۔“

”ہوں.....!“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ”کیا صغریٰ کے بہن بہنوئی نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ یعقوب کل سہ پہر میں، ان کے گھر سے واپسی کے لیے روانہ ہو گیا تھا؟“

”جی ہاں!“ شوکت علی اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے

بولا۔ ”ان کے گھر کا تو ہر چھوٹا بڑا اس بات کی تصدیق کر رہا ہے کہ یعقوب کل وہاں سے واپس آ گیا تھا۔“

”یعقوب کل سہ پہر میں کمال پور سے شرف آباد کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”یہ خبر سن کر صغریٰ پر کیا اثر ہوا ہے؟“

”اس کی حالت پہلے ہی کچھ اچھی نہیں تھی ملک صاحب۔“ وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جب اسے پتا چلا کہ یعقوب کل ہی وہاں سے روانہ ہو گیا تھا تو وہ غش کھا کر گر پڑی۔ اس کو ہوش میں لانے میں کوئی ایک گھنٹا لگ گیا تھا۔ وہ ہوش میں تو آ گئی لیکن اس کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں۔“

”کیا تم لوگ صغریٰ کو اس کے گھر پہنچانے کے بعد تھانے آئے ہو؟“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ”نہیں جناب۔“ اے ایس آئی تقی میں گردن ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ تو ادھر کمال پور ہی میں ہے۔“

”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

”جناب! اسے کبریٰ اور جان محمد نے ضد کر کے اپنے پاس روک لیا ہے۔“ شوکت علی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”اس کی ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے جان محمد نے اسے شرف آباد آنے کی اجازت نہیں دی اور ہمیں یہ ہدایت کی ہے کہ ہم جلد از جلد یعقوب کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔ جب تک اس کا اتنا پتا نہیں مل جاتا، وہ لوگ صغریٰ کو اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھیں گے۔“

”یہ بھی اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”کیا مردہ گھوڑے کے بارے میں صغریٰ یا کبریٰ اینڈ کمپنی کو خبر ہو گئی ہے؟“

”نہیں جناب، بالکل نہیں۔“ شوکت نے اپنے سر کوئی میں جنبش دی اور بتایا۔ ”ہم جنگل سے سیدھے ادھر ہی آئے ہیں۔“

پاس چلے آئے ہیں۔

”میں نے اس کا رتا سے پر انہیں شاباشی دی پھر ایک اہم سوال کیا۔ ”صغریٰ نے کل صبح ایک ٹکڑی رقم کے ساتھ یعقوب کو کمال پور کی جانب روانہ کیا تھا۔ کیا وہ رقم کبریٰ تک بہ خیر و عافیت پہنچ گئی ہے؟“

جی ہاں، میں نے کبریٰ سے اس امر کی تصدیق کر لی ہے ملک صاحب۔“ اے ایس آئی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”وہ رقم بڑے محفوظ انداز میں کل ہی کبریٰ کو مل گئی تھی۔“ میں نے ایک مطمئن اور پرسکون سانس لی پھر شوکت علی سے دریافت کیا۔ ”تم نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ یعقوب کے گھوڑے کو کس طرح موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے؟“

”گھوڑے کا سارا بدن خصوصاً ٹانگیں اور گردن لہولہاں ہو رہی تھی۔“ اے ایس آئی ایک جبر جبری لیے ہوئے بولا۔ ”دن کی روشنی بہت کم رہ گئی تھی تاہم میرا اندازہ ہے کہ گھوڑے پر کسی تیز دھار آلے مثلاً کلہاڑی وغیرہ سے پے در پے خطرناک اور مہلک وارے کیے گئے ہیں۔“ ”اس طرز کی وحشیانہ دشمنی گھوڑے سے تو کسی شخص کی ہو نہیں سکتی۔“ میں نے تشویش میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”قاتل جو کوئی بھی تھا یا تھے وہ یقیناً یعقوب کے تعاقب میں ہوں گے۔ پتا نہیں، ان بدبختوں نے بے چارے یعقوب کا کیا حشر کیا ہوگا.....؟“

”میں بھی اس نوجوان کے لیے بہت پریشان ہوں ملک صاحب۔“ شوکت علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”گھوڑے کی لاش جنگل کے اندرونی حصے میں پڑی ملی ہے اور یہ حصہ نہروالے کپے راستے سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ میرے اندازے کے مطابق کمال پور سے شرف آباد کی طرف آتے ہوئے کوئی دشمن اس کے پیچھے لگ گیا تھا پھر وہ اسے گھوڑے سمیت گھیر گھاڑ کر جنگل کے اندر لے گیا اور وہاں اس پر حملہ کر دیا۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دشمن گھیر کر اسے جنگل میں نہ لے گیا ہو بلکہ وہ دشمن سے بچنے کے لیے نہروالہ کپڑا راستہ چھوڑ کر جنگل کے اندر گھس گیا ہو۔“ میں نے خیال آرائی کی۔ ”لیکن ہر دو صورت میں یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ یعقوب کہاں غائب ہے۔ اگر اس کی سواری کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے تو دشمن نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے.....؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!“ اے ایس آئی

آئی تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یعقوب گمشدگی کو لگ بھگ چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اگر اب تک اس کی کوئی خیر خبر سامنے نہیں آئی تو ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ یہی سوچنا پڑے گا کہ اس بے چارے کے ساتھ کوئی سنگین حادثہ پیش آچکا ہے۔“

میں معنی خیز انداز میں سر کو اٹھاتی جنبش دے کر رہ گیا ہمارے درمیان مزید بیس پچیس منٹ تک یعقوب کی گمشدگی اور اس کے گھوڑے کی ہلاکت کے بارے میں بات ہوتی رہی پھر میں نے اٹھنے سے پہلے اے ایس آئی کو کچھ اس انداز میں ہدایات دیں۔

”شوکت علی! کل صبح تم میرے ساتھ، یعقوب کی تلاش میں جنگل کی طرف جاؤ گے۔“ ”ٹھیک ہے ملک صاحب!“ وہ فرماں برداری سے بولا۔ ”جو آپ کا حکم۔“

”اور ہم یہاں سے علی الصبح نکل جائیں گے تاکہ جب ہم جائے وقوعہ پر پہنچیں تو سورج نکل رہا ہو، اس طرح ہمیں کام کرنے کے لیے زیادہ وقت مل جائے گا۔ آج کل دیے بھی دن کافی چھوٹا ہو چکا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم رات ہی میں ضروری تیاری کر لیتا۔ سواری کے لیے تانگے کا بندوبست کرو گے یا.....؟“

”میرے خیال میں گھوڑے زیادہ مناسب رہیں گے۔“ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔ ”جائے وقوعہ تک رسائی کے لیے تو تانگا ٹھیک ہے لیکن یعقوب کی تلاش میں پتا نہیں، ہمیں جنگل کی کس گہرائی تک جانا پڑے۔ گھنے درختوں کے بچوں بیچ تانگے کو آگے بڑھانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ثابت ہوگا۔“

”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں شوکت علی!“ میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم نے بڑی عاقلانہ تجویز دی ہے۔ اب ہم صبح ہی ملیں گے۔ جیسے ہی سپید سحر نمودار ہوگا، ہم تھانے سے روانہ ہو جائیں گے۔“

میں مطمئن ہو کر تھانے سے نکلا اور اپنے سرکاری کوارٹر میں آگیا۔ میں نے خلاف معمول رات کا کھانا تھوڑی تاخیر سے کھایا پھر عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اس رات مجھے آسانی سے نیند نہ آئی۔ بستر پر لیٹے لیٹے میں کافی دیر تک یعقوب کے بارے ہی میں سوچتا رہا۔ ایک بات تو طے تھی کہ کسی شخص کو یعقوب کے گھوڑے سے قطعاً کوئی دشمن نہیں ہو سکتی تھی۔ قاتل جو کوئی بھی تھا وہ یقیناً یعقوب کے تعاقب میں تھا اور اس نے یعقوب کو زیر کرنے کے

سیدھی بات

اس پر بھی خطرناک حملہ کیا ہوگا۔ جب وہ بے زبان گھوڑا دلوں کی تاب نہ لاتے ہوئے لقمہ اجل بن گیا تھا تو یہ سوچنا ہر محنت ہوتی کہ یعقوب کہیں صبح سلامت بیٹھا ہوگا۔

گھوڑے کی موت اور یعقوب کے ساتھ پیش آنے والی بہم صورت حالات کے اسباب پر غور کریں تو اس رقم کو غرا انداز نہیں کیا جاسکتا تھا جو صغریٰ بی بی نے اپنی بڑی بہن گھری بی بی کے لیے بھیجی تھی۔ کوئی بھی شخص اس رقم کے لیے یعقوب کی جان کا دشمن بن سکتا تھا لیکن اس تصویر میں ایک بہت بڑا سقم مجھے شروع ہی سے نظر آ رہا تھا۔

اور وہ یہ کہ..... اگر کوئی شخص یعقوب کے ساتھ اس رقم کی خاطر کوئی اونچ نیچ کرتا تو پھر یہ افسوس ناک واقعہ شرف آباد سے کمال پور کی جانب سفر کے دوران میں پیش آنا چاہیے تھا۔ اگر کوئی شخص اس راز سے آگاہ ہو گیا تھا کہ یعقوب ایک موٹی رقم لے کر شرف آباد سے کمال پور جا رہا ہے تو ایسے شخص کو یعقوب کے کمال پور پہنچنے سے پہلے، راستے میں کہیں ”کارروائی“ کرنا چاہیے تھی لیکن واقعہ اس کے برعکس پیش آیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ یہ سارا ہنگامہ رقم کی وجہ سے ہرگز نہیں تھا۔

۵۵۵

اگلے روز میں علی الصبح تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ایک اسی صورت حال میری منتظر تھی، میں جیسے ہی اپنے کمرے کی جانب بڑھا، صغریٰ بی بی ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ وہاں آن موجود ہوئی۔ میں اٹنی صبح اسے اپنے سامنے دیکھ کر چونک اٹھا کیونکہ میری معلومات کے مطابق صغریٰ کے بہن بہنوئی نے اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر اسے ادھر کمال پور ہی میں روک لیا تھا۔ اگر وہ اتنی صبح تھانے میں موجود تھی تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس طرف کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔

میں نے صغریٰ اور اس کے ساتھی کو فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔ بعد ازاں پتا لگا کہ ساتھ آنے والا شخص صغریٰ کا بہنوئی جان محمد تھا۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا پھر صغریٰ کی جانب دیکھتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

”خیریت تو ہے نا صغریٰ.....؟“

”تھانے دار صاحب!“ صغریٰ کے بجائے اس کے بہنوئی جان محمد نے جواب دیا۔ ”صغریٰ اپنے جوان بیٹے کی ہدائی میں نیم پاگل ہو گئی ہے۔ کل آپ کے عملے کے دو افراد کے ساتھ یہ ہمارے پاس آئی تھی اور جب اسے پتا چلا کہ یعقوب ہمارے گھر سے صبح و سلامت روانہ ہو گیا تھا تو اس کی طبیعت بگڑ گئی، مجبوراً ہم نے اسے ادھر کمال پور ہی میں روک

لیا تھا اور.....“ ”ہاں، یہ بات تو رات ہی کو میرے علم میں آ گئی تھی کہ صغریٰ کو تم لوگوں نے اپنے پاس روک لیا ہے۔“ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”اور اب اتنی صبح تم لوگ یہاں ہو، یہ کیا ماجرا ہے جان محمد.....؟“

جان محمد کی عمر پچپن سے متجاوز نظر آتی تھی۔ وہ ایک متناسب البدن اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کے سر کے بالوں میں سفیدی اور سیاہی کا تناسب یکساں تھا۔ سات بچوں کا باپ بھی تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ محنت اولاد کی تعداد بڑھانے پر کی تھی۔ بعد ازاں مجھے یہ بھی پتا چلا کہ درحقیقت کبریٰ کے بطن سے دس بچے پیدا ہوئے تھے۔ چار لڑکیاں اور چھ لڑکے..... جن میں سے تین لڑکے اداکل عمری ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اسی جان محمد نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”تھانے دار جی! ہم نے تو صغریٰ کے بھلے ہی کے لیے اسے اپنے گھر میں روک لیا تھا کہ جب تک یعقوب کی خیر خبر نہیں مل جاتی یہ ہمارے ساتھ رہے لیکن جناب، ہم نے پوری رات جاگ کر گزار دی اور فجر کی اذان کے وقت میں اس کی ضد کے سامنے مجبور ہو گیا اور اسے اپنے ساتھ لے کر یہاں آگیا ہوں۔ اس کا خیال یہ ہے کہ اسے اپنے گھر میں رہتے ہوئے یعقوب کا انتظار کرنا چاہیے۔“ خدا خدا کر کے وہ متوقف ہوا، ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم ابھی ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ میں صغریٰ کو لے کر اس کے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اس کی ضد پر ادھر آگیا ہوں۔ یہ گھر میں قدم رکھنے سے پہلے آپ سے ملنا چاہتی تھی۔ اب آپ خود اس سے بات کر لیں۔“

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا جیسے اس کے بولنے کا کوئی ختم ہو گیا ہو۔ جان محمد کے چپ ہوتے ہی صغریٰ پھٹ پڑی۔ ”تھانے دار جی..... میرے یعقوب کا کچھ پتا چلا؟“ اس کا یہ سوال کرب میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلاتی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہاں، ایک سراغ ملا تو ہے۔“

”دیکھا، میں نے کہا تھا نا.....“ وہ اپنے بہنوئی کی طرف دیکھتے ہوئے جوشیلے انداز میں بولی۔ ”تھانے دار جی ضرور میرے یعقوب کو ڈھونڈ نکالیں گے اسی لیے تو میں شرف آباد آنے کی ضد کر رہی تھی۔“ پھر وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہو گئی اور سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”یعقوب کہاں ہے تھانے دار جی؟“

میں نے دانستہ ان جیٹھ بھابی کی تلخ گفتگو کو طویل نہیں ہونے دیا تھا۔ اس سے سوائے وقت ضائع ہونے کے اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ صغریٰ کے جانے کے بعد میں نے اسے ایسے کی شوکت علی کو روانہ ہونے کا اشارہ کر دیا اور رحمت علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم اپنے تانگے پر ہمارے پیچھے آؤ۔“

”ہمیں جانا کہاں ہے؟“ وہ انہیں زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

”یعقوب کو ڈھونڈنے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ادھر جنگل میں۔“

”جنگل میں.....؟“ اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔

میں نے گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے یعقوب کے گھوڑے کو پیش آنے والے اندوہناک واقعے سے آگاہ کیا پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

”دیکھو رحمت! مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ تمہارا صغریٰ کے ساتھ کیا جھگڑا ہے اور میں یہ بھی نہیں جانتا چاہوں گا کہ تم دونوں کے بیچ کس نوعیت کے اختلافات ہیں۔ میں تو پہلی فرصت میں تمہارے بھتیجے یعقوب کو ڈھونڈ نکالنا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں، وہ بے چارہ کہاں اور کس حال میں ہوگا؟“ میں نے لچاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اس کی جانب گردن گھما کر پوچھا۔

”تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو؟“

اب ہم تھانے کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور کمال پور کی جانب ہمارا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اے ایس آئی شوکت علی اور میں گھوڑوں پر سوار تھے جبکہ رحمت علی اپنے تانگے پر بیٹھا ہوا تھا۔ شوکت کی راہنما کے مانند ہم سب سے آگے تھا اور میرا گھوڑا رحمت علی کے تانگے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، اس طرح کہ ہم بہ آسانی بات چیت بھی کرتے چلے جا رہے تھے۔ بچپن کا ہندسہ عبور کرنے کے باوجود بھی وہ خاصا مستعد دکھائی دیتا تھا۔

رحمت نے میرے استفسار کے جواب میں کہا۔

”تھانے دار جی! مجھے آپ کی مدد کرنے میں تو کوئی اعتراض نہیں لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ جب تک مجھے حالات کا پوری طرح علم نہ ہو۔“

”حالات کا مکمل علم تو کسی کو بھی نہیں ہے رحمت!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ابھی تک اس سلسلے میں جو پیش رفت ہوئی ہے وہ میں نے تمہیں بتا دی ہے۔“

وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ تو بڑی

تشویش ناک صورت حال ہے جناب!“

میں نے تھوڑی دیر پہلے، تھانے کے سامنے رحمت اور صغریٰ کے درمیان ہونے والی گفتگو کو بڑی توجہ سے سنا تھا۔ رحمت کا انداز تعاون آمیز تھا جبکہ صغریٰ اس سے سخت ناراض اور برہم نظر آتی تھی۔ ان کے بیچ اصل وجہ کیا تھا وہ تو ابھی مجھے معلوم نہیں تھی اسی لیے میں رحمت سے بات کرتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات کو بھی خصوصاً نوٹ کرتا جا رہا تھا تاکہ اسے سمجھنے میں مجھے آسانی رہے۔

”رحمت! تمہارا ذہن اس معاملے کو کس انداز میں لے رہا ہے؟“ میں نے سنجیدہ لہجے میں اس سے سوال کیا۔ ”تمہارے خیال میں یعقوب کو کس قسم کے حالات پیش آئے ہوں گے۔“

”میں سمجھتا ہوں، صغریٰ کے بیٹے کو کوئی سنگین حادثہ پیش آچکا ہے۔“ وہ گہمیر انداز میں بولا۔ ”آپ نے جو حالات بتائے ہیں وہ تو اسی جانب اشارہ کرتے ہیں۔“

”ہوں.....!“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

”شرف آباد اور کمال پور کے درمیان جنگل کا ایک بڑا حصہ بڑتا ہے۔“ رحمت نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”یہ جنگل لگ بھگ دو، ڈھائی میل تک پھیلا ہوا ہے۔ مجھے تو یہ کوئی راہ زنی کی واردات لگتی ہے جناب.....!“

”راہ زنی!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”تمہارا مطلب کہ کمال پور سے شرف آباد کی طرف آتے ہوئے ڈاکوؤں نے یعقوب کو لوٹنے کی کوشش کی ہوگی؟“

”ایسا ناممکن تو نہیں ہے جناب۔“ وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ”آپ تو جانتے ہی ہیں، یہ جنگل ڈاکوؤں کے وجود سے خالی نہیں۔ اکاؤکا وارداتیں تو سامنے آتی ہی رہتی ہیں، جب گھوڑے کی لاش جنگل کے اندرونی حصے سے ملی ہے تو یعقوب کا سراغ بھی اسی جنگل سے ملے گا جناب۔ ہمیں جنگل کے اس حصے کو خاص طور پر اچھی طرح کھنگالنا چاہیے جہاں یعقوب کے گھوڑے کی لاش پڑی ملی ہے۔“

”ہم اسی طرف جا رہے ہیں رحمت.....!“ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

۵۵۵

لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد اے ایس آئی شوکت علی کی راہنمائی میں ہم اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں یعقوب کے گھوڑے کی لاش پڑی تھی۔ میں نے پہلے کھڑے کھڑے اور پھر اکڑوں بیٹھ کر گھوڑے کی لاش کا تفصیلی جائزہ لیا۔ واقعی

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

سیدھی بات

رنجش کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا نا.....“ میں نے لچاتی توقف کر کے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم بتانا نہ چاہو تو الگ بات ہے.....“

”ایسی بات نہیں ہے ملک صاحب۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میں صرف اس لیے اپنی زبان نہیں کھول رہا کہ کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ، میں صغریٰ کے خلاف زہرا گل رہا ہوں۔

اس کی پیٹھ پیچھے برائی کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔“

انسانی جان بچانے کے لیے اور تشویش کی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے نظریہ ضرورت کے تحت اسے جائز سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک کسی بھی قانون قاعدے سے زیادہ اہم انسان ہوتا ہے اور..... وہ صورت حال اہم ہوتی ہے جس کے اندر انسان پھنسا ہوا ہو۔ ہم اس وقت جس مشن پر ہیں اس کا مقصد نیک اور مثبت ہے لہذا اگر یعقوب تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے تمہاری زبان سے صغریٰ کی اور صغریٰ کی زبان سے تمہاری برائی بھی اگلوانا پڑے تو میں اس میں ایک لمحے کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کروں گا۔“ میں نے توقف کر کے بڑی گہری نظر سے رحمت علی کی طرف دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اگر میری بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہو تو بتا دو کہ تمہاری صغریٰ سے یا صغریٰ کی تم سے کیا دشمنی ہے..... وہ تم سے اتنی شدید نفرت کیوں کرتی ہے؟“

”میری تو اس سے قطعاً کوئی دشمنی نہیں ہے ملک صاحب!“ وہ بڑے کھلے ڈالے انداز میں بولا۔ ”اب جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ وہ مجھے کیوں ناپسند کرتی ہے تو میں اس سلسلے میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ وہ ایک سازشی اور فتنہ پرور عورت ہے۔ میں چونکہ گہری بات کرتا ہوں اس لیے وہ مجھ سے اپنی نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ اسی عورت کی چال بازیوں نے ہمارا ہنسا بستا گھرا جا کر رکھ دیا ہے۔“

یہ ایک بالکل نئی کہانی سامنے آرہی تھی۔ میں نے یعقوب کی تلاش کا کام جاری رکھتے ہوئے رحمت علی سے کہا۔

”رحمت! ابھی تم نے صغریٰ کے حوالے سے جن گہری حالات و واقعات کا ذکر کیا ہے، مجھے تفصیلاً اس کے بارے میں بتاؤ، میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔“

میں نے گرین سنگل دیا تو وہ اللہ کا بندہ شروع ہو گیا۔

اس نے تو مجھے ایک لمبا چوڑا قصہ سنا ڈالا تھا لیکن میں اس کے بیان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ صغریٰ بی بی کا پس منظر آپ

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

ہیں بے زبان جانور پر بڑا ستم توڑا گیا تھا۔ اس کا پورا بدن رملوں سے چور چور تھا۔ گردن پر لگنے والے وار نے اس کی دھڑک کو کاٹ ڈالا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اسی خطرناک زخم سے اس کی موت واقع ہوئی تھی۔

ہم اس وقت جنگل کے ابتدائی حصے میں کھڑے تھے۔ میں گھوڑے کی لاش کے معائنے سے فارغ ہوا تو شوکت علی نے کہا۔

”ملک صاحب! اب کیا کرنا ہے؟“

”کرنا تو وہی ہے جو ہم یہاں کرنے آئے ہیں۔“ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”یعنی یعقوب کی تلاش.....“

”اس کا کیا کرنا ہے؟“ اس بار اے ایس آئی نے گھوڑے کی لاش کی جانب اشارہ کیا۔

”اگر یہ کسی انسان کا جسد خاکی ہوتا تو میں وقوعہ کی ضروری کارروائی کے فوراً بعد اسے پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیتا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”فی الحال اس کو یہیں چھوڑ کر ہمیں یعقوب کی تلاش میں آگے بڑھنا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے ملک صاحب! بسم اللہ کریں۔“ وہ سر کو تائیدی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ اور ہم نے بسم اللہ کر دی۔

”ہم“ سے میری مراد میں، اے ایس آئی شوکت علی اور گمشدہ یعقوب کا تیا رحمت علی تھے۔ رحمت نے کوچوان کو تانگے ہی میں چھوڑ دیا تھا جولاش سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا۔

میں ”تلاش یعقوب“ کی تفصیل میں جا کر آپ کو پور نہیں کروں گا کیونکہ گھنے جنگل میں اس نوعیت کا کام خاصا اکتاہٹ آمیز اور دشوار گزار ہوتا ہے۔ اس دوران میں ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ایک سوال صبح ہی سے میری سوچ کو ڈسٹرب کر رہا تھا لہذا اپنے ذہن کی کشمکش کے لیے میں نے رحمت علی سے پوچھ لیا۔

”رحمت! میں نے واضح طور پر محسوس کیا ہے کہ تمہاری بھابی تم سے سخت ناراض ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے؟“

”جناب! یہ ماجرا تو آج تک میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔“ وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”پتا نہیں، اسے مجھ سے خدا واسطے کا بھیر کیوں ہے جبکہ آج تک میں نے ایک پیسے کا نقصان اسے نہیں پہنچایا۔“

”اتنی شدید نفرت خواہو نہیں پیدا ہو جاتی رحمت۔“

میں نے گہمیر انداز میں کہا۔ ”میں نے صغریٰ کی آنکھوں میں تمہارے لیے ناپسندیدگی اندازے دیکھی ہے۔ اس نوعیت کی

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

۵۵۵

کے سامنے اجاگر ہو جائے۔ ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ یہ رحمت علی کا موقف ہے جو اس نے میرے کوش گزاری کیا اور میں آپ تک پہنچا رہا ہوں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ صغریٰ رحمت کے موقف سے اتفاق بھی کرے بلکہ مجھے جو حالات نظر آ رہے تھے ان کی روشنی میں ایک بات میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ صغریٰ اس سے مکمل اختلاف ہی کرے گی۔ رحمت علی کے بیان کے مطابق صغریٰ بہت ہی چنٹ اور چالاک عورت تھی۔ اس کی مکاری اور چال بازی کو سمجھتا ہما شام کے بس کی بات نہیں تھی لہذا مرحوم برکت علی (صغریٰ کا شوہر اور رحمت علی کا چھوٹا بھائی) بھی اس کے دام فریب کا شکار ہو گیا۔ صغریٰ کا تعلق دوسرے خاندان سے تھا اور رحمت کا باپ سلامت علی اس رشتے کے لیے تیار نہیں تھا۔ صغریٰ نے ایسا چکر چلایا کہ اسے پانے کے لیے برکت علی نے والدین کی مخالفت مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ معاملہ جب حدود سے تجاوز کرنے لگا تو سلامت علی نے بہت ہی دانش مندانہ اقدام کیا حالانکہ رحمت علی اور اس کی ماں کنیز فاطمہ بھی برکت اور صغریٰ کی شادی کے حق میں نہیں تھے۔ سلامت علی نے اس بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کو ٹھنڈا کرنے اور خاندان کی بقا کے لیے تمام تر اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر برکت علی کو صغریٰ سے شادی کرنے کی اجازت دے دی۔

برکت اور رحمت صرف دو بھائی تھے۔ ان کی کوئی بہن نہیں تھی۔ رحمت کی شادی چند سال پہلے اپنے ماموں کی بیٹی سے ہوئی تھی اور یہ سب لوگ مل جل کر ایک ہی بڑے سے گھر میں رہتے تھے۔ سلامت علی، شرف آباد کے چودھری مرغوب حسین کے بعد دوسرے درجے کے چودھریوں میں پہلے نمبر پر شمار کیا جاتا تھا۔ اس کی اچھی خاصی اراضی تھی اور گھر کے اندر ہر سکون اور آسائش میسر تھی۔ صغریٰ بھی بیاہ کر اسی گھر میں آگئی تھی۔

دو تین ماہ تو ہنستے کھیلتے گزر گئے۔ اس کے بعد رحمت علی کے مطابق صغریٰ نے پر پرزے نکالنا شروع کر دیے۔ سب سے پہلے تو دیورانی اور جیشانی میں محاذ جنگ کھل گیا۔ یہ جھگڑے پھڑے اتنے بڑھے کہ اپنی بیویوں کی حمایت میں دونوں بھائی ایک دوسرے کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ اس صورت حال نے بوڑھے والدین کو مشکل میں ڈال دیا۔ سلامت علی ایک دانا و پنا شخص تھا۔ اسے معاملے کی یہ تک پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس نے ایک مکان اور پچیس ایکڑ نہری زرعی اراضی دے کر برکت علی اور اس کی بیوی صغریٰ کو الگ کر دیا۔ رحمت علی کے مطابق صغریٰ نے یہ سارا فساد الگ ہونے کے لیے ہی برپا کیا تھا، بالآخر وہ

اپنی ضدنما کوشش یا جھگڑا نما سازش میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس تلخ گی کے بعد صغریٰ نے پلٹ کر اپنی سسرال میں قدم نہیں رکھا تھا البتہ دونوں بھائیوں میں کبھی کبھار میل ملاقات ہو جاتی تھی۔ گا ہے یہ گا ہے برکت علی اپنے والدین سے ملنے بھی چلا جاتا تھا۔ انہی حالات میں سال پر سال گزرتے چلے گئے۔ اس دوران میں سلامت علی اور کنیز فاطمہ کا انتقال ہو گیا۔ سلامت علی کے پاس کل ستر ایکڑ زمین تھی۔ جب برکت علی الگ ہوا تو اسے ایک مکان کے علاوہ انہی ستر میں سے پچیس ایکڑ زمین دے دی گئی تھی لہذا باقی بچ رہنے والے پینتالیس ایکڑ رحمت علی کے حصے میں آ گئے تھے۔ وہ اب اپنے بیوی بچوں کے ساتھ والدین والے بڑے گھر میں رہ رہا تھا۔

رحمت نے مجھے بتایا کہ سلامت علی اور کنیز فاطمہ کے انتقال کے بعد صغریٰ نے ایک مرتبہ پھر تنازع کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ والدین کے انتقال کے بعد دونوں بھائیوں میں زمین و جائیداد کی منصفانہ تقسیم ہونا چاہیے یعنی دونوں کے حصے میں پچیس، پچیس ایکڑ زمین آنا چاہیے۔ اس سلسلے میں چونکہ برکت علی نے کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا لہذا رحمت علی نے بھی صغریٰ کے دوائے کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد جب برکت علی حادثاتی موت کا شکار ہو کر دوسری دنیا میں منتقل ہو گیا تو یہ معاملہ بھی دب دبا گیا۔ رحمت علی کا ضمیر مطمئن تھا کہ اس نے کسی کا حق نہیں کھایا۔ جب والد صاحب نے ایک شاندار مکان اور پچیس ایکڑ زرعی اراضی دے کر برکت علی کو اسی کے مطالبے پر الگ کیا تھا تو جائیداد کی تقسیم اسی دن ہو گئی تھی۔ اب جو کچھ بھی باقی بچا تھا اس پر صرف اور صرف اسی کا حق تھا۔

اپنے بیان کے آخر میں رحمت علی نے بڑے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ”ملک صاحب! میں صغریٰ کی ہرزادی کو نظر انداز کر سکتا ہوں لیکن برکت کے انتقال کے کچھ عرصے بعد اس نے ایک ایسی گھٹیا حرکت کی کہ مجھے بھی اس سے شدید نفرت ہو گئی تھی اور.....“ اس نے توقف کر کے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”کیا کروں جناب صغریٰ تو غیر تھی اور اب تک غیر ہی بنی ہوئی ہے لیکن یعقوب تو میرے بھائی کا خون ہے نا..... اس کی گمشدگی سے میرا دل نہیں دکھے گا تو پھر کس کا دکھے گا۔ بس، دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے خون کی پکار پر میں ادھر آ گیا تھا ورنہ صغریٰ کی تو شکل دیکھنے کو ہی نہیں چاہتا۔“

سیدھی بات

وہ خاموش ہوا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”صغریٰ ہمارے ساتھ ایسی کون سی گھٹیا حرکت کی تھی جو تمہارا دل ۲۱ ہو گیا.....؟“

”اس نے مجھ پر یہ گھناؤنا الزام لگایا تھا کہ ایک رات نے اس کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔“ اتنا بتانے لہو وہ افسردہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اس کے بعد ہمارے درمیان خاموشی کا ایک طویل دایا پھر یعقوب کی تلاش کے ساتھ ہی ادھر ادھر کی باتیں نے لگیں۔ آئندہ چند گھنٹوں میں، میں نے جنگل کا تقریباً چپا اہمان مارا لیکن مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا کہ یعقوب کا ہمیں کوئی سراغ نہیں ملا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں اڑن چھو ہو گیا اب یہی کہا جاسکتا تھا کہ اسے مان نے کھایا تھا اور نہ ہی زمین نے نگلا تھا۔ وہ اگر اس جنگل داخل ہوا تھا تو پھر وہ جنگل سے نکل کر آگے کہیں اور چلا گیا لہذا اسے کہیں اور پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کا گھوڑا زخموں کی تاب لاتے ہوئے موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ اگر خدا بخواتی ب کے ساتھ بھی اسی نوعیت کا کوئی سنگین اور جان لیوا حادثہ پیش آ گیا تھا تو آج کی تلاش کے دوران میں مجھے اس کی ال بھی مل جانا چاہیے تھی۔ سردست میں یہی سوچنے پر مجبور تھا کہ یعقوب اس جنگل سے نکل کر کہیں اور چلا گیا تھا۔

ہم یعقوب کی تلاش والے مشن میں ناکام و نامراد واپس لوٹ آئے۔ میرا ذہن ابھمن زدہ اور دل بوجھل تھا اور میں مسلسل ایک ہی نقطے پر غور کر رہا تھا کہ یعقوب کا ایسا افسانہ کون کون ہو سکتا ہے جس نے پہلے اس کے گھوڑے کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا اور پھر خود اسے بھی ماب کر دیا۔ ایسا کام کسی دوست کا تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔

شروع میں میرا دھیان ڈاکوؤں کی کارروائی کی طرف تھا لیکن جنگل کا مکمل سروے کرنے کے بعد میں اس نتیجے پہنچا تھا کہ گھوڑے کی دردناک موت اور یعقوب کے لاپ میں کوئی ڈاکو یا ان کا گروہ ملوث نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر یہ ڈاکوؤں کا کارنامہ ہوتا تو وہ یعقوب کو لوٹنے کے بعد آگے ادا جاتے۔ انہیں گھوڑے کو موت کے گھاٹ اتارنے کی اتنی ضرورت نہیں تھی اور بالفرض محال، کسی جھینا جھپٹی اور لٹیلا تانی میں گھوڑا شدید زخمی ہو بھی گیا تھا تو پھر یعقوب کا گم و سالم بچ جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ زخمی یا مردہ اسی جنگل میں دستیاب ہو جاتا..... چونکہ ایسا نہیں ہوا تھا اس لیے میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ یہ واقعہ کسی بھی

زادے سے ڈاکوؤں کے کھاتے میں نہیں ڈالا جاسکتا تھا..... میں سوچ کے گھوڑے دوڑا ہی رہا تھا کہ رحمت علی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”ملک صاحب! مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔“ میں نے ابھمن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیسا چکر رحمت علی؟“

”مجھے تو یوں لگتا ہے، یعقوب کے ساتھ جنگل میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”میں کافی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یعقوب چپ چاپ خود ہی کہیں نکل گیا ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

”چپ چاپ وہ کیوں چلا جائے گا.....؟“ میری ابھمن بھاگتی۔

”ہو سکتا ہے، یہ کوئی لڑکی وغیرہ کا چکر ہو.....!“ وہ اتنی دھیمی آواز میں بولا کہ اسے ایسے آئی شوکت علی ہماری جانب متوجہ نہ ہو سکے۔ ”وہ کہیں کسی لڑکی کو تو بھگا نہیں لے گیا؟“

”عقل کو ہاتھ مارو رحمت علی!“ میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ”یعقوب کو قہبے سے غائب ہوئے آج تیسرا دن ہے۔ اگر یہ لڑکی کو بھگا لے جانے کا کوئی واقعہ ہوتا تو اب تک اس میدان لڑکی کے درمیان ضرور حرکت میں آچکے ہوتے۔ شرف آباد میں اتنی خاموشی نظر نہ آتی اور پھر.....“ میں نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”شاید یہ بات تمہارے علم میں نہیں کہ یعقوب کی منگنی کبریٰ کی بیٹی سلکی سے ہو چکی ہے اور ڈیڑھ دو سال میں ان کی شادی ہونے والی ہے۔ ان حالات میں وہ کسی لڑکی کو کیسے بھگا کر کہیں لے جاسکتا ہے؟“

”میں اس کی منگنی سے اچھی طرح واقف ہوں ملک صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”عین ممکن ہے، وہ اپنی خالہ کی بیٹی کو پسند نہ کرتا ہو، صغریٰ نے یہ منگنی زبردستی کر دی ہو۔ وہ چکے چکے کسی اور لڑکی کو چاہتا ہو اور موقع ملے ہی وہ اس لڑکی کے ساتھ نہیں فرار ہو گیا ہو..... یہ ناممکن تو نہیں ہے جناب۔ عشق اور محبت کے معاملات بعض اوقات بڑے حیرت انگیز اور سمجھ میں نہ آنے والے واقعات کو جنم دیتے ہیں۔“

”ہاں، رحمت علی! ایسا ہو جانا ناممکن تو نہیں۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس صورت میں تم یعقوب کے گھوڑے کی دردناک موت کو کس خانے میں

فت کرو گے؟“

”سہ ڈراما خود یعقوب کا رچایا ہوا بھی تو ہو سکتا ہے جناب!“ وہ گھبرائے انداز میں بولا۔ ”تا کہ سب کا دھیان ڈاکوؤں کی کارروائی کی طرف جائے اور کوئی اس کے اصل مقصد تک رسائی حاصل نہ کر سکے جیسا کہ ہم نے بھی یہی سوچا اور پانچ چھ گھنٹے جنگل میں ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد واپس آ گئے.....؟“

”تمہاری باتوں میں خاصا وزن ہے رحمت علی!“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ”اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا وہ اتنا ہی شقی القلب ہے کہ اپنی ماں کو تنہا چھوڑ کر کسی لڑکی کے ساتھ کہیں رفو چکر ہو گیا ہے۔“

”میرے ذہن میں جو بات آئی، وہ میں نے آپ کو بتا دی ہے۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ”یقین کریں یا نہ کریں، یہ تو آپ کی مرضی ہے جناب.....!“

”یقین نہ کرنے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے رحمت علی۔“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”تفتیش کی گاڑی تو ہمیشہ شک کے نیٹروں ہی سے چلتی ہے اور تم نے اس سلسلے میں مجھے عملی اقدام کے لیے کئی راہیں دکھا دی ہیں۔ میں تمہارے اس تعاون کے لیے شکر گزار ہوں۔“

”جناب ایہ تو میرا فرض تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”صغریٰ مجھے لاکھ اپنا دشمن سمجھتی رہے لیکن یعقوب تو میرا بھتیجا
 ہے اور ہمیشہ بھتیجا ہی رہے گا۔ میں تو یہی چاہوں گا کہ اس کا
 کوئی نقصان نہ ہو۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں رحمت علی!“ میں نے
تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور اس سلسلے
میں تم سے میری ایک درخواست ہے۔“
”درخواست نہیں، آپ حکم کریں ملک صاحب۔“ وہ
جذباتی ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ”یعقوب کی تلاش اور بازیابی کے لیے تم اپنے طور پر جو بھی کوشش کرنا چاہو، میں تمہیں روکوں گا نہیں لیکن صغریٰ کو اس بات کی خبر نہیں ہونا چاہیے کہ اس گفتیش میں تم بہ نفس نفیس ملوث ہو۔ تم سمجھ رہے ہونا، میں یہ بات کیوں کہہ رہا ہوں؟“

”جی ملک صاحب! بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ جب اسے پتا چلے گا کہ یعقوب کی تلاش کے سلسلے میں، میں آپ کے ساتھ کسی قسم کا تعاون کر رہا ہوں تو وہ ہتھے سے اکھڑ جائے گی۔“

”ہاں، بالکل یہی بات ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں

میں گردن ہلائی۔ ”تم درپردہ رہ کر کام کرو گے اور
کوشش کی رپورٹ پہنچاتے رہو گے۔۔۔۔۔“
”آپ بھی مجھ سے کچھ نہیں چھپائیں گے
اپنایت سے بولا

”اس سلسلے میں جو بھی پیش رفت ہوگی اس سے آگاہ کرتے رہیں گے.....؟“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے دو لفظی جواب پر کیا۔

لک بھگ چار بجے سہ پہر ہم واپس خانے پہنچ گئے
۵۵۵

سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے میں منہ سے ملنے اس کے گھر چلا گیا۔ آج کا پورا دن بہت بھاگ بھاگ شہید نوعیت کی مشقت میں گزرا تھا۔ کام تو ہم روز کرتے تھے اور ظاہر ہے، اس کام سے تھکاوٹ بھی ہوتی تھی۔ آخر میں انسان کو اس کا مقصد حاصل ہو جائے تو پھر سارا ممکن راحت میں بدل جاتی ہے، میرے ساتھ چونکہ ایسا نہ رہا تھا لہذا دن بھر کی تھکان نے اعصاب اور حواس پر بے بسی اتکا ہٹ اور بے زاری طاری کر دی تھی۔

یہ یو میرے بچی جان کی کیفیت تھی، اس ماں کے دل
یا گزر رہی ہوگی جس کا جوان جہان چٹا پھلے دودن
ہوا تھا..... بس یہی سوچ کر میں صغریٰ سے ملنے چلا آیا تھا
یہاں آکر پتا چلا کہ کمال پور سے کبرئی اور عمران
میں ہوئے ہیں۔ عمران کبرئی کا بڑا بیٹا تھا جس کی عمر کم
سال تھی۔ وہ اس وقت باہر گلی میں دوسرے بچوں
فٹھ کھیل رہا تھا۔ یہ لوگ کوئی ایک گھنٹا پہلے کمال پور
آباد پہنچے تھے۔ کبرئی کو اپنی بہن کے ساتھ ماہ
نے والے داماد کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی لہذا وہ اس
کو لے کر ادھر ہی آگئی تھی۔

میں کھر کے اندر پہنچا تو جان محمد، صفری اور کبریٰ کو
ت بھری سوالیہ نگاہوں نے مجھے گھیر لیا۔ ان کے
راری استفسارات کے جواب میں، میں نے نہایت م
اور جامع الفاظ میں انہیں تازہ ترین صورت حال
کر دیا۔ دنیا کا سب سے مشکل کام یہی ہوتا ہے کہ کسی
ہوئی امید کو توڑ دیا جائے۔

ان کے چہرے اتر گئے اور وہاں پر گہرے رنج و
ناؤں نے ڈیرا جما لیا۔

میں نے صغریٰ کو مخاطب کرتے ہوئے ہمدردی سے لہجہ میں کہا۔ ”دیکھو بی بی! تمہارے بیٹے کے ساتھ

میں کیا واقعہ پیش آیا ہوگا ابھی اس کے بارے میں حتمی
 کہہ نہیں کہا جاسکتا لیکن مجھے امید ہے کہ میں بہت جلد
 اسرارِ لگا لگوں گا۔“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ان
 ۱۱ اضافہ کر دیا۔

”میں تمہارے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوں۔ میں
 ے تھانے کا پورا عملہ یعقوب کی تلاش کے سلسلے میں
 دل ہے لیکن اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے
 لئے تمہارے بھرپور تعاون کی بھی ضرورت ہے۔“
 ”جی.....“ وہ روہانی ہو گئی۔ ”آپ مجھ سے کسی قسم کا
 ن چاہتے ہیں؟“

”میں تمہاری مدد سے اس شخص تک پہنچنا چاہتا ہوں
 ابھی حوالے سے اپنے دل میں یعقوب کے لیے دشمنی کے
 آثار رکھتا ہو.....؟“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”دیکھیں جی، دلوں کے حال تو صرف خدا ہی جانتا
 ہے۔“ وہ دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں خشک کرتے
 ہوئے بولی۔ ”میں تو یعقوب کے کسی دشمن کو نہیں جانتی۔ وہ تو
 مجھ کے ساتھ بنا کر رہنے والا بچہ تھا۔“

”یعقوب کے کھوڑے کو جس بے دردی سے موت
لحاٹ اتارا کیا ہے وہ کسی عالم اور سفاک شخص کا کارنامہ
کی دیتا ہے اور ایسا کام کوئی دمن ہی کر سکتا ہے۔“ میں
سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”لہذا جب تک مجھے یہ پتا
پلے کہ یعقوب کس کی آنکھ میں کھٹکتا تھا، میں تفتیش کی گاڑی
وڑا انداز میں آگے نہیں بڑھا سکتا۔“

”تمہانے دارحی..... یہ کام راہزنوں اور ڈاکوؤں کا بھی تو ہو سکتا ہے۔“ جان محمد نے تشویش بھرے انداز کہا۔ ”یہ دو ڈھائی میل تک پھیلا ہوا جنگل بہت ہی ناک ہے۔“

”میں نے ڈاکوؤں والے پہلو پر بہت غور کیا ہے جان“
 ”میں نے جان محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 لیکن یہ مجھے ان کا کیا دھرا نہیں لگتا۔“

”جناب! یہ بات آپ کس بنا پر کہہ رہے ہیں؟“ وہ
 بیٹھا۔

”بنا.....!“ میں نے وضاحت کرنے ہوئے کہا۔
 ملی بات تو یہ کہ ڈاکو اور خصوصاً وہ ڈاکو جو جنگل کا سہارا لے
 مسافروں کو لوٹتے ہیں وہ اس قسم کی کارروائی دن
 رے نہیں کیا کرتے۔ جنگل کو یہ لوگ اپنے مسکن کے طور پر
 مال کرتے ہیں۔ رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر وہ اپنے
 من سے دور کوئی خطرناک واردات کرتے ہیں پھر جنگل

سسپنس ڈائجسٹ

میں آکر چھپ جاتے ہیں۔“ میں نے تھوڑی دیر کے لیے رک کر ان تینوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یعقوب دن کے اجالے میں کمال پور سے روانہ ہوا تھا اور جب وہ جائے وقوعہ پر پہنچا اس وقت بھی اچھی خاصی روشنی ہوگی لہذا اڑاکوؤں کی کارروائی کا امکان تو رہی کر دیں۔ البتہ کسی راہزن کے بارے میں تھوڑی دیر کے لیے سوچا جاسکتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اس لیے کہ مجھے نہیں امید، یہ کسی راہزن کا کیا دھرا ہو کیونکہ راہزن بڑی جلدی میں ہوتا ہے اور وہ قتل و غارتگری سے حتی الامکان گریز کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا صحیح نظر مسافر کو لوٹنا اور بڑی سرعت سے آگے بڑھ جانا ہوتا ہے۔ وہ اس قسم کے معاملات میں نہیں پڑتا جیسا کہ یعقوب کے گھوڑے کے ساتھ ہوا ہے۔“

جان محمد سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ اغوا برائے تادان کا بھی تو واقعہ ہو سکتا ہے؟“

”ہرگز نہیں!“ میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”اگر یعقوب کو کسی تادان کی غرض سے اغوا کیا گیا ہوتا تو اب تک اغوا کنندگان کی جانب سے کوئی مطالبہ سامنے آچکا ہوتا اور اغوا کرنے والے مغوی کی سواری کو عبرت ناک موت سے دو جا نہیں کیا کرتے۔“

”پھر..... آپ کے خیال میں یعقوب کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا؟“ یہ سوال کبریٰ کی طرف سے اٹھایا گیا تھا۔
”میں نے یعقوب کی گمشدگی کے حوالے سے اب تک جو تفتیش کی ہے اس سے میرے سامنے صرف دو وجوہات آئی ہیں۔“ میں نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال، کوئی تیسرا سبب سمجھ میں نہیں آ رہا.....“

”اور وہ دو وجوہات کون سی ہیں؟“ جان محمد نے سنسنی خیز انداز میں مجھ سے پوچھا۔ ”کیا آپ ہمیں بھی بتائیں گے۔“

”کیوں نہیں.....“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں اسی لیے تو یہاں آیا ہوں کہ اپنے اور آپ لوگوں کے خیالات کو ملا کر کوئی جامع منصوبہ بندی کر سکوں۔“

مجھے آپ لوگوں سے زیادہ یعقوب کو بازیاب کرانے کی جلدی ہے۔“ میں نے تھوڑی دیر کو رک کر ایک پوجمل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”میری نظر میں یہ یعقوب کے کسی جانے پہچانے دشمن کی کارستانی ہے۔ وہ کمال پورہی سے اس کے تعاقب میں تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے، وہ شرف آیا د سے اس کے پیچھے کیا ہو۔ اسے راستے میں وار کرنے کا موقع نہ ملا، ہولہذا اس نے واپسی

125 جون 2012ء

پر اپنا کام دکھا دیا۔ یعقوب کو جیسے ہی حملہ آور کا احساس ہوا، اس نے اپنے گھوڑے کو بھگانے کی کوشش کی ہوگی لہذا حملہ آور کے زیادہ تر وار گھوڑے کے بدن پر لگے اور وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یعقوب کہاں چلا گیا.....؟ میں نے آج جنگل کا چپا چپا اور کونا کونا چھان مارا ہے، زندہ، یا زخمی یا مردہ یعقوب کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیے۔ اس راز سے وہ شخص ہی پردہ اٹھا سکتا ہے جس نے گھوڑے کو اذیت ناک موت مرنے پر مجبور کر دیا تھا..... وہی دراصل یعقوب کا دشمن ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔“

”اور دوسری وجہ.....؟“ میرے خاموش ہونے پر جان محمد نے سوال کیا۔

”دوسری وجہ خود یعقوب ہی ہو سکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”جی..... کیا مطلب.....؟“ صغریٰ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

”یہ بھی ممکن ہے کہ یعقوب کسی لڑکی کو یہاں سے بھاگ لے گیا ہو۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”گھوڑے کو موت کے گھاٹ اتار کر اس نے اغوا وغیرہ کا ڈراما چایا ہو، یہ لڑکی شرف آباد کی رہنے والی بھی ہو سکتی ہے اور کمال پور کی دستیک بھی۔ آپ لوگوں کا اس بارے میں کیا خیال ہے.....؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا نے دار صاحب!“

صغریٰ بڑے وثوق سے بولی۔ ”اگر اس کا کسی لڑکی کے ساتھ کوئی چکر ہوتا تو مجھ سے چھپ نہیں سکتا تھا اور پھر اس کی تو منگنی بھی ہو چکی ہے۔“

ہر ماں کا اپنی اولاد کے بارے میں یہی دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ ان کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے کی بھی خبر رکھتی ہے۔ انہی خیالات کا اظہار صغریٰ لی لی نے بھی کیا تھا۔ میں اس کے دعوے کو چیلنج کر کے بحث کا کوئی نیا دروازہ نہیں کھول سکتا تھا لہذا کبرئی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یعقوب کی ادھر کمال پور میں تو کسی سے دشمنی وغیرہ نہیں تھی؟“

”نہیں جی..... وہ تو کسی سے گھٹا ملا ہی نہیں تھا۔“ کبرئی نے جواب دیا۔ ”یعقوب اپنے کام سے کام رکھنے والا بچہ تھا۔“

ایک فوری خیال کے تحت میں نے جان محمد سے پوچھ لیا۔ ”ایک بڑا نازک اور ذاتی نوعیت کا سوال ہے لیکن آپ لوگوں کو اس کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا ہوگا۔“

”جی پوچھیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

یعقوب کی بازیابی کے لیے سخت پریشان ہیں۔ آپ جو بھی سوال کریں گے، ہم اس کا بالکل درست جواب گے۔“

میں نے یکے بعد دیگرے جان محمد اور کبرئی کی طرف دیکھا پھر سوال کیا۔ ”کیا سلسلی اور یعقوب کی منگنی سے پہلا کا کہیں اور سے بھی رشتہ آیا تھا؟“

”جی ہاں، سلسلی کے تین رشتے آئے تھے۔“ میں نے بتایا۔ ”لیکن میں چونکہ صغریٰ کو زبان دے چکی تھی لیے ہم نے ان سب کو صاف انکار کر دیا۔“

”کیا ان لوگوں کا تعلق کمال پور ہی سے تھا؟“

”جی ہاں!“ کبرئی نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”تم مجھے ان تینوں کے نام اور گھر کے پتے نوٹ دو۔“ میں نے اپنی جیب سے پاکٹ ڈائری اور قلم ہما کرتے ہوئے کہا۔

اس دوران میں جان محمد خاموش بیٹھا بڑی گہری دل سے میرا جائزہ لیتا رہا تھا۔ کبرئی نے ایک ہی سانس میں ان لڑکوں کے نام اور پتے لکھوا دیے جن کے رشتے اس بچی سلسلی کے لیے آئے تھے۔ ان لڑکوں کے نام علی الترتیب کچھ اس طرح تھے۔ ساجد علی، امیر خان اور پرویز احمد۔

”رشتے ٹھکرائے جانے پر ان لوگوں میں سے کسی کوئی احتجاج وغیرہ بھی کیا تھا۔“ میں نے ٹٹولنے والے میں پوچھا۔ ”اپنی برہمی یا ناراضی وغیرہ کا اظہار کیا ہو.....“

”ساجد علی اور پرویز احمد نے تو ہمارے انکار کو ہالہ عام انداز میں لیا تھا۔“ کبرئی نے جواب دیا۔ ”لیکن امیر خان اور اس کے گھر والوں کو ہمارا منہ کرنا بہت برا لگا۔ اسی روز سے انہوں نے ہم سے بول چال اور ملنا جلنا بھی کر دیا ہے۔“

”امیر خان.....!“ میں نے زیر لب دہرایا پھر ڈا میں درج اس نام پر دائرہ لگا دیا۔ جان محمد سرسرائی ہوئی آوا میں بولا۔

”تھانے دار صاحب! میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ سلسلے کے مسترد کیے جانے والے رشتوں کے بارے میں اتنا گہرا کرید کر کیوں پوچھ رہے ہیں۔ آپ کے ذہن میں یہ بات ہے کہ ممکن ہے، انہی میں سے کسی نے حاسدانہ جذبات مغلوب ہو کر یعقوب کو نقصان پہنچایا ہو.....!“

”یہ ناممکن تو نہیں ہے.....!“ میں نے سوالیہ جان محمد کی طرف دیکھا۔ ”مجھے تو ہر وہ راہ اختیار کرنا ہے جو

سیدھی بات

ہے۔ اصل مجرم تک پہنچا دے اور مجھے یقین ہے، ایک دن بھی یہی چاہتے ہیں؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب..... بے ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔“ جان محمد نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ جیسے مناسب سمجھتے ہیں، ضرور تفتیش لیں۔ ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ادھر کمال پور سے کسی یعقوب کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔“

میں نے جان محمد کی بات سنی اور اس کے خاموشی پر صغریٰ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”تو تم کب تک کسی دشمن کو نہیں جانتی ہو.....؟“

”جی ہاں، جو حقیقت ہے وہ میں نے آپ کو بتا دی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”دشمن ہیں تو یعقوب کے چند ایسے دوستوں ہی کے نام بتا دو جن کے ساتھ اس کا زیادہ اٹھنا بیٹھنا تھا.....؟“

”ان میں ایک کا نام تو نور شاہ ہے اور دوسرے کا نام حنیف خان۔“ اس نے بتایا۔ ”یعقوب کی زیادہ میل ملاقات انہی دو لڑکوں سے تھی۔“

”کیا حنیف خان اور نور شاہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یعقوب پچھلے دو دن سے غائب ہے؟“ میں نے صغریٰ سے سوال کیا۔

”جی۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”یہ دونوں ہی یعقوب کی گمشدگی کی وجہ سے سخت پریشان ہیں۔“

”ہوں.....!“ میں نے پرسوج انداز میں ہنکارا بھرا کر کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں ان کو تھانے بلا کر ضرور پوچھ گچھ کروں گا۔ کیا یہ بھی اسی محلے میں رہتے ہیں؟“

صغریٰ نے مجھے ان کے گھروں کے حدود اربعہ کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔ میں نے ضروری معلومات کو اپنی ڈائری میں درج کرنے کے بعد نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”صغریٰ! میں تم سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

میرے الفاظ سے فکری سنجیدگی بلکہ سنگینی کو محسوس کر کے کبرئی اور جان محمد نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر صغریٰ کی سمت دیکھتے ہوئے جان محمد نے کہا۔

”صغریٰ! ہم دوسرے کمرے میں جا رہے ہیں۔ تم امینان سے بیٹھ کر تھانے دار صاحب کی بات سن لو۔“

پھر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ میاں بیوی خاموشی سے

اٹھے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ تنہائی میرا آتے ہی میں نے صغریٰ سے پوچھا۔

”یہ تمہارے جیٹھ رحمت علی کا کیا معاملہ ہے.....؟“

”کیوں.....“ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ ”کیا اس نے میرے بارے میں کوئی بکو اس کی ہے.....؟“

میں نے صغریٰ کو یہ بتانا ضروری نہ سمجھا کہ یعقوب کی تلاش میں رحمت علی کو دن بھر میں نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ یہ جان کر خواہ مخواہ اس کا پارا چڑھ جاتا۔ یہ بات میں نے اچھی طرح جان لی تھی کہ صغریٰ، رحمت علی کے لیے اپنے دل میں نفرت کے جذبات رکھتی تھی۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

”میں نہیں جانتا، اس نے بکو اس کی ہے یا حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی بھالی یعنی تم اس سے قدر خفا کیوں ہو تو اس نے مجھے اس چپقلش کا خاندانی پس منظر بتا دیا۔ مجھے ان باتوں سے تو غرض نہیں کہ تم لوگوں کے بیچ کس نوعیت کے تنازعات رہے ہیں لیکن ایک امر کی تصدیق میں ضروری سمجھتا ہوں اسی لیے میں نے تم سے تنہائی میں بات کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ اس معاملے کا تعلق براہ راست تمہاری ذات سے ہے۔“

اس کی پیشانی پر الجھن کی لکیریں پھیل گئیں، متاثر لہجے میں بولی۔ ”ایسا کون سا معاملہ ہے تھانے دار صاحب؟“

”رحمت علی نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے اس پر کوئی گھناؤنا الزام لگایا تھا.....؟“

”الزام نہیں، حقیقت کہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ تلخ انداز میں بولی۔ ”جب اس نے زبان کھول دی ہے تو میں بھی خاموش نہیں رہوں گی۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم مجھے اصل بات بتاؤ۔“ میں نے اس کا اعتماد حاصل کرنے کی غرض سے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”رحمت نے جو کچھ بھی بتایا ہے، مجھے تو اس پر یقین نہیں آیا۔ بھلا تم ایسا کیوں کرو گی۔ یہ تو تمہاری بدنامی کا سبب بھی تھا۔“

”جی ہاں، اس میں سراسر میری بدنامی کا بھی امکان تھا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”لیکن چونکہ وہ ایک کھلاج تھا اس لیے میں نے کسی بات کی پروا نہیں کی تھی۔“

”آخر ہوا کیا تھا صغریٰ.....؟“ میں نے اہم روی ہمرے لہجے میں پوچھا۔

”یہ برکت علی کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد کی بات ہے۔“ وہ خواب ناک انداز میں مجھے بتانے لگی۔ ”ایک رات رحمت علی میرے دروازے پر آیا.....“

آئندہ آدھے گھنٹے میں صغریٰ نے مجھے اس افسوس ناک واقعے کی جس تفصیل سے آگاہ کیا، میں اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

اس رات صغریٰ گھر پر اکیلی تھی۔ یعقوب کی عمر اس وقت محض آٹھ سال تھی اور وہ اپنے خالو جان محمد کے ساتھ کمال پور گیا ہوا تھا۔ اسے ایک ہفتہ وہاں رہ کر واپس آنا تھا۔ صغریٰ کا شرف آباد میں رکنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ ان دنوں فصل کی کٹائی کا سیزن چل رہا تھا۔ نصف شب سے تھوڑی دیر پہلے جب اس کے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک اٹھی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے پوچھنا ضروری سمجھا۔

”کون ہے.....؟“

”میں ہوں بھابی، رحمت علی.....!“ باہر سے آواز آئی۔

صغریٰ نے اپنے جیٹھ کی آواز کو فوراً پہچان لیا اور قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”یہاں کیوں آئے ہو رحمت علی؟“

”صغریٰ! میں تم سے چند ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔“ رحمت نے ندامت آمیز انداز میں کہا۔ ”میں اپنے اب تک کے رویوں پر سخت شرمندہ ہوں۔ یوں سمجھو کہ میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ دروازہ کھول دو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے تمہارے دروازے کے سامنے کھڑا دیکھے۔“

صغریٰ کے جی میں پتا نہیں کیا آئی کہ اس نے رحمت علی کے لیے اپنے گھر کا دروازہ کھول دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں صغریٰ کی بیٹھک میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ رحمت علی نے بڑی محبت سے پوچھا۔

”بھابی! تمہیں برکت علی کے بغیر زندگی کیسی لگتی ہے؟“

”بہت ہی اداس اور ویران.....!“ صغریٰ نے جواب دیا۔

وہ شرمندہ سے انداز میں بولا۔ ”میں نے آج تک آپ لوگوں کے ساتھ جو بھی زیادتی کی ہے، میں اس کے لیے تہ دل سے معافی چاہتا ہوں۔ اگر آپ میری درخواست مان لوگی تو میں وعدہ کرتا ہوں، تمہارے ہر نقصان کی تلافی کر دوں گا۔“

صغریٰ کو رحمت کا بدلا ہوا مہذب انداز بڑا عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ بہر حال، وہ اسے گھر کے اندر لے آئی تھی اس کی بات سننا بھی ضروری تھا۔ یہ وہ پہلے والا رحمت ہرگز نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کھوجتی ہوئی نظر سے اپنے جیٹھ کو دیکھا اور پوچھا۔

”تم کس طرح ماضی کی یادتیوں کی تلافی کرو گے؟“

”تمہارا خیال رکھ کر۔“ رحمت علی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”برکت کو زہر پلے ناگ نے دس کرم سے چھین لیا ہے تو کیا ہوا، میں ہوں نا..... اگر تم چاہو گی تو میں تمہیں کبھی برکت کی کئی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔“

صغریٰ کو رحمت کی باتوں سے الجھن ہونے لگی۔ وہ بیزاری سے بولی۔ ”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، تم کیا کہہ رہے ہو.....؟“

”میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور صغریٰ کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم تعاون کرو تو ہم دونوں کی زندگی میں بہار آ سکتی ہے۔“

”تعاون.....؟“ صغریٰ کی چھٹی حس نے اسے وارننگ دی کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ”تم کس قسم کے تعاون کی بات کر رہے ہو؟“ اس نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”یا ہی تعاون کی بات کر رہا ہوں صغریٰ“ وہ ہونٹوں پر مخصوص مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم راز کو راز رکھنے کا وعدہ کرو تو ہم اسی طرح رات کی تاریکی اور تنہائی میں ملتے رہیں گے۔ اس میں ہم دونوں کا ہی فائدہ ہے.....“

صغریٰ کے ذہن میں خطرے کا الارم تونج ہی چکا تھا، رہی سہی کسر رحمت کے الفاظ نے پوری کر دی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور سخت لہجے میں بولی۔

”رحمت! یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ کیا تم نے مجھے بکا ڈال سمجھا ہوا ہے؟“

”یہ بکواس نہیں، تمہاری محبت ہے صغریٰ!“ وہ مخمور لہجے میں بولا۔ ”میں اپنے دل سے مجبور ہو کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ تم خود کو بکا ڈال نہ کہو۔ میں دل و جان سے تمہاری قدر کرتا ہوں۔ تم میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“

صغریٰ کو یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری نہ ہوئی کہ رحمت علی اس وقت نشے میں بھی تھا۔ اسے گھر کے اندر بلا کر صغریٰ نے بہت بڑی غلطی کی تھی اور اس غلطی کو سنبھالنا بھی اسی کو تھا، وہ قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”رحمت! تم جس طرح خاموشی سے یہاں آئے ہو ویسے ہی چپ چاپ واپس چلے جاؤ، مجھے تم سے یا تمہارے

دلی جذبات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”تم ایک مرتبہ میری ہانہوں میں آجاؤ پھر میں تمہارے گھر سے واپس چلا جاؤں گا۔“ وہ دونوں بازو دا کر کے صغریٰ کی جانب بڑھا۔

”رحمت! اگر یہ تمہارا کوئی ڈراما ہے تو اس ڈرامے کو یہیں ختم کر دو۔“ اس نے آخری مرتبہ اپنے جیٹھ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ تمہارے اس فعل سے برکت علی کی روح کو کس قدر اذیت ہو رہی ہوگی۔“

”میں زندہ تمہارے پاس موجود ہوں اور تم مرحوم کو یاد کر رہی ہو۔“ رحمت نے اس کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بھائی کی روح کو خود جواب دے دوں گا۔ تم میری بات مان لو۔“ اس کے ہاتھ اب بھی آگے کو پھیلے ہوئے تھے۔

”مجھے چھوٹے کی کوشش نہ کرنا رحمت۔“ صغریٰ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ”ورنہ میں شور مچا دوں گی۔“

”شور مچانے میں تمہارا بھلا نہیں ہوگا۔“ وہ عجیب سے انداز میں ہنسا اور مزید کہا۔ ”بلکہ اس طرح تو تم بدنام ہو کر رہ جاؤ گی۔“

”ہیں..... میں کیوں بدنام ہوں گی۔“ صغریٰ نے غصے کے عالم میں استفسار کیا۔ ”میرے شور مچانے پر تو لوگ جمع ہو جائیں گے پھر تمہارے کالے لڑکھوٹ سب کے سامنے آ جائیں گے۔ وہ تم پر ہی تھوکیں گے۔“

”میں چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاؤں گا کہ تم بھاتی ہو تو میں یہاں آتا ہوں۔“ وہ بڑے مکروہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”جب گاؤں والوں کو میری زبانی یہ پتا چلے گا کہ میں رات کی تاریکی میں پہلے بھی تمہارے پاس آتا رہا ہوں تو تم کسی شخص کو صورت دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ تمہاری کس قدر رسوائی ہوگی۔ لوگ مجھ پر نہیں بلکہ تم پر تھو تھو کریں گے۔ جب چاروں طرف سے تم پر انگلیاں اٹھیں گی تو کس کس کا ہاتھ اور کس کس کی زبان کو روکو گی صغریٰ.....!“

اس رات صغریٰ نے انتہائی بہادری اور رحمت نے بے حد بزدلی کا ثبوت فراہم کیا تھا۔ صغریٰ نے مجھے بتایا کہ اپنے جیٹھ کی نیت کھل جانے کے بعد اس نے ہر مصلحت اور احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر چیخنے اور چلانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں رہی تھی کہ لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے، ان نازک اور سنگین لحاظ میں پہلی ترجیح اپنی عزت کی حفاظت تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ چیخنے کے لیے اپنی زبان اور حلق کو زحمت دیتی، رحمت نے جھپٹ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ پھر وہ صغریٰ کے کان کے پاس اپنا منہ لے کر پسپائی

اختیار کرنے والے انداز میں بولا تھا۔

”شور مچانے کی کوشش نہ کرنا..... میں یہاں ت ہوں۔“

اور پھر وہ واقعی صغریٰ کے گھر سے نکل گیا تھا۔ صغریٰ نے اس واقعے کو مکمل کیا پھر میرے چہرہ نگاہ جماتے ہوئے بولی۔ ”اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے میں رحمت علی سے اس قدر نفرت کیوں کرتی ہوں.....؟“ دونوں فریقین نے اپنی اپنی جگہ خود کو بے قصور ا پاک دامن ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس بحث میں اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ان میں سے کون سا اور کون جھوٹا اور حذکرہ بالا واقعہ موجودہ معاملے سے راست کوئی تعلق بھی نہیں رکھتا تھا۔ میرے لیے یہی اطمینان کافی تھا کہ اس رات، اپنی اپنی جگہ ان دونوں کی عزت محفوظ رہی تھی لہذا صغریٰ کے استفسار کے جواب میں، میں نے بڑا رمان سے کہہ دیا۔

”بڑی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں صغریٰ.....!“ میرے جواب کی محنتی توانائی سے اسے مطمئن کر دیا۔

اگلے روز میں نے دو اہم کام کیے۔ میں نے ا تھانے کے عملے میں سے دو، دو افراد پر مشتمل دو ٹیمیں بنائیں۔ سادہ لباس ان ٹیموں کو میری ہدایات کی روشنی میں بڑی اہم معلومات اکٹھا کرنا تھیں۔ ایک ٹیم کو کمال پور جا کر امیر خان کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھنا تھی۔ سہمی کے آنے والے جن تین رشتوں کو صاف انکار کر دیا گیا تھا، ان میں سے ایک امیر خان بھی تھا۔ جان محمد اور کبریٰ کے بیال کے مطابق، ساجد علی، پرویز احمد اور ان کے گھر والے تو انکا سن کر خاموش ہو بیٹھے تھے تاہم امیر خان اور اس کے گھر والوں نے نہ صرف یہ کہ کافی شور مچایا تھا بلکہ انہوں نے ان لوگوں کا سوشل بائیکاٹ بھی کر دیا تھا، اس تناظر میں امیر خاں کے غصے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یعقوب ایک طرح سے اس کے نزدیک رقیب روسیہ کا درجہ رکھتا تھا۔ امیر خان کے دل میں یعقوب کے لیے بے انتہا غم و غصہ بھرا ہوا تھا۔ اگر اسے ایسی کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو پھر اس معاملے پر اس کے گھر والوں کی جانب سے شدید نوعیت کی برہمی اور نفرت کا اظہار دیکھنے کو کیوں ملتا..... اپنے بیٹے کے رشتے ٹھکرائے جانے پر امیر خان کے گھر والوں نے جان محمد کے گھر والوں کا سوشل بائیکاٹ کر دیا تھا اور یہ سب کچھ یعقوب اور سہمی کی مٹنی کے طفیل ہی ہوا تھا۔

سیدھی بات

دوسری ٹیم کے ذمے میں نے ایک ایسا کام لگایا تھا کہ تعلق ہمارے اپنے علاقے شرف آباد ہی سے تھا۔ ہماری ہدایت کے مطابق قصبے میں محوم پھر کر اس بات کا لگایا تھا کہ گزشتہ دو چار روز میں علاقے کی کوئی لڑکی تو سے غائب نہیں ہوئی۔ ہم شدہ یعقوب کے تائیا رحمت علی جان کردہ اندیشے کو یکسر نظر انداز کر دینا مناسب تھا اور نہ کی معقول بات۔ عین ممکن تھا کہ یعقوب قصبے کی کسی لڑکی کو نے لڑکیوں نکل گیا ہو اور گھوڑے کی الم ناک موت والا ڈراما اس نے اس لیے رچایا ہو کہ اس کی گمشدگی کے حوالے سے لوگوں کا دھیان راہ زنی کی کسی واردات کی طرف جائے اور اہلی حقیقت سے واقف نہ ہو سکے۔ دیے ایک بات میرے ان میں ٹھنک رہی تھی اور وہ یہ کہ اگر شرف آباد سے کوئی لڑکی اب ہوئی ہو تو یہ بات اب تک چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

جب یہ دونوں ٹیمیں اپنے مشن پر روانہ ہوئیں تو میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر حالات و واقعات پر غور کرنے لگا۔ معاملہ خاصا الجھ کر رہ گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مغرب کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا تھا۔ اس تمام تر سوچ مار کے دوران میں بھی رحمت علی کو میں نے ایک لمحے کے لیے اپنے ذہن سے غائب نہیں ہونے دیا۔ اس بندے نے صغریٰ کی نفرت کے حوالے سے مجھے جو کہانی سنائی تھی، صغریٰ کا بیان اس کے انتہائی مخالف جاتا تھا۔ اگر رحمت علی کی کہانی کو درست تسلیم کر لیا جاتا تو پھر صغریٰ ایک عیار اور حال باز اورت کی شکل میں سامنے آتی تاہم اس کا یعقوب کی گمشدگی سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا تھا اور اگر صغریٰ کے بیان کو سچ ان لیا جاتا تو پھر کہیں میں ایک سنسنی خیز موٹر کا امکان نظر آتا تھا لہذا رحمت علی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ اپنی بے لڑائی اور نا آسودہ خواہشات کی عدم تکمیل کے بدلے میں صغریٰ کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے اور اسے کوئی دلی صدمہ پہنچانے کی خاطر کوئی بھی الٹا سیدھا قدم اٹھا سکتا تھا اور انہی اٹے سیدھے قدموں میں ایک قدم یعقوب کو جانی نقصان پہنچانا بھی ہو سکتا تھا۔

رحمت علی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے طور پر یعقوب کو لاش کرنے کی حتی الامکان کوشش کرے گا اور میں نے اسے اس بات کی اجازت بھی دے دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک سادہ لباس الہکار کو اس کی خفیہ نگرانی پر بھی مامور کر دیا تا کہ اس کی حرکات و سکنات کی مجھے خبر ہوئی رہے۔ اگر وہ یعقوب کی کم اندکی میں کسی بھی طور ملوث تھا تو یہ بات زیادہ عرصے تک مجھ سے بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ میں نے جس الہکار کو اس کی نگرانی کا کام سونپا

تھا، وہ نہایت مستعد اور بیدار مغز شخص تھا۔ صغریٰ نے گزشتہ روز مجھے کم شدہ یعقوب کے دو دوستوں نور شاہ اور حنیف خان کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ صغریٰ کے مطابق یعقوب کی زیادہ میل جول انہی دو بندوں کے ساتھ تھی۔ دوپہر کے بعد میں نے ایک بندہ بھیج کر ان دونوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ حنیف خان اور نور شاہ کا تعلق چونکہ شرف آباد ہی سے تھا لہذا انہیں ڈھونڈ کر تھانے پہنچانے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا تھا۔

رہی علیک سلیک کے بعد میں انہیں اصل موضوع پر لے آیا۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد سوال کیا۔ ”کیا تم لوگ یہ نہیں چاہتے کہ تمہارا دوست جلد از جلد باز یاب ہو جائے؟“

”کیوں نہیں جناب!“ نور شاہ جلدی سے بولا۔ ”ہم بھلا ایسا کیوں نہیں چاہیں گے۔ ہم تو یعقوب کے لیے بہت زیادہ فکرمند ہیں۔“

”بہت زیادہ فکرمند ہیں۔“ میں نے اسی کے الفاظ دہراتے ہوئے نور شاہ سے پوچھا۔ ”صرف فکرمند ہی ہیں یا یہ بھی پتا چلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کیا کہاں؟“

”جی، ہم نے اپنے طور پر یعقوب کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی ہے مگر ہمیں کامیابی نہیں ہوئی۔“ حنیف خان دھمکی لہجے میں بولا۔ ”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، وہ کہاں غائب ہو گیا ہے۔“

”ہوں.....!“ میں گہری، ٹٹولنے والی نظر سے باری باری ان دونوں کو گھورنے لگا۔

صغریٰ بی بی کے مطابق حنیف خان اور نور شاہ سے یعقوب کی گہری دوستی تھی لہذا انہی کو سب سے زیادہ یعقوب کی خبر بھی ہونا چاہیے تھی۔ شرف آباد میں کسی سے یعقوب کا زیادہ ملنا جلنا نہیں تھا۔ یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ بعض اوقات قریبی دوست ہی کام دکھا جاتے ہیں۔ وہ دونوں زیادہ دیر تک میری نظر کی تاب نہ لا سکے اور حنیف خان جلدی سے بولا۔ ”تھانے دار صاحب! انسان اسی حد تک جاسکتا ہے جہاں تک اس کی پہنچ ہوتی ہے۔ ہم نے یہاں یعقوب کی تلاش میں شرف آباد کا چپا چپا جھان مارا ہے۔ پچھلے دو تین دن میں ہم سے جو ہو سکتا تھا، وہ کر کے دیکھ لیا ہے لیکن یعقوب ہمیں کہیں نہیں ملا۔ اس کے بعد تو ہم مجبور ہیں۔“

”جب ہمیں پتا چلا کہ یعقوب کا گھوڑا ادھر کمال پور کے قریب جنگل میں مردہ پایا گیا ہے تو ہم نے اس کی تلاش میں جنگل کا رخ بھی کیا تھا۔“ نور شاہ اپنی کارگزاری کو آگے

”کس کو..... اور کیسے.....؟“ میں نے چونک کر

پوچھا۔

”وہ جناب، بات دراصل یہ ہے کہ.....“ نور شاہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جب یعقوب ہمیں اپنے کمال پور جانے کے بارے میں بتا رہا تھا تو اس وقت نوا جا بھی ہمارے پاس ہی کھڑا تھا۔“

”کھڑا نہیں تھا بلکہ وہ اسی وقت آیا تھا جب یعقوب نے کمال پور جانے کی بات شروع کی تھی۔“ حنیف خان نے نور شاہ کی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”جی..... جی ہاں۔“ نور شاہ نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”حنیف خان بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یعقوب نے کمال پور جانے کی بات شروع کی ہی تھی کہ نوا جا وہاں آ گیا تھا۔“

”تو اس کا مطلب ہے، یعقوب نے نوا جا کو ستانے کے لیے وہ جھوٹ بولا تھا۔“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہو سکتا ہے جی، یہی بات ہو۔“ نور شاہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نوا جا ویسے بھی کوئی اچھا بندہ نہیں ہے۔“

”تم دو تین دن سے اتنی اہم بات اپنے دل میں دبائے بیٹھے تھے۔“ میں نے غلطی آمیز نظر سے باری باری ان دونوں کو گھورا۔ ”جلدی بتاؤ، یہ نوا جا ہے کون اور کہاں ملے گا؟“

”نوا جا کا اصل نام نواز تیلی ہے جی۔“ نور شاہ نے بتایا۔ ”وہ ادھر شرف آباد ہی میں رہتا ہے جناب۔ اس کے باپ سرفراز تیلی کا اپنا کولہو ہے جی۔“

ساری کہانی میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ نوا جا کی آمد پر اگر یعقوب نے کمال پور جانے کے حوالے سے اپنے دوستوں سے غلط بیانی کی تھی تو اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نوا جا ہی سے اس بات کو چھپانا چاہتا تھا کہ وہ ایک بھاری رقم لے کر کمال پور جا رہا ہے۔ یقیناً اسے نوا جا کی طرف سے کوئی خطرہ لاحق تھا۔ ویسے ابھی تھوڑی دیر پہلے نور شاہ نے بھی یہی بتایا تھا کہ نوا جا کوئی اچھا بندہ نہیں ہے۔ نوا جا، یعقوب کی گمشدگی اور اس کے گھوڑے کے حسرت ناک انجام والے معاملے میں ملوث تھا یا نہیں اس امر کی تصدیق صرف دو افراد ہی کر سکتے تھے۔ نمبر ایک یعقوب اور نمبر دو نوا جا۔ یعقوب تو پچھلے تین دن سے غائب تھا البتہ نوا جا بے آسانی مجھے دستیاب ہو سکتا تھا۔ نوا جا کو نارگٹ بناتے ہوئے میں نے یعقوب کے دوستوں سے سوال کیا۔

”ہوئی ہے؟“

”نہیں جناب۔“ نور شاہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے۔ ”ہم نے صغریٰ چاچی سے کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں کی تھی۔ یعقوب نے ہمیں جو بھی بتایا، ہم نے اس یقین کر لیا تھا۔“

”پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یعقوب نے تم لوگوں سے غلط بیانی کیوں کی؟“ میں اپنے پوائنٹ پر واپس آ گیا۔ ”میرا ذہن پچھلے آدھے گھنٹے میں اس کی صرف ایک ہی وجہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکا ہے۔“

”کون سی وجہ؟“ نور شاہ نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

”یہی کہ..... اگر اس نے سچ بات بتادی تو اس رقم کی وجہ سے شرف آباد سے کمال پور کی طرف جاتے ہوئے اس کے ساتھ کوئی بھی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔“ میں نے اپنی سوچ کی روشنی میں کہا۔ ”اور اسے اس قسم کا خطرہ شرف آباد میں رہنے والے کسی شخص سے تھا اور..... عین ممکن ہے کہ وہ شخص تم دونوں میں سے کوئی ہو.....؟“

میں حالات و واقعات کی روشنی میں بالکل درست جواب پیش کر رہا تھا۔ یعقوب نے غلط بیانی کی اور وہ شرف آباد سے کمال پور تک صحیح سلامت پہنچ گیا تھا لیکن واپسی کے راستے میں اسے ایک اندوہناک سانحہ پیش آ گیا تھا اور مجھے مدد فیصد یقین تھا کہ یعقوب کے ساتھ جو بھی ہوا تھا وہ انہی اڑیچہ ہزار روپے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اب مجھے یہ پتا چلا تھا کہ رقم والی بات ان دونوں کے علاوہ اور کس کس کو معلوم تھی۔

وہ دونوں بڑی بڑی قسمیں کھا کر مجھے اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرنے لگے۔ میں چند لمحات تک تو ہلکے زادیوں سے، ان سے کڑے سوالات کرتا رہا پھر مہرے پیشہ وراں تجربے نے بتایا کہ وہ کسی قسم کی دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہے لہذا میں نے بھی اپنے انداز میں نرمی برتتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تم لوگوں نے کسی اور سے بھی اس بات کا ذکر کیا؟“

”اے والا ہے؟“

”ہم نے تو کسی سے ذکر نہیں کیا مگر.....“

حنیف خان کچھ کہتے کہتے اچانک رک گیا تو میں نے اضطرابی لہجے میں دریافت کیا۔ ”مگر کیا حنیف خان؟“

”مگر یہ بات ہمارے علاوہ بھی کسی کو پتا تھی.....؟“ وہ علی خیز انداز میں بولا۔

ہوئے اضطرابی لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا یعقوب نے ضروری کام“ کی وضاحت بھی کی تھی جس کی وجہ سے ا کمال پور جانا پڑا تھا؟“

”جی ہاں!“ اس بار نور شاہ نے جواب دے کر ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنی خالہ سے رقم لینے کمال پور جا رہا ہے۔“

میں اس کی بات سن کر اچھل پڑا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”جی تمہارے دار صاحب۔“ حنیف خان نے نور شاہ کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”اس نے ہمیں یہی بتایا تھا۔“

”یعنی کہ..... اس نے بتایا تھا..... وہ اپنی خالہ سے رقم لینے کمال پور جا رہا ہے؟“ میں نے باری باری تصدیق نظر سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”بالکل.....“ نور شاہ اچھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ کو اگر ہماری بات کا یقین نہیں آ رہا تو ہم قسم کھانے کا تیار ہیں۔“

”واقعی..... مجھے آپ لوگوں کی بات کا یقین آ رہا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔“

”اور وہ حقیقت کیا ہے تمہارے دار صاحب.....؟“ حنیف خان سوچتی ہوئی نظر سے مجھے ٹکنے لگا۔

”حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی خالہ کو رقم دینے کمال پور گیا تھا۔“ میں نے ٹھوس انداز میں بتایا۔

”کیا.....!“ اب ان کے چونکنے کی باری تھی۔ ”پھر اس نے ہم سے جھوٹ کیوں بولا؟“

”یہ تو تم ہی بتاؤ گے۔“ میں نے ٹیٹوتی ہوئی نظر سے انہیں دیکھا۔ ”ہو سکتا ہے، اسے تم لوگوں پر اعتبار نہ ہو.....؟“

”بے اعتباری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ حنیف خان بڑے اعتماد سے بولا۔ ”ہم تینوں دوست ایک دوسرے سے جھوٹ بولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور آپ بتا رہے ہیں، یعقوب نے ہم سے غلط بیانی کی تھی۔“

”میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ ساری باتیں مجھے یعقوب کی ماں صغریٰ بی بی نے بتائی ہیں۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے باری باری سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”کیا اس سلسلے میں تم لوگوں کی صغریٰ بی بی سے کوئی

بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ہمیں ہر جگہ ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑا۔ تھک ہار کر ہم نے خاموشی اختیار کر لی لیکن ہمارے دل اپنے یار کے لیے بہت پریشان ہیں۔ ہم دن رات یعقوب کی بہ خیریت واپسی کے لیے دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔“

بعد ازاں ان سے ہونے والی مزید گفتگو میں مجھے پتا چلا کہ وہ لوگ ہمارے واپس آنے کے بعد جنگل کی طرف گئے تھے۔ جب ہمیں آدھے پونے دن کی تلاش بیکار کے بعد جنگل میں یعقوب کا کوئی نام و نشان نہیں ملا تھا تو انہیں کوئی سراغ کیسے مل سکتا تھا۔

”دیکھو.....“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر واقعی تم دونوں کی یہی خواہش ہے کہ میں جلد از جلد تمہارے دوست کو بازیاب کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو پھر تمہیں میرے ساتھ بھر پور تعاون کرنا ہوگا۔“

”آپ حکم کریں تمہارے دار صاحب۔“ نور شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہم ہر تعاون کے لیے تیار ہیں۔“

میں نے ان سے اس طرح سوالات کرنا شروع کیے کہ میرا مقصد بھی پورا ہو جائے اور انہیں بھی محسوس نہ ہو کہ میں ان سے کوئی شک بھری تفتیش کر رہا ہوں۔

”کیا تم یہ بات جانتے تھے کہ یعقوب کمال پور جانے والا ہے؟“

”جی ہاں۔“ نور شاہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”یعقوب نے کمال پور جانے والی بات خود ہمیں بتائی تھی۔“

”کب.....!“ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ”اس نے یہ بات تم لوگوں کو کب بتائی تھی؟“

”کمال پور جانے سے ایک دن پہلے۔“ حنیف خان نے بتایا۔ ”رات کو ہماری ملاقات ہوئی تھی اور اگلی صبح وہ کمال پور روانہ ہو گیا تھا۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ”کیا اس نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کمال پور کیوں جا رہا ہے؟“

”جی، اس نے بتایا تھا کہ کسی ضروری کام سے اسے کمال پور جانا ہے۔“ حنیف خان گردن کو اٹھاتی جھبش دیتے ہوئے بولا۔ ”اس کا کہنا تھا کہ وہ رات کو واپس شرف آباد آ جائے گا مگر.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا.....“

میں نے سردست اس کی افسردگی کو نظر انداز کرتے



چور کا لاش

بابر نعیم

کسی کی زندگی میں جہانکنا جہاں اخلاقی جرم ہے وہیں کبھی کبھی اپنی ہی زندگی کے ہی پوشیدہ گوشے تہہ وبالا ہو جاتے ہیں مگر... ضروری نہیں کہ یہ فارمولا آپ کو ہمیشہ درپیش رہے... اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ آئینے سے ملاقات ہو جاتی ہے اور انسان اپنا ہی عکس دیکھ کر یوں گھبرا جاتا ہے کہ جاننا کہیں ہوتا ہے اور قدم کہیں پڑتا ہے... ایسے میں کوئی اپنی منزل تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔

نظروں سے اوجھل رہنے والی پراسرار شخصیت کی ایک خوفناک جنگ

اسپتال سے رخصت کرتے وقت ڈاکٹر نے ہیکٹر کو گھر جا کر مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ چند روز پہلے اس پر دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ نہایت نازک حالت میں اسپتال لایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے گھر جانے اور آرام کرنے کا مشورہ تو دے دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سے گھر جائے۔ کیونکہ اس کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ شہر میں اس کی درجن بھر سابق بیویاں موجود تھیں، پر وہ ان میں سے کسی کے پاس جانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اسپتال سے باہر نکلنے کے بعد اس

واقعات کی تفصیل کے مطابق اس کے دل میں آگیا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ یعقوب کمال پور سے بھاری رقم لے کر آنے والا ہے تو اس نے اپنے ”بھائی“ سخی محمد کے ساتھ مل کر یعقوب کو لوٹنے کا منصوبہ بنالیا۔ سخی محمد بھی آوارہ اور بدقماش شخص تھا۔ دونوں تیز و ہمار کھلاڑیوں سے لیس ہو کر جنگل کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں یعقوب کو گزر کر شرف آباد کی طرف آنا تھا۔ انہوں نے ان کے چہروں کو ڈھانوں کے پیچھے چھپا رکھا تھا تاکہ یعقوب انہیں پہچان نہ سکے۔ انہوں نے واردات کے لیے جانی بوجھ ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جو کمال پور کے نزدیک بھی تاکر اس واقعے کے حوالے سے شرف آباد کے کسی آدمی پر شک آئے مگر وہی بات کہ جب وقت ساتھ نہ دے تو بڑی بڑی پلاننگ خاک میں مل کر رہ جاتی ہے۔ نوا جا اور اس کا شریک جرم سخی محمد کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ نوا جا کی نشان دہی پر میں نے اسی رات سخی محمد کو بھی گرفتار کر لیا۔

جب میرے شکنجے میں آنے کے بعد انہوں نے اسے جرم کا اقرار کر لیا تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں یعقوب کی لاش کا سراغ لگائے بغیر ان کی جان چھوڑ دیتا۔ انہوں مجھے بتایا کہ یعقوب سے ”معرکے“ کے دوران میں اس کو گھوڑا تو شدید زخمی ہوا ہی تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یعقوب بھی جان کی بازی ہار گیا تھا۔ لب دم زخمی گھوڑے کو انہوں نے جنگل ہی میں چھوڑ دیا اور یعقوب کی لاش کو نہر کے اندرونی حصے میں گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔

یہ ان کی ایک سنگین غلطی تھی۔ اگر وہ یعقوب کی لاش جنگل میں ہی چھوڑ دیتے تو شاید میری تحقیق شرف آباد کا رخ نہ کرتی۔ جب مردہ گھوڑے کے قریب یعقوب کی لاش پڑی ملتی تو یہ سمجھ کر مبر کر لیا جاتا کہ یعقوب راہ زلوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ انہوں نے اسے لوٹنے کے بعد قتل کیا یا قتل کر کے کے بعد لوٹا اور جائے وقوعہ سے فرار ہو گئے۔

کوئی کچا مجرم ہو یا پکا لیکن وہ کہیں نہ کہیں کوئی ایسی غلطی ضرور کرتا ہے جس سے اس کا یا اس کے جرم کا سراغ لگنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس معاملے میں بھی یہی ہوا تھا انسان چاہے جتنی بھی مضبوط پلاننگ کر لے مگر اوپر بھی کوئی بیٹھا ہے۔ قدرت اپنے انداز میں مصروف عمل رہتی ہے اور سیدھی بات یہ کہ.....

تدبیر کنندہ بندہ
تقدیر کنندہ خندہ

(تحریر: حسام بٹ)

”تم لوگوں نے آخری مرتبہ نوا جا کو کب اور کہاں دیکھا تھا؟“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے جناب۔“ حنیف خان نے جلدی سے کہا۔ ”میں نے اسے کولہو پر دیکھا تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ کام میں جتا ہوا تھا۔“

نواز تیلی عرف نوا جا میری نظر میں مشکوک ہو گیا تھا لہذا میں فوراً سے پوچھ سٹرا سے اپنے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے کی جانے والی پوچھ تاچہ مجھے اس کیس کے منطقی انجام تک پہنچا سکتی تھی۔ میں نے دو کاٹسٹیلو کو اپنے ساتھ لیا اور حنیف خان اینڈ کمپنی کی معیت میں نوا جا کی طرف روانہ ہو گیا۔ دس منٹ کے بعد ہم سرفراز تیلی کے کولہو سے سو قدم کی دوری پر تھے۔

نور شاہ نے کولہو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تھانے دار صاحب! وہ دیکھیں، جس بندے نے کالا کرتہ پہنا ہوا ہے نا..... وہی نوا جا ہے۔ اس کا باپ اس وقت کولہو پر نظر نہیں آ رہا۔“

میں نے ویسے بھی اس کے باپ کا اچا نہیں ڈالنا تھا۔ میرا مارگٹ صرف اور صرف نوا جا تھا اور وہ اس وقت میری نظر کے سامنے تھا۔ میں اپنے آدمیوں کے ساتھ تیزی سے کولہو کی طرف بڑھنے لگا۔

پتا نہیں، نوا جا کی چھٹی حس تیز تھی یا بے خیالی میں اس نے گردن اٹھا کر ہماری جانب دیکھا تھا۔ ہم اس وقت یو نیفارم میں تھے۔ تین بارودی پولیس والوں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ بری طرح چونک اٹھا پھر اس نے بدحواسی میں ایک ایسی حرکت کی جس نے اس کے جرم ہونے پر مہر تقدیق ثبت کر دی تھی۔

ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر ایک جانب کھیٹوں کی سمت بھاگ اٹھا تھا مگر میں کہاں اسے فرار ہونے کا موقع دینے والا تھا۔ دس منٹ کے اندر ہی میں نے اپنے آدمیوں کی مدد سے گھیر گھاڑ کر نوا جا کو ہتھکڑی لگا دی۔ اس ”کار خیر“ میں نور شاہ اور حنیف خان نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ ڈالا تھا۔

۵۵۵

نواز تیلی عرف نوا جا ایک کچا مجرم تھا۔ وہ دس پندرہ منٹ سے زیادہ تحقیق کے مختلف مراحل کا ”سامنا“ نہ کر سکا اور اس نے زبان کھول دی۔ اپنی بزدلی اور نا پختہ پن کا مظاہرہ تو وہ کولہو پر ہمیں دیکھتے ہی کر چکا تھا جب پولیس پر نگاہ پڑے تو اس نے راہ فرار اختیار کی تھی۔ ہمیں اس پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی اور اس نے یعقوب کے قتل کا اقرار کر لیا۔

نے بچی کبھی رقم کا اندازہ لگایا۔ ریزگاری کے علاوہ اس کی جیب میں کل سات سو پچاسی ڈالرز تھے۔ پس اس نے ایک سستا سا کرا کر اے پر لے لیا تاکہ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق وہاں آرام کر سکے، آرام کے علاوہ اسے تحفظ کی بھی ضرورت تھی۔ وہ ان درجنوں بیوہ خواتین کی نظروں سے دور رہتا چاہتا تھا جنہیں اس نے شادی کا لالچ دے کر دھوکا دیا تھا۔ اس وقت وہ اس پرندے کے مانند تھا جس کے پر کاٹ دیے گئے ہوں۔ اس کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں تقریباً ناکارہ ہو چکی تھیں۔ کئی ہفتوں تک بستر پر پڑا وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا رہا۔ اب وہ ہسپتال یا چاقو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کسی کو دھمکانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ بڑا ڈاکٹر تو در کی بات تھی اب وہ چھوٹی موٹی لوٹ مار بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اگر اس دوران میں اس پر دل کا دودھ پڑ گیا تو پچنا محال جاتا۔ بسا اوقات وہ اپنے بھاری بھر کم اور مضبوط جسم کو ٹٹول کر سوچتا کہ گزشتہ پچاس سال سے جو جسم اس کا پورا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ آج کیوں نہیں دے سکتا؟ وہ کیوں ناکارہ ہو گیا؟ وہ یہ بات تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا کہ وہ بیمار ہے لیکن جب وہ ہال سے گزر کر غسل خانے کی طرف جاتا تو بھی کبھی سینے میں اٹھنے والا اچانک درد اسے یاد دلاتا کہ وہ واقعی بیمار ہے۔

زیادہ تر وہ سویا رہتا یا مطالعہ کرتا رہتا اور ذہن کو تفکرات سے آزاد رکھنے کی کوشش کرتا۔ کمرے کا کرایہ دس ڈالرز فی ہفتہ تھا اور مزید گیارہ ڈالرز فی ہفتہ کے عوض لینڈ لیڈی اسے دو وقت کا کھانا اور پڑھنے کے لیے رسالے اور اخبار مہیا کر دیتی تھی۔ دراصل وہ ایسے خاموش طبیعت اور امن پسند کرائے دار سے بہت خوش تھی۔

ہیکٹر کے لیے فوری طور پر پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ موجودہ رقم کم از کم چھ ماہ تک چل سکتی تھی لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ نوکری کا تصور اس کے لیے موت سے زیادہ اذیت ناک تھا۔ دولت، شراب اور عورت اس کی زندگی کے محور تھے۔ ماضی میں اسے بھی ان چیزوں کی کمی محسوس نہیں ہوئی لیکن اب صورت حال مختلف تھی، اس کی خود اعتمادی اور قوت عمل قصہ ماضی بن چکی تھی۔

ضرورت تھی جس میں طاقت کے استعمال کی ضرورت نہ ہو۔ تک اس نے قوت بازو پر بھروسہ کیا تھا۔ پرچ اور عیا منصوبے اس کی نظر میں بزدلی کی علامت تھے لیکن اب وہ قوت بازو کے بجائے دماغ استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ ایک روز اس نے رسالے کے اندر ایک ایسے ساعت کا اشتہار پڑھا جس کی مدد سے سو فٹ کے دائرے ہونے والی گفتگو سنی جاسکتی تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے یہ آلہ خریدنے کا فیصلہ کر لیا اور اگلے روز بیس ڈالر ایک خط آلہ فروخت کرنے والی کمپنی کو بھیج دیا۔ ایک ہفتے بعد اسے ایک بڑا سا بیٹک موصول ہو گیا۔ اس نے جلد جلدی بیٹک کھولا۔

وہ ایک بیضوی سا پیالہ نما آلہ تھا جو تین ٹانگوں والا، اسٹینڈ پر نصب تھا۔ بیضوی پیالے کے اندر ریڈیو کے والوے ملتی جلتی کوئی چیز لگی ہوئی تھی۔ آلے کی پشت میں ایک لمبا سا تھما جس کے سرے پر اسٹیتھو سکوپ سے مشابہ ایئر فون لگے ہوئے تھے۔ طریقہ استعمال بہت سیدھا سادا تھا۔ ایئر فون کا نوں سے لگا کر والو کا رخ مطلوبہ سمت میں کر دیا جائے تو آ

آنی شروع ہو جائے گی۔ ہیکٹر نے آلہ ساعت کو کھڑی کے قریب رکھ دیا اور ایئر فون کو کانوں سے لگا کر والو کا رخ سڑک کے کنارے ہوئی دو خواتین کی طرف کر دیا۔ ایک عورت کہہ رہی تھی۔ ”صرف تین ڈالر۔ میں نے کیشئر سے کہا کہ ڈیے لکھی ہوئی قیمت بھول جاؤ۔ اس اشتہار میں اس کی قیمت ڈالر لکھی ہے۔ اس سے زیادہ ایک پینی۔“

اس نے آلے کا رخ تین چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کی طرف کر دیا۔ ”آئی۔ جے۔ کے۔ ایل۔ این۔۔۔۔۔ تم نے ایم چھ دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موٹا مارون تمہارا بوائے فرینڈ ہے۔ آہ۔۔۔۔۔“

ہیکٹر اس تجربے سے اس قدر خوش ہوا کہ دل تو کیا دل دھڑکن بھی بھول گیا۔ وہ کئی گھنٹوں تک مختلف لوگوں کی آواز سن رہا۔ چار بجے تک وہ خاصا تھک گیا تھا۔ اس نے آ

ساعت چھپا کر رکھ دیا اور سو گیا۔ شام کے چھ بجے لینڈ لیڈی نے اسے جگا دیا۔ رات کھانا کھانے کے بعد وہ نصف گھنٹے تک ریڈیو سن رہا۔ جب سواند میرا پھیل گیا اور سامنے کی عمارت کی کھڑکی میں روشنی آنے لگی تو اس نے اپنے کمرے کی روشنی گل کر دی اور ساعت لے کر کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ ہر چند وہ رات

گاہ کے اندر کسی شخص کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ”ٹی وی کے پاس سے اٹھ جاؤ۔ کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ انمول کا کام ختم کرو پھر ٹی وی دیکھو۔ جلدی سے کام ختم۔ اب دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔“ دوسری کھڑکی۔

”ڈالرنگ! تم نے غور سے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ یوں طوم ہوتا تھا کہ آئل پینٹ کروا کے آئی ہے۔ سچ کہتی ہوں اس کی عمر پچاس سال سے ایک دن بھی کم نہیں۔ لیکن پندرہ سال لپھو کر رہنے کی کوشش کر۔۔۔۔۔“

تیسری کھڑکی۔ ”نہیں دیکھا سکتا۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ کیا تم گھر میں بیٹھ کر تفریح نہیں کر سکتیں۔ ٹی وی ہے، ریڈیو ہے، تمہاری (ماشیں تو مجھے یا گل کر دیں گی۔۔۔۔۔“

چوتھی کھڑکی سے ٹی وی پر چلنے والی فلم کے ڈائلاگ ہل دیے۔ ”فصلے کا دارو مدار تمہاری مرضی پر ہے پانٹر یا ایک ہول، ایک گھوڑا اور سونا میرے حوالے کر دیا اس چاقو سے میں تمہارا زرخرہ کاٹ دوں گا۔ میں نیو یارک سے کیلی فورنیا آ رہا ہوں۔ بے شمار لوگوں کو قبرستان میں آباد کر چکا ہوں۔ ایک اور می۔ میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ قانون میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

پانچویں کھڑکی۔ ”ڈیڈی اگلے ہفتے میری سالگرہ ہے۔ اس مرتبہ میں اولی اچھا سا تحفہ لوں گی اور ایک کے لیے آج ہی۔۔۔۔۔“

چھٹی کھڑکی تیسری منزل پر واقع تھی۔ پہلے پہل دھڑکی سمجھا کہ وہ وہاں سے بھی کسی ٹی وی کے ڈائلاگ سن رہا ہے۔ ”پیسے دیکھ ہی لیے تم نے! ٹھیک ہے بر تھا! چلو اچھا ہوا نہیں خود بخود یہ راز معلوم ہو گیا۔ اب بتاؤ اس میں کیا برائی ہے؟“

”ہاں ہاں، تم اور کہہ بھی کیا سکتے ہو، ان میں کیا برائی ہے۔ فرینک کیا تم یا گل تو نہیں ہو گئے؟ میں ہزار ڈالر معمولی رقم لیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اتنی بڑی رقم کی کشدگی کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہوگا؟ ایسی صورت میں بینک اب تک دیوالیا نہ بناتا۔ یقیناً تم جیل چلے جاؤ گے۔“

”ٹھیک ہے، لیکن ہر شخص اتنا ذہین اور دلیر نہیں ہوتا۔“

”ٹھیک ٹھیک بتاؤ فرینک! تم اتنی بڑی رقم کو کس طرح خرچ کرنا چاہتے ہو؟“

”ٹی الحال میں اس رقم کو خرچ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ پروگرام یہ ہے کہ ہر مہینے اپنے سیونگ اکاؤنٹ سے ایک ہزار ڈالر نکالتا رہوں گا اور جب میرے پاس مجموعی طور پر پچاس ہزار ڈالر ہو جائیں گے تو پھر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اگر تم ساتھ جانا چاہو تو بڑی اچھی بات ہوگی ورنہ۔۔۔۔۔“

”میں۔۔۔۔۔ تمہارے ساتھ جاؤں، کہاں۔۔۔۔۔؟ جیل کے اندر؟“

”بر تھا، میں کبھی تم پر اصلیت ظاہر نہ کرتا۔۔۔۔۔ میں تمہیں صرف یہ بتاتا کہ میری لائبری نکل آئی ہے۔ میری بات سنو بے بی، کیا تم بتا سکتی ہو کہ ہمارے اندر کیا خای یا خرابی ہے؟ ہماری زندگی کو لہو کے تیل کی طرح ایک محور پر گھوم رہی ہے۔ کام کرنا، کھانا اور سو جانا۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر جس میں کوئی خوشی، کوئی ولولہ اور کوئی رنگینی نہ ہو۔ ذرا سوچو، ہم دونوں نوکری کرتے ہیں۔ شام کو تھکے ہوئے گھر آتے ہیں اور کھانا کھا کر سو جاتے ہیں۔ ہمیں از دوامی زندگی کی کوئی خوشی میسر نہیں۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ ہم اسی طرح بوڑھے ہو جائیں؟ میں ایک خستہ حال بینک کیشئر کی حیثیت سے ریٹائر ہونا یا ساٹھ سال کی عمر میں کسی چھوٹی سی برانچ کا منیجر بننا ہرگز پسند نہیں کروں گا۔“

”لیکن فرینک، یہ تو کھلی کھلی چوری ہے۔“

”ایک لحاظ سے اسے چوری بھی کہا جاسکتا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بینک کے لاکھوں ڈالر کی حفاظت کی، میں نے اپنے پیٹ میں گولی کھائی اور ڈاکوؤں کی کوشش ناکام بنا دی۔ بتاؤ اس کا رتا سے کے بدلے بینک نے مجھے کیا دیا؟ خوشنودی کا ایک خط!“

”انہوں نے تمہیں دو ماہ کی بیماری کی چھٹی دی اور ہسپتال کا بل ادا کیا۔“

”یقیناً میری سات پشتوں پر احسان کیا۔ اگر ہسپتال کا بل بھی ادا نہ کرتے تو کیا مجھے مرنے کے لیے چھوڑ دیتے؟ بر تھا، تمہارے ساتھ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں دس سال سے یورپ کی سیاحت کے خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہاں میں مصوری کا شوق بھی پورا کر سکوں گا۔“

”فرینک، فرینک! خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب بھی موقع ہے، رقم واپس رکھ دو ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا۔“

”ڈالرنگ! اب میں رقم واپس نہیں رکھ سکتا۔ اس کا مطلب اعتراف جرم کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں ایسی حماقت کرنا ہی نہیں چاہتا۔ کیا تمہیں یہ بات سمجھ میں

نہیں آتی کہ خوشی حاصل کرنے کا ایسا کوئی اور موقع ہمیں میسر نہیں آئے گا۔ میں جوانی کے ان سنہری ایام کو مفلسی کے ہاتھوں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارا مشورہ قبول نہیں کر سکتا۔“

”میرے مشورے کو رد کر کے تم اپنی جوانی کے سنہری ایام کو تباہی کی طرف دھکیل رہے ہو۔“

”ناممکن، قطعی ناممکن۔ تم نہیں سمجھ سکتیں۔ اچھا میں ذرا چہل قدمی کے لیے جا رہا ہوں۔“

ہیکٹر نے زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ اس کے بعد گھبر خاموشی چھا گئی۔ چند منٹوں کے بعد ایک طویل القامت شخص عمارت سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔ تاہم مدہم روشنی کی وجہ سے ہیکٹر واضح طور پر اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ پھر ایئر فون کے اندر اسے برتھا کی سسکیوں کی آواز کے درمیان ٹیلی فون ڈائل کرنے کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو ایڈی!..... میں برتھا بول رہی ہوں..... ہاں، میں نے اسے بتا دیا ہے کہ میں رقم کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں..... نہیں، اس نے میرا مشورہ بالکل رد کر دیا ہے۔ رقم واپس رکھنے پر تیار نہیں۔ کہتا ہے کہ یہ بالکل ناممکن ہے..... ادہ ایڈی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں؟..... میں؟ ہاں میں اسے چھوڑنے پر بالکل تیار ہوں لیکن معاملہ بالکل الجھ گیا ہے لیکن اس احمق کو کچھ احساس ہی نہیں۔“

کچھ لمحوں کے لیے خاموشی ہو گئی۔ ہیکٹر دوسری جانب سے کہی جانے والی بات نہیں سن سکتا تھا۔ برتھا نے مزید کہا۔

”ادہ یقیناً۔ میں پوری پوری طرح سے اپنے ارادے پر قائم ہوں لیکن یہ سب کچھ کسی خواب پریشاں کے مانند معلوم ہوتا ہے..... ہاں ٹھیک ہے، اچھا خدا حافظ پیارے۔“

فون بند ہونے کے بعد سسکیوں کی آواز دوبارہ سنائی دینے لگی۔ کچھ دیر کے بعد برتنوں کے کھٹکنے کی آوازیں آنے لگیں..... ہیکٹر نے ایئر فون اتار کر رکھ دیا اور بتی جلادی۔ پھر اس نے ایک کانڈ پر عمارت کا خاکہ بنایا اور تیسری منزل پر واقع چھٹی کھڑکی پر کراس لگا دیا۔ اس نے دوبارہ بتی بجھا دی اور ایئر فون لگا کر والو کارخ چوتھی منزل کی اس کھڑکی کی طرف کر دیا جو فرینک کے ایئر ٹمنٹ کے عین اوپر تھی۔

”بڑی اچھی لڑکی ہے، گزشتہ ہفتے میں ان کے اسٹور سے سودا خریدنے گئی تو اتفاق سے کچھ پیسے کم پڑ گئے، کیشئر ادھار دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ بے چاری نے اپنی جیب سے میری کی پوری کردی اور کیشئر سے بولی۔ ”مسز پارکس ہماری پرانی گاہک ہیں، بہت اچھی خاتون ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ

نام سے زیادہ وہ میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔“

ہیکٹر نے ایئر فون نکال کر میز پر رکھ دیا۔ بتی روشن اور چوتھی منزل کی اس کھڑکی پر ”مسز پارکس“ لکھ دیا۔ اس بعد اس نے دو گولیاں کھائیں اور نہایت سکون کے ساتھ سر اگلے روز وہ علی الصباح بیدار ہو گیا۔ والو کارخ فر کی کھڑکی کی جانب کر دیا اور ایئر فون کانوں پر لگا کر بیٹھ کر چاروں طرف ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پورے سات ریڈیو موسیقی کی آواز سنائی دی۔ پھر کچھ وقفے کے بعد برتھا آواز سنائی دی۔

”فرینک اٹھ جاؤ۔“

کچھ دیر کے بعد غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز سنائی دی جو ریڈیو پر ہونے والی خبروں کے ساتھ ملی جلی دے رہی تھی۔ سات بج کر دس منٹ پر برتھا نے آواز لگائی۔

”فرینک تمہاری کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ جلدی کرو۔ انڈ کتنے کھاؤ گے؟“

”انڈے نہیں۔ صرف ٹوسٹ کھاؤں گا۔“

”فرینک کچھ عرصے سے تمہاری خوراک بہت کم ہو رہی ہے۔ اس پیسے کی وجہ سے تمہاری صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے، ابھی وقت ہے۔“

”بس بس برتھا، پیسے کا کوئی ذکر نہیں۔ آج کے پیسے کا بالکل نام نہیں لوگی..... تمہارا کام صرف یہ سوچنا ہے کہ تم میرا ساتھ دینا پسند کرو گی یا.....“

”لیکن یہ مرحلہ تو دو سال کے بعد آئے گا۔ اس دورا اگر بینک کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا؟“

”میرا منصوبہ نہایت ٹیکنیکل قسم کا ہے۔ اگر بینک کو چل گیا تو میں اکیلا ہی جیل جاؤں گا۔ تمہارا اس معاملے سے کو تعلق نہیں ہوگا۔ بھول جاؤ کہ تم نے الماری کے خفیہ خانے میں رقم دیکھی تھی۔ میرے خیال میں چند سال کی جیل کے بدلے سودا مہنگا نہیں ہوگا۔ اب اس بات کو چھوڑو اور ذرا چینی دال ادھر بڑھا دو۔“

چند لمحوں کے بعد ہیکٹر نے دونوں کے باہر نکلنے اور دروازہ بند ہونے کی آوازیں سنیں۔ اسی وقت عمارت کے اٹار سے کئی جوڑے اپنے اپنے کاموں پر جانے کے لیے باہر نکلتے رہے تھے۔ اس لیے وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ان میں فرینک برتھا کون سے تھے اور یہ بات جاننے کی اسے کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔

آلہ ساعت کو ایک طرف رکھنے کے بعد وہ دوبارہ گیا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد لینڈ لیڈی ٹاشا لیے ہوئے اس

کمرے میں داخل ہوئی۔ ہیکٹر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ گیا۔ لینڈ لیڈی نے ناشتے کی ٹرے میز پر رکھ دی اور حیرانی کے ساتھ اس عجیب و غریب آلہ سماعت کو دیکھنے لگی۔

”اچھا تو یہ وہ چیز ہے جس کا کل پارسل آیا تھا۔ یہ کیا چیز ہے مسٹر ہیکٹر؟“

”یہ نہایت حساس قسم کا ایریل ہے جو میں نے اپنے ریڈیو کے لیے منگوایا ہے، اس کی مدد سے دور دراز کے اسٹیشن بھی آسانی کے ساتھ سنے جاسکتے ہیں۔“ پھر اس نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ”آج کا دن بڑا خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج دھوپ میں تھوڑی سی چہل قدمی کروں گا۔“

”ہاں دن تو اچھا ہے لیکن ذرا احتیاط کرنا۔ تم ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے۔“

گیارہ بجے تک وہ کمرے کے اندر ہی آرام کرتا رہا۔ پھر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور ٹھنڈا ہوا سامنے والی عمارت میں داخل ہو گیا۔ تیسری منزل کے اپارٹمنٹ نمبر 3 جی پر ایڈورڈ فریک لکھا تھا اور چوتھی منزل کے اپارٹمنٹ نمبر 3 جی پر پارکس ریسنڈ لکھا تھا پھر وہ خرابی خرابی چلتا ہوا ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہو گیا اور انکوائری سے ایڈورڈ فریک کا فون نمبر دریافت کیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ ہر چند وہ خاصا تھک گیا تھا تاہم اس کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔ بالآخر اس نے اپنا پرانا وعدہ شروع کر دیا تھا۔

شام کے ساڑھے پانچ بجے اس نے آلہ سماعت کا رخ فریک کی کھڑکی کی طرف کر دیا۔ ٹھیک پونے چھ بجے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ہیکٹر نے وقت نوٹ کر لیا۔ اس کے بیس منٹ بعد دوبارہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی برتھا کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو فریک..... تم کہاں ہو؟“

”میں بیڈروم میں ہوں۔“ فریک نے جواب دیا۔

”کام کر رہا ہوں۔“

”میں رات کا کھانا تیار کرنے جا رہی ہوں۔“

ہیکٹر کئی گھنٹوں تک آلہ سماعت لگائے بیٹھا رہا۔ رات کے کھانے کے دوران میں اس نے چند لمحوں کے لیے آلہ سماعت بند کر دیا..... فریک اور برتھا کی گفتگو کے ساتھ ساتھ ٹی وی پر ہونے والے پروگرام کی آواز بھی اس کے کانوں میں آتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد فریک کی آواز آئی۔ ”ذرا ٹی وی کی آواز ہلکی کر دو، میرے مطالعے میں حرج ہو رہا ہے۔“

اگلے روز ہیکٹر دن بھر آرام کرتا رہا۔ اس کا منصوبہ

نہایت عمدہ تھا۔ اس نے زندگی بھر فریک کی شکل نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی فریک نے اسے دیکھا تھا۔ لہذا منصوبہ ناکام ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ شام کے ساڑھے پانچ بجے وہ تیار ہو کر باہر نکلا اور ٹیلی فون بوتھ کے اندر جا کر فریک کا نمبر کھمایا۔ کچھ دیر تک گھنٹی بجتی رہی پھر ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ہیکٹر نے دوستانہ انداز میں کہا۔

”ہیلو فریک کیا حال چال ہے؟“

”ٹھیک ہے۔ آپ کی تعریف؟“

”تمہارا ایک پرانا دوست۔“ ہیکٹر نے جواب دیا۔

”کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟“ فریک نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

”میاں، یہ تکلفات چھوڑو اور ذرا غور سے میری بات سنو۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”یقیناً تم یہ بات پسند نہیں کرو گے کہ بینک والوں کو بیس ہزار ڈالر کی بابت معلوم ہو، کیا سمجھے؟“

اچانک دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ قدرے توقف کے بعد فریک نے کہا۔ ”تم کون ہو؟“

”اس بات کی فکر نہیں کرو کہ میں کون ہوں۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”اور سنو، شہر چھوڑنے یا اسی قسم کی کوئی اور حرکت کرنے کی حماقت نہیں کرنا۔ میں فوراً بینک والوں کو خبر کر دوں گا۔ تمہیں اپنی کھال بچانے کے لیے صرف پانچ ہزار ڈالر.....“

”پتا نہیں تم کیا فضول بکواس کر رہے ہو.....“ فریک نے کہا اور فون بند کر دیا۔

چند منٹ توقف کے بعد ہیکٹر نے دوبارہ فریک کا نمبر ملایا جیسے ہی دوسری طرف سے آواز آئی، ہیکٹر نے کہا۔

”میرے رہٹ میں ایک ہزار ڈالر کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اب تمہیں پانچ کے بجائے چھ ہزار ڈالر دینے پڑیں گے۔ دوبارہ فون بند کرنے کی غلطی نہیں کرنا ورنہ میرا رہٹ اور بڑھ جائے گا۔ میری بات کو مذاق نہیں سمجھو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ بیس ہزار کی رقم الماری کے خفیہ خانے میں رکھی ہے۔ فی الحال میں تمہیں سوچنے کی مہلت دیتا ہوں۔ دوبارہ فون کروں گا، خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور بوتھ سے باہر نکل کر گلی میں چلنے والے ہجوم میں شامل ہو گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے آلہ سماعت کا رخ فریک کی کھڑکی کی طرف کر دیا اور ایئر فون لگا کر سننے لگا۔ برتھا تیز تیز آواز میں باتیں کر رہی تھی۔ ”میں اتنی پاگل نہیں ہوں فریک۔ میں بھلا کسی کو پیسوں کے بارے میں کیوں بتانے لگی۔ میں تو پیسوں کے خیال سے ہی کاٹنے لگتی ہوں۔ تم نے یہ سوال کیسے کیا؟“

”بس یونہی پوچھ لیا۔“ فریک نے کہا۔ ”میں تاکید کرتا ہوں کہ اس بات کا ذکر کسی کے سامنے نہیں کرنا۔ گو تمہارے چنے کا انداز مختلف ہے لیکن میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں۔ اس میں تمہاری بھی بھلائی ہے۔“

”میں کہتی ہوں۔ مجھے ایسی بھلائی کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”اچھا اچھا۔ اب اس گفتگو کو ختم کر دو۔“

ہیکٹر نے آلہ سماعت بند کر دیا اور کپڑے تبدیل کر کے اسٹرپر لیٹ گیا۔ رات کے کھانے کے بعد کچھ دیر تک وہ اخبار کا مطالعہ کرتا رہا پھر نہایت اطمینان کے ساتھ سو گیا۔ اگلے روز پانچ بجے اس نے دوبارہ فریک کو فون کیا۔

”کیوں پیارے، رات کیسے گزری؟ اور سنو، برتھا پر غصہ نہیں نکالو۔ اس نے مجھے کوئی بات نہیں بتائی۔ میری معلومات کا ذریعہ کچھ اور ہے جو تمہارے گمان سے بھی بالاتر ہے۔“

”ت..... تم کون ہو؟“ فریک نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”میں؟..... مجھے تم گھر کا بھیدی کہہ سکتے ہو۔ میں تمہارے تمام منصوبوں سے آگاہ ہوں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ تم اپنے سیونگ اکاؤنٹ سے ہر مہینے ایک ہزار ڈالر نکالتے رہو گے اور جب تمہارے پاس مجموعی طور پر پچاس ہزار ڈالر ہو جائیں گے تو تم یورپ کی سیاحت پر نکل جاؤ گے..... میرے عزیز معصوم! صرف چھ ہزار ڈالر میں تمہیں تحفظ مل رہا ہے۔ تمہیں بزرگوں کا یہ قول ضرور یاد ہو گا کہ سارا دھن جاتا دیکھے تو آدھا دیجیے بانٹ۔ ورنہ دولت کے ساتھ ساتھ تمہارا مصوری اور سیاحت کا سہانا خواب بھی خاک میں مل جائے گا۔“ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ ہیکٹر نے دتی کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اچھے بچوں کی طرح میری بات مان لو ورنہ ایک ہزار ڈالر کا مزید نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔“

”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“

”یہ تم اتنے بھی بھولے نہیں ہو؟ میں صرف چھ ہزار ڈالر چاہتا ہوں۔ اس بات سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ میں ایک شریف آدمی ہوں اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں دوبارہ پریشان نہیں کروں گا۔ ذرا سوچو تو آخر میرے بھی کچھ خواب ہیں اور محض اللہ کی مہربانی سے دوا آدمیوں کے خواب ایک ساتھ پورے ہو رہے ہیں۔“

”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم دوبارہ مجھے تنگ نہیں کرو گے؟“

”میں کوئی ضمانت فراہم نہیں کر سکتا۔ تمہیں میری بات

پر یقین کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی ہم دونوں ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں یعنی چور کا بھائی گرہ کٹا۔“

”آں ہاں..... یہ تو ٹھیک ہے۔ ہماری ملاقات کب ہوگی؟“

”ابھی نہیں۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”وقت اور جگہ کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔ شب بخیر فرمائیگی!“

کمرے میں واپس آنے کے بعد ہیکٹر نے فریک کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ایک نوجوان شخص کھڑکی کے درمیان کھڑا جھانک رہا تھا، اس کے بال سرخ رنگ کے تھے۔ رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہیکٹر نے کمرے کی بنی بجھادی اور آلہ سماعت لے کر کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ والو کا رخ حسب معمول کھڑکی کی طرف تھا۔ سب سے پہلے اس کے کانوں میں برتھا کی آواز آئی۔ ”کیا بات ہے، آج بہت خوش نظر آ رہے ہو۔“

”کچھ نہیں بلکہ میں تو کچھ تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں۔“

”مفتے کے روز می کی ساگرہ ہے۔ کیا خیال ہے کیوں نہ ہفتہ اتوار می کے ہاں گزارا جائے۔ ویسے بھی تمہیں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے۔“

”تم اکیلی ہی چلی جاؤ برتھا۔ میں نے کئی ایک کام نمٹانے ہیں اور کچھ آرام بھی کر لوں گا۔“

”دیکھا..... دولت کی موجودگی نے تمہارے اندر کتنی زبردست تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ تم گھرا کیلا چھوڑ کر جاتے ہوئے گھبراتے ہو، میں خود بھی کسی بلی کی طرح خوف زدہ رہتی ہوں۔“

”پیسے کی کوئی بات نہیں میری جان۔ تم جانتی ہی ہو کہ میرے جانے سے وہاں کی صورت حال ناخوش گوار ہو جائے گی۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ کیا فائدہ تمہاری می کی ساگرہ کا بیڑہ غرق ہو جائے گا۔ چپکے سے جیسے کے روز ٹرین پر بیٹھ کر چلی جاؤ اور اتوار کی شام واپس آ جانا اور اب ذرا ٹی وی کھول دو، میرا پسندیدہ پروگرام شروع ہونے والا ہے۔“

اگلی شام ہیکٹر نے فریک کو فون کر کے کہا۔

”ہیلو فریک، تمہارا پرانا دوست بول رہا ہوں۔“

”میرا دوست؟“

”انجان بننے کی کوشش نہیں کرو بیٹا۔ اور سنو! ایک قیمتی مشورہ یاد رکھو، یورپ کے سفر پر روانہ ہوتے وقت اپنے بالوں کو رنگنے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر سرکاری کتے تمہارے پیچھے لگ گئے تو وہ سب سے پہلے اس قسم کی امکانی تبدیلیوں کو ذہن میں رکھ کر تمہاری تلاش کریں گے۔“

”شکریہ! اب یہ بتاؤ کہ ہماری ملاقات کہاں ہوگی تاکہ اس معاملے کو ختم کیا جاسکے۔“
”فکر کیوں کرتے ہو فریڈنکی۔ اس کے لیے ابھی بہت وقت پڑا ہے۔“

”آئندہ ہفتے کی شام کیسی رہے گی؟“
”پیارے، مجھ پر حکم چلانے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ ہفتے کی شام کو برتھا گھر پر نہیں ہوگی۔ وہ جمعے کے روز اپنی مہمی کی سالگرہ میں شریک ہونے جارہی ہے۔ لو پیارے، ایک مزے دار لطیفہ سنو۔ تمہاری پیاری برتھا تمہیں ڈنل کراس کر رہی ہے۔ تم نے ایڈی کا نام سنا ہوگا۔ وہ.....“
”ایڈی؟..... ایڈی تو اس کا..... کیوں بے چہند! اس بات سے تمہارا مقصد کیا ہے؟“

”اگر تم نے اس قسم کی زبان استعمال کی تو مجھے رقم میں اضافہ کرنا پڑے گا۔ کیا سمجھے.....؟ رقم تیار رکھنا۔ میں دوبارہ فون کروں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اس رات فریڈنکی خاصی دیر تک کھڑکی میں کھڑا بیٹھنے لگی میں دیکھتا رہا۔ ہیکٹر بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔

اگلے روز علی الصباح ہیکٹر نے فریڈنکی سے چھ ہزار ڈالر..... وصول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا اور قرب وجوار میں ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوگی۔ ہیکٹر دھیرے دھیرے چلتا ہوا کونے کے ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہو گیا۔ بوتھ تک پہنچتے پہنچتے اس کا سانس پھول گیا اور سینے میں ہلکا سا درد بھی ہونے لگا۔ اسے یاد آیا کہ ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ بوتھ میں بیٹھ کر سانس درست کرتا رہا پھر اس نے فریڈنکی کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی جواب دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فریڈنکی اس کے فون کا پہلے سے منتظر تھا۔ یہ بات اسے قدرے عجیب سی لگی۔ تاہم اس نے اپنے لہجے میں بے نیازی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو فریڈنکی، تمہارا پرانا دوست بول رہا ہوں۔ رقم تیار ہے؟..... ایسا کرو کہ چھ ہزار ڈالر زکوٰۃ اخبار میں لپیٹ کر تیار رکھو۔“

”ایک منٹ..... ذرا ہولڈ کرو۔“
”کوئی بات نہیں۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”سہولت سے کام کرو۔“ انتظار کرتے ہوئے ہیکٹر سوچنے لگا کہ شاید فریڈنکی یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے کہ میں کس ٹیلی فون بوتھ سے فون کر رہا ہوں۔ لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوگا۔ تقریباً نصف منٹ تک انتظار کرنے کے بعد ہیکٹر نے فون بند کر دیا اور ایک منٹ کے بعد دوبارہ نمبر ڈائل کیا لیکن رابطہ نہ مل سکا۔ غالباً

فریڈنکی نے ابھی تک ریسیور نیچے ہی رکھا ہوا تھا۔

اس نے ریسیور نیچے رکھ دیا اور بوتھ کا دروازہ تھوڑا کھول کر فریڈنکی کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ گویا ہر پھیلی ہوئی دھند کی وجہ سے صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تاہم فریڈنکی کی کھڑکی میں دھات کی بنی ہوئی ایک چمکدار چیز نظر آرہی تھی ہیکٹر نے اسے شناخت کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ وہ ایک آلہ سماعت تھا جس کے لمبوترے والو کا رخ ٹیلی فون بوتھ کی طرف تھا۔ ہیکٹر کے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔

عین اسی وقت ہیکٹر کو عمارت کے صدر دروازے سے فریڈنکی نکلتا دکھائی دیا۔ اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا اور وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا ٹیلی فون بوتھ کی طرف آ رہا تھا۔ معاملہ بالکل بگڑ گیا تھا۔ ہیکٹر نے جلدی سے بوتھ کا دروازہ کھولا اور تیزی سے ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ بات اس کے ذہن سے بالکل ہی نکل گئی تھی کہ ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ چند قدم دوڑنے کے بعد وہ لڑکھڑایا اور منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔

عجیب سی بات! ہیکٹر کی نوٹ بک سے نظریں ہٹا کر ارد گرد جمع ہو جانے والے ہجوم کی طرف دیکھا۔

”کسی شخص نے کہا تھا کہ اس پر دل کا دورہ پڑا تھا؟“
اس نے ہیکٹر کے بے حرکت جسم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
”کیا یہ شخص مر چکا ہے؟“ فریڈنکی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

”ہاں۔ کیا تم نے اسے گرتے ہوئے دیکھا تھا؟“
”جی ہاں جناب۔“ فریڈنکی نے جواب دیا۔ ”میں سامنے والی عمارت میں رہتا ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے میں ڈنل روٹی اور انڈے لینے کے لیے اسٹور کی طرف جا رہا تھا تو شخص کو ٹیلی فون بوتھ سے نکل کر تیزی سے سڑک کی دوسری جانب جاتے دیکھا۔ غالباً یہ شخص یا تو بھاگ رہا تھا یا بہت تیز رفتاری کے ساتھ چل رہا تھا۔ درحقیقت میں نے اس کی طرف خاص توجہ نہیں دی لیکن جب یہ اچانک سڑک پر گر پڑا تو میں مدد کے لیے اس کی طرف بھاگا۔“

”اب یہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں رہا۔“ سای نے پرتاسف لہجے میں کہا۔ ”کیا تم اسے جانتے ہو یا پہلے بھی اسے دیکھا ہے؟“

”نہیں جناب۔“ فریڈنکی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”زندگی میں پہلی مرتبہ اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ نہ معلوم کون ہے بے چارہ۔“

الارم نے شور مچایا تو ہیری کارٹر نے آنکھ کھول کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ اس کے کام پر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ مگر کام پر تو جانا تھا۔ ہیری تقریباً تیس برس کا خوب رو اور سویر نظر آنے والا شخص تھا، اس کے ہلکے سرمئی بال نفاست سے تراشے ہوئے تھے۔ کسی قدر ورزشی جسم کی وجہ سے وہ اسٹارٹ دکھائی دیتا تھا اور جلد

نوجوانوں کی طرح تروتازہ تھی۔ اس نے اٹھ کر واش روم کا رخ کیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر وہ باہر آیا۔ اس نے دروازے سے سوٹ نکالا اور پھر اس کے ساتھ بیچ کرتی ٹائی، شرٹ اور جوتے موزے نکال کر انہیں ترتیب سے رکھ دیا۔ وہ چن چن میں آیا تو اس کی ماما کا تھانا شاٹ لگا چکی تھی۔ اس نے ماں کو پیار کیا اور میز پر آ گیا۔ ناشتا بہت سادہ تھوڑا سا بلی انڈوں، دو

کاشف زہر جیسا

مکروفریب کی اس دنیا میں کب کوئی کسی کو جان سکا ہے۔ بعض اوقات کوئی ہوشیاری میں بھی اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لیتا ہے اور کسی کی سادگی میں اتنے پیچ و خم ہوتے ہیں کہ شکار ہونے والے کی خوش گمانیاں اسے احساس نہیں ہونے دیتیں کہ وہ کس بلا میں گرفتار ہو چکا ہے... بس یہی خوبی اس کہانی کی انفرادیت ہے کہ جیسے کو جیسا ایسے ہی ملا کرتا ہے۔

فریڈنکی نے ہیکٹر کے ایک انسان دوست چرم کی روداد



عدو سلاخیں اور جوس کے ایک گلاس پر مشتمل۔

”ہیری... مجھے دوسو ڈالرز کی ضرورت ہے۔“ اگا تھا نے کہا۔ ”کچھ سامان لانا ہے۔“

اگا تھا ایک گارمنٹ اسٹور میں پارٹ ٹائم جاب کرتی تھی۔ وہ دس بجے جاتی اور شام چار بجے تک لوٹ آتی تھی۔ اس کی تنخواہ سے گھر چلتا تھا لیکن کسی مہینے اخراجات زیادہ ہو جاتے تو وہ ہیری سے بھی رقم لیتی تھی۔ اگا تھا کی عمر پچاس سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس نے خود کو سنبھال کر رکھا تھا مگر ہیری کے باپ کے مرنے کے بعد اس نے دوسری شادی کا بھی نہیں سوچا تھا، اس کی توجہ کا محور صرف ہیری تھا۔ ہیری دنیا میں کسی سے محبت کرتا تھا تو وہ اس کی ماں تھی۔ یہ گھر، ہیری کے باپ نے لیا تھا اور اس کے مرنے کے بعد یہ ہیری کو مل گیا تھا۔ ناشتا کر کے اس نے اپنے والٹ سے دوسو ڈالرز نکال کر ماں کو دیے اور تیار ہونے لگا۔ اب اس کے پاس زیادہ رقم نہیں رہی تھی لیکن اسے امید تھی کہ شام تک اسے رقم مل جائے گی۔

تیار ہو کر وہ باہر آیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے کسی گھنٹی کا کوئی بزنس ایجنٹ جو جاب پر جا رہا ہے۔ کی صرف ایک بریف کیس کی بھی جو اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ یہ کی اس نے ایک اخبار کے اسٹال سے بزنس ویلے لے کر پوری کر لی۔ وہ اخبار کی سرخیاں دیکھتا ہوا نیو یارک سب وے کے ایک اسٹیشن پر آیا۔ اس نے ٹکٹ لیا اور دفتر جانے والوں کے ہجوم کے ساتھ ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے برابر ایک خوش پوش شخص کھڑا تھا۔ ہیری اسے دیکھ کر مسکرایا تو وہ بھی مسکرا دیا۔ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو کر رکی اور اس کے دروازے کھلے تو ہجوم اس کی طرف لپکا۔ ہیری کے ساتھ کھڑا شخص آگے بڑھا تو اس سے ٹکرانے سے ہیری کے ہاتھ سے اخبار گر گیا۔

اس نے معذرت کرتے ہوئے جھک کر ہیری کا اخبار اٹھایا اور اسے بالکل احساس تک نہ ہوسکا کہ اس دوران میں اس کی پتلون کی جیب سے والٹ نکل کر ہیری کے کوٹ کی جیب میں جا چکا ہے۔ اخبار اسے دے کر وہ شخص تیزی سے ٹرین میں داخل ہو گیا کیونکہ ٹرین صرف ایک منٹ کے لیے رکتی تھی اور اس کے بعد اسی روٹ کی ٹرین آدھے گھنٹے بعد آتی۔ وہ شخص یہ ٹرین مس نہیں کرتا چاہتا تھا اور اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ ہیری اندر جانے کے بجائے ہجوم میں آہستہ سے پیچھے ہٹنے لگا تھا اور پھر ٹرین کا دروازہ بند ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک دفتری عمارت کے سامنے تھا۔

اس کثیر المنزلہ عمارت میں بے شمار دفاتر میں ہزاروں لوگ کام کرتے تھے۔ اس وقت بھی لوگوں کا ایک ہجوم اندر جا رہا تھا۔ ہیری بھی ان میں شامل ہو کر اندر پہنچ گیا۔ اس سے آگے ایک خوب صورت عورت چھوٹے سے آئینے میں اپنی لپ اسٹک چیک کرتی جا رہی تھی۔ اس نے آئینہ اپنے پرس میں رکھا تو ہیری نے اس میں چھوٹا والٹ دیکھ لیا۔ ساتھ ہی جدید آئی فون بھی موجود تھا۔ ہیری نے یہاں بھی اخبار والی تکنیک استعمال کی۔ وہ اس طرح عورت کے راستے میں آیا کہ وہ ظاہر عورت کی ٹکر سے اخبار گرا اور اس کے صفحے بکھر گئے۔ پہلے عورت نے غصے سے اس کی طرف دیکھا پھر ہیری کی دل کش شخصیت نے اسے مسکرا کر دیا۔

”اوہ سوری...“ عورت نے بیٹھ کر جلدی سے اخبار سمیٹتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ ہیری نے سحر انگیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ وہ اس کے بالکل پاس بیٹھ گیا تھا۔ ”عظمتی میری بھی تھی، مجھے اس ہجوم میں اخبار نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔“ عورت نے اسے اخبار سمیٹ کر دیا اور اپنا بیگ شانے پر لٹکاتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ حادثہ اس کے لیے خوشگوار تھا۔ اس سے ذرا آگے نکلتے ہی ہیری پلٹا اور باہر جانے لگا۔ اس کی جیب میں عورت کے منی والٹ اور اس کے آئی فون کا اضافہ ہو گیا تھا۔ عورت کا بیگ اس کے اور ہیری کے درمیان میں آگیا تھا، اس لیے اس سمیٹ کی نے نہیں دیکھا کہ ہیری نے بیگ کے ساتھ کیا کیا ہے۔ کچھ دیر بعد ایک پارک میں بچ پر بیٹھے ہوئے اس نے دونوں پرسوں کا معائنہ کیا۔ مرد کے پرس سے صرف ایک سو نوے ڈالرز اور اس کا کریڈٹ کارڈ نکلا تھا، ایک ڈیبٹ کارڈ بھی تھا لیکن وہ اس کے لیے بیکار تھا۔ اس نے صرف رقم اور کریڈٹ کارڈ رکھ کر پرس پیچھے جھاڑی میں پھینک دیا۔ عورت کے والٹ سے البتہ اچھی رقم نکلی تھی یہ کل سات سو چھپن ڈالرز تھے۔ اس کے پاس بھی کریڈٹ کارڈ تھا۔ آئی فون نیا تھا۔ اس نے باقی سامان جھاڑی میں پھینکا پھر مرد کے کریڈٹ کارڈ پر اس کے دستخط دیکھ کر ایک خالی پیڈ پر کچھ دیر ان کی مشق کرتا رہا۔

چند منٹ بعد وہ کچھ دور ایک جدید شاپنگ سینٹر میں تھا۔ اس نے پہلے پچاس ڈالرز کی خریداری کی اور کریڈٹ کارڈ پیش کر دیا۔ کاؤنٹر پر موجود لڑکی نے سلیپ پر اس کے سامنے غور سے دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس مرحلے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس نے اسٹور کے دوسرے

بھ میں خاصی شاپنگ کی، اس نے اپنے لیے کئی فرس، پینٹس، جوتے، پرفیومز اور اسی طرح کی کئی دوسری چیزیں لے لیں۔ ابھی تک کریڈٹ کارڈ کی چوری کی ہارٹ سسٹم میں نہیں آئی تھی مگر اب اس میں زیادہ دیر بھی نہیں تھی۔ اسٹور سے باہر آ کر اس نے کریڈٹ کارڈ ایک اسٹ بن میں پھینکنا چاہا لیکن پھر رک گیا اور اسے واپس بیب میں رکھ لیا۔ خریدہ ہوا سارا سامان اس نے بس ٹرینل کے ایک لاکر میں رکھوا دیا۔ یہ لاکر اس کے پاس رہتا تھا۔

شام تک اس نے مزید اسی طرح کے کام کیے۔ اس کے پاس کئی موبائل فون اور خاصا کیش جمع ہو گیا تھا۔ پانچ بجے اس نے سترھویں شاہراہ کا رخ کیا۔ اس نے دوپہر میں اقامتہ کھانا نہیں کھایا، بس ایک برگر لے لیا تھا۔ ہاں خود کو ترو تازہ رکھنے کے لیے کافی لیتا رہا تھا۔ اس کا کام ایسا تھا جس میں چستی اور مہارت درکار تھی۔ کھانے کے بعد سستی طاری ہونے لگتی تھی۔ سارا دن گھوم پھر کر اسے بھوک لگ رہی تھی لیکن ابھی رات کے کھانے میں خاصا وقت تھا۔ سترھویں شاہراہ پر وہ اندرونی علاقے کی طرف گھوم گیا۔ مرکزی شاہراہ کی نسبت یہ دراکم تر درجے کا علاقہ تھا، یہاں گلیاں چوڑی تھیں مگر زیادہ صفائی نہیں تھی اور گلیوں میں لوگ بھی کم نظر آ رہے تھے۔ ہیری جانتا تھا کہ رات ہوتے ہی یہ علاقہ اجنبیوں کے لیے کتنا خطرناک ہو جاتا تھا۔ ہیری ایک عمارت کے نیچے رکا اور اس نے اوپر دیکھا تو اسے ہنگامی حالات میں استعمال ہونے والی میزبانیوں پر روپڑ جوڑو کی خیالی مشق کرتا نظر آیا۔

”ہے روپ...!“ ہیری نے اسے آواز دی لیکن وہ بہ دستور اپنی مشق میں لگا رہا۔ ہیری جانتا تھا، اس نے سن لیا ہے مگر جان کر انجان بنا ہوا ہے۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد وہ جانے کے لیے مڑا تھا کہ کوئی چیز چھن سے اس کے پیچھے گری۔ یہ چابی تھی، ہیری نے چابی اٹھائی اور داخلی دروازے سے اندر آیا۔ تیسری منزل پر فلیٹ میں داخل ہوا تو ردپرٹ اب سگار نوشی میں مصروف تھا۔ جوڑو کی مشق کے علاوہ اس کے مشاغل میں سگار اور شراب بھی شامل تھے۔ کھردرے نقوش اور سرخ آنکھوں کی وجہ سے وہ جرائم پیشہ نظر آتا تھا۔ وہ ایک لیدر صوفے پر بیٹھا دھواں اڑا رہا تھا۔ ہیری نے تمام چیزیں مع رقم اس کے سامنے ڈال دیں لیکن یہاں آنے سے پہلے وہ کیش میں نصف کی کر چکا تھا۔ یہ گیش اس وقت اس کی انڈر ویئر میں خاص طور سے بنی چھوٹی ی جیب میں تھا۔

”یہ تمہارا کوہمارے جوڑو کو کینسر کر دے گی۔“ ہیری نے

کہا اور فریج سے اپنے لیے بیئر کی بوتل نکالی۔ روپڑ سامنے پڑی چیزوں کو گھور رہا تھا۔ اس نے ایک موبائل فون اٹھایا اور پھر اسے ایک طرف پھینک دیا۔ دوسرا اور تیسرا بھی اسی طرح پھینکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ہیری سے کہا۔ ”یہ سب کیا کچرا ہے؟“

”لوگ آج کل یہی کچرا جیب میں لے کر گھوم رہے ہیں۔“ ہیری نے اسے مطلع کیا۔

”ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔“ روپڑ چلایا۔ ”کوئی کوڑیوں کے مول بھی نہیں لیتا انہیں۔“

ہیری نے جدید آئی فون اٹھا کر اس کے سامنے کیا۔ ”یہ نیا ایک ہزار ڈالرز کا ملتا ہے، کوئی بھی شوقین اس کے پانچ سو ڈالرز دیدے گا۔“

روپڑ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ لاک ہو جائے گا۔“ ”صرف سو ڈالرز ادا کر کے اسے ان لاک کیا جاسکتا ہے۔“

”یہ صرف دو ڈھائی سو کی چیز ہے۔“

”جب میں کیا کروں، لوگ جو چیزیں گھر سے لے کر نکلیں گے میں وہی لاسکتا ہوں۔“ ہیری نے شانے اچکائے۔ ”سنو، مجھے قیمتی چیزیں چاہئیں، سیکڑوں نہیں ہزاروں ڈالرز والی چیزیں، مجھے قیمتی گھڑیاں لاکر دو، سچے مولی کے ہار اور ہیرے کی انگوٹھیاں چاہئیں، سناتم نے...“

”یہ بہت مشکل کام ہے۔ لوگ اپنی ان چیزوں کی طرف سے ہوشیار رہتے ہیں۔ گھڑی اور ہار جسم کا حصہ ہوتے ہیں اور ان کی گمشدگی کا فوراً پتا چلتا جاتا ہے۔“

”میں کچھ نہیں جانتا۔“ روپڑ چلایا۔ ”مجھے قیمتی چیزیں چاہئیں ورنہ یہاں آنے کی زحمت مت کرنا۔“

ہیری اسے گھورتا رہا پھر اس نے میز پر پڑے نوٹ اٹھانے کی کوشش کی لیکن روپڑ نے پھر سے پہلے اٹھا لیے۔ اس نے انہیں گنا اور پھر ان میں سے کچھ نوٹ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیے۔ یہ کل رقم کا چالیس فیصد تھے۔ ہیری نے انہیں جیب میں ڈال لیا۔ روپڑ اب مضطرب انداز میں ٹہل رہا تھا، اس نے ہیری کا چہرہ دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ”سوری میں بہت پریشان ہوں تم خیال مت کرنا... اپنا کام کرو لیکن کوشش کرو کوئی قیمتی چیز ہاتھ لگے جس سے مجھے بھی فائدہ ہو اور تمہیں بھی۔ اگر تم کوئی قیمتی چیز لاؤ گے تو اس کی اصل مالیت کا تیس فیصد تمہارا ہوگا۔“

ہیری پہلی بار مسکرایا۔ ”اب کی ہے نا تم نے کام کی بات۔“

وہ روپرٹ کے اپارٹمنٹ سے باہر آیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا زائد والٹ نکالا۔ اس میں بہت کچھ تھا۔ یہ والٹ اس نے دو دن پہلے ایک خاتون کے پرس سے نکالا تھا۔ وہ سب وہ میں اپنے برابر میں بیٹھی دوسری عورت سے گفتگو کر رہی تھی اور اس کا بیگ پیچھے رکھا تھا۔ اس نے ہیری کو نہیں دیکھا تھا۔ پرس میں معمولی سی رقم، ایک ڈبیٹ کارڈ اور دوسری ضروری چیزیں تھیں۔ یہ کام بیکار ثابت ہوا تھا اس لیے اب وہ دوسری طرح سے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کارڈ پر موجود نمبر پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے عورت نے فون ریسو کیا اور چند منٹ میں وہ اس کے ساتھ ملاقات کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ ہیری نے اسے ایک اچھے ریسٹوران میں بلایا تھا۔ وہ اسے اس کا پرس واپس دینا چاہتا تھا جو یہ قول اس کے اسے ایک گلی میں پڑا ملا تھا۔ عورت اتنی نا سمجھ نہیں تھی کہ اس طرح ڈنر پر بلا کر پرس واپس کرنے کا مقصد نہ سمجھتی۔

☆☆☆

پولیس افسر جان ڈیکن کو اس کے پاس نے طلب کر لیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ یہ بلی کیوں تھی۔ اس کے علاقے میں مسلسل چوری اور جیب تراشی کی وارداتیں ہو رہی تھیں اور اب تک اس سلسلے میں کسی شخص کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔ اس کا پاس کیپٹن میگرا تھ سخت گیر آدمی تھا اور اس کے ماتحت اس کے سامنے جاتے ہوئے ڈرتے تھے لیکن جان اس سے نہیں ڈرتا تھا۔ وہ اس کے دفتر میں داخل ہوا تو میگرا تھ اخبار دیکھ رہا تھا، اس نے طنزیہ انداز میں جان کی طرف دیکھا۔ ”آؤ آفیسر... میں تمہاری کارکردگی دیکھ رہا تھا۔“ اس نے اخبار جان کی طرف پھینک دیا۔

”خبردار غور سے دیکھو۔“ کپتان نے اخبار پر ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”اس میں ایک قابل فخر پولیس افسر کا ذکر ہے جو اپنے پرس سے ہاتھ دھو بیٹھا جس میں اس کا بیج بھی تھا۔“ جان کی بھوین تن گئیں۔ ”یہ خبر اخبار تک کیسے پہنچی؟“ میگرا تھ نے شانے اچکائے۔ ”یہ تم اس رپورٹر سے پوچھ لینا، تمہیں بتائے گا۔ آج اس ڈیٹ آدمی نے مزید کئی وارداتیں کی ہیں۔“

”میں دیکھ لوں گا۔“ جان نے بہ دستور بے پروائی سے کہا۔

”سنو جان مجھے میٹر کو جواب دینا ہوتا ہے۔“ میگرا تھ ذرا

آگے جھک کر بولا اور پھر دہاڑا۔ ”مجھے ہر صورت یہ آدمی چاہیے۔“ جان اس کی دہاڑ سے متاثر نہیں ہوا تھا، وہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ میگرا تھ کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ ”اب تم دفع ہو سکتے ہو۔“

”شکریہ۔“ جان اٹھا اور مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ ہال میں آیا جہاں ایک مبینہ مجرم موجود تھا، اس کی ہتھکڑی ایک ہک سے بندھی تھی۔ جان نے اس کی ہتھکڑی کھولی تو اس نے بولنا شروع کر دیا۔

”دیکھو میں کچھ نہیں جانتا... تم بلا وجہ مجھے اس چکر میں ڈال رہے ہو۔“

”ٹھٹ اپ ڈونی۔“ جان نے کہا اور اسے لاک والے حصے میں لایا۔ یہاں آخر میں ایک ڈبل لاک والا لاک تھا جہاں انتہائی خطرناک طرزموں کو رکھا جاتا تھا۔ نی الحال یہاں کوئی نہیں تھا اور اسی لیے جان، ڈونی کو یہاں لایا تھا۔ اس نے اندر آ کر دروازہ بند کیا، اپنا کوٹ اتار کر دروازے کے شیشے والے حصے پر ٹانگ دیا اور ڈونی کی طرف دیکھا جو خوفزدہ نظر آ رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ اب کیا ہوگا۔ جان نے دونوں ہاتھ ملے ہوئے کہا۔ ”ہاں تو مسٹر ڈونی...“

”میں کچھ نہیں...“ ڈونی کی بات ادھوری رہ گئی تھی، اس کے پیٹ میں پڑنے والا گھونسا اتنا ہی شدید تھا۔

☆☆☆

ہیری اس حسین خاتون کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ دونوں ڈنر سے پہلے وائن لے رہے تھے، اس کا نام اینڈریا تھا مگر ہیری اسے اینڈی کہہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وینر نے کھانا لگانا شروع کر دیا۔ اینڈی بہت شکر گزار تھی۔ رقم تو پرس میں نہ تھی لیکن کاغذات مل گئے جو بہت اہم تھے۔ جب مل ادا کرنے کا وقت آیا تو ہیری نے اینڈی کے اصرار کے باوجود مل خود اٹھا لیا اور وینر کو اسی شخص کا کریڈٹ کارڈ نکال کر دیا۔ وینر گیا اور جلد ہی لوٹ آیا، اس نے آہستہ سے کہا۔ ”سوری سر، سسٹم کارڈ کو مسٹر دکر رہا ہے۔“

”ادا سنگی میں کر دیتی ہوں۔“ اینڈی بولی۔

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے کبھی کبھی سسٹم میں مسئلہ آ جاتا ہے۔“ ہیری نے کہا اور وینر کو لے کر ایک طرف آیا۔ ”مسئلہ کیا ہے؟“

”کارڈ قبول نہیں ہو رہا ہے۔“

”بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔“ ہیری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھ سے سلب ہر سائن لے لو، پیک ادا سنگی کر دے گا۔“

وینر نے سوچا اور پھر کہا۔ ”یہ کام فحش کر سکتا ہے۔ ایک محنت میں اسے بلاتا ہوں۔“

ایک طرف وینر گیا، دوسری طرف سے ہیری نے سادہ لباس میں پولیس والوں کو آتے دیکھا۔ وہ سادہ لباس میں بھی صاف پہچانے جا رہے تھے۔ ہیری گھبرائے بغیر آگے بڑھا اور پولیس والوں کے برابر سے ہوتا ہوا ریسٹوران سے باہر نکل گیا۔ اینڈی حیران پریشان اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک منٹ سے پہلے پولیس والے اس کے سامنے تھے اور اس سے ہیری کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اینڈی نے کہا۔ ”میں مسٹر سولوس کو نہیں جانتی، اس سے آج ہی ملی ہوں۔ دراصل میرا پرس چوری ہو گیا تھا جو اسے ملا تھا اور اس نے مجھے واپس دینے کے لیے...“

آنے والوں میں جان بھی شامل تھا یہ اسی کا کیس تھا جیسے ہی اسے پتا چلا کہ مشکوک شخص باہر جا چکا ہے، وہ دروازے کی طرف لپکا لیکن وہ شاطر جاتے ہوئے ریسٹوران کے دروازے کو باہر سے ہتھکڑی ڈال کر بند کر گیا تھا۔ مجبوراً پولیس والوں کو شیشہ توڑ کر باہر آنا پڑا تھا۔ اتنی دیر میں ہیری غائب ہو چکا تھا۔ وہ ایک بس میں گھر کی طرف جا رہا تھا اور اپنی قسمت پر افسوس کر رہا تھا اگر پولیس مداخلت نہ کرتی تو شاید آج رات وہ اس حسین خاتون کے ساتھ گزرتا۔ پولیس نے یقیناً کریڈٹ کارڈ کی مدد سے اس کا سراغ لگایا تھا۔ اس نے خود کو کوسا کہ اسے اتنی کجی کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ آج ہی اس نے آٹھ سو ڈالر سے زیادہ کمائے تھے۔ اگر وہ دو ڈھائی سو کا مل ادا کر دیتا تو اسے یوں نہ بھاگنا پڑتا مگر معمولی سی رقم بچانے کے چکر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ ذہنی طور پر وہ ایسے مواقعوں کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا اس لیے اس کی جیب میں ہتھکڑی بھی موجود تھی۔ اگر وہ دروازہ بند نہ کرتا تو پولیس بہت تیزی سے اس کے پیچھے آتی۔ وہ گھر پہنچا تو اگا تھا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اسے کچھ بتانا چاہتی تھی لیکن وہ تھکن کا کہہ کر اپنے بیڈروم میں آ گیا اور ٹھنک گیا وہاں ایک شخص پہلے سے موجود تھا جس کا سر بالوں سے تقریباً فارغ تھا اور اس نے مونے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ صرف گاؤن اور ٹیکر میں تھا۔ اگا تھا، ہیری کے پیچھے آئی تو ہیری نے برہمی سے اس سے پوچھا۔ ”مام، یہ شخص کون ہے؟“

”یہ فرینگی ہے۔“ اگا تھا نے نروس لہجہ میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے لیکن یہ میرے بیڈروم اور اس صلیے میں کیا

کر رہا ہے؟“

فرینگی آگے آیا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”ہیلو ہیری! میں تمہاری مام کا فرینڈ ہوں۔“

”ہوائے فرینڈ۔“ اگا تھا نے تصدیق کی تو ہیری نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”یہ تمہارا بوائے فرینڈ ہے؟“

فرینگی اس کے پاس سے گزر کر فریج تک گیا، وہ ماں بیٹے کی جیج سے بے نیاز لگ رہا تھا۔ اس نے ایک ٹن نکالا اور دیوار سے ٹک کر پینے لگا۔ اگا تھا ہیری کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ فرینگی بہت اچھا آدمی ہے اور اس سے محبت کرتا ہے لیکن ہیری سننے کے لیے تیار نہیں تھا، ایک موقع پر وہ بے قابو ہو کر فرینگی کی طرف لپکا بھی تھا۔

☆☆☆

ہیری، روپرٹ کے کلیٹ میں بیٹھا تھا اور اپنے سوجے منہ کی آنکس بیگ سے نکور کر رہا تھا۔ اس کی دائیں آنکھ کے نیچے خاصی سوجن تھی اور بائیں کپٹی پر بھی دم تھا۔ روپرٹ اس کے برابر میں بیٹھالی وی پریٹ لی کی فلم دیکھ رہا تھا جس میں جیٹ لی تن تنہا کئی افراد کی مرمت لگا رہا تھا۔ اس نے ہیری کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”ایک عمر رسیدہ بوڑھے شخص نے تمہارا یہ حال کیا ہے؟“

”وہ خبیث کسی بھینسے کی طرح مضبوط ہے۔“ ہیری کراہا۔ ”اس نے صرف دو گھونٹے مارے تھے اور مجھے ہوش نہیں رہا۔“

”تمہاری مام کیا کہتی ہے؟“

”وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

”گویا دس سال بعد اسے شادی کا خیال آ گیا۔“ روپرٹ ہنسا۔ ”ویسے کیا وہ جانتی ہے کہ تم میرے لیے کام کرتے ہو؟“

”نہیں اسے اتنا معلوم ہے کہ میں کسی فرم میں ملازم ہوں اور مجھے زیادہ تنخواہ نہیں ملتی۔“

”حالانکہ تم اچھا خاصا کارہیے ہو۔“

”اچھا خاصا۔“ ہیری نے غی سے کہا۔ ”میں خود کو خطرے میں ڈال کر تمہارے لیے کماتا ہوں اور مجھے تیس چالیس فیصد سے زیادہ نہیں ملتا اب تک میں گرفتاری سے بچا ہوا ہوں، پولیس کے پاس میرا کوئی ریکارڈ نہیں ہے لیکن ایک بار میں پکڑا گیا تو وہ سب کھایا پیا اگلا لیس کے۔“

روپرٹ نے پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”وہی جو تم سمجھ رہے ہو۔“ ہیری نے اٹھ کر آئس بیگ فریج میں رکھ دیا اور اپنی جیکٹ پہنی۔ ”میں یہ کام چھوڑ رہا ہوں۔“

”تم کام چھوڑ رہے ہو پھر تم کیا کرو گے؟“
”کچھ بھی کروں گا، میں نے کچھ رقم جمع کی ہے شاید کوئی چھوٹا موٹا بزنس کر لوں۔“

روپرٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم کوئی اور کام نہیں کر سکتے کیونکہ تمہیں کام کرنے کی عادت ہی نہیں ہے۔“
”دیکھو گا..... لیکن اب میں یہ کام نہیں کروں گا۔“
”ٹھیک ہے مجھے کوئی ایسی چیز لا دو جس کی مالیت پچاس ہزار ڈالرز ہو اور اس کے بعد تم جہنم میں جانے کے لیے بھی آزاد ہو۔“

ہیری نے اس کے الفاظ نظر انداز کیے پھر استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھا اور دروازے کی طرف جانے لگا، عقب سے روپرٹ نے چلا کر کہا۔ ”پچاس ہزار... یاد رکھنا۔“
برف کی ٹکڑوں سے خاصا فرق پڑا تھا اور اس کا چہرہ تقریباً نارمل ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ روپرٹ اتنی آسانی سے اس کی جان نہیں چھوڑے گا۔ اسے یاد تھا، دس سال پہلے جب اس کا باپ ایک بینک ڈکیتی کے دوران ڈاکوؤں کو روکتے ہوئے مارا گیا تھا۔ اس کے چند دن بعد ہی روپرٹ کے گھر گئے اسے اٹھا کر لے گئے۔ انہوں نے اسے بری طرح سے مارا۔ جب وہ ادھموا ہوا تو روپرٹ سامنے آیا اور اس نے ہیری کو بتایا کہ ان کا باپ اس کے لیے کام کرتا تھا وہ اسے اور اس کے آدمیوں کو تحفظ دیتا تھا۔ روپرٹ چوروں کا سرغنہ تھا، اس کے آدمی اس کے لیے چیزیں چوری کر کے لاتے تھے اور وہ چوری کے مال کو آگے فروخت کرتا تھا۔ ہیری کے لیے یہ انکشاف تھا کہ اس کا پولیس مین باپ اصل میں چوروں کا ساتھی تھا اور اس نے اس بات پر یقین نہیں کیا تھا مگر وہ روپرٹ کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت وہ ایک بار میں کام کرتا تھا اور اسے صرف تیس ڈالرز روز ملنے لگے تھے۔ باقی اسکول کے بعد اس نے کالج میں داخلے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے بجائے وہ جلد از جلد کچھ کم کم زندگی کے مزے اڑانا چاہتا تھا۔

روپرٹ کے لیے کام کرنے کے عوض اسے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی تھی لیکن یہ بات اس نے اپنی ماں سے چھپائی تھی۔ گھر سے باہر کل کر عیاشی کرنے کے بعد بھی وہ اچھی خاصی رقم بچا لیتا تھا اور یہ رقم اس نے گھر میں ایک خفیہ جگہ چھپا رکھی تھی جس کا اگلا تھا کو بھی علم نہیں تھا۔ اب یہ رقم تین

لاکھ ڈالرز سے اوپر جا چکی تھی۔ ہیری کچھ عرصے سے سوچ رہا تھا کہ وہ اب یہ دھند چھوڑ کر کوئی کام شروع کر دے۔ اتنی سے وہ کوئی گیس اسٹیشن یا ہائی وے پر چلتا ہوا ریسٹوران خرید سکتا تھا لیکن وہ شہر کا آدمی تھا اور شہر سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے اس نے کسی اچھے علاقے میں چلتا ہوا بار لینے کا فیصلہ کیا تھا جہاں جھگڑے فساد نہ ہوتے ہوں اور آنے والے ہماری جیب رکھتے ہوں۔

لیکن اس سے پہلے روپرٹ سے جان چھڑانا لازمی تھی۔ پچاس ہزار مالیت کی چیز کوئی قیمتی گھڑی ہو سکتی تھی یا کوئی بیش قیمت ہار۔ ان دونوں چیزوں کو سرعام چرانا نہایت خطرناک کام تھا اور اس میں پکڑے جانے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ ہیری صبح گھر واپس آ گیا، اب وہ چہرہ بالکل ٹھیک ہونے تک باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اگلا تھا اس کے لیے پریشان تھی لیکن اس نے ماں سے بات چیت بند کر رکھی تھی۔ دو دن بعد اس کا چہرہ ٹھیک ہو گیا تو وہ تیار ہو کر اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ وہ ایک دفتری عمارت میں داخل ہو جہاں زیادہ تر بینکوں اور مالیاتی اداروں کے دفاتر تھے یہاں ڈائریکٹرز لیول کے ملازمین آتے تھے اور ان میں سے اکثر نے بیش قیمت گھڑیاں پہن رکھی ہوتی تھیں، عورتوں کے پاس قیمتی زیورات تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ عمارت میں داخل ہوتا ایک لڑکی اس کے سامنے آگئی۔

”ہائے...“
لڑکی خاصی دلکش تھی، بہت نازک سے نقوش تھے اس کے۔ ہیری رک گیا اور پھر مسکرایا۔ ”ہائے...“
”ہم تین مہینے پہلے ملے تھے۔“ لڑکی نے یوں کہا جیسے ہیری نے بھی اسے پہچان لیا ہو۔ ہیری کے مسکرانے کا انداز ہی ایسا تھا۔

”اوہ... ہاں۔“ وہ بولا، ویسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔
”مجھے تم سے اہم بات کرنی ہے۔“
ہیری اسے راستے سے ہٹا کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی سائڈ پر لے آیا۔ ”ہاں کہو...؟“
”وہ میں...“ لڑکی زور سے ہو رہی تھی۔ ”امید سے ہوں۔“

”امید سے...“ ہیری نے اس کی بات دہرائی۔
”اوہ... اچھی بات ہے... کب سے ہو؟“
لڑکی براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی، اس نے جواب دیا۔ ”تین مہینے سے۔“

ہیری کو جھٹکا سا لگا اور اس نے یوگلا کر آس پاس مگھا۔ پھر اس نے نزدیکی ستون کے گرد چکر لگایا اور دوبارہ لڑکی کے پاس آیا اور بولا۔ ”میرا خیال ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ یقین سے بولی۔ ”میں نے دو بار ٹیسٹ کرایا ہے۔“
”میں اپنے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

اچانک لڑکی کی آنکھیں بجھ گئیں اور چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”تمہارا مطلب ہے تم مجھے پچا پنے سے انکار کر رہے ہو؟“
”ہاں، میں نے تمہیں آج سے پہلے نہیں دیکھا۔“
”تم مجھ سے مڈویسٹ میں پارکر بار میں ملے تھے جہاں میں کام کرتی ہوں اور تم کہتے ہو تم نے مجھے دیکھا ہی نہیں ہے۔“ لڑکی کا لہجہ تیز ہو گیا۔

”ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں اور جہاں تک اس بچے کا تعلق ہے تو...“ ہیری کی بات مکمل ہونے سے پہلے منہ پر پڑنے والے تھپڑ نے اس کی زبان بند کر دی اور لڑکی ایڑیاں بجاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ آس پاس کے کچھ لوگوں نے اس کی بے عزتی کا یہ منظر دیکھا لیکن کسی نے دخل اندازی نہیں کی۔ ہیری کا موڈ خراب ہو گیا تھا، اس نے کام کا ارادہ ملتوی کر دیا اور گھر کا رخ کیا۔ وہ گھر پہنچا تو اس نے اگلا تھا کو پیننگ کرتے پایا۔ ”مام یہ کیا ہے؟“

”میں نے اور فریج میں شادی کا فیصلہ کر لیا ہے اور میں اس کے گھر جا رہی ہوں۔“
”مجھے چھوڑ کر...؟“ ہیری نے بے یقینی سے کہا۔

”ہاں کیونکہ فریج ایک اچھا آدمی ہے اور تم اب اپنی دیکھ بھال خود کر سکتے ہو۔ میں مزید اکیلے نہیں رہ سکتی۔“
”اکیلے... میرے ساتھ؟“

”تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔“ اگلا تھا نے اس کی بات کاٹی۔ ”عورت کو ایک مرد کا ساتھ چاہیے ہوتا ہے جو اس کے لیے ہو۔ مجھے یہ ساتھ فریج کی صورت میں مل گیا ہے۔ تم اور تمہاری زندگی میری نہیں ہے۔“
”گو یا تم نے فیصلہ کر لیا ہے؟“

”ہاں، اور میں جا رہی ہوں۔ کیا تم اپنی ماں کو رخصت نہیں کرو گے؟“

ہیری بیڈروم میں چلا گیا اور اس نے دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اگلا تھا گھر سے چلی گئی۔ ہیری نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا۔

اگلا تھا فریج کی بڑی سی کار میں سامان رکھوا رہی تھی اور پھر وہ نئے ہنی مون جوڑے کی طرح وہاں سے چلے گئے۔ ہیری دانت پیستا رہا گیا تھا آج اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ پہلے ایک لڑکی ملی جس کا دعویٰ تھا کہ وہ تین مہینے پہلے اس سے مل چکی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ امید سے چلی۔ گھر آیا تو ماں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رخصت ہو گئی تھی اور اب اس سے شادی کرنے جا رہی تھی۔ ماں کا مسئلہ اتنا اہم نہیں تھا لیکن اس لڑکی نے جو دعویٰ کیا تھا وہ پریشان کن تھا۔ ہیری اس بارے میں سوچتے ہوئے چونک گیا۔ تین مہینے پہلے ایک دن وہ رات بھر اور اگلے دن دو پہر تک گھر سے غائب رہا تھا، اگلا تھا کا کہنا تھا کہ ایک ٹیکسی اسے گھر پہنچا گئی تھی اور وہ پیننگ اور کاشکار ہو کر سو رہا تھا، بڑی مشکل سے اسے گھر تک پہنچایا گیا تھا۔ رات کو جب وہ سو کر اٹھا تو اسے کچھ نہیں یاد تھا سوائے اس کے کہ رات کے کھانے کے بعد اس نے نزدیکی کسی بار کا رخ کیا تھا۔ ہیری کو یاد تھا کہ کھانا اس نے مڈویسٹ کے ایک ریسٹوران میں کھایا تھا اور لڑکی نے بھی مڈویسٹ کا ہی ذکر کیا تھا۔

شام کو ہیری نے کپڑے بدلے اور گھر سے نکل آیا، اس نے مڈویسٹ کا رخ کیا۔ شام ہوتے ہی نیویارک کی رونق بڑھ گئی تھی۔ مڈویسٹ پر پارکر بار تلاش کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ یہ ایک درمیانے درجے کا بار تھا جہاں نزدیکی رہائشی علاقوں میں رہنے والے اور اس سڑک سے گزرنے والے پینے کے لیے چلے آتے تھے۔ ہیری نے اندر آ کر کاؤنٹر پر ایک لائٹ وٹسکی طلب کی۔ اس کی نظریں اس لڑکی کو تلاش کر رہی تھیں۔ بار ٹینڈر نے وٹسکی کا گلاس اس کے سامنے رکھا اور سخت لہجے میں بولا۔ ”اور کچھ؟“

”نہیں، بس یہی چاہیے۔“ اس نے کہا اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ اسی لمحے اسے میزوں کے درمیان گھومتی لڑکی نظر آگئی۔ وہ آرڈر لے رہی تھی اور سرونگ کر رہی تھی۔ ہیری ایک سکے کاؤنٹر پر رکھ کر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے پاس جا کر اس لڑکی کا بازو پکڑا۔ ”سنو، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

لڑکی نے ایک جھٹکے سے اس سے بازو چھڑا لیا۔ ”لیکن مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔“
”پلیز... میری بات سنو...“

وہ اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکا تھا کیونکہ ایک نو مند آدمی نے آکر اس کا بازو پکڑ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا وہ اسے مچھ کر بار کے عقبی دروازے تک لے آیا۔ ہیری اسے

سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ صرف لڑکی سے بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے ہیری کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ سامنے دیوار کے ساتھ رکھے لکڑی کے خالی ڈبوں پر جا گرا۔ عقب میں دروازہ بند ہو گیا تھا۔ ہیری کو کسی قدر چوٹ آئی تھی اس نے اٹھتے ہوئے آدی کو ایک گالی دی اور پھر اس کے پرس کا معائنہ کیا۔ جب وہ اسے کھینچ رہا تھا تب ہیری نے ہاتھ کی صفائی دکھادی تھی۔ مگر اس کے پرس میں سوائے دس ڈالرز کے چار نوٹوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ ہیری نے نوٹ نکال کر پرس کچرے کے ڈبے پر کھینچ مارا اسی لمحے عقب سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی، شاید آدی کو پرس کی کم شدگی کا پتا چل گیا تھا۔

”لخت ہو۔“ اس نے کہا۔

”اچھا، لخت ہو۔“ عقب سے لڑکی کی آواز آئی۔ وہ واپس جا رہی تھی ہیری بوکھلا کر اس کی طرف دوڑا۔

”ایک منٹ روکو میں نے تم کو نہیں کہا تھا۔“

لڑکی رک گئی۔ ”کیوں آئے ہو یہاں؟“

”میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔“ ہیری نے کہا اور پھر جلدی جلدی کہنے لگا۔ ”دیکھو میں سچ کہتا ہوں مجھے اس رات بلکہ اگلے دن کی بات بھی یاد نہیں ہے۔ اس رات میں نے بہت زیادہ پی لی تھی لیکن میں تسلیم کرتا ہوں تم جو کہہ رہی ہو وہ بالکل ٹھیک ہے۔“

”تو پھر...؟“ لڑکی نے جارحانہ انداز میں کہا۔

”دیکھو میں... مجھے تمہارا نام بھی نہیں معلوم ہے۔“

”مینی کارل۔“ وہ بولی۔ ”کارل میرا خاندانی نام ہے۔“

”ہیری کارل۔“ جواباً اس نے اپنا نام بتایا۔

”ہاں تو ہیری تمہارے پاس اس مسئلے کا کیا حل ہے؟“

ہیری ٹپٹے لگا پھر اس نے کہا۔ ”میں تمہارے لیے ایک ڈاکٹر کا بند بست کرتا ہوں اور اس کی فیس بھی میں ادا کروں گا۔“

”ڈاکٹر کیا کرے گا؟“

”وہ اس مسئلے کو سرے سے ختم کر دے گا۔“ ہیری نے ڈھکے چھپے انداز میں کہا۔

”کیا تم ایسے کسی ڈاکٹر کو جانتے ہو؟“

”نہیں لیکن میں تلاش کروں گا۔“ ہیری نے کہا۔ ”تم کہو، تم راضی ہو؟“

مینی نے سر ہلایا۔ ”میں یہاں اکیلی ہوں اور کوئی

ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی۔“

”ٹھیک ہے اپنا سیل نمبر دو میں ڈاکٹر کا بندوبست کرتے ہی تم سے رابطہ کروں گا۔“

مینی نے اسے اپنا سیل نمبر دیا اور ہیری نے اپنا سیل نمبر اسے بتایا۔ ”میں تم سے جلد رابطہ کروں گا۔“

ہیری کا خیال تھا کہ شاید یہ کام دس سے بیس ہزار ڈالرز میں منٹ جائے گا کیونکہ کام غیر قانونی تھا اور اس کی فیس بھی اچھی خاصی ہوتی۔ اسے اس قسم کے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے اس نے روپرٹ سے رابطہ کیا۔ ”سنو مجھے کسی ایسے ڈاکٹر کا پتا چاہیے جو خواتین کے مسائل حل کر سکتا ہو، تم سمجھ رہے ہو نا میرا مطلب...؟“

”نہیں...“ روپرٹ نے انکار کیا۔ ”یہ ہاتھ کی صفائی دکھاتے دکھاتے تم نے اچانک دوسرا دھند شروع کر دیا ہے۔“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“ ہیری نے رکھائی سے جواب دیا۔ ”اگر تم ایسے کسی ڈاکٹر کے بارے میں جانتے ہو تو...“

”ہاں ایک ڈاکٹر کے بارے میں جانتا ہوں لیکن میرے کام کا کیا ہوا؟“

”وہ بھی جاری ہے، میں اس مسئلے سے نمٹ لوں پھر تمہارا کام بھی کرتا ہوں۔“ ہیری نے بیزارگی سے کہا۔

روپرٹ نے اسے ایک پتا لکھوا دیا۔

”لیکن میرا نام مت لیتا۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ ہیری نے کہا۔

فون بند کر کے وہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اگا تھا کہ بغیر گھرا سے بڑا عجیب لگ رہا تھا پھر اس نے سوچا کہ اس نے فریگی کے بارے میں معلوم ہی نہیں کیا کہ وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے۔ اس وقت اسے ہوش ہی نہیں تھا، وہ غصے میں اندھا ہو رہا تھا۔ بہر حال اس معاملے سے نمٹنے کے بعد وہ اس کا بھی پتا کر سکتا تھا۔ اگلے روز صبح اس نے اپنی جمع پونجی دیکھی۔ کچن میں لکڑی کے ریک اس نے خود بنائے تھے اور اس دوران میں اس نے ایک ایسا خفیہ خانہ بنایا تھا جس کا پتا اگا تھا کو بھی نہیں تھا۔ یہ فریج کے ساتھ کینٹ کے نیچے الگ ہو جانے والا حصہ تھا جو ایک کھٹکا پٹانے پر کسی ٹرے کی طرح باہر آ جاتا تھا۔ اس میں اس نے رقم کے علاوہ وہ تمام چیزیں بھی رکھی تھیں جنہیں پھینکنے کو اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ ان میں تصاویر بھی تھیں اور چمچیں بھی۔ اور ایک عدد پولیس بیج بھی تھا۔ اس نے ایک بار غلطی سے ایک پولیس والے کی جیب پر ہاتھ صاف کر دیا تھا۔

”تم ہیری کارل کو جانتے ہو؟“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ اندر سے اسی کے فلور پر رہنے والی ایک عورت برآمد ہوئی، اس نے ہیری کو دیکھتے ہی کہا۔ ”ہیری تمہاری ماں کہاں گئی ہے...؟“

اس کا جملہ ٹھہل ہونے سے پہلے ہی ہیری اندر جا چکا تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے اسے لاک کر دیا اور پھر عمارت کے پچھلے حصے کی طرف بھاگا، جب تک جان اور ریٹنڈ دروازہ کھول کر اس کے پیچھے آئے، وہ حقیقی محن میں پہنچ کر دیوار پھلانگ کر باہر آ گیا اور اس کے بعد نظر آنے والی پہلی ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے پوچھا۔

”کہاں جانا ہے؟“

”کہیں بھی چلو، یہاں سے نکلو۔“ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ اسے خوف تھا کہ اگر پولیس والے اس کے پیچھے آ گئے اور اسے ٹیکسی میں دیکھ لیا تو وہ پکڑا جائے گا۔ اس لیے وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ٹیکسی آگے بڑھی اور فوراً ہی دونوں پولیس والے دوڑتے ہوئے نمودار ہوئے، ہیری نے جوتے کے تسمے باندھنے کے ہانے سر نیچے کر لیا تھا۔ جب وہ سیدھا ہوا تو ٹیکسی خاصی آگے ہانچ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پولیس والے اس کے گھر تک کیسے پہنچے اور کس سلسلے میں پہنچے تھے، اس نے بے شمار داتا میں کی ٹھیس لیکن گزشتہ چند دن سے وہ بالکل خاموش تھا۔ پولیس اس کے گھر پہنچ گئی تھی اس کا مطلب تھا وہ گھر میں قید جاسکتا تھا، اس نے ٹیکسی والے کو روپرٹ کے علاقے کا کہا۔ اس کے پاس فی الحال یہی ایک پناہ گاہ تھی۔

مگر روپرٹ نے اسے دیکھ کر دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ اس نے زنجیر کی حد تک دروازہ کھولا اور غرا کو ہلا۔ ”پولیس والے تمہارے بارے میں پوچھتے ہوئے

میں رقم اچھی خاصی جگہ گھیرتی تھی اس لیے اس نے رقم یورو میں بدل کر لی تھی۔ یہ ڈھائی لاکھ یورو کی رقم تھی کیونکہ یورو میں ڈاکٹر کا نوٹ بھی ہوتا ہے اس لیے یہ رقم صرف ڈھائی گڈی میں آگئی تھی۔ اسے رقم کی ضرورت تھی اور اس کے لیے اس نے چند ہزار ڈالرز کی رقم الگ سے رکھی تھی۔ اس نے اس میں سے کچھ رقم لی اور ٹرے کو بند کر دیا۔ وہ تیار ہو کر باہر آیا، اس کا ارادہ اس ڈاکٹر کے پاس جانے کا تھا جس کا پتہ روپرٹ نے بتایا تھا لیکن جیسے ہی وہ عمارت سے باہر آیا، سامنے ایک کار رکی اور اس سے جان اور اس کا سامنی پولیس آفیسر ریٹنڈ بائل باہر آئے۔ جان نے ہیری سے پوچھا۔ ”تم ہیری کارل ہو؟“

”نہیں میرا نام جیمس کرو ہے۔“ اس نے گھبرائے بغیر کہا۔

”تم ہیری کارل کو جانتے ہو؟“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ اندر سے اسی کے فلور پر رہنے والی ایک عورت برآمد ہوئی، اس نے ہیری کو دیکھتے ہی کہا۔ ”ہیری تمہاری ماں کہاں گئی ہے...؟“

اس کا جملہ ٹھہل ہونے سے پہلے ہی ہیری اندر جا چکا تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے اسے لاک کر دیا اور پھر عمارت کے پچھلے حصے کی طرف بھاگا، جب تک جان اور ریٹنڈ دروازہ کھول کر اس کے پیچھے آئے، وہ حقیقی محن میں پہنچ کر دیوار پھلانگ کر باہر آ گیا اور اس کے بعد نظر آنے والی پہلی ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے پوچھا۔

”کہاں جانا ہے؟“

”کہیں بھی چلو، یہاں سے نکلو۔“ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ اسے خوف تھا کہ اگر پولیس والے اس کے پیچھے آ گئے اور اسے ٹیکسی میں دیکھ لیا تو وہ پکڑا جائے گا۔ اس لیے وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ٹیکسی آگے بڑھی اور فوراً ہی دونوں پولیس والے دوڑتے ہوئے نمودار ہوئے، ہیری نے جوتے کے تسمے باندھنے کے ہانے سر نیچے کر لیا تھا۔ جب وہ سیدھا ہوا تو ٹیکسی خاصی آگے ہانچ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پولیس والے اس کے گھر تک کیسے پہنچے اور کس سلسلے میں پہنچے تھے، اس نے بے شمار داتا میں کی ٹھیس لیکن گزشتہ چند دن سے وہ بالکل خاموش تھا۔ پولیس اس کے گھر پہنچ گئی تھی اس کا مطلب تھا وہ گھر میں قید جاسکتا تھا، اس نے ٹیکسی والے کو روپرٹ کے علاقے کا کہا۔ اس کے پاس فی الحال یہی ایک پناہ گاہ تھی۔

مگر روپرٹ نے اسے دیکھ کر دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ اس نے زنجیر کی حد تک دروازہ کھولا اور غرا کو ہلا۔ ”پولیس والے تمہارے بارے میں پوچھتے ہوئے

ستہری باتیں

☆ شیکسپیر کی ماں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ”تم انگلش میں بہت کمزور ہو، اگر تم اس بار بھی انگلش میں ٹھیک ہوئے تو میں تمہیں مزید تعلیم جاری رکھنے کی اجازت نہیں دوں گی۔“ شیکسپیر ایم اے انگلش پاس نہ کر سکا۔ مگر اب کوئی بھی طالب علم شیکسپیر کو پڑھے بغیر ایم اے انگلش نہیں کر سکتا۔

☆ تنقید کسی انسان کو انسان بنا بھی سکتی ہے اور کسی کو توڑ بھی سکتی ہے، چنانچہ کسی پر تنقید کرنے میں محتاط رہیے۔

☆ کسی کو بھٹایا کرنے سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو ہم سے پیار کرتے ہیں، مگر بہت کم ایسے ہیں جو ہمیں سمجھ پاتے ہیں۔

☆ دنیا آپ کو اس وقت تک... نہیں ہر اسکتی جب تک آپ خود سے نہ ہار جائیں۔ اگر سب کچھ کھو کر بھی کچھ کرنے کی ہمت باقی ہے تو سمجھیں آپ نے کچھ نہیں کھویا۔

☆ شیر آگے چھلانگ لگانے سے قبل ایک قدم پیچھے ہٹتا ہے، چنانچہ زندگی کی کوئی ناکامی آپ کو پیچھے کی طرف کھینچے تو پریشان نہ ہوں کیونکہ یہ آپ کی ایک عظیم فتح کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔

☆ جب کوئی دوست آپ کو اپنا راز دیتا ہے تو سمجھ لیتا کہ وہ اپنی عزت آپ کو امانت کے طور پر دیتا ہے، اس لیے امانت میں خیانت نہ کرنا۔

مرسلہ: اختر شاہ عارف، جہلم

یہاں تک آچکے ہیں اور اب میں تمہاری صورت اپنے دروازے پر نہیں دیکھنا چاہتا۔ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

”پلیز رو پرت... اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”میں کچھ نہیں جانتا، یہاں سے چلے جاؤ۔“ وہ غرایا۔ ”ورنہ میں خود پولیس کو کال کروں گا۔“

مجبوراً ہیری وہاں سے نکل آیا۔ رو پرت ڈرا ہوا تھا اور اسی وجہ سے اسے اندر آنے کی اجازت بھی نہیں دے رہا تھا۔ ہیری نے پچھلا راستہ اختیار کیا تھا۔ واپس جاتے ہوئے بھی اس نے پچھلا راستہ جتنا اسے یقین تھا کہ سامنے پولیس ہو گی اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ سامنے سے نہیں آیا ورنہ اس وقت گرفتار ہو کر پولیس کے ساتھ جا رہا ہوتا۔ کچھ نہ کچھ گزری ہوئی تھی جس کی وجہ سے پولیس اس کی راہ پر لگی تھی ورنہ اس کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا، وہ ہمیشہ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرتا تھا۔ گھر جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اسے گھر کی پروا نہیں تھی لیکن وہاں اس کی جمع پونجی موجود تھی۔ وہ سڑکوں پر پھرتا رہا اور پھر رات کو ایک پارک میں بیچ پر لیٹ کر سو گیا۔

خوش قسمتی سے ستمبر کا آخر تھا ورنہ سرد موسم میں رات باہر گزارنا ناممکن ہو جاتا۔ صبح اس نے ایک ٹھیلے سے برگر اور شیک لے کر ناشتا کیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ عمارت کے پاس پہنچ کر اس نے احتیاط سے کونے سے جھانکا اور ایک کار کو دروازے کے عین سامنے پارک ٹھنڈی سانس لی۔ پولیس والے نگرانی کر رہے تھے۔ وہ کسی صورت خود سے اندر جا کر رقم نہیں نکال سکتا تھا، اسے معلوم تھا کہ پولیس والے عمارت کے پچھلے حصے کی نگرانی بھی کر رہے ہوں گے۔ وہ عمارت میں نہیں جا سکتا تھا اور اندر جائے بغیر رقم حاصل نہیں کر سکتا تھا جبکہ رقم کے بغیر اس کے مسئلے حل نہیں ہو سکتے تھے۔

ہیری سوچ رہا تھا کہ رقم کس طرح حاصل کرے؟ اسے بنی کو بھی اس مشکل سے نجات دلانی تھی۔ بنی سے اسے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ اس کی مدد حاصل کرے۔ یہ خیال آتے ہی وہ پارک کی طرف روانہ ہو گیا لیکن وہاں پہنچ کر اسے مایوسی ہوئی۔ بار اس وقت بند تھا اور شام چار بجے کھلا بنی بھی اسی وقت کام پر آئی تھی۔ بار چار سے بارہ بجے تک کھلا رہتا تھا۔ وہ بار کے سامنے انتظار کرتا رہا اور اس دوران میں صرف بیچ کے لیے وہاں سے گیا تھا۔ چار بجے بار کھلا تھا۔ اور اس کے کچھ دیر بعد ایک چھوٹی سی پرانی کار سے بنی اترتی دکھائی دی۔ ہیری اس کی طرف لپکا۔ وہ اسے اچانک سامنے دیکھ کر چونک گئی۔ ”تم نے ڈاکٹر تلاش کر لیا ہے؟“

”ہاں کر لیا ہے۔“ ہیری عجلت میں بولا۔ ”لیکن اس وقت میں تمہارے پاس ایک کام سے آیا ہوں کیا تم کام سے ایک دن کی چھٹی لے سکتی ہو؟“

”ہاں چھٹی لے سکتی ہوں لیکن کام کیا ہے؟“ بنی نے تجسس سے پوچھا۔

”پلیز پہلے تم چھٹی کا کہہ دو۔“

وہ بار کی طرف جانے کے بجائے کار میں بیٹھ گئی اور سیل فون پر باس سے رابطہ کر کے اپنی طبیعت خرابی کا بتانے لگی۔ اس نے کہہ دیا کہ آج وہ کام پر نہیں آئے گی۔ باس کی بک بک سے بغیر اس نے سیل فون رکھ دیا۔ اس دوران میں ہیری اس کے برابر میں آ بیٹھا تھا۔ بنی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ہیری نے دیکھا، ڈیش بورڈ کے نچلے خانے میں ایک قیمتی اور اعلیٰ درجے کا کیمرا رکھا ہوا تھا۔ ”تم فوٹو گرافی کا شوق رکھتی ہو؟“

”جیس، میں کمرشل فوٹو گرافی کا کورس کر رہی ہوں صبح کالج جاتی ہوں اور شام کو یہ ملازمت کرتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”تمہارا کیا مسئلہ ہے؟“

”میرے گھر میں ایک جگہ میری رقم رکھی ہے لیکن میں خود جا کر اسے حاصل نہیں کر سکتا، میں چاہتا ہوں تم جا کر وہاں سے رقم نکال لاؤ۔“

”تم کیوں نہیں جاسکتے؟“

”وہ دراصل باہر پولیس موجود ہے۔ وہ داخلی دروازے کی نگرانی کر رہے ہیں۔“

بنی نے کار ایک طرف روک دی اور اس کی طرز مزے۔ ”تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ پولیس تمہاری تلاش میں ہے اور تم اس سے بچتے پھر رہے ہو؟“

”یہی بات ہے۔“ ہیری نے اقرار کیا تو بنی نے سر پشت پر مارا۔

”میرے خدا! وہ شخص جو میرے پیٹ میں موجود ہے کا باپ ہے ایک مجرم ہے اور پولیس کو مطلوب ہے۔“

”یہ ایک غلط فہمی ہے۔“

”مجھے بے وقوف مت بناؤ۔“ بنی نے سیل فون نکالا۔

”میں نے بلا وجہ آج کی چھٹی کی۔“

”پلیز میری بات سنو۔“ ہیری نے التجا کی۔ ”میں بیچ کر رہا ہوں میں اس وقت بالکل خالی ہوں، میں نے رات ایک پارک کی بیچ پر گزاری ہے اور صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔“

بنی کا ہاتھ رک گیا مگر اس نے سیل فون رکھا نہیں۔ ”تم نے کچھ تو کیا ہوگا، پولیس ایسے ہی تو کسی کے پیچھے نہیں پڑتی ہے۔“

ہیری کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ ”وہ دراصل...“

مہرا اپنے ہونے والے سوتیلے باپ سے جھگڑا ہو گیا تھا اور کچھ مار پیٹ بھی ہوئی تھی شاید اس نے پولیس میں رپورٹ کر دی ہو۔“

بنی کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے سیل فون رکھ دیا۔ ”مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے لیکن میں تمہاری مدد کروں گی کیونکہ تم فلاش ہو گے تو ڈاکٹر کی فیس کہاں سے ادا کرو گے؟“

ہیری خوش ہو گیا۔ ”یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔“

اس نے کار عمارت سے کچھ دور رکوائی تھی۔ اس نے بنی کو جانی دی اور اس خفیہ جگہ کا سمجھایا جہاں رقم تھی۔ بنی کو دراصل مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ مزے سے شہتی ہوئی گئی اور رقم نکال کر واپس آ گئی۔ وہ حیران تھی جب اس نے لفافے میں لپٹی گڈیاں ہیری کو دیں جو اس نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیں۔ ”میرے خدا! یہ تو تین لاکھ ڈالرز سے زیادہ کی رقم ہے۔“

”ہاں۔“ ہیری نے کہا اور اسے ڈاکٹر کے کلینک کا چتا سمجھایا۔

”تم کرتے کیا ہو؟“

ہیری نے اس سوال کا جواب گول کر کے کہا۔ ”میرا ارادہ ایک بار لینے کا ہے۔“

وہ چونکی۔ ”اگر بار لینے کا ارادہ ہے تو پارک کا بار خرید لو وہ بیچ کر جا رہا ہے۔“

”اچھا!“ ہیری نے دلچسپی سے کہا۔ ”کتنے مانگ رہا ہے؟“

”بانچ مانگ رہا ہے کیونکہ جگہ بھی اس کی ہے لیکن میرا خیال ہے اگر کوئی اسے چار لاکھ دے تو وہ بار بیچ دے گا۔“

”چار لاکھ!“ ہیری نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ ”خیر دیکھیں گے۔“

کلینک جاتے ہوئے ہیری کسی قدر زورس تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ کام کس طرح ہوگا۔ اس نے بنی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے تمہیں ایک دو دن کلینک میں رہنا ہوگا۔“

”پتا نہیں۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔“

کلینک کے سامنے کار روک کر وہ اندر جانے لگے ایک پریشان نظر آنے والا شخص سیڑھیاں اترتے ہوئے ہیری سے ٹکرایا اور پھر اس سے معذرت کرتے ہوئے چلا گیا۔ یہ میٹرٹی ہوم تھا اور اندر جا رہا ایسے جوڑے نظر آئے

”ہاں، میں چاہتا ہوں ہم شادی کر لیں۔“ ہیری نے اس کے ہاتھ سے فارم لے کر پھاڑ دیا۔ ”آؤ میں تمہیں اپنی مام سے ملواتا ہوں۔“

”میری بات تو سنو...“ بنی کہتی رہ گئی اور وہ اسے کھینچ کر باہر لے آیا۔ راستے میں اس نے اگا تھا کو ایس ایم ایس

جو اپنے آنے والے بچے کی خاطر یہاں آئے ہوئے تھے، وہ خوش اور پر امید تھے۔ ہیری بنی کو لے کر کاؤنٹر کی طرف گیا اور اس نے وہاں موجود لڑکی سے آہستہ سے کہا۔ ”ہم مسئلہ حل کرانے آئے ہیں۔“

لڑکی کے لیے یہ بات نئی نہیں تھی، اس نے ایک فارم اس کے سامنے رکھ دیا اور دھیمے لہجے میں بولی۔ ”اسے دوسروں کی طرح فل کرو، ایک گھنٹے بعد میں تمہاری ملاقات ڈاکٹر مل مین سے کرائی ہوں۔“

بنی فارم لے کر ایک طرف آ گئی۔ ہیری جو اس کے ساتھ ہی تھا اتفاق سے اس کا ہاتھ اپنی جیب کی جیکٹ پر گیا اور پھر وہیں رک گیا، رقم والا لفافہ غائب تھا اس نے بوکھلا کر جلدی سے تمام جیبیں دیکھیں۔ لیکن لفافہ کہیں نہیں تھا حالانکہ اس نے راستے میں خود جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھا تھا اس کے کہیں اور ہونے یا گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اچانک اسے اس آدمی کا خیال آیا جو کلینک میں داخل ہوتے ہوئے اس سے ٹکرایا تھا، اس کا انداز بھی نپا تلا تھا گھرانے کے دوران میں اس نے نہایت صفائی سے ہیری کی جیکٹ سے لفافہ نکال لیا۔ یہ اپنا جوتا اپنے ہی سر پڑنے والی بات ہو گئی تھی۔ اس نے برسوں خطرات مول لے کر جو رقم بچائی تھی وہ ایک ہی بار میں اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور وہ خالی ہاتھ رہ گیا تھا۔

وہ صدمے کی کیفیت میں بیٹھا تھا اور بنی فارم فل کر رہی تھی اچانک ہیری کو خیال آیا، اس کے پاس رقم تو تھی نہیں، وہ ڈاکٹر کی فیس کہاں سے ادا کرتا۔ اس نے بنی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو ہیری نے بوکھلا کر کہا۔ ”سنو، کیا تم اس بچے کو پیدا نہیں کر سکتیں؟“

بنی نے غصے سے اسے دیکھا۔ ”تمہارا دماغ درست ہے میں کیوں اسے پیدا کروں اور پھر پالوں میرا تو سارا کیریئر ہی ختم ہو جائے گا۔“

”میرا مطلب ہے ہم دونوں مل کر اسے پیدا کرتے اور پالتے ہیں۔“

بنی نے شک سے کہا۔ ”کیا تم مجھے پرو پوز کر رہے ہو؟“

”ہاں، میں چاہتا ہوں ہم شادی کر لیں۔“ ہیری نے اس کے ہاتھ سے فارم لے کر پھاڑ دیا۔ ”آؤ میں تمہیں اپنی مام سے ملواتا ہوں۔“

”میری بات تو سنو...“ بنی کہتی رہ گئی اور وہ اسے کھینچ کر باہر لے آیا۔ راستے میں اس نے اگا تھا کو ایس ایم ایس

سائنس سائنس

☆ غیر حقیقت پسندانہ سوچ اور ناقص منصوبہ بندی مایوسی اور فرسٹریشن کو جنم دیتی ہے۔

☆ ہماری کامیابی اور ناکامی میں مایوسی کا بہت دخل ہے۔

☆ اگر ہم کامیابیوں کے بارے میں سوچیں گے تو کامیابی حاصل ہوگی۔ اگر مایوسانہ طرز فکر اپنائیں گے تو ناکامی ملے گی۔

☆ جن لوگوں کے دلوں میں منفی خیالات، نفرت اور مایوسی پرورش پا رہی ہوتی ہے۔ وہ لوگ پرسکون شخصیت کے مالک نہیں ہوتے۔



مسکراہٹ

افسردہ یا سنجیدہ چہرے کے مقابلے میں ایک مسکراتا ہوا چہرہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف زیادہ آسانی سے مبذول کر لیتا ہے۔ ہر وقت مسکراتے رہیں لیکن زیادہ قہقہہ ہرگز مت لگائیں ورنہ لوگ آپ کو لاابالی اور خالی دماغ سمجھنے لگیں گے۔ ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ طاری نہ کریں بلکہ یہ مسکراہٹ آپ کے اندر سے آتی چاہیے۔



غصہ

☆ غصہ آنے پر غصے کا باعث بننے والی صورت حال، فرد یا ماحول سے دور چلے جائیں۔ غصہ کم ہو جائے گا۔

☆ غصہ آنے پر اس کے اظہار کو چند منٹ مؤخر کر دیں۔ غصہ دھیمّا ہو جائے گا۔

☆ جب آپ کو غصہ آئے تو متعلقہ بات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کریں۔ اگر آپ غصے میں ہیں تو ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی لیں اور گہرے گہرے سانس لیں۔ اس عمل سے آپ بہتر محسوس کریں گے۔ اس کے علاوہ کسی اچھی سی کتاب کا مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

آزمائش شرط ہے۔

مدرسہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا (اداکارہ)

ہیولی۔ "ہیری، کیا تم کوئی غیر قانونی کام کرتے ہو؟" ہیری خاموش رہا۔ اس کی خاموشی ہی ہینی کے سوال کا جواب تھی۔ ہینی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہیری بے ادب ہو گیا، اس نے کہا۔ "ہاں، میں غیر قانونی کام کرتا تھا اب میں یہ سب کام چھوڑ چکا ہوں ابھی میں بار لینے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"تم ماضی کو چھوڑ دو گے لیکن ماضی تو تمہیں نہیں ہڑے گا۔" وہ ہینی سے بولی۔ "تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ابھی کو بھی تمہاری تلاش ہے۔"

"ہینی مجھ پر اعتماد کرو، میں سارے مسئلے حل کر لوں گا، لیکن..."

ہینی نے کوئی جواب نہیں دیا، اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ ہیری جانتا تھا کہ وہ اسے اس وقت بھی دھوکا دے رہا تھا وہ بالکل کنکلا ہو گیا تھا اور اب اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا جہاں سے اسے مدد مل سکتی تھی، یہ روپرٹ تھا مگر اس کی مدد اسے ایسے ہی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ ایک بار پھر اس کی چنگل میں گرفتار ہو جاتا لیکن اس کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اسپتال سے نکلا تو خاصا مایوس تھا۔ اس نے اپنی قسمت کو کوسا اور روپرٹ کے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ دروازہ اس کے چھوٹے بھائی کارڈی نے کھولا جسے ہیری نے ہمیشہ ویڈیو گیمز میں مگن دیکھا تھا، اسے کسی اور معاملے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ "روپرٹ نہیں ہے۔ اس نے منع کیا ہے، تم یہاں نہیں آ سکتے۔"

ہیری اسے دھکا دے کر اندر داخل ہو گیا۔ "بکو اس مت کرو، مجھے ہر صورت میں روپرٹ سے ملنا ہے۔"

اسی لمحے باہر کا دروازہ کھلا اور روپرٹ اپنے ایک ادنی چارلی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ چارلی اس کی غنڈا اور اس کا سرغنہ تھا۔ جب ہیری کو پہلی بار یہاں لایا گیا تھا تو اسی نے اس پر تشدد کیا تھا۔ روپرٹ نے پستول نکالا ہوا تھا۔ "ہیری... کتیا کے بچے... میں نے تم سے کہا تھا مجھ سے دور رہنا... پولیس تمہارے پیچھے ہے۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن میں مجبوراً یہاں آیا ہوں۔ کسی نے میری تمام رقم میری جیب سے نکال لی ہے۔"

"جیب سے نکال لی ہے۔" روپرٹ نے اس کی بات اہرائی پھر اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ "کسی نے تمہاری جیب نکال لی؟"

"ہاں۔" ہیری مشتعل ہو کر بولا۔ "میں اس وقت ہاتھ دھو رہا تھا کہ اس نے میرے ساتھ اپنا ہو گیا۔ اب میرے

ہاتھ پر ہاتھ، اچانک ہینی نے ابکائی لی اور پھر اٹھ کر دواش روم کی طرف بھاگی۔ جب ہیری اور اگا تھا اس کے پیچھے آئے وہ کوڑ میں سارا کھایا پیا نکال چکی تھی۔ اگا تھانے بے تاب سے پوچھا۔ "ہینی کیا ہوا، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" "وہ مام..... یہ امید سے ہے۔" ہیری نے بتایا۔ "تین مہینے سے۔" ہینی ہانپتے ہوئے بولی اور بے ہوش ہو گئی۔

ہینی نے سن کر اگا تھا کو بھی چکر آ گئے تھے لیکن وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ فرینکی نے ایسبولنس کے لیے کال کر دی تھی آدھے گھنٹے بعد ہینی کو اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا جہاں اس کے ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ ہیری یوں بے قرار تھا جیسے اس کی ہینی سے شادی ہو گئی ہو اور وہ پہلی بار ماں بننے والی ہو۔ اگا تھا اور فرینکی اس اطلاع پر دم بہ خود رہ گئے تھے کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی ملاقات حال ہی میں ہوئی ہے۔ اگا تھا نے ہیری سے شکوہ بھی کیا کہ اس نے اسے بتایا نہیں۔ ہیری نے شرمندگی سے کہا۔ "مام ہینی سے تعلق تو پہلے سے تھا لیکن شادی تک لو بتا ہی آئی ہے۔"

جب ہینی کو کمرے میں شفٹ کیا گیا تو ہیری کو اس سے ملنے کی اجازت ملی تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق وہ خاصی کمزور تھی اور ابھی اس کے مزید کچھ ٹیسٹ ہونے تھے جس کے لیے اسے اسپتال میں دو دن اور رہنا تھا۔ ہیری اسے دیکھ کر آیا۔ "اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" "ٹھیک ہوں۔" وہ بھی مسکرائی۔

ہیری نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ پھر ہم شادی کر لیں گے۔"

ہینی کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ "بہت جلد...؟" "نہیں... ہیری نے سر کھجایا۔ "فورا ممکن نہیں ہے ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ جو تم تم گھر سے نکال کر لائی تھیں وہ کسی نے میری جیکٹ سے نکال لی ہے۔"

ہینی حیران رہ گئی تھی۔ اصل حیرت اسے ہیری کی ہمت پر تھی جو اتنا بڑا نقصان برداشت کر کے بھی تارل تھا اور اس کے لیے فکر مند تھا۔ ہیری نے اسے تسلی دی۔ "تم فکر مت کرو، میں پھر کوشش کروں گا اور اتنی رقم جمع کر لوں گا۔"

"لیکن کیسے...؟ اور تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تم کہا کام کرتے ہو؟"

"یہ میں تمہیں یہاں سے نکلنے کے بعد بتاؤں گا۔" ہیری نے کہا۔

ہینی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ٹھہرے ہوئے انداز

کر کے اس سے فرینکی کے گھر کا پتا پوچھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہینی کو پتا چلے کہ وہ اپنی ماں کی رہائش سے لاعلم ہے۔ ایک منٹ بعد اگا تھانے پتا ایس ایم ایس کر دیا۔ ہیری نے ہینی کو پتا بتایا۔ فرینکی ایک اچھے علاقے میں اور ایک خوب صورت عمارت میں واقع خاصے بڑے فلیٹ میں رہتا تھا۔ دروازہ دو عدد ایک جیسے نقوش کے حامل بہت شوخ بچوں نے کھولا۔ فرینکی کا پوچھنے پر انہوں نے کہا۔

"پاپائی ماما کے ساتھ شاپنگ پر گئے ہیں۔"

"میں ہیری ہوں، تمہاری نئی ماما کا پرانا بیٹا۔"

بچے پر جوش ہو گئے۔ "ماما نے تمہارے بارے میں بتایا تھا، اندر آؤ۔"

ہینی بھی اندر آئی۔ "یہ ہینی ہے، میری گرل فرینڈ ہے۔ ہم جلد شادی کرنے والے ہیں۔"

فرینکی اور اگا تھا کچھ دیر بعد آئے اور انہوں نے ہیری اور ہینی کو گرم جوش سے گلے لگایا تھا۔ اگا تھا یہ سنتے ہی ہینی پر داری قربان جانے لگی تھی کہ وہ ہیری کی ہونے والی بیوی تھی۔ "میں تو کب سے ترس رہی تھی کہ یہ لڑکا شادی کرے۔"

"یہ خوشی کا موقع ہے۔" فرینکی نے کہا۔ "میں کچھ اور سامان لے کر آتا ہوں۔"

"جب تک ہم ڈنر تیار کرتے ہیں۔" اگا تھانے ہینی کو کچن کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد ہیری ساری پریشانیاں بھول کر دونوں لڑکوں کو چٹکوں کا کھیل سکھا رہا تھا۔ وہ اب تک ویڈیو گیم اور اسی طرح کے کھیل کھیلتے آئے تھے۔ اس قسم کا کھیل انہوں نے پہلی بار کھیلا تھا۔ وہ بہت خوش ہو رہے تھے۔ فرینکی اس بار پیز اور کیک لے کر آیا تھا۔ اس دوران میں ہینی اور اگا تھا آپس میں بات کرتے ہوئے ڈنر کی میز تیار کر رہی تھیں اگا تھا بہت خوش تھی کیونکہ اس کا بیٹا پہلی بار اس کے گھر آیا تھا اور ہونے والی بہو کو بھی ساتھ لایا تھا۔ کھانا لگ گیا اور وہ سب میز پر آ گئے، دعا کے بعد کھانے کا آغاز ہوا اور ہیری کو پہلی بار پتا چلا کہ فرینکی کی ایک چھوٹی سی جیولری شاپ تھی۔ وہ ہیروں سے بنے ہوئے چھوٹے زیورات فروخت کرتا تھا۔ ہیری کو افسوس ہوا کہ اس نے اس شادی کی مخالفت کیوں کی تھی۔ فرینکی اچھا اور کھانا پیتا آدی تھا اس کے دونوں بچے بھی دوستانہ فطرت رکھتے تھے اور اگا تھا کے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا تھا۔

ہینی کھانے کے دوران کچھ پریشان تھی۔ جس وقت ہیری کھانا ختم کر کے وائٹ سے مشتعل کرتے ہوئے فرینکی سے



فرینکی نے سر ہلایا۔ وہ کسی قدر پریشان لگ رہا تھا شاید پہلے وہ بھی اتنی ہیبتی ہیرے کی انگوٹھیاں لے کر شاپ سے باہر نہیں آیا تھا۔ اگر کوئی نقصان ہو جاتا تو انشورنس کمپنی اس کی تلافی کی پابند نہ ہوتی کیونکہ یہ انشورنس صرف دکان کی مدد تک تھی۔ ٹیکسی میں وہ بریف کیس کو اپنی اکلوتی اولاد کی طرح سینے سے لگائے بیٹھا رہا۔ روپرٹ اسے ایک پوش رہائشی علاقے میں لایا جہاں گھڑی قسم کے اپارٹمنٹس تھے۔ وہ ٹیکسی سے اترے اور ایک عمارت کی طرف بڑھے ہی تھے کہ فٹ پاتھ پر ایک تومند جوان آدمی تیزی سے چھٹا اس نے فرینکی سے بریف کیس چھیننے کی کوشش کی مگر اس نے اس کا ہینڈل بہت مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اچکا پہلی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا مگر اس نے کوشش ترک نہیں کی اور فرینکی سے بریف کیس چھڑانے میں لگا رہا فرینکی چلا رہا تھا اور مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ روپرٹ ان دونوں کے آس پاس تھا لیکن اس نے فرینکی کی مدد کرنے یا اسے بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”تم میری مدد کیوں نہیں کر رہے؟“ فرینکی نے چلا کر کہا۔

”وہ... میں... لڑ نہیں سکتا۔“ روپرٹ ہٹکایا۔ بالآخر اچکا کامیاب رہا، اس نے فرینکی کو زوردار دھکا دیا اور بریف کیس چھین کر فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ فرینکی اور روپرٹ کچھ دور اس کے پیچھے دوڑے لیکن وہ ایک بینک پر بیٹھ کر بھاگ نکلا۔ فرینکی روہانسا ہو رہا تھا اس نے لڑتے ہاتھوں سے سوبائیل نکال کر پولیس کو کال کی اور چیخ چیخ کر بتانے لگا کہ اس کے ساتھ کسی واردات ہو گئی ہے اور وہ لٹ گیا ہے۔ فون بند کر کے وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ روپرٹ اس

”تب اس مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے؟“ فرینکی نے کہا۔ ”ایسا کرو تم اپنی منگیتر کو یہاں لے آؤ وہ خود انگوٹھی پسند لے۔“

”وہ یہاں نہیں آئے گی۔“ روپرٹ نے سوچے۔ ”ایک ترکیب ہو سکتی ہے، تم یہ سیٹ خود چل کر لے دیکھا دو۔“

”سوری دوست! میں اس طرح بزنس نہیں کرتا۔“ فرینکی نے کہا اور سیٹ لے جا کر واپس تجوری میں رکھ دیے۔ ”پلیز میری بات سنو۔“ روپرٹ نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ”دیکھو میرے پاس یہ چار لاکھ ڈالرز ہیں۔ اس لے چھوٹا بریف کیس فرینکی کے سامنے رکھ دیا۔ ”میں ایک ڈس ڈیل کے لیے نکلا تھا لیکن یہ کام پہلے کرتا ہے۔“

”میں اس طرح کام نہیں کرتا ہوں۔“ فرینکی نے ہر انکار کیا۔ ”یہ بہت رکیک کام ہے۔“

”پلیز۔“ اب کے روپرٹ نے بریف کیس کھول کر اس کے سامنے کر دیا جس میں تہ در تہ ڈالرز کی گڈیاں بھی تھیں۔ ”میں نے ہیری سے یہی فور چاہا تھا۔ اگر تم انکار کر دو گے تو مجھے کہیں اور جانا پڑے گا۔ یہ چار لاکھ کیش ہیں۔“

فرینکی کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے بریف کیس سے گڈیاں نکال کر چیک کیں یہ سارے اصلی اور پرانے نوٹ تھے۔ بالآخر اس نے سر ہلایا۔ ”اوکے... میں نے آج تک اس طرح کا کام کیا نہیں ہے لیکن تم ہیری کے دوست ہو اس لیے...“ وہ بریف کیس لے کر اندر گیا، اسے تجوری میں رکھا پھر اندر سے انگوٹھیوں کا کیس نکال کر لے آیا۔ اس نے روپرٹ کو کیس ایک بار پھر کھول کر دکھایا تاکہ اس کی تسلی ہو جائے۔ ”یہی اگلیاں دکھانی ہیں تمہاری ہونے والی منگیتر کو؟“

روپرٹ نے سر ہلایا، فرینکی اندر گیا اس نے ایک ریف کیس اٹھایا اور اس میں انگوٹھیوں والا کیس رکھا۔ روپرٹ دیکھ رہا تھا۔ فرینکی بریف کیس لے کر آیا اور ایک لمبے کے لیے روپرٹ کے سامنے رکھا، اس نے ہن دبا کر ”واڑے کا لاک کھولا۔“ میں شاپ سے زیادہ دیر کے لیے لہر ماضی نہیں ہو سکتا۔“

”میرا خیال ہے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔“

روپرٹ نے باہر نکل کر ایک ٹیکسی روکی۔ ”تمہارے اس گاڑی نہیں ہے؟“

روپرٹ نے کہا۔ ”میری کار کا معمولی سا حادثہ ہو گیا اور درکشاپ گئی ہے۔“

دیکھا۔ ”میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں مسٹر...؟“

”روپرٹ روز برگ۔“ روپرٹ نروس انداز میں بولا۔ ”وہ میں... مسٹر فرینکی، دراصل مجھے ہیری نے...“

”اوہ اچھا، تم ہیری کے دوست ہو۔ اس نے تمہارے ذکر کیا تھا اور تمہارا فیور کرنے کو بھی کہا تھا۔“ فرینکی اس بات کاٹ کر بولا۔ اس کا لہجہ اور انداز بدل گیا تھا۔ ”ہیری اچھا لڑکا ہے، اس کے دوست میرے بھی دوست ہیں۔“

”مجھے اپنی منگیتر کے لیے ایک ڈائمنڈ رنگ چاہیے۔“ روپرٹ نے اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کا ڈیڑھ بہت اعلیٰ ہے اور اسے کوئی چیز مشکل سے ہی پسند آتی ہے۔“

”تمہاری ریش کیا ہے؟“

”ایک لاکھ ڈالرز یا اس سے کچھ اوپر۔“ فرینکی کی آنکھیں کچھ دیر کے لیے پھیلی تھیں شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ روپرٹ اتنی موٹی انگوٹھی کا فرمائش کر دے گا۔ اس نے کاؤنٹر کے نیچے لگا ایک ہن دبا کر شاپ میں داخل ہونے والے دروازے کو لاک کر دیا۔ اب نہ کوئی اندر آ سکتا تھا اور نہ کوئی باہر جا سکتا تھا۔ پھر اس نے پیچھے چھوٹے سے آفس میں موجود تجوری کھولی اور اس میں سے انگوٹھیوں کا ایک سیٹ نکال لایا۔ سیٹ میں کل تین انگوٹھیاں تھیں۔ اس نے سیٹ روپرٹ کے سامنے رکھا اور بولا۔ ”اس میں سے ہر انگوٹھی ایک لاکھ ڈالرز سے زیادہ مالیت کی ہے۔“

”بہت خوب صورت ہیں۔“ روپرٹ انگوٹھیاں اٹھا کر دیکھنے لگا مگر ساتھ ہی اس کے انداز میں ہچکچاہٹ پائی جاتی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے اپنی پسند پر اعتبار نہ ہو یا اسے خوف ہو کہ وہ جو انگوٹھی پسند کر کے لے جائے گا سکتا ہے وہ اس کی منگیتر کو پسند نہ آئے۔ فرینکی غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”کیا بات ہے روپرٹ، تمہیں کوئی انگوٹھی پسند نہیں آئی؟ میرے پاس اس سے زیادہ قیمت والی انگوٹھیاں نہیں ہیں۔ ویسے اس قیمت میں ایسی انگوٹھیاں تمہیں کہیں نہیں ملیں گی۔“

”یہ بات نہیں ہے، دراصل مجھے خوف ہے کہ کہیں میری منگیتر کو میری چوٹس اچھی نہ لگے۔“

”تو تم اسے بدلوا سکتے ہو۔ میں ایک ہفتے کی مٹی ہک گاڑی دیے بھی دیتا ہوں۔“

روپرٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں مصروف آ ہوں، بار بار نہیں آ سکتا۔“

پاس کچھ نہیں ہے اور مجھے رقم کی ضرورت ہے۔“

”تمہارے لیے میرے پاس کوئی رقم نہیں ہے۔“

”اچھا تو مجھے کام ہی دو۔“ ہیری چلایا۔

”میرے پاس تمہارے لیے ایک ہی کام ہے۔“ روپرٹ نے سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں۔ ان لوگوں نے میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ تمہیں ان کے حوالے کر دوں گا تو میری جان بھی چھوٹ جائے گی۔“

ہیری فکر مند ہو گیا۔ ”روپرٹ تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”میں ایسا ہی کرنے جا رہا ہوں۔“ وہ بولا اور نمبر ملانے لگا۔

”ایک منٹ... ایک منٹ...“ ہیری بولا۔ ”سنو میرے ساتھ ایک ڈیل کر لو... تمہیں کوئی قیمتی چیز چاہیے نا... میں تمہیں قیمتی چیز دلوں سکتا ہوں۔“

روپرٹ نے سوچا اور سیل فون واپس جیب میں ڈال لیا۔ ”کیا کر سکتے ہو تم؟“

ہیری اسے بتانے لگا کہ وہ کیا کر سکتا تھا۔ آدمی گھنٹے بعد وہ روپرٹ کے فلیٹ سے باہر تھا۔ فٹ پاتھ پر تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس نے فرینکی کا نمبر ملایا۔ ”فرینکی میں ہیری بات کر رہا ہوں... مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔“

”ٹھیک ہے، میری شاپ پر آ جاؤ۔“ فرینکی نے جواب دیا۔

☆☆☆

روپرٹ اس وقت خامے معززانہ حلیے میں تھا۔ اس نے شارک اسکن تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ہمہ وقت بکھرے رہنے والے لمبے بال اس وقت سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ مگر اس کے چہرے پر برستی خباثت برقرار تھی۔ اس کے ہاتھ میں زمرہ کی قیمتی انگوٹھی اور ہیروں میں مگر مجھ کی کھال کے بنے جوتے تھے اور اسی سے بچ کر ہوا چھوٹا سا بریف کیس بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجموعی طور پر وہ بہت دولت مند نظر آ رہا تھا۔ دیکھنے والے یہ سمجھ سکتے تھے کہ اس نے دولت غلط طریقے سے کمائی ہے۔ وہ نیویارک کے ایک پوش علاقے میں موجود تھا۔ اس نے فٹ پاتھ چھوڑ کر سڑک عبور کی اور دوسری طرف ایک جیولری شاپ میں قدم رکھا۔ یہ فرینکی جیولریز شاپ تھی۔

اندر فرینکی کاؤنٹر کے پیچھے موجود تھا۔ کاؤنٹر کا اوپری حصہ شیشے کا بنا تھا جبکہ چھلچھلے فیس فارمیکا سے بنایا گیا تھا۔ فرینکی نے سوالیہ نظروں سے روپرٹ کی طرف

کے آس پاس ٹہل رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ ”تم فکر مت کرو... وہ پکڑا جائے گا... میرے خدا! یہ سب میرا قصور ہے... مجھے معاف کر دینا... میری وجہ سے تمہیں اتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔“

”نقصان!“ فرینکی نے سر اٹھا کر کہا۔ ”میں تباہ ہو گیا ہوں، اس میں سے صرف دو انگلیاں میری میٹھی بانی دوسروں کی تھیں۔ میں کہاں سے ایک ملین ڈالرز کا نقصان بھروں گا۔“ وہ سسک سسک کر رونے لگا اور روپرٹ اس کے پاس بیٹھ کر اسے تسلیاں دینے لگا۔ اس کے چہرے سے قطعی نہیں لگ رہا تھا کہ اسے سچ سچ کوئی افسوس ہے۔ دس منٹ بعد پولیس کار وہاں آگئی تھی اور فرینکی اپنے ساتھ ہونے والی واردات کا بتانے لگا۔ روپرٹ اس کے ساتھ تھا۔ اپنی باری پر اس نے اپنا بیان لکھوایا۔ اچھے کے بارے میں دونوں کا بیان یہی تھا کہ وہ ٹھیک سے اس کی صورت نہیں دیکھ سکے تھے کیونکہ اس نے سر پر پی کیپ اور آنکھوں پر بڑے سائز کا سن گلاس لگا رکھا تھا۔ پولیس والے روپرٹ لکھ کر فرینکی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ روپرٹ کو جانے کی اجازت مل گئی اور اس نے غلت میں ایک ٹیکسی پکڑتے ہوئے اپنے فلیٹ کا رخ کیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس کا آدمی چارلی پہلے ہی بریف کیس لے کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ روپرٹ نے بریف کیس دیکھا اور پاگلوں کی طرح ہنس پڑا۔ اس نے چارلی سے کہا۔ ”تمہیں پتا ہے، اس میں ایک اعشاریہ دو ملین ڈالرز مالیت کی ہیرے کی انگلیاں ہیں۔“

”ہاں لیکن ہیری کہاں ہے؟“ چارلی نے پوچھا۔

”اس پر لعنت بھیجو۔“ روپرٹ بریف کیس کوٹنے میں رکھی میز تک لے گیا اور پھر اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ لاک تھا۔ اس کے نمبر صرف فرینکی کو پتا تھے لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ روپرٹ نے ایک بڑا چاقو اٹھایا اور بریف کیس کھولنے کی کوشش شروع کر دی مگر یہ خاصا مضبوط قسم کا بریف کیس تھا اتنی آسانی سے کھلنے پر آمادہ نہیں تھا۔ روپرٹ مشتعل ہو گیا اور اس نے وحشیانہ انداز میں بے درپے وار کر کے بریف کیس کو جاک کر دیا۔ اس کے لاک جواب دے گئے اور وہ کھل گیا مگر جیسے ہی بریف کیس کھلا روپرٹ اچھل پڑا، اس میں انگلیوں کا کیس نہیں تھا اس کی جگہ صرف ایک کاغذ رکھا تھا جس پر لکھا تھا۔ ”جیسے کو تیسرا۔“

اس نے کاغذ اٹھایا اور پھر چونک گیا کاغذ کے نیچے بریف کیس پر ایک پولیس سچ چکا ہوا تھا۔ ابھی روپرٹ کے منہ سے گالیوں کا طوفان برآمد ہوا تھا کہ ایک دھماکے سے

فلیٹ کا داخلی دروازہ کھلا اور مسلح پولیس والے اندر گھس آئے وہ چلا کر سب کو ہاتھ اوپر کرنے کو کہہ رہے تھے۔ ان سب سے آگے جان تھا، اس نے آگے آ کر بریف کیس دیا اور اس میں چکا اپنا سچ نکال لیا۔ پھر اس نے روپرٹ دیکھا تو وہ ہلکا کر بولا۔ ”یہ میرا کام نہیں ہے... سارا ہیرا حرای پن ہے۔“

”بکو اس مت کرو۔“ جان نے اسے گھونسا رسید ”ہیری اچھا لڑکا ہے اور اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ جہاں شاپ چلاتا ہے۔ بد معاش تم ہو۔“

روپرٹ نے جان کو بتانے کی کوشش کی کہ ہیری ا فرینکی نے مل کر اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلا تھا لیکن اس ایک نہیں سنی اور کچھ دیر بعد وہ ہتھکڑیوں میں جکڑے ہو۔ پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف جا رہے تھے۔ جان نے روپرٹ بتایا کہ متعدد چوریوں اور فراڈ کی وارداتوں کے الزام میں ساری عمر کے لیے جیل جائے گا اور اسے وہاں سے زہ واپس آنا نصیب نہیں ہوگا۔ روپرٹ دل ہی دل میں ہیری گالیاں دے رہا تھا۔ اس نے جو ہیری کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے نہایت چالاک سے اسے لوٹا دیا تھا صرف یہی نہیں۔ اس نے زیادہ وصول کر لیا تھا بلکہ اس نے ہمیشہ کے روپرٹ اور اس کے ساتھیوں کو جیل پہنچانے کا انتظام بھی دیا تھا۔ اب روپرٹ کو اندازہ ہو رہا تھا کہ ہیری باقاہ منصوبے کے تحت اس کے پاس آیا تھا۔

روپرٹ نے ہی اپنے آدمی ہیری کے پیچھے لگا رہے تھے اور جب وہ بیٹی کو لے کر کلیٹک پہنچا تو انہوں نے اس کو جیب صاف کر دی تھی۔ اس وقت روپرٹ کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ ہیری کی تمام جمع پونجی ہتھیالے گا اس کا اندازہ تھا کہ کلیٹک بڑی رقم لے کر آئے گا۔ اب ہیری بالکل کنگلا اورا کے لیے بے کار ہو چکا تھا۔ روپرٹ نے اسے پولیس کے ہمر کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ ایک مجرم ہاتھ میں آجائام پولیس بھی ٹھنڈی ہو کر بیٹھ جاتی اور روپرٹ آرام سے اپنا کام جاری رکھ سکتا تھا۔ اس کے لیے کام کرنے والوں کی کمی تھی۔ ہیری اس کے پاس آیا، اپنے سوتیلے باپ کی شا میں موجود قیمتی ہیروں کا لالچ دیا اور وہ اس لالچ میں آ

اس نے ایک ملین ڈالرز کے ہیرے حاصل کرنے کے اپنے چار لاکھ ڈالرز بھی داؤ پر لگا دیے اور وہ یہ ہار گیا تھا تو ہاتھ سے گئی تھی، اب اس کی آزادی بھی خطرے میں تھی روپرٹ سمجھ گیا تھا کہ فرینکی نے اسے کس طرح قوف بنایا تھا۔ جب وہ اس کا بریف کیس رکھنے گیا اور انگلو

میں نکال کر لایا۔ پھر اس نے روپرٹ کے سامنے ہی یہ بریف کیس میں رکھا۔ اصل ہاتھ کی مٹائی اس نے وہاں لالچ کیا جب وہ ایک لمحے کے لیے کاؤنٹر پر اس کے سامنے رکھا تھا ہاں کا بریف کیس والا ہاتھ نیچے اور روپرٹ کی نظروں سے ہل گیا۔ اس جگہ پہلے ہی دوسرا مگر بالکل ویسا ہی بریف کیس نکلی ہی تیار رکھا ہوا تھا۔ عین ممکن ہے کاؤنٹر کے نیچے خود ہیری لگا ہوا اور اسی نے فرینکی کو دوسرا بریف کیس تمہارا دیا ہو۔ فرینکی اس کے ساتھ شاپ سے نکل آیا۔ اس کے پاس بریف کیس میں کچھ نہیں تھا سوائے ایک کاغذ اور ایک پولیس سچ کے اور وہی روپرٹ کے گلے پڑ گیا تھا۔

☆☆☆

فرینکی اور ہیری ایک کافی شاپ میں بیٹھے تھے۔ فرینکی نے کافی کی چسکی لی اور بولا۔ ”سب پلان کے مطابق ہوا۔ وہ اتحق تمہارے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔“

”میری قسمت نے بھی ساتھ دیا ورنہ وہ نہایت ہلاک آدمی ہے اور ایسے ہی اتنا بڑا گینگ نہیں چلا رہا ہے۔“

”وہ لالچ میں مارا گیا۔“ فرینکی نے سر ہلایا۔ ”میں نے چار لاکھ ڈالرز ایک بینک اکاؤنٹ میں جمع کر دیے تھے۔ یہ اس کی چیک بک اور سلپ ہے۔“ اس نے ایک لفافہ ہیری کی طرف بڑھا دیا۔ ”تم بار خریدنے کا سوچ رہے ہو، ہرے ساتھ کیوں نہیں شامل ہو جاتے۔ میں تمہیں تربیت دوں گا اس میں نفع بھی زیادہ ہے۔“

ہیری کو یہ پیشکش اچھی لگی تھی۔ اس نے کہا۔ ”تھینک یو، میں سوچ کر جواب دوں گا۔“

فرینکی مسکرایا۔ ”ٹھیک ہے اور وہ پیاری سی لڑکی کیسی ہے؟“

”اس دن کے بعد سے میں اس سے نہیں ملا ہوں۔“ ہیری نے بتایا۔ ”آج ملنے جاؤں گا، پتا نہیں وہ مجھے معاف کرتی ہے یا نہیں۔“

”عورت اپنے محبوب سے خفا ہو سکتی ہے لیکن اپنے ہونے والے بچے کے باپ سے خفا نہیں ہو سکتی۔“ فرینکی اٹھتے ہوئے بولا۔ ”ممکن ہے وہ تم سے خفا ظاہر کرے لیکن الا ٹرمان جائے گی۔ ہیری، میری ایک بات مانو۔ جیسے وہ مانے فوراً اس سے شادی کر لیتا۔ اتنی اچھی لڑکی قسمت سے ملتی ہے۔“

ہیری نے سر ہلایا۔ ”میں ایسا ہی کر دوں گا۔“

روپرٹ کے چنگل سے ہی نہیں نکالا تھا بلکہ اس نے پولیس افسر جان کو بھی راضی کیا تھا کہ وہ ہیری کو ایک موقع دے کہ وہ شریفانہ زندگی گزار سکے، اس کے بدلے وہ اسے روپرٹ جیسا پرانا مجرم مع ثبوت کے حوالے کرتے۔ جان ڈیکن اس شرط پر راضی ہو گیا۔ اس نے روپرٹ کو ثبوتوں کے ساتھ گرفتار کر لیا تھا اس کے فلیٹ سے متعدد سیل فون، پرس، کریڈٹ کارڈز اور چوری کا دوسرا سامان برآمد ہوا تھا۔ یہ سب چیزیں، خاص طور سے سیل فون اور کریڈٹ کارڈ اسے لمبے عرصے کے لیے جیل بھیجنے کو کافی تھے۔

ہیری بار بار پہنچا تو اس کا خیال تھا کہ بیٹی گرم جوش سے اس کا استقبال کرے گی۔ وہ آج ہی اسپتال سے فارغ ہوئی تھی۔ وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

”بیٹی...!“

بیٹی نے اسے دیکھا۔ ”تم پھر آگئے... ہے پارکر...“ اس نے پکارا۔ جب وہی تو منہ شخص ہیری کی طرف بڑھا اور تب اسے معلوم ہوا کہ وہ خود ہی پارکا مالک ہے۔ اس نے گدی سے ہیری کو پکڑا اور عقبی دروازے سے لے جا کر اسے باہر دھکیل دیا۔ ہیری اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ بیٹی سے ملنے آیا ہے جو اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے اور وہ دونوں عنقریب شادی کر لیں گے مگر پارکر نے اس کی ایک نہیں سنی۔ جب اس نے ہیری کو باہر دھکا دیا تو وہ چلا اٹھا۔ ”لعنت ہو تم پر... اب میں تمہارا بار ہرگز نہیں خریدوں گا۔“

پارکر نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے نہایت حقارت سے اسے دیکھا اور دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔ ہیری نے کھڑے ہو کر ایک خالی پٹنی کولات ماری۔ ”غصہ اتار رہے ہو؟“ بیٹی کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر دیکھا، وہ دروازے پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”مجھے بھی ایسے ہی غصہ آیا تھا اور میں نے پارکر کی مدد سے اتار دیا۔“

ہیری اس کی طرف بڑھا۔ ”یعنی اب تمہیں مجھ پر غصہ نہیں ہے؟“

”ہوتا تو میں یہاں کیوں آتی۔“ اس نے کہتے ہوئے سر ہیری کے شانے پر رکھ دیا۔ ”آج میں نے جلدی چھٹی لی ہے۔ ہم کہیں چلیں؟“

ہیری بھی مسکرانے لگا۔ ”کیوں نہیں؟“ وہ دونوں شانہ بٹانہ تاریک گلی کے سرے کی طرف جانے لگے جہاں روشنی تھی۔





✽ کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی
کبھی آنسو کبھی سجدے کبھی ہاتھوں کا اٹھ جانا
محبتیں ناکام ہو جائیں تو رب ہی یاد آتا ہے
✽ اختر شاہ عارف..... جہلم
کفن بدوش ہم اپنے گھروں میں رہتے ہیں
بقید زیست ہیں اور مقبروں میں رہتے ہیں
جنہیں قریب سے سورج نظر نہیں آتا
وہ کم نگاہ بھی دیدہ وروں میں رہتے ہیں
✽ محمد لطیف ساحل..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
وفا کے نام پر تم، کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی



✽ کنول زاہد..... گلبرگ لاہور
کتنی بے فیض رہ جاتی ہے دل کی بستی
کتنے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے
✽ سدرہ اسلم، ریحانہ اسلم..... سندیلپانوالی
خوشبوؤں کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک
اس شہر میں سب کچھ ہے بس تیری کمی ہے
✽ ابرار وارثی..... درآباد، سندیلپانوالی
ان کی زلفوں کی راہ گیر تو دیکھو
دل قید ہے جس میں وہ زنجیر تو دیکھو
پھر شوق سے کہنا دیوانہ مجھے لوگو
پہلے میرے محبوب کی تصویر تو دیکھو
✽ راجا افتخار علی افقی..... چوآسدن شاہ
ہم سے کھلتی رہی دنیا تاش کے چوں کی طرح دوست
جس نے جیتا اس نے بھی پھینکا جس نے ہارا اس نے بھی پھینکا
✽ ماہا ایمان..... حافظ آباد
دل سے آغاز کیا، جاں کے زیاں تک کھیلے
بازی عشق کو ہم دیکھ، کہاں تک کھیلے
ہار اور جیت کے معیار بدلنے ہوں گے
ایک سے تھیل کو اب کوئی کہاں تک کھیلے

✽ ایم یوسف خان..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
آپ نے انداز محبت دیکھا ہے انداز وفا نہیں
ہجرہ کھول بھی دو تو کچھ سمجھی جایا نہیں کرتے
✽ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
تھک جائے گا تو مانگ کے ہم کو دعاؤں میں
تیرے خیال و خواب کا محور رہیں گے ہم
✽ سید محی الدین اشفاق..... فتح پور (لیہ)
ان کے دل پہ اس طرح تحریر ہوتا تھا مجھے
آئینہ وہ خود نہیں تصویر ہونا تھا مجھے
گردشوں کے بعد آخر آپ ہم مل ہی گئے
یہ بھی طے تھا آپ کی تقدیر ہونا تھا مجھے
✽ ذیشان حیدر بلوچ..... سکالا تحصیل ساہیوال
ہواؤں نے توڑ دی ہیں درختوں کی ٹہنیاں
کیسے کٹے گی رات پرندے اداس ہیں

✽ ڈاکٹر وسیم خالق کہیاں..... گجرات
ات بات پہ دیتے ہو پرندوں کی مثال
صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہمارا شہر چھوڑ دو
✽ عمران حیدر بلوچ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
دہکے جس جو کھلا آسمان بھول گئے
رہا ہوئے تو پرندے اڑان بھول گئے
✽ صوبیدار (ر) انوار بخش..... بلیر کینٹ
میرے غم زخم، یہ جسم و جاں، ہوں نفس نفس میں دھواں دھواں
مجھے اہل وطن سے کیا ملا، مجھے اہل وطن نے کیا دیا
✽ غلام اکبر ساقی نورنگہ..... میانوالی
ہماری قسمت میں سب کچھ ہے پھولوں کے سوا
تم اگر پھول نہ ہوتے تو ہمارے ہوتے
✽ حاجی محمد زابد اقبال زرگر..... نئی منڈی سکھکی
کچھ انوکھے تجھے انداز ستم آتے ہیں
ہم تیری بزم سے ہادیدہ تم آتے ہیں
سچ تو ہے کہ کمبختی ہے وہ پھولوں کی طرح
جس جگہ آپ کے گزرگ قدم آتے ہیں
✽ طاہرہ یاسمین..... کشمیر ٹاؤن، سرگودھا
شام کی چپ کا اثر اس کی صدا سے ٹوٹا
خشک پتا تھا ذرا تیز ہوا سے ٹوٹا
✽ ابرار احمد..... پاک کیمپ پٹارو (سندھ)
جی تو چاہتا ہے کبھی آگ لگا کر دل کو
پھر کہیں دور کھڑے ہو کر تماشا دیکھوں
✽ نوید انجم بٹ کہیاں..... گجرات
تم نے تو رو رو کے رکھا ہے وفا کا بھرم
ہم بھی رو دیتے گر پیار میں جھوٹے ہوتے
✽ انیلارشد سیال..... بلقان خیر پور میرس
نہیں محفوظ کوئی آج انسانوں کی بستی میں
ہمیں اونچے پہاڑوں پر بسیرے ڈھونڈنے ہو گئے
✽ ڈاکٹر انجیل اے لطیف..... فقیر والی
بوکر زمین دل میں تیری آرزو کے بیج
بیٹھا ہوں میں غریب زمیندار کی طرح
✽ اوریس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

✽ مسز ضیا القمر سلطانہ..... رتی ٹبی، ساہیوال
اور کتنی چوڑیاں ٹوٹیں گی اس دہلیز پر؟
اور کتنی دلہنیں آہیں بھریں گی دوستو؟
اسی طرح گراگیاں نوچیں گی شاخوں سے گلاب
تتلیاں پھر خار پر بیٹھا کریں گی دوستو
✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو جا رہے ہیں پنی لیا میں نے
✽ شوکت علی..... گلبرگ، لاہور
لے جائے نہ چپ چاپ سمندر کو اٹھا کر
یہ شخص جو ساحل پہ کھڑا سوچ رہا ہے
✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
موسم کے تغیر نے تقدیر سے پوچھا ہے
ان خانہ بدوشوں نے کیوں کوچ کی ٹھانی ہے
✽ ملک الطاف حسین کھلنگ..... تحصیل جتوئی
پھر اک شخص سے امید وفا
اے دل تجھے عزت داس نہیں
✽ شبیر احمد جان..... کاظم آباد، کراچی
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے
✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خانیوال
بزم جہاں میں اپنی غریبی نہ پوچھیے
اک درد دل ہے! وہ بھی کسی کا دیا ہوا
✽ جعفر حسین..... تحصیل بھوانہ، ضلع چنیوٹ
گلہ شکوہ ہی کر ڈالو کہ کچھ وقت کٹ جائے
لبوں پہ تمہارے یہ خاموشی اچھی نہیں لگتی
✽ محمد اشفاق سیال..... شورکوٹ شی
بڑا منفرد کھیل ہے محبت، سارے کھیلوں میں
جو ہارا پھر نہ کھیلا وہ، جو جیتا اس نے بھی تو بہ کی
✽ محمد یونس چوہدری..... لاہور
اس بادشاہ وقت سے کیسی توقعات
بیٹھا ہو جو تخت پر عنایات بیچ کر
✽ رانا حبیب الرحمن..... ٹوبہ ٹیک سنگھ
اتر تو گئے محبت کے ساغر میں لیکن لے جانے جانے
دور اس سمندر کے کنارے ہو گئے بھی سوچا نہ تھا



خواب

تئیر ریاض

جب تک وہ خواب غفلت کا شکار رہا، تب تک دنیا کے فکر و آلام سے غافل رہا مگر جیسے ہی وہ اس کیفیت سے باہر آیا اسے ادراک ہوا کہ وہ کسی اور کی جگہ سولی پر چڑھ چکا ہے... اور پھر یہی احساس اسے زندگی سے اتنی دور لے آیا کہ جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے تعاقب میں کوئی سایہ تک نہ تھا۔

سہیلہ بیگم نے فریاد کیا کہ ایک ہی آدمی کو دو بار تک...

تجسمہ نے لگا۔ ذہن آگہوں اور خوب صورت مسکراہٹ والی کاؤٹر ٹرک نے سونی کی ٹیوب اٹھائی اور اس کا لیبل پڑھتے ہوئے بولی۔ ”اسے لگانے سے تمہارے ہونٹ بالکل تروتازہ ہو جائیں گے، سانا۔“ پھر اس نے لیبل پر لگی قیمت پڑھی اور کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے بولی۔ ”ایک سو اکیاسی سینٹ۔“

”ایک سو تانوںے۔“ سونی نے ہنسی کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ رعایت یہاں کے ملازمین کے لیے ہے۔“ لوکی

سونی ٹیلر کے ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔ لہذا اس نے ایک جیب اسٹاک اٹھائی اور کیش کاڈ ٹرکی جانب بڑھا دیا۔ اس سے آگے ایک لڑکا ڈھلی سی جیکٹ اور کیپ لگائے ہوئے لی کی دھن پر تھرک رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور گاتے ہوئے بولا۔ ”تو تم سانا کلاز ہو؟“

سونی نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک ہانی نکالی اور لڑکے کو دیتے ہوئے بولا۔ ”کرکس مبارک ہو۔“

محمد کا مران خالد..... ضلع انک

قبروں میں نہیں ہم کو کتابوں میں اتارو ہم لوگ محبت کی کہانی میں مرے ہیں

پلو مشہ..... پشاور سبھی کا ٹٹا سا چہتا ہے تمہارا ساتھ ادھورا تھا کہ اپنی ذات ادھوری ہے

حسین خان بلوچ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا تشفی سے بچا ہے کہ مجھے عشق ہوا ہے

خالد بشیر..... کوئٹہ حاصل زندگی حسرتوں کے سوا کچھ بھی نہیں یہ کیا نہیں، وہ ہوا نہیں، یہ ملا نہیں وہ رہا نہیں

محمد جاوید راؤ..... بہاولنگر رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی

جانے کیا ہو گیا ہے زمانے کو سچی بات کہو تو ددڑتا ہے کھانے کو

احمد حسن عرضی خان..... قبولہ شریف کچھ اس طرح سے نظر انداز ہو گئے ہم جیسے اضافی حرف تھے تیری زندگی کی کتاب میں

مرزا طاہر الدین بیگ..... میرپور خاص باندھ لیں ہاتھ پھر سینے پہ سجالیں تم کو جی میں آتا ہے کہ تصویر بنا لیں تم کو

ماریا علی بھٹو..... جندوڑی، ضلع شکارپور اس کی نازک انگلیوں کو دیکھ کر اکثر عدم ایک ہلکی سی صدائے ساز آتی ہے مجھے

محمد بشارت..... کنٹر دورہ کئی صدیاں گزر جائیں مگر آثار بولیں گے حقیقت چھپ نہیں سکتی درود یوار بولیں گے

خلیل الرحمن..... کھاناں نام کیا نشان بھی کیا خواب و خیال ہو گئے تیری مثال دے کے ہم تیری مثال ہو گئے

محمد امین..... کراچی ہنر ہے ہم میں دریا کا نکل جاتے ہیں ہر جانب کہ لہروں کی طرح ساحل سے نکلایا نہیں کرتے

ذیشان منہاس..... گلشن اقبال، کراچی جس کی رفاقت شام کے ڈھلتے سائے تک ہی ملتی ہے

ماتا دہ خورشید ہے لیکن اس کی پوجا کیا کرتے

مختل شعرو سخن

نام: _____ پتا: _____

کوین
برائے
شمارہ
جولائی
2012

”یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔“ سونی قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”یہ میں اپنے حساب میں دے رہی ہوں۔“
”شکر یہ۔“ سونی اس کے گلے میں پڑے ہوئے کارڈ پر نام پڑھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا نام اے پتا ہے۔“
”لوگ مجھے اسی کے نام سے پکارتے ہیں۔“
سونی نے اسے بھی ایک ٹائی پکڑا دی۔ شفٹ سپروائزر کا دفتر کے دوسرے سرے پر کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ چلاتے ہوئے بولی۔ ”کیا کوئی مسئلہ ہے؟“
”نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ لڑکی نے جواب دیا۔
سپروائزر نے سونی کو کھڑکتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ڈیوٹی کے دوران ذاتی اشیاء کی خریداری نہیں کرنا چاہیے۔“
سونی نے وہ ٹیوب اٹھائی اور ہونٹوں پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ ”میرے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔“
”اچھا، اچھا، ٹھیک ہے۔“ وہ غصے سے بولی، پھر کاؤنٹر کلرک کو دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ جلدی جلدی لوگوں کو نمٹاؤ۔

سونی اسٹک کی پیکنگ کھولنے میں اتنا محو ہوا کہ چلتے چلتے اسٹور کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں الیکٹرونکس کا سامان رکھا ہوا تھا۔ جب وہ اسٹک کو اپنے ہونٹوں پر لگانے کے لیے رکھا تو اس کی نظر بیٹریوں کے خانے پر چلی گئی جہاں ہر سائز اور برائڈ کی بیٹریاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک ڈبا اٹھایا جس میں آٹھ عدد بیٹریاں سل رکھے ہوئے تھے۔ ان بیٹریوں کو دیکھ کر اس کے ذہن میں ماضی کی کئی یادیں ابھر آئیں۔ جب وہ اپنی پینسل ٹارچ، کھلونوں اور ریڈیو کے لیے بیٹریاں استعمال کیا کرتا تھا۔ اس نے ڈبے پر نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا کہ اسے ایک ٹرانزسٹر ریڈیو خرید لینا چاہیے تاکہ نیند نہ آنے کی صورت میں وہ اس سے ول بہلا سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا اور اس نے وہ ڈبا اپنے تھیلے میں ڈال لیا جو اس کے کندھے پر لٹکا ہوا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے اسٹور میں بہت رش تھا۔ وہ بچوں میں تحائف اور تافیاں تقسیم کرتا رہا اور آٹھ بجے جب شفٹ ختم ہوئی تو وہ بری طرح تھک چکا تھا اور اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس کے تھیلے میں بیٹریاں سل پڑے ہوئے ہیں۔ اس نے ابھی تک سائن کا ڈالا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ

اپنے کندھے پر تھملا لٹکائے اسٹور کے عقبی دروازے باہر آیا اور اپنی پرانی کار کی جانب بڑھنے لگا جیسا کہ ایک گارڈ اس کے پاس آیا اور بولا۔

”اگر تم خیال نہ کرو تو میں تمہارا تھملا دیکھ لوں۔“
سونی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور تھملا اس کے میں تھما دیا۔ اس شخص نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور سیل کا ڈبا نکالتے ہوئے بولا۔ ”یہ بیٹریاں اس تھیلے میں کیسے آئیں گی؟“
سیکیورٹی گارڈ نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑا اسے لے کر عمارت کی جانب چل دیا۔ اس کا رخ اس کمرہ جانب تھا جہاں ملازمین وقفہ کے دوران میں بیٹھا کرتے تھے وہاں سیکیورٹی انچارج اور شفٹ سپروائزر دونوں موجود تھے۔ گارڈ نے سیل کا ڈبا انچارج کے سامنے رکھ دیا اور سوہانہ انداز میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ شاہ سپروائزر وہی عورت تھی جس سے اس کا سامنا کیش کاؤنٹر ہو چکا تھا۔ سونی نے اس کا نام پڑھا۔ ”ڈارلا“ اس کے وہاں دو کلرک بطور گواہ بھی موجود تھے۔

سیکیورٹی انچارج نے سونی کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس کے مقابل دوسری کرسی پر بیٹھ گیا پھر اس نے میز کے وسط میں وہ بیٹریاں سل رکھے اور دروازے پر پید نکال لیا۔

”ضرور یہ کسی سنجے کی شرارت ہے اسی نے یہ بیٹریاں سل میرے تھیلے میں رکھے ہوں گے۔“ سونی اپنی منہ پشیم کرتے ہوئے بولا۔

سیکیورٹی گارڈ نے ٹرائی پر رکھے ہوئے ٹیلی ویژن ریموٹ آن کیا اور اسکرین پر اسٹور کا وہ حصہ نظر آنے لگا جہاں الیکٹرونکس آسٹم رکھے ہوئے تھے۔ کیمرا کی آنکھ نے وہ منظر محفوظ کر لیا تھا جب سونی نے وہ بیٹریاں سل اٹھا کر اپنے تھیلے میں رکھے تھے۔ سیکیورٹی انچارج نے ریموٹ کاٹھو دبا یا اور وہ منظر سبک ہو گیا۔

”سونی!“ سیکیورٹی انچارج نے اسے مخاطب کیا وہاں موجود سب لوگوں کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جم کر رہ گئیں۔ ”تم نے کیا سوچ کر یہ حرکت کی تھی؟“

سونی نے کئی بار پلکیں جھپکائیں۔ وہ خود بھی ٹی وی اسکرین کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سوال کا کیا جواب دے پھر بات بتاتے ہوئے، ”میرا خیال ہے کہ میں ان کی ادائیگی کرنا بھول گیا تھا۔“
”یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ شفٹ سپروائزر بولی۔
وی کیمرہ بتا رہا ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔“

اپنی ساری زندگی اس اسکول کی نذر کر دی تھی لیکن اس کی ایک ذرا سی غلطی نے عمر بھر کی ریاضت پر پانی پھیر دیا۔

یہ اسکول میں اس کا آخری سال تھا۔ اگلے جون میں اس کی ریٹائرمنٹ تھی لہذا اس نے سوچا کہ وہ آہستہ آہستہ اپنا ذاتی سامان گھر منتقل کرنا شروع کر دے جو گزشتہ چالیس سالوں میں اچھی خاصی تعداد میں جمع ہو گیا تھا۔ لہذا اس نے اس مقصد کے لیے اسکول کا ٹرک مستعار لیا۔ گوکہ وہ ابھی ریٹائر ہونا نہیں چاہتا تھا لیکن نئے ہیڈ ماسٹر نے جو اس سے عمر میں بیس سال چھوٹا تھا۔ اس کی ملازمت میں توسیع کی درخواست مسترد کر دی۔ اس نے خود پہلے بھی کسی اسکول میں کام نہیں کیا تھا۔ وہ ایک بزنس مین اور معاشیات کا ماہر تھا۔ اسی لیے اسکول کی انتظامیہ نے اس کی خدمات حاصل کی تھیں اور اسے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ کم سے کم پیسوں میں لوگوں سے زیادہ کام لے۔ اس نے سونی کی درخواست مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ”بوڑھے لوگ ریٹائر ہوں گے تو جوانوں کو آگے آنے کا موقع ملے گا جو کم تنخواہ میں زیادہ اچھے نتائج دے سکتے ہیں۔“

”مجھے پڑھانے سے پیار ہے اور میں اب بھی اچھے نتائج دے رہا ہوں۔“ سونی نے کہا۔

اس کا کہنا کسی حد تک صحیح تھا۔ اس کے شاگرد اچھے نمبروں سے امتحان میں کامیاب ہو رہے تھے۔ البتہ اب وہ گھٹنے کی تکلیف کی وجہ سے فٹ بال کی کوچنگ کے قابل نہیں رہا تھا اور نہ ہی وہ اسکول کی دوسری سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتا تھا بلکہ کئی بار تو اسے میٹنگ کے دوران میں سوتا ہوا بھی پایا گیا۔

”ہم جو تنخواہ دے رہے ہیں۔ اس کے عوض نہ صرف ایک نیا ٹیچر بھرتی کیا جاسکتا ہے بلکہ باسکٹ بال ٹیم کے نئے یونیفارم اور ٹینس کورٹ کا نیا نیٹ بھی خریدا جاسکتا ہے۔ تم نے چالیس سال نوکری کر لی۔ جولائی میں باسٹھ سال کے ہو جاؤ گے پھر تمہیں سوشل سیکیورٹی سے معقول پنشن ملنے لگے گی جس سے تمہارا گزارہ بہ آسانی ہو سکتا ہے۔“

سونی کے پاس مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

سونی کی آخری امید بھی ختم ہو گئی تو اس نے اپنا ذاتی سامان گھر منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسکول کی انتظامیہ نے پیشکش کی کہ اگر وہ چاہے تو اسے اس کام میں مدد دینے کے لیے دو آدمی فراہم کیے جاسکتے ہیں تاکہ اسے بار بار چکر لگانا نہ

”ٹھیک ہے۔“ سیکیورٹی انچارج بولا اور پھر پیڈ پر لکھنے لگا۔ سونی نے اپنی جیب سے دس ڈالر کا نوٹ نکالا۔ سیکیورٹی انچارج کی طرف کھسکا دیا۔ سیکیورٹی انچارج نے گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہ پیسے اپنے پاس ہی رکھو۔“
سونی نے کندھے اچکائے اور نوٹ اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

”مجھے افسوس ہے کہ تم نے آٹھ بیٹریاں سیل کی خاطر بیٹری گنوا دی۔“ شفٹ سپروائزر نے کہا۔

سونی نے اس اسٹور میں ملازمت صرف اس لیے لگائی تھی کہ کچھ پیسے کم کر اپنا گزارہ کر سکے۔ صرف سات پیسے کی بات تھی۔ پھر وہ باسٹھ سال کا ہو جاتا اور اسے سوشل سیکیورٹی سے گزارہ الاؤنس ملنے لگتا۔

سیکیورٹی انچارج نے قلم میز پر رکھا اور بولا۔ ”میں لے رہا ہوں لکھ لی ہے۔ اسے پڑھ کر دستخط کر دو۔“
”یہ میرا اصلی نام نہیں ہے۔“ سونی نے کاغذ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم اپنا اصلی نام لکھ کر ہی دستخط کر دو۔“
سونی اس کے بعد بھی تذبذب میں مبتلا رہا تو شفٹ سپروائزر بولی۔ ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم اس کاغذ پر دستخط کرتے ہو یا نہیں۔ ہمارے پاس فوج موجود ہے جس میں تم چوری کرتے ہوئے نظر آ رہے ہو۔“

سیکیورٹی انچارج نے غصے سے شفٹ سپروائزر کو دیکھا اور سونی سے کاغذ واپس لے لیا۔

شفٹ سپروائزر چاہتی تھی کہ سونی کے ساتھ کسی شخص کو اس کے گھر بھیجا جائے جو اس سے سائن کا سوٹ واپس لے کر آئے لیکن سیکیورٹی انچارج نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور اولا۔ ”سونی! تم جب چاہو یہ سوٹ واپس کر سکتے ہو۔“

سونی کو یہ فکر لاحق ہوئی تھی کہ اگر اسٹور کی انتظامیہ نے اس واقعے کی رپورٹ درج کروادی تو جرح کے دوران میں اس کے ماضی پر بھی بحث ہوگی اور اس سے پوچھا جائے گا کہ تین مہینے پہلے اس نے اپنی اصلی ملازمت کیوں چھوڑ دی تھی۔ وہ چالیس سال تک ہائی اسکول انکس ٹیچر رہا تھا۔ اس اسکول میں اس نے کنڈرگارٹن سے بارہویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی اور یہی وہ اسکول تھا جہاں اس کے باپ نے بھی چوالیس سال تک پڑھایا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد سونی کو اس کی ہر ملازمت رکھ لیا تھا۔ اس وقت وہ بائیس سال کا تھا۔ اس نے

پڑیں لیکن سونی نے شکریہ کے ساتھ یہ پیشکش مسترد کر دی اور کہا کہ وہ خود ہی یہ کام کرنے لگا۔ اس نے کتابوں اور کاغذات سے بھرے ہوئے نصف درجن باکس ٹرک میں رکھے اور پھر اسے دو ڈورک شاپ کی طرف لے گیا۔ شاپ بچہ نے اس کے لیے فالٹو لکڑی سے بھرے ہوئے تین تھیلے الگ کر دیے تھے تاکہ وہ اپنا آتش دان گرم رکھ سکے۔ اسے خیال آیا کہ ان کتابوں کے لیے اسے مزید بیک شیف کی ضرورت پڑے گی۔ لہذا اس نے صاف شدہ لکڑی کے اٹھارہ تختے اٹھائے اور انہیں ٹرک میں لا دیا۔ اس کے علاوہ ایک عدد برقی آری، تارچین کا ڈبا اور کچھ برش بھی ٹرک میں رکھ لیے۔ پھر وہ ٹرک کو اس طرف لے گیا جہاں اسٹور کی نئی عمارت زیر تعمیر تھی اور وہاں سے اس نے ایشیئیں اٹھا کر ٹرک میں رکھنا شروع کر دیں جو شیف بنانے میں اس کے کام آسکتی تھیں۔

ہیڈ ماسٹر اسکول کی عمارت سے متصل ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ اس نے دو ڈورک شاپ کی لائٹس روشن دیکھیں تو اپنی کار چلاتا ہوا سروس روڈ پر آ گیا اور اس نے اپنی کار میں اس جگہ روکی جہاں سونی وولوں ہاتھوں میں ایشیئیں اٹھائے ٹرک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر سونی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اسکول کی انتظامیہ نے مقدمہ بازی اور بدنامی سے بچنے کے لیے سونی کو مجبور کیا کہ وہ ملازمت سے فوری برطرفی قبول کر لے۔ ایسی صورت میں اسے پنشن، میڈیکل انشورنس، اس کے اعزاز میں ہونے والی الوداعی پارٹی سے محروم ہونا پڑے گا۔ بورڈ آف ٹرشی کے ایک ممبر نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے دفاع میں کوئی وکیل کر سکتا ہے لیکن سونی جانتا تھا کہ وکیل کو قیس دینے میں اس کی تھوڑی بہت جمع پونجی بھی ختم ہو جائے گی۔ لہذا اس نے خاموشی سے سر جھکاتے ہوئے برطرفی کے خط پر دستخط کر دیے۔

اسے ڈر تھا کہ اگر اسٹور کی انتظامیہ نے پولیس میں رپورٹ درج کروادی تو اس کے ماضی کو بھی کھنگالا جائے گا۔ وہ ہیڈ ماسٹر، بورڈ کے اراکین، اس کے ساتھی اساتذہ اور دیگر لوگوں سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر اخباروں میں اس کی تصویر کے ساتھ خبر شائع ہوگی۔ اسے مقدمہ کا سامنا کرنا پڑے گا اور جرم ثابت ہونے پر وہ جیل بھیج دیا جائے گا۔

”شام بخیر، پروفیسر ٹیلر!“ سزن پیل نے اپنے مخصوص ہندوستانی لہجہ میں کہا۔

اسکول کی ملازمت ختم ہو جانے کے بعد سونی کو اپنا وہ

مکان چھوڑنا پڑا جہاں وہ گزشتہ تینتیس سال سے رہا کیونکہ اب وہ اس کا کرایہ ادا کرنے کے قابل نہیں تھا وہ ایک کمرے کے فلیٹ میں منتقل ہو چکا تھا جو رپور پارک میں واقع ایک عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔ اس میں چونکہ سامان رکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے اس پرانے گھر کا سارا سامان صرف تین سو ڈالر میں فرو دیا۔ اب اس کے پاس پہننے کے کپڑوں اور ذاتی استعمال اشیاء کے سوا کچھ نہیں تھا جنہیں وہ ایک سوٹ کیس میں کر اس ایک کمرے کے فلیٹ میں آ گیا۔

”کیا تم میرے ساتھ چائے پینا پسند کرو گے؟“

پیل چھپاتے ہوئے بولی۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ وہ جب بھی شام کو گھر والا آتا تو مکان کی مالکہ سزن پیل دروازے پر اس کا استہ کرتی اور اسے اپنے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے اور باتیں کی دعوت دیتی۔

وہ اسے لیونگ روم میں بٹھا کر چلی گئی۔ واپس آ کر اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے رکھی جس میں چائے کے سا پینو بھی رکھے ہوئے تھے۔ ورنہ عام طور پر چائے کے سا ساتھ ہندوستانی لوازمات ہی پیش کرتی تھی۔

”آج مجھے کچھ بنانے کے لیے وقت ہی نہیں مل سکا وہ کپ میں چائے اٹھالیتے ہوئے بولی۔ ”میرا بیٹا آتا ہے۔ ہم دن بھر شاپنگ کرتے رہے۔“

وہ ٹورنٹو میں رہتا تھا اور ہر دو تین مہینے بعد کارڈ دورے پر امریکا آیا کرتا تھا۔ اس کا قیام خواہ کسی بھی شہر ہو لیکن وہ کچھ وقت نکال کر اپنی ماں سے ملنے بنیو ضرر، پھر دونوں ماں بیٹا مل کر خوب شاپنگ کرتے، اچھے ہونا ڈنر کرتے اور جب تک وہ یہاں رہتا، سزن پیل کی مصرا بھی خاصی بڑھ جاتی۔

”یہ ٹی وی بہت خوب صورت ہے۔“ سولی کمرے میں رکھے ہوئے نئے ٹیلی ویژن سیٹ کی تعرا کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ اس کے پاس اتنے پیسے کہاں آئے ہیں۔“ سزن پیل جتنے ہوئے بولی۔ ”شاید اللہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ کیا یہ کافی نہیں کہ وہ ہر خیال رکھتا ہے؟“

سونی کو بالکل بھی اعزاز نہیں تھا کہ سزن پیل کا کام کرتا ہے، البتہ اسے کبھی بھی شک گزرتا کہ اس کا کسی قسم کی بجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ آخر وہ

اور ہارے جس کے لیے وہ ہر دو تین ماہ بعد امریکا کے مختلف شہروں کا چکر لگاتا ہے۔ موبائل، فیکس اور انٹرنیٹ کے رپے تمام کاروباری معاملات گھر بیٹھے طے کیے جاسکتے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ سزن پیل سے نہیں کہہ سکا۔

سونی چائے کی پیالی ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیٹھا تھا کہ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلی رہی تھیں۔ ایک چھوٹی سی ملاقات کی اسے اتنی بڑی سزا ملی تھی۔ وہ ابھی تک سانا کا اڈ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس لباس میں اسے خاصی بے آراہی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ سزن پیل سے لمبی لپ شپ کرنے کے بجائے پہلے وہ گھر جا کر لباس تبدیل کرے کہ اچانک ہی سزن پیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”پلیز پروفیسر!“ اس نے پلیٹ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ پیٹر تولو۔“

وہ شاید اسے کالج کا ریٹارڈ پروفیسر سمجھتی تھی۔ سونی نے ایک پیٹر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے سونی کہا کرو۔“

عام طور پر سونی اس سے موسم یا اس کے بنائے ہوئے ملکس کے بارے میں گفتگو کرتا تھا یا کبھی کبھی دوران امی پیش آنے والا کوئی دلچسپ واقعہ سنا دیتا۔ لہذا اس کے ہلے ہوئے رویے کو محسوس کرتے ہوئے سزن پیل بولی۔

”کیا بات ہے؟ آج تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟“ سونی نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور پیالی میز پر کھے ہوئے بولا۔ ”میری ملازمت ختم ہو گئی ہے۔“

”کوئی بات نہیں، دوسری مل جائے گی۔ ویسے بھی یہ ام قہارے شایان شان نہ تھا۔“

اس نے ایک اور پیٹر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ کام اگلی فزج کے لیے کر رہا تھا۔“

”ہاں، میں سمجھتی ہوں۔“ سزن پیل بولی۔ ”اور لگاؤ؟ تم نے ہاتھ کیوں روک لیا؟“

سونی کی نگاہ کمرے میں رکھے ہوئے دو عدد وینڈ کیری کیسوں پر گئی تو وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

”کیا تم کہیں جا رہی ہو؟“ سزن پیل ہنستے ہوئے بولی۔ ”نہیں۔ یہ میرے بیٹے کا ان ہے۔ شاید اس بار تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے تو

مے یہ ضرور پوچھنا کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔“

یہ بات وہ پہلے بھی کہہ چکی تھی کہ سونی اس کے بیٹے ایک دوسرے بل چکا تھا لیکن سزن پیل نے بھی اسے بیٹے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کی دعوت نہیں دی اور یہ ایک لہجے سے سونی کے حق میں اچھا ہی تھا ورنہ وہ مشکل میں پڑ

جاتا کہ وہ اس کے بیٹے سے یہ بات کس طرح معلوم کرے۔ اس نے دوسری پلیٹ میں رکھی ہوئی ایک چاکلیٹ اٹھا لی اور گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ اب اسے اٹھ جانا چاہیے۔ سزن پیل کا بیٹا کسی وقت بھی آسکتا تھا اور اس وقت سونی کی ذہنی کیفیت ایسی نہ تھی کہ وہ اس سے بیٹھ کر باتیں کرتا۔

اس رات سونی دیر تک جاگتا رہا۔ گزرے ہوئے واقعات کسی قلم کے ماتند اس کے ذہن کے پردے پر روشن ہوتے رہے۔ اس کی زندگی میں ابھی تک کچھ بھی اچھا نہ ہوا تھا۔ قدم قدم پر مصیبتیں اور پریشانیوں اس کا راستہ روکتیں لیکن وہ کسی نہ کسی طرح زندگی کی گاڑی گھنچتا آ رہا تھا۔ اب ایک نیا خطرہ اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اگر اسٹور کی انتظامیہ نے چوری کی رپورٹ درج کروادی تو وہ ایک نئے عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس سے پہلے اسے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔

دوسری صبح وہ اٹھا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد لباس تبدیل کیا اور گھڑی میں کھڑا ہو کر دیر تک پڑوسی کے گھر میں جھانکتا رہا پھر اسے خیال آیا کہ اب اسے نکل جانا چاہیے۔ کہیں سزن پیل اس کی خیریت معلوم کرنے نہ آجائے۔ رات بھی اس نے ٹھکن کا بہانہ کر کے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی تھی، اس نے سانا کلاز کا لباس بغل میں دبایا اور آہستہ آہستہ بیڑھیاں اترنے لگا تاکہ سزن پیل اس کے قدموں کی چاپ نہ سن سکے لیکن وہ بلاوجہ ہی پریشان ہو رہا تھا کیونکہ سزن پیل جا چکی تھی۔ اس کے دروازے پر ایک کاغذ چسپاں تھا جس میں لکھا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ادھیو جارہی ہے جہاں وہ اپنی بہن کے پاس چند روز قیام کرے گی۔ اس لیے اس کی غیر حاضری میں سونی کو شام کی چائے کا اہتمام خود ہی کرنا ہوگا۔ تمام سامان کچن میں موجود ہے۔ اسے صرف پانی ابال کر چائے بنانا ہوگی۔ کھانے پینے کا دیگر سامان بھی موجود ہے۔ اس لیے سونی کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اس نے آخر میں یہ بھی تاکید کی تھی کہ سونی اس کی غیر موجودگی میں گھر کا خیال رکھے۔

سونی اس غیر متوقع صورت حال سے تھوڑا سا بدحواس ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اگر وہ گزشتہ شب تھوڑی دیر اور اس کے پاس بیٹھا رہتا تو اس کے بیٹے سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ماں بیٹے نے یہ پروگرام رات میں کسی وقت بنایا ہوگا۔ اس لیے سزن پیل اسے آگاہ نہ کر سکی۔ اس نے سوچا کہ باہر نکلنے سے پہلے ایک چائے کی پیالی پی لے تاکہ دن کا آغاز

اچھا ہو۔ اس نے سز پٹیل کے کچن میں جا کر چائے بنائی اور لیونگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ اس نے لی دی آن کیا تو وہاں کوئی انڈین فلم چل رہی تھی۔ اس نے ٹائٹل پھیلائیں اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر فلم دیکھنے لگا۔ گوکہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن وہ فلم کے رومانوی مناظر، رقص اور موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس دوران میں بار بار اس کی آنکھ لگتی رہی۔ کئی بار وہ اٹھ کر ٹائلٹ گیا، بھوک لگی تو اس نے کچن کا رخ کیا اور رات کے بچے ہوئے پیٹرو سے اپنے پیٹ کی آگ بجھائی۔

سونے جانے کی کیفیت میں تین بج گئے۔ اس کی آنکھ مکمل طور پر اس وقت کھلی جب لی دی پر چلنے والی آخری فلم زوردار موسیقی کی آواز کے ساتھ ختم ہو گئی۔ وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور سستی دور کرنے کے لیے چہل قدمی کرتا رہا۔ پھر وہ کچن میں آ گیا اور وہاں سے ایک خالی تھیلا لے کر آیا۔ اس میں سائنا کلاز کا سوٹ رکھا اور وہاں سے چل دیا۔

سونی کا خیال تھا کہ وہ خود جانے کے بجائے یہ سوٹ ڈاک سے بھیج دے لیکن اس طرح اس کا قصور وار ہونا ثابت ہو جاتا جبکہ وہ اپنی دانست میں خود کو بے قصور سمجھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے وہ بیٹری سیل چوری نہیں کیے بلکہ بے دھیانی میں اٹھا کر اپنے تھیلے میں رکھ لیے۔ اس کے باوجود وہ ان کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھا لیکن سخت گیر شفٹ سپروائزر نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے چوری کا مرتکب قرار دے دیا۔ لہذا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود یہ سوٹ واپس کرنے جائے گا تا کہ انہیں معلوم ہو سکے کہ اس کے دل میں چور نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اسٹور انتظامیہ اس غیر اہم معاملے کی رپورٹ پوکیس میں نہیں کرے گی کیونکہ شفٹ سپروائزر نے خود ان بیٹری سیل کو معمولی قیمت کا بتایا تھا۔

چھٹی کی وجہ سے اسٹور سنان پڑا ہوا تھا اور اکاؤنٹ کا لوگ ہی وہاں نظر آ رہے تھے۔ سونی نے جھجکتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ اسے امید تھی کہ کسی نے اسے اندر داخل ہوتے نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ اسٹور کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ ساتھ ساتھ ادھر ادھر بھی دیکھتا جا رہا تھا کہ کہیں اس کا سامنا شفٹ سپروائزر سے نہ ہو جائے۔ اسٹور کے عقبی حصے میں پہنچ کر وہ نیم تاریک کوریڈور کی جانب بڑھ گیا جہاں ملازمین کے کمرے تھے۔ اس نے کوشش کی تھی کہ وہ ایسے وقت اسٹور پہنچے جب شفٹ تبدیل ہو رہی ہو اور وہ اس میں کامیاب رہا تھا۔ شفٹ سپروائزر ایک میز پر بیٹھی ہوئی

تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی چست چٹون اور نارنجی ر ہل اور پھین رکھا تھا اس کا ایک ہاتھ میز پر ٹکا ہوا تھا دوسرے ہاتھ میں کسی مشروب کا گلاس تھا۔ اس کے وہاں تین دوسرے کارکن بھی موجود تھے۔ ان میں سے نے گزشتہ شب اس کے خلاف گواہی دی تھی۔

سونی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولنا شروع دیا جو کہ خلاف تہذیب تھا لہذا وہ لوگ جو پہلے سے باتوں مصروف تھے، خاموش ہو گئے۔ سونی نے بلا کسی تمہید شفٹ سپروائزر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں مس ڈارلا۔ شفٹ سپروائزر کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ ۱ نے پلٹ کر دیکھا اور حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”تم مجھ بات کرنا چاہتے ہو؟“

یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لیا پھر سونی کی طرف دیکھا۔ دوسرے کارکن معذرت کر کے وہاں سے جانے تو اس نے گواہی دینے والے کارکن سے کہا کہ وہ سیکر انچارج کو بلا کر لائے۔

”تم بھی اس کے ساتھ ہی آؤ گے۔“ وہ تاکید کر ہوئے بولی۔ ”کیونکہ تم سوج کے گواہ ہو۔“ پھر اس کا سونی کی طرف ہو گیا۔ ”تم بھی اس وقت تک مجھ سے بات نہیں کرو گے جب تک یہ لوگ نہ آجائیں۔“

”میں یہ سوٹ واپس کرنے آیا تھا۔“ سونی نے ۲ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں یہ سوٹ یہاں سے باہر لے کر نہیں چاہیے تھا۔“ سپروائزر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”ہاں۔“ سونی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ”تم بارے میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔“

”تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔“

”میں تم سے اسی سلسلے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔“

”اگر تم چوری کے بارے میں کچھ کہنا چاہ رہے ۱۱ اس پر کوئی بات نہیں ہوگی۔“

”اگر تم میری بات سنو تو.....“

”میں تم سے پہلے کہہ چکی ہوں کہ جب تک یہاں ۱۲ گواہ موجود نہ ہو۔ میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی۔“

سونی نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور بولا۔ ”دیکھو۔“

”کیا تم مجھے دھمکانے کی کوشش کر رہے ہو۔ ۱۳ بگڑتے ہوئے بولی۔ سونی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ جوا میں کیا کہے۔ عین اسی وقت سیکورٹی انچارج کمرے

داخل ہوا۔ وہ کافی سنجیدہ اور سخت دکھائی دے رہا تھا۔
”سونی! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”یہاں میں بھی اس سے پوچھ رہی تھی۔“ شفٹ سپروائزر نے کہا۔ ”یہ شخص یہاں کیا کرنے آیا ہے۔ اصرار کر رہا ہے کہ میں اس کی بات سنوں۔ جبکہ اب سننے اور دیکھنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔ میں وہ فلم دیکھ چکی ہوں جس میں اسے بیٹریاں چراتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔“

سونی بولا۔ ”میں صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا۔۔۔۔۔۔“
شفٹ سپروائزر نے اس کی بات کاٹ دی اور بولی۔
”وہ گواہ کہاں ہے، میں اس کی غیر موجودگی میں اس کی کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔“

سیکیورٹی انچارج نے کہا۔ ”یہ کچھ نہیں بولے گا۔“ پھر اس نے سونی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”چلو، تمہیں یہاں رکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”ایک منٹ ٹھہرو۔“ سونی گڑگڑاتے ہوئے بولا۔
”میں معافی مانگتا چاہتا ہوں۔“

”معافی تو تمہیں کل ہی مانگی جا چکی تھی لیکن تم نے اس کے بجائے مجھے دھمکانے کی کوشش کی جبکہ میں کسی کی دھمکی میں نہیں آئی۔“ شفٹ سپروائزر مشتعل ہوتے ہوئے بولی۔
”مجھے کسی کی معافی سننے کی ضرورت نہیں۔“

سونی کو یوں لگا جیسے وہ کسی دلدل کے کنارے کھڑا ہے اور اسے وہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا۔ اس نے اپنے حواس جمع کیے اور بولا۔ ”میں اس قے کو ختم کرنا چاہ رہا تھا۔“

شفٹ سپروائزر نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ”اس کا ایک ہی انجام ہے۔ وہ جو سامنے دیوار پر لکھا ہے اسے غور سے پڑھو، چوری کرنے والے کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

”نہیں، پہلے میری بات سن لو۔ میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ وہ میز پر مکا مارے ہوئے بولا۔

”یہ شخص مجھے دھمکی دے رہا ہے۔“ وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”اس نے میز پر مکا مارا۔ تم الزامات کی فہرست میں اس دھمکی کا بھی اضافہ کر لو۔“

سونی کو یوں لگا جیسے وہ پاگل جانوروں کے ساتھ کسی بچرے میں قید ہو گیا ہے۔ سیکیورٹی انچارج اسے دروازے کی طرف لے جانے لگا اور عورت نے اپنی جیب سے سیل فون نکال لیا۔

”سونی! کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں اس سے دور رہنے کا

عدالتی حکم مل جائے؟“ سیکیورٹی انچارج بولا۔

”میرے پاس اپنی حفاظت کے اور بھی طریقے ہیں۔“ شفٹ سپروائزر ٹیلی فون نمبر ڈائل کرتے ہوئے بولی۔

”تم کسے فون کر رہی ہو؟“ سونی نے پوچھا۔
”تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔“
”تم حد سے آگے بڑھ رہی ہو۔“ سونی غصے

بولا۔

سیکیورٹی انچارج نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑا اور اسے دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔ ”سونی! خاموش ہو جاؤ۔“

باہر آنے کے بعد سونی نے کہا۔ ”کیا یہ عورت پاگل ہو گئی ہے، میں نے اسے کوئی دھمکی نہیں دی۔“

”گھر جاؤ۔ اس جگہ اور اس عورت سے دور رہنے کی کوشش کرو۔“

”میں نے کسی کو دھمکی نہیں دی۔ میں تو صرف بات کرنا چاہ رہا تھا۔ تم مجھے پولیس کے حوالے نہیں کر سکتے۔“

”میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ آئندہ دو ہفتوں تک کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ تب تک یہ معاملہ ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔“

ایک لمحے کے لیے سونی نے سوچا کہ وہ سیکیورٹی انچارج کی اپنی پوری کہانی سنا دے اور یہ بھی بتائے کہ وہ اسٹوری ملازمت کیوں کر رہا تھا۔ بے درپے غلط فہمیوں کی وجہ سے اس کی زندگی کس طرح تباہ ہو گئی لیکن اس نے اپنا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں سانا کا سوٹ واپس کرنے آیا تھا۔“

سیکیورٹی انچارج اس کے ساتھ چلتا ہوا کار تک آیا۔ سونی دروازہ کھولی گرڈ رائیٹنگ سیٹ پر بیٹھ گیا پھر اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور تشکر آمیز نگاہوں سے سیکیورٹی انچارج کو دیکھنے لگا۔ جواب میں انچارج نے اس کی کار کی چھت ہلکے سے تھپتھپایا اور بولا۔ ”ہم رابطے میں رہیں گے۔“

راستے میں ایک جگہ رک کر اس نے ایک اسٹوری کھانے پینے کا سامان خریدا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ مسز ٹیل گھر پر نہیں ہوگی لہذا اسے شام کی چائے کے ساتھ کھا۔ کے لیے کچھ نہیں ملے گا۔ جب وہ گھر کے قریب پہنچا تو اس نے دو آدمیوں کو دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا پایا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس لیے کار میں بیٹھے ہوئے سونی کی نظریں ان پر نہیں گئی۔ جب وہ گاڑی پارک کر کے سیڑھیوں قریب پہنچا تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ ایسا علاقہ نہیں

یہاں لوگ گھروں کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوں۔ اس نے ۲۰ چاکر شاید یہ لوگ مسز ٹیل سے ملنے آئے ہوں۔ شاید دروازے پر زمین یا گھروں پر سامان پہنچانے والے ہوں۔

اسے دیکھ کر وہ دونوں آدمی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سونی نے کہا۔ ”میں اس گھر کا مالک نہیں ہوں۔“ وہ اپنے پورشن کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”مسز ٹیل شہر سے اہر گئی ہوئی ہے۔“

”ہم اس سے ملنے نہیں آئے۔“ ان میں سے چھوٹے قد والا بولا۔ ”ہمیں سانا کلاز کی تلاش ہے۔“

”کیوں؟“

”تمہیں سانا کلاز ہوتا؟“

دوسرا آدمی براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”تم نے ہی ڈارلوسن کو دھمکی دی تھی۔“

سونی کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ان میں سے چھوٹے قد والے نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور پیچھے سے اس کی گردن پکڑی۔

سونی نے اپنی گردن چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”تم غلط پتے پر آ گئے ہو۔“

ان دونوں نے بیک وقت نظریں اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا جیسے مکان کا نمبر چیک کر رہے ہوں پھر چھوٹے قد والا بولا۔ ”نہیں، ہم ٹھیک جگہ پر آئے ہیں۔“

دوسرے آدمی نے سونی کے ہاتھ سے چاکلیٹ کا لفافہ لے لیا اور بولا۔ ”اس میں کیا ہے؟“ پھر اس میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو سانا کو شیشی چیزیں پسند ہیں۔ میں بھی چاکلیٹ بڑے شوق سے کھاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے وہ لفافہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

چھوٹے قد کے آدمی نے سونی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”ڈارلوسن کو تو جانتے ہوتا۔ اسی نے ہمیں بھیجا ہے تاکہ تمہارا دماغ ٹھکانے لگا جائے۔“

”اس سے دور رہو۔“ دوسرا آدمی خراشے ہوئے بولا۔
پھر اس نے سونی کی ٹھوڑی کے نیچے ایک زوردار چٹکی لی، درد کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں ابھری اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا پھر اس شخص نے دوسرے ہاتھ سے سونی کا سر پکڑا اور اسے زور سے دھکا دے کر دروازے سے گرا دیا۔ اس ضرب سے سونی کا دماغ جھنجھٹا اٹھا۔

”اب اگر اس کے آس پاس نظر آئے تو تمہارا انجام اہمانہ ہوگا۔“

اس آدمی نے ایک بار پھر سونی کا گریبان پکڑا۔ اسے

باہمیں جانب گھمایا اور زور سے دھکا دے دیا۔ سونی لہراتا ہوا پیچھے کی جانب گیا اور پشت کے بل زمین پر گر گیا۔ وہ کچھ دیر یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد جب اس کے حواس قابو میں آئے تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن۔۔۔ وہ دونوں وہاں سے جا چکے تھے۔ سونی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اتنی جلدی کہاں غائب ہو گئے۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر تک زمین پر پڑا رہا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کی کمر میں بری طرح چوٹ آئی تھی اور ٹھوڑی کے نیچے بھی جلن ہو رہی تھی۔

اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ لہذا وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے مسز ٹیل کے لیوگ روم میں رکھے ہوئے صوفے پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ اس نے ٹی وی کی جانب بھی توجہ نہیں دی اور نہ ہی اس کی نظر کسی اور جانب گئی۔ وہ کافی دیر تک صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے سستا تا رہا پھر اسے بھوک محسوس ہوئی، اس نے جیسیں ٹولیس تو مونگ پھلی کا پیکٹ ہاتھ میں آ گیا۔ سونی نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ان دونوں آدمیوں کو صرف چاکلیٹ ہی پسند تھی ورنہ وہ اس مونگ پھلی کے پیکٹ سے بھی محروم ہو جاتا۔

عین اسی وقت اس کی نگاہ کوٹنے میں رکھے ہوئے دو عدد سوٹ کیسوں پر گئی جو یقیناً مسز ٹیل کے بیٹے کے تھے۔ وہ ان سوٹ کیسوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا کیونکہ جب بھی مسز ٹیل کا بیٹا اپنی ماں سے ملنے آتا تو یہ سوٹ اس کے ساتھ ہوتے سونی سوچ رہا تھا کہ وہ یہ سوٹ کیس یہاں کیوں چھوڑ گیا۔ اس کے دل میں بے ایمانی آ گئی۔ اس نے ایک سوٹ کیس اٹھایا اور اسے کافی ٹیل پر رکھ کر کھولنے کی کوشش کرنے لگا لیکن سوٹ کیس میں تالا لگا ہوا تھا۔

اس نے میز کی دراز کھولی تو اسے وہاں ہینر کلب کا پیکٹ رکھا ہوا نظر آیا۔ اس نے ایک کلب نکال کر اسے سیدھا کیا اور اسے تالے کے سوراخ میں ڈال کر دو تین بار گھمایا۔ ذرا سی کوشش سے تالا کھل گیا۔ سوٹ کیس میں سب سے اوپر ایک نیلے رنگ کی ٹی شرٹ رکھی ہوئی تھی اور اس کے اطراف میں کئی چھوٹے چھوٹے توپے ٹولس دیے گئے تھے۔ سونی نے وہ توپے ہٹائے تو اسے وہاں سو سو ڈالر کے نوٹوں کی کئی گڈیاں دکھائی دیں۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیرت، خوف، پریشانی اور خوشی کی ملی جلی کیفیات اس پر طاری ہو گئیں۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان گڈیوں کو گنتا شروع کیا۔ وہ تعداد میں ڈیڑھ سو تھیں جبکہ ہر گڈی سو

ڈالرز کی تھی گویا وہ کل ملا کر پندرہ لاکھ ڈالرز تھے۔ سونی کا سانس اور پرکا اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس نے جلدی جلدی دوسرا سوٹ کیس کھولا۔ اس میں بھی اتنی ہی رقم تھی۔ سونی کے پاس سوچنے سمجھنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس کی ساری تھکاوٹ اور سستی دور ہو چکی تھی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی اور نہ ہی پیاس۔ اس نے دونوں سوٹ کیس بند کیے اور انہیں لے کر باہر آ گیا۔

اس کی کار کا رخ مغرب کی جانب تھا۔ وہ اس قصبے بلکہ ریاست سے جتنا دور نکل جائے، اتنا ہی اس کے حق میں بہتر ہے گوکہ مسز پنیل کی واپسی ایک ہفتہ سے پہلے ممکن نہ تھی لیکن سونی کوئی خطرہ مول لیتا نہیں چاہتا تھا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ مسز پنیل یا اس کا بیٹا اس رقم کی چوری کی رپورٹ درج نہیں کروا سکتے کیونکہ یہ ان کی جائز آمدنی نہیں تھی۔ کوئی بھی اتنی بڑی رقم سوٹ کیسوں میں لیے ہوئے نہیں بھرتا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ مسز پنیل کا بیٹا ناجائز کاموں میں ملوث ہے اور اس کے تعلقات بے حد خطرناک لوگوں سے بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ اتنی بڑی رقم کے چوری ہو جانے پر خاموشی سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔ چوری کا علم ہوتے ہی وہ اپنے آدمیوں کو اس کی تلاش پر مامور کر سکتا تھا۔ اسی لیے سونی کی کوشش تھی کہ وہ جتنی جلد ممکن ہو۔ یہاں سے دور چلا جائے اور اگر زیادہ خطرہ محسوس ہوا تو وہ یہ ملک ہی چھوڑ دے گا۔

گاڑی چلاتے وقت اس کا ذہن مسلسل حساب کتاب میں لگا رہا۔ تیس لاکھ ڈالرز میں اس کی بقیہ زندگی بڑے عیش و آرام سے گزر سکتی تھی۔ سب سے پہلے وہ ایک نئی کار خریدے گا۔ پھر بارڈر کے قریب کسی جنوبی قصبے میں ایک مکان کرائے پر لے کر وہاں رہائش اختیار کر لے گا۔ ممکن ہے کہ وہ ان پیسوں سے ایک چھوٹا سا جہاز خرید سکے۔ اس طرح وہ وقفے وقفے سے اپنا ٹھکانا بدلتا رہے گا۔ خیالی پلاؤ پکاتے پکاتے اچانک اسے خیال آیا کہ راستے میں متعدد چوکیاں آتی ہیں اور اکثر جگہ سامان کی تلاشی بھی لے جاتی ہے۔ ایسی صورت میں پکڑے جانے کا امکان بہت زیادہ ہے۔ اس کے لیے چوکی کے اہل کاروں کو رقم کے بارے میں مطمئن کرنا بہت مشکل ہوگا۔ اس نے سوچا کہ فی الحال ایک لاکر لے کر یہ سوٹ کیس وہاں رکھ دے اور راستے کی ضرورت کے لیے تھوڑے بہت ڈالرز اپنے پاس رکھ لے۔ ایک بار وہ ان سرحدی چوکیوں سے گزر جائے تو اسے اندازہ ہو جائے گا کہ وہاں کس قسم کی چیکنگ ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہاں ہر

فحص اس کے انتظار میں بیٹھا ہو۔ آخر مسز پنیل کا بیٹا بھی تو اس طرح کی ناجائز رقم لے کر مختلف ریاستوں میں گھومتا رہتا ہے، وہ تو بھی نہیں پکڑا گیا۔

سونی کی گاڑی میں گیس ختم ہو رہی تھی۔ اس نے کار کا رخ انگوٹھ لاسروس پلازا کی جانب موڑ دیا۔ ویسے بھی وہ دودن سے چاکلیوں پر ہی گزارہ کر رہا تھا لہذا اس نے سوچا کہ گیس بھر دانے سے پہلے پیٹ میں کچھ ڈال لے۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، رات کے دو بج رہے تھے۔ فوڈ شاپ سبناں پڑی تھی اور وہاں صرف ایک عورت اپنے بچے کے ساتھ انتظار گاہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سونی سمجھ گیا کہ وہ اپنے شوہر کا انتظار کر رہی ہوگی۔

سونی نے اپنے لیے برگر اور اورنج سوڈا کا آرڈر دیا۔ وہ پہلے ہی سوٹ کیس میں سے سوڈا لے کر ایک پیکٹ نکال اپنی جیب میں رکھ چکا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیکٹ میں سے ایک نوٹ نکالا اور اسے انگلیوں کے درمیان رکھ کر مسلنے لگا۔ یہ جاننے کے لیے کہ اس نے پیکٹ سے ایک ہی نوٹ نکالا ہے۔

کاؤنٹر کلرک نے نوٹ ہاتھ میں پکڑا اور اسے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے آئہ پر رکھ دیا۔

”بقیہ پیسے تم رکھ لو۔ میری کرمس!“ سونی نے شاہانہ انداز میں کہا اور خود ہی ہنسنے لگا۔

کلرک نے نوٹ کو دونوں انگلیوں سے مسلا اور بولا۔

”یہ تو جعلی ہے۔“

اس وقت وہاں کوئی دوسرا گاہک موجود نہ تھا۔ کلرک کی آواز کی گونج دور تک سنی گئی۔ برگر تیار کرنے والے لڑکے نے جالی سے جھانک کر دیکھا اور منجبر تیزی سے چلتا ہوا کاؤنٹر پر آیا۔

”کیا ہوا؟“

سونی کو اپنے عقب میں ایک آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں ایک پولیس والا کھڑا تھا، اس نے چھٹی ہوئی نظروں سے سونی کو دیکھا اور کلرک سے پوچھنے لگا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“

کلرک نے نوٹ لہرایا اور چیخ چیخ کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ سونی کی ناگوں میں جان نہ رہی۔ وہ کاؤنٹر کا سہارا لے کر اپنی کار کی جانب دیکھنے لگا۔ جس کی ڈکی میں تیس لاکھ ڈالرز سے بھرے ہوئے دو سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے اس کے خوابوں کا محل ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

۲۰

ماں باپ نے اس کا نام ارجن کمار رکھا تھا پر گاؤں والے ارجن کے نام سے پکارتے تھے پھر ارجن سے وہ راجو مگاڑیا کہلانے لگا۔ کارن یہ تھا کہ گاؤں کے بڑے گھنٹا گھر والے بازار میں اس کی کباڑی کی دکان تھی۔ اس کے پرکھوں کا یہ بیو پار برسوں سے چلا آ رہا تھا۔ سات سال کی عمر سے اپنے باپو جیون لال کے ساتھ اسی دکان پر پلا بڑھا تھا۔ اٹھارہ انیس کے لپیٹے میں تھا کہ اس کے باپ کو ایک زہریلے سانپ نے ڈس لیا۔ اس سے پہلے

محسوس لب و لہجہ اور مانوس ماحول کی خالق... رجنی پنیل ایک بار پھر...

صنفر نازک ہمیشہ سے بڑی بڑی داستانیں رقم کرتی چلی آرہی ہے۔ کہیں جھیل کے مانند گہرائی میں پیار چھپا کر دکھتی ہے تو کہیں زخمی ناری کی آگن بن کر انتقام کے شعلے بھڑکاتی ہے۔ کبھی وحشت زدہ ہو کر صحرا میں پناہ ڈھونڈتی ہے تو کبھی محفوظ پناہ گاہ سے نکلتے ہی بھک جاتی ہے مگر... ایک بے چینی، ایک انجان سی کسک ہمیشہ اس کے تعاقب میں رہتی ہے... ہزاروں رنگوں میں ڈھلنے کے باوجود ایک رنگ ایسا بھی آتا ہے جس پر اپنا تن من دھن واردیتی ہے... جسے ٹوٹ کر چاہے اس کی خاطر ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے اور مسکراتی ہے... محبت آسمانوں پر... بہت اونچے مکانوں پر حسین اک گیت گاتی ہے۔ یہی ایک عورت کی کہانی ہے۔ کہیں الجھی ہوئی ریشم، کہیں سلجھی ہوئی ڈوری۔

رجنی پنیل
کانچے
چوراسی



کہ دو ادارہ ہوتا وہ منہ سے جھاگ اڑاتا، بھگوان کو پکارتا م گیا۔ اس کے بعد سے ہی کچی دکان کو راجو جی نے سنبھال لیا تھا، ایک بوڑھی ماں تھی جو گھر پر برتن مانتی اور کھانے پکانے میں مصروف رہتی تھی۔ بچی کے مرنے کے بعد اس کے ہونٹوں پر بھی چھڑی سی جھنے لگی۔ بچھڑنے والے جنم جنم کے ساتھی کا روگ اسے اندر ہی اندر کھل رہا تھا۔

کہنے کو تو راجو کبڑی ہی تھا لیکن گاؤں کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اس کی حیثیت کم نہیں تھی۔ صبح سے شام تک وہ پرانا سا بان فروخت کر کے اتنا کما لیتا تھا جو دفتر میں کام کرنے والے کسی بابو کی دو تین دن کی پگڑ سے بھی زیادہ ہوتا تھا۔ اچھے مکان میں رہتا تھا، اچھا کھانا پیتا اور پہننا تھا لیکن جب گاؤں والے اسے راجو کبڑی کے نام سے آواز دیتے تو اسے یوں لگتا جیسے بھرے بازار میں اس کے اچلے پھڑوں پر کسی نے ہولی کی پچکاری مار دی ہو۔ وہ ایسے موقعوں پر زبردستی اپنے ہونٹوں پر ایک مسکان ضرور سجالتا تھا پر تو اندر اندر ہی اپنے کی آگ کے انوسار بڑی دیر تک سلگتا رہتا۔ خاص طور پر جب گاؤں کی لڑکیاں اسے کبڑی کہتیں تو اس کا من کرتا کہ انہیں بھرے بازار میں چت کر کے ان کا کبڑا کر دے۔ اس کا بھی ایک کارن تھا۔ گاؤں کے بہت سارے جوانوں کی طرح اس کی رال بھی کانتا کی ابھرتی جوانی پر پٹکتا شروع ہو گئی تھی۔

کانتا رکھو گوالے کی اکلوتی لڑکی تھی، گھر کا خالص دودھ، دہی اور تھرا ہوا مکھن کھا کھا کر اس پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا۔ راجو نے کئی بار سوچا کہ کسی طرح رکھو تک اپنی پسند کا سندیا بھیج کر کانتا کے گلے میں اپنے نام کی تختی لگوا دے لیکن بوڑھی ماں سے دل کی بات کہتے اسے جانے کیوں لاج سی آتی تھی۔ البتہ بھی وہ دلی زبان میں تندو سے کانتا کے بارے میں دو چار باتیں ضرور کر لیتا تھا۔

تندو کا نام بھی پہلے اچھا بھلا سریندر تھا لیکن اس کی دکان سے سائیکل کی پمپی ٹیوب کا پتھر لگوانے اور بھاڑے پر سائیکل لینے والوں نے اس کے اچھے بھلے سند نام کو سریندر ناتھ سے تندو بنا دیا تھا۔ سریندر اور راجو کی دکانیں ساتھ ساتھ تھیں۔ دونوں لگ بھگ ایک ہی عمر کے تھے اس لیے ایک دوسرے کے دوست بھی بن گئے تھے۔

راجو کی طرح تندو نے بھی اپنے آپ کو سینت کر نہیں رکھا تھا۔ اچھا خاصا گبرو جوان تھا اس لیے دو چار ادنی پونی لڑکیوں سے اس نے ناجائز سمبندھ قائم رکھا تھا۔ راجو نے کئی بار اسے اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ایک کان سے

سننا اور دوسرے سے اڑا دیتا۔ ایک دن راجو نے اسے بن کر اچلی ڈگر پر لانے کی کوشش کی۔ ”دیکھ تندو..... یہ جوجو ہے نا، یہ ایک بار جا کر واپس نہیں آتی، کسی ہرجائی ناری کی طرح روٹھ جائے تو اسے منانا بھی منس کے بس میں نہیں ہوتا۔ میری بات مان تو کسی ایک کو پسند کر کے اس سے رشتہ جوڑ لے۔ ادھر ادھر منہ مارنے سے بدنامی بھی ہوتی ہے۔ کسی دن رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تو بنی بنائی عجت بھی مٹی میں مل جائے گی۔ گاؤں کے سارے لوگ بھی تھو تھو کریں گے۔“

”میں تیری بات سمجھتا ہوں راجو..... بڑا ابلہ ہے بیت گیا۔“ تندو نے کسی دیس کے غیتا کی طرح مسکرا کر جواب دیا۔ ”من پسند کر سی ہاتھ سے نکل جائے تو ہارنے والا ہمیشہ ہاتھ مل کر رہ جاتا ہے۔ ایکشن میں سلیکشن نہ ہوتو منس کے اندر کی تمام منو کا منائیں بھی ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں چڑھتے ندی نالے ایک بار گھاٹ سے منہ موڑ لیں تو گھاٹ سداسونا سونا ہی رہتا ہے۔“

”ایک بات بتا تندو؟“ راجو نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تو نے اتنی بڑی بڑی باتیں کہاں سے سیکھ ہیں؟“

”ان ہی ہرنیوں سے سیکھی ہیں جن سے تو دامن چھڑانے کا بھاشن دے رہا ہے۔“ تندو نے ایک آنکھ جھپکا کر کہا تو راجو دنگ رہ گیا۔ کچھ دیر اسے ٹوٹتی نظروں سے دیکھتا رہا پھر دلی زبان میں پوچھا۔

”تیرے من میں کون سی تھی جو اب ہاتھ سے نکل گئی؟“

”پہلے دھن دے، تو یہ بات زبان سے نہیں نکالے گا۔“ تندو کا چہرہ ایک دم ہی مرجھا سا گیا۔

”سورگ باسی پتا کی سوگند..... تیری کئی بات میرے ساتھ ہی چتا کی آگ میں جل بھن کر راکھ ہو جائے گی۔ میری بات کا دوش اس کر۔“

تندو کچھ دیر گم سم رہا، گونگا بنا آکاش کو نکلتا رہا پھر کسما کر بولا۔

”وہ..... اس کا نام..... جیوتی تھا؟“

”تھا سے تیرا کیا مطلب ہے؟..... جیوتی تو اب بھی جیوتی ہے۔“ راجو نے پلکیں جھپکائیں۔ ”بچوں کی نظر سہیلیوں کے ساتھ ادھر ادھر اچھلتی پھرتی ہے، صورت دل میں بھی بہتوں سے بہتر ہے۔“

”ہے تو سہی لیکن اب اس میں وہ ماڑ نہیں رہا جو کور لٹھے میں ہوتا ہے۔“

”کھل کر بات کر..... تیری پہیلیاں اپنے آپ سے نہیں پڑ رہیں۔“ راجو نے چڑ کر کہا۔ ”پھر میرے تیرے بیچ کوئی پردہ بھی نہیں ہے۔ تو جانتا ہے کہ لچھے دار باتیں مجھے نہیں چھتیں۔“

”ساری بات اسی پردے کی ہے میرے بھولے ادشاہ۔“ تندو نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ٹھنڈی کے کپڑے کی چمک دمک کیول اس سے تک رہتی ہے جب تک اسے گھر پر دھیان سے دھویا جائے، ایک بار وہ کسی دھوپ کی گھاٹ کے پتھر پر سر سے اونچا ہو کر ”ہی ہا ہا“ کی آواز سے بچھاڑ کھالے تو ساری چمک دمک.....“

”یہ تو کیا بکواس کر رہا ہے.....؟“ راجو نے اس کی بات سمجھتے ہوئے چمک کر پوچھا۔ ”جیوتی کے لیے جو شہر تیری زبان سے نکل رہے ہیں۔ اگر اس کی ماں یا کسی اور کے کانوں تک پہنچ گئے تو وہ تجھے آسانی سے شا بھی نہیں کریں گے۔“

”اس کی ماما نے سب لیپا پوتی پہلے ہی کر دی ہے۔“ تندو نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے چباتے ہوئے کہا۔

”گاؤں کی سب سے پرانی اور گھاگ دانی ہے، اپنی چھوری کاروگ جانتے ہی اس نے ایسی کوئی جڑی بوٹی اسے گھول کر پلا دی ہے کہ اس کی کوکھ کبھی ہری نہیں ہوگی۔ اب جہاں پہا ہے..... بیچ لڑاتی پھرے سالی۔ خطرے کی گھنٹی دوبارہ نہیں بجے گی۔“

”تو سچ کہہ رہا ہے.....؟“

”ہاں..... کچے کرپلے کی طرح کڑوا سچ۔“ تندو کے ہونٹوں پر ایک اربانوں بھری مسکان تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔

”پر..... تجھے اتنے اندر کی بات کی بھنک کیسے ملی؟“

”کوئی اور بات کر راجو.....“ تندو نے جھنجھلا کر کہا پھر بڑی رازداری سے بولا۔

”میں تیرا متر ہوں راجو۔ تیرے اردے کے سمیتر جو پودا جڑیں مضبوط کر رہا ہے میں نے اسے بھی تازہ کیا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تیرا.....؟“ راجو پٹپٹا کر رہ گیا۔

”یاروں سے کیا چھپانا میری جان کے چوتھائی گھوڑے۔“ تندو نے راجو کے قریب کھسک کر دم آواز میں کہا۔ ”میرے سر پر ہاتھ دھر کر قسم اٹھا..... کیا تیرے من میں کانتا کو دیکھ کر کھد بد نہیں ہوتی.....؟“

”ہوتی تو ہے پر..... پر رکھو شاید میرا رشتہ سوینکار کرنے میں چھر چھر ضرور کرے گا۔“

”کیوں..... کیا کی ہے تیرے اندر؟“

”بات کی کی نہیں ہے لیکن جب جانے پہچانے لوگ لکھ کھاڑیا کہتے ہیں تو خود مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔ رکھو تو پھر

کانتا کا پتا ہے۔“ راجو نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اس کے علاوہ میرا کوئی بڑا بھی نہیں جو رکھو سے بات چھیڑ کر اس کے من کا بھید بھاڑ جان سکے۔ ایک بار اس نے منہ کھول کر ”نا“ کہہ دی تو میرے سینے بھی ٹوٹ جائیں گے۔“

”تو بنسی کا کا کے آگے زبان کھول کر انہیں بیچ میں ڈال کر دیکھ۔“ تندو نے رائے دی۔ ”بنسی کا کا تیرے پتا کے متر بھی تھے اور رکھو سے بھی ان کی گاڑھی چھنتی ہے۔“

”کہتا تو ٹھیک ہے لیکن بنسی کا کا کے سامنے میری زبان نہیں کھلے گی۔“

”ماسی تو بات چھیڑ سکتی ہے۔“ تندو نے چمک کر کہا پھر راجو کی کسمساہٹ دیکھ کر جھلا گیا۔ ”سمجھ گیا..... تو نے شاید ابھی تک ماسی سے بھی من کا بھید چھپا رکھا ہے..... کیوں؟“

راجو نے اقرار کر لیا تو تندو نے ادھر ادھر دیکھ کر بڑی رازداری سے کہا۔

”میری بات دھیان سے سن لے راجو..... جو لوگ سیانے ہوتے ہیں وہ تازہ کے پھل کے نیچے رات ہی سے ہانڈی باندھ کر اس میں تک لگا دیتے ہیں اور سویرے سویرے سورج نکلنے سے پہلے ہی ہانڈی میں جمع سارا رس ڈکار جاتے ہیں۔ اس رس کو نیرا کہتے ہیں۔ نیرا منس کو سدا جوان رکھتی ہے۔ پر تھو اگر اسی رس کو سورج مہاراج کی ایک کرن بھی چھو لے تو وہ تازی بن جاتی ہے اور تازی کا نشہ سب سے خراب ہوتا ہے۔ اچھا بھلا مرد چھڑو سن کر رہ جاتا ہے۔“

”تیرا بھاشن میرے لیے نہیں پڑا، یہ میرے اور کانتا کے رشتے کے بیچ نیرا اور تازی کہاں سے آگئی؟“

”سمجھنے کی کوشش کر میرے یار۔“ تندو نے سرد آہ بھری۔ ”اپنی جیوتی کو بھی سورج کی کرن چھو گئی تھی۔ جیوتی تو اس کے قدم ڈمگا گئے تھے۔“

”جب تیرے من سے اس کا دھیان نکل چکا ہے تو دل سے نکل بھی نکال دے میرے یار۔“ راجو نے ہمدردی کا اظہار کیا تو تندو مسکرا کر بولا۔

”نکل کی بھی تو نے بھلی کہی۔ میں نے گنگا بہتی دیکھی تو اپنے ہاتھ بھی دھو لیے۔“

”تجھے شرم نہیں آئی اس کے بدن کو ہاتھ لگاتے؟“

”جب اس کو ناری ہو کر لاج نہیں آتی تو میں کس بات کی شرم کرتا؟“ تندو نے ڈھٹائی سے جواب دیا پھر بولا۔

”نرکھ میں ڈال جیوتی کو۔ تو کانتا سے رشتے کی بات کر..... ہمیں کوئی نہ کوئی اپائے تو کرنا ہوگا۔ اگر رکھو نے اس کا نانا کہیں اور پکا کر دیا تو پھر مجھے بھی دکھ ہوگا۔ تیری اور کانتا کی

جوڑی بن جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن بنی کا کا اور ماتاجی سے بات کون چھیڑے گا؟“

”سمجھ گیا راجو..... تو بچی پکائی کھانا چاہتا ہے۔“ نندو ایک پرانے گا ہک کو دکان پر کھڑا دیکھ کر پڑے جھاڑتا ہوا اٹھ گیا۔ ”چنانہ کر۔ اب میں ہی کوئی نہ کوئی چکر چلانے کی کوشش کروں گا۔“

نندو چلا گیا تو راجو گھٹے کے ساتھ رکھی پرانی کرسی کے گدیلے سے ٹیک لگا کر کانتا کے سپنوں میں گم ہو گیا۔

ساوان کے آتے ہی بڑے میدان میں خیم کے پرانے درخت پر جمولے پڑ گئے تھے، گاؤں کی لڑکیاں شام کے وقت ادھر ہی جمع ہو کر من بہلایا کرتی تھیں۔ اس سے جمولوں پر لڑکیاں پتلیں بڑھا کر ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی دھن میں گن گنیں کچھ لڑکیاں تالیاں پیٹ پیٹ کر ان کو جوش دلارہی تھیں، آپس میں ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ بھی جاری تھی۔ سہانی رات میں الہڑ لڑکیوں کے جوان فہمبوں نے موسم کو بھی نکھار دیا تھا۔ اس ہنگامے سے تھوڑی دور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی ماسٹر سیتا رام کی اکلوتی بیٹی بندیا اپنی سہیلی جننا سے کہہ رہی تھی۔

”کانتا کل بھی نہیں آئی تھی..... آج بھی نظر نہیں آ رہی۔ تو نے بھی کچھ سنا ہے اس کے بارے میں؟“

”کیوں..... تو نے ایسی کیا بات من کی جو تیرے پیٹ میں مروڑاٹھ رہی ہے؟“ جننا نے بندیا کو حیرت سے گھورا۔

”بات ایسی ہی ہے کہ تو سننے کی تو تیرے من میں بھی ہوک اٹھے گی۔“ جننا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ابھی اس کے جھاڑ میں کیریاں پک کر آم بھی نہیں ہوئیں اور پتھر آنے لگے اور ہم دونوں ابھی تک اس لگائے بیٹھے گزارا کر رہے ہیں۔“

بندیا کل کھلا کر ہنس دی۔ ”تو ماسٹر کی بیٹی ہے نا۔ اسی لیے تجھے ایسی چٹ پٹی باتیں کرنا بھی آگئی ہیں۔ دیسے کانتا کے گھر پتھر آنے والی بات تو نے کب اور کہاں سنی؟“

”سچ کیا ہے یہ تو کانتا ہی بتائے گی۔ پر میرے کان میں یہ بھنک پڑی ہے کہ بنی کا کا اور رگھو بابا کے درمیان دو روز سے کچھ کچھڑی پک رہی ہے۔“

”پھر تو ریش کے بھاگ ہی کھلنے کی بات ہوگی۔“ جننا نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے ہوا میں تیر چلایا۔ ”تو بھی جانتی ہے کہ ریش کی رال اپنی کانتا پر ٹپک رہی ہے۔ کانتا کا جھکاؤ بھی ادھر ہی لگتا ہے۔ دونوں کا آپس میں آنکھ مٹکا

بھی چل رہا ہے۔“

”بات کانتا کے جھکاؤ کی نہیں..... بنی کا کا کی ہے بندیا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر ریش کا چکر ہوتا تو اس کا بھی رگھو بابا کے پاس جاسکتا تھا۔ بنی کا کا کوچ میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”پھر تیرے خیال میں اور کون ہو سکتا ہے.....؟“

”پورے دھواں سے کچھ نہیں کہہ سکتی پر تو ہو سکتا ہے کہ راجو کباڑیے کی قسمت جاگنے کی بات ہو۔“

”تیرے دھیان میں راجو کا نام کیسے آگیا؟ اپنی کا تو ریش کو من میں بسانے کے سینے دیکھ رہی ہے۔“

”سننے کی بھی ایک کہی تو نے۔“ بندیا نے بچل کر جواب دیا۔ ”اگر ہم لڑکیوں کے سینے پورے ہونے لگیں تو پھر رونا کس بات کا ہے.....؟ ہم تو کھونٹے سے بندھی بیڑ بکریوں کے انوسار ہوتے ہیں، ماتا پتا اپنا ادھیکار پورا کرتے ہیں تو ہم بے زبان جانوروں کی طرح ان کی مرضی ہانک دے جاتے ہیں۔“

”لیکن راجو والی بات من کو نہیں چھتی۔“

”تو یہ کیوں بھول رہی ہے کہ بنی کا کا نے مرتے سے جیون چاچا کو دین دیا تھا کہ وہ اس کی چتا جلنے کے بعد اس کے گھر والوں کا پورا پورا دھیان رکھے گا۔ راجو کی ماتا پتی کے مرنے کا روگ لگائے کھٹیا سے لگی اپنے نمبر کا انتظار کر رہی ہے۔ راجو کے لیے اس نے ہی بنی کا کا کوچ میں ڈالا ہوگا۔“

”بندیا.....“ جننا نے بندیا کو گھورتے ہوئے اسے کھوجنے کی کوشش کی۔ ”کیا اب تو مجھے بھی باتوں میں الجھانے کی کوشش کرے گی؟“

”یہ دھیان تیرے من میں کیسے آیا؟“

”جو بات تو کہہ رہی ہے تجھے بنی کا کا نے تو نہیں بتائی.....؟ سچ بتا، تیرے کان میں اس کی بھنک کیسے پڑی؟“

اپنا جملہ پورا کرتے کرتے جننا نے بندیا کے بھرے بھرے کو لپے پر اس زور کی چٹکی بھری کہ بندیا تھلا کر رہ گئی۔

”دیکھ جننا، میں تجھ سے پہلے بھی گئی بار.....“

”سچ اگل دے ورنہ۔“ بندیا کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی جننا نے اس کے دوسرے کو لپے کی طرف ہالو بڑھایا تو بندیا نے جلدی سے ہتھیار ڈال دیے۔ کسسا مدھم سروں میں بولی۔

”وہ..... وہ..... دراصل مجھے جیوتی نے بتایا تھا۔“

”اب سمجھی۔“ جننا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ماں طرح اب جیوتی نے بھی دوسروں کا پیٹ کھنگالنا شروع

ا ہے۔“

”تجھے میری سوگند جننا.....“ بندیا نے ہاتھ باندھ لیے۔ ”تو یہ بات کسی اور سے نہ کہنا۔“

پھر جننا کوئی جواب دیتی، اس سے پہلے ہی کانتا دور سے آتی نظر آگئی۔ جننا نے کانتا کو لہراتے، بل کھاتے چلتے دیکھا تو دبی زبان میں بندیا سے کہا۔ ”کانتا ریش سے من لگا کر آگ سے ٹھیل رہی ہے۔ تو بھی جانتی ہے کہ ریش دکنے میں جتنا بھکاری نظر آتا ہے، اندر سے اتنا ہی راکش بھی ہے، کئی دس نمبری پٹھو پال رکھے ہیں اس نے، اگر اس کی وال نہ لگی تو وہ راجو کی بیل بھی منڈھے نہیں چڑھنے دے گا۔

ناری کی عزت بھی کسی چم چم گاڑی کے انوسار ہوتی ہے۔ ایک واری غلط ہاتھوں چڑھ جائے تو پھر وہ پہلے ہی رگڑے میں اس کے سارے رنگ پٹنن نا کارہ کر دیتا ہے پھر..... وہ سارا جیون کسی کھٹارا گاڑی کی طرح دھواں دیتی رہتی ہے۔“

بندیا نے جننا کی بات سن کر اسے حیرت سے گھورا لیکن کانتا کے قریب آنے کی وجہ سے اس کے دل میں رنگ پٹنن والی بات کا کھنچ لگانے کا ارمان پورا نہ ہو سکا۔

”کہاں بھی میری رانی.....؟“ بندیا نے کانتا سے پوچھا۔ ”کل بھی تیرے درشن نہیں ہوئے۔“

”کل بابو باڑے کی صفائی کر رہا تھا، میں بھی اس کا ہاتھ بٹانے میں لگی رہی۔“

”سنا ہے ادھر بنی کا کا تیرے گھر کے کئی چکر لگا چکا ہے؟“ جننا نے ذرا ٹکا کر پوچھا تو کانتا نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”پتا جی کا لنگوٹیا ہے اس لیے آتا جاتا رہتا ہے۔ تجھے اس سے بنی کا کا کا دھیان کیسے آگیا؟“

”چل چھوڑ..... تو نہیں بتانا چاہتی تو جانے دے۔“

ہمانے ہونٹوں پر مسکان سجا کر چباتے ہوئے کہا۔ ”آج جو ہانڈی میں ہے وہ کل ڈوکی میں بھی آجائے گا۔“

”کیا مطلب.....؟“ کانتا چونکی۔ ”یہ تو نے ہانڈی اور ڈوکی والی بات کیوں کی؟“

”میں تیری پرانی سکھی ہوں میری جان اس لیے تجھے لول رہی تھی۔“

”پرٹھو لے کا کوئی کارن بھی تو ہوگا۔“ کانتا اور سنجیدہ ہوئی تو جننا نے بے پروائی سے کاندھے اچکا کر کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ پھر کسی دشمن نے بے پرکی اڑا دی۔“

”لیکن کچھ پتا تو چلے کہ آخر بات کیا ہے؟“

کچھ کچھ

ایک پاکستانی، ایک روسی اور ایک امریکی اکٹھے سفر کر رہے تھے۔ تینوں ایک دوسرے کو اپنے اپنے ملک کی باتیں بتا رہے تھے۔ روسی بولا۔ ”میرے ملک میں ہوائی جہاز آسمان سے لگ کر چلتے ہیں۔“

امریکی اور پاکستانی حیران ہوئے اور بولے ”کیا بالکل آسمان سے لگ کر اڑتے ہیں؟“

روسی نے جواب دیا۔ ”بھئی بالکل تو نہیں، البتہ آسمان سے تھوڑا سا نیچے۔“

امریکی فوراً بولا۔ ”میرے ملک میں بحری جہاز سمندر کی تہ سے لگ کر چلتے ہیں۔“

یہ سن کر روسی اور پاکستانی دونوں بولے۔ ”کیا بالکل سمندر کی تہ سے لگ کر چلتے ہیں؟“

”نہیں، تہ سے کچھ اوپر چلتے ہیں۔“

پاکستانی دونوں کی باتیں سن کر تپ گیا اور بولا۔ ”بھئی تم دونوں نے کوئی ایسی خاص بات نہیں بتائی، میں تمہیں اپنے ملک کی ایک خاص بات بتاتا ہوں، میرے ملک میں لوگ باگ ناک سے کھانا کھاتے ہیں۔“

یہ سن کر امریکی اور روسی کو بڑی حیرت ہوئی اور دونوں نے یکدم کہا۔ ”بھئی کمال ہے! کیا تمہارے لوگ بالکل ناک سے کھانا کھاتے ہیں؟“

پاکستانی نے جواب دیا۔ ”ناک سے نہیں، ناک کچھ نیچے۔“

☆☆☆

ایک میاں بیوی میں اتنی ناچاقی بڑھی کہ طلاق کی نوبت آگئی۔ طلاق ملنے کے بعد عورت کی سہیلی نے پوچھا۔ ”تمہارے دونوں لڑکوں کا کیا فیصلہ ہوا؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”ایک میرے پاس ہے اور ایک میرے شوہر کے پاس۔“

سہیلی نے دوسرا سوال کیا۔ ”اور بینک بیلنس کا کیا ہوا؟“

عورت نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ ”آدھا میرے شوہر کے وکیل کے پاس اور آدھا میرے وکیل کے پاس۔“

مرسلہ: قاطعہ ہنت خجہ، میلی

”میں بتاتی ہوں۔“ بندیا نے ہاتھ تھام کر کانٹا کو قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ستا ہے کہ بنی کا کا اور تیرے پتا کے بیچ، تیری اور راجو کی پھڑکی یک رہی ہے۔“

”دماغ چل گیا اس پاگل کا جس نے یہ خبر اڑائی ہے۔“ کانٹا چمک اٹھی۔ ”میں اور اس کباڑیے کو منہ لگاؤں گی، کیا گاؤں کے باقی سارے جوان مر گئے ہیں؟“

”ناراض مت ہو رانی۔“ جتنا نے اس کے قریب کھسک کر کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ کسی نے جھوٹ گھڑ لیا ہو۔ ہم نے تو تیرے بھلے کے لیے ایک سنی سنائی بات تیرے کان میں ڈال دی۔“

”راجو کباڑیے کے ساتھ میری لگن کی بات ہو۔۔۔۔۔۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ کانٹا نے سینہ تان کر اپنا فیصلہ سنایا۔ ”مر جاؤں گی، پر اس کے ساتھ کبھی اگنی کے پھیرے نہیں لگاؤں گی۔“

”یہ مرنے مرنے کی بات رہنے دو میری رانی۔ ہم آنگن کی چڑیا ہوتے ہیں، کیول بننے دیکھ سکتے ہیں، پر ہوتا وہی ہے جو ماتا پتا ملے کر دیتے ہیں۔ سدا سے یہی ریت چلی آ رہی ہے۔“

دو تین سکھیاں اور قریب آنے لگیں تو بات ادھوری رہ گئی، کانٹا بھی دل کی بھڑاس نہ نکال سکی لیکن اس کے تیور بتا رہے تھے جیسے راجو والی بات نے کسی زہریلے پھوکی طرح اس کے شریر پر ڈنک مار دیا ہو۔

رگھو باڑا ٹٹا کر چراغ جلنے کے بعد گھر پہنچا تو بیوی سامنے ہی تخت پر بیٹھی اس کی راہ تک رہی تھی۔ ”آج بڑی دیر کر دی۔“ اس نے پتی سے پوچھا۔

”تیرے پاس گھر میں نہ کوئی کھڑی ہے نہ کھٹنا پھر۔۔۔۔۔۔“

”جھے دیر سویر کی خبر کیسے ہو جاتی ہے؟“ رگھو نے پتی کو غور سے دیکھا جو عمر ڈھلنے کے باوجود اب بھی گاؤں کی ہم عمر عورتوں سے زیادہ سندر دکھائی دیتی تھی۔

”جھے آج اس بات کا دھیان کیسے آگیا؟“ اس نے پتی کو شکایت بھری نظروں سے دیکھا۔ ”میں تو ہمیشہ تیری راہ نکلتی رہتی ہوں۔ جب تک تو نہ آجائے مجھے چین نہیں آتا۔“

”بیچ کہہ رہی ہے؟“ رگھو کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تو وہ نظریں منکا کر بولی۔

”چل۔۔۔۔۔۔ بھوجن کر لے۔ اس عمر میں اب یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔“

”عمر کی بھی بھلی کبھی تو نے۔“ رگھو نے لپک کر اس کا

ہاتھ تھام لیا۔ سر سراتے لہجے میں بولا۔ ”میرے لیے تو تواب بھی وہی ہے جو پہلی رات کوئی۔ ایک بات اور بتا دوں۔ مرد اور گھوڑے کبھی پوڑے نہیں ہوتے، چارہ ملا رہے تو ہمیشہ جوان ہی رہتے ہیں۔“

”کیا بات ہے۔۔۔۔۔۔ آج تو نے کہیں سروسوں کا کھیت تو نہیں دیکھا؟“

”تیرے بغیر سروسوں کا کھیت بھی سونا ہی سونا لگے گا۔۔۔۔۔۔ چل، اندر چل کر باتیں کرتے ہیں۔“ اس نے پتی کو لاڈ سے کمرے کی طرف چلنے کو کہا تو وہ شرما کر بولی۔

”پہلے چل کر بھوجن کر لے۔۔۔۔۔۔ خالی پیٹ تو ڈانگر بھی دولتی نہیں جھاڑتے۔“

”چھوڑ بھوجن کو۔۔۔۔۔۔“ رگھو نے پتی کا جواب سنا تو موج میں آ کر بولا۔ ”آج جھے اس بات کا دشواں پھر دلا دوں کہ میں۔۔۔۔۔۔“

”دماغ تو نہیں چل گیا تیرا۔“ پتی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے شرما کر کہا۔ ”گھر میں جوان چھوری بیٹھی ہے اور تو اپنا موج میلا کرنے کی راگنی الاپنے کی سوچ رہا ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔۔ چل، اندر تو چل۔۔۔۔۔۔“ جھے سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

دونوں اندر آگئے تو رگھو نے بستر پر کمر سیدھی کرتے ہوئے پوچھا۔

”اپنی کانٹا کہاں ہے۔۔۔۔۔۔؟“

”اپنے کمرے میں۔۔۔۔۔۔ کیوں؟ جھے اس سے کانٹا کیسے یاد آگئی؟“ وہ رگھو کے ساتھ ہی سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”آج اپنا یار بنی آیا تھا۔ میں نے باڑے میں بھوجن بھی اسی کے ساتھ کر لیا ہے۔“

”کوئی خاص بات؟“

”ہاں۔۔۔۔۔۔ وہ اپنی کانٹا کے لیے ایک رشتے کی بات کر رہا تھا۔“

”کون ہے۔۔۔۔۔۔؟“ وہ رگھو کے قریب ہو گئی۔

”نام جاننے سے پہلے ایک بات دھیان سے من لے۔“ رگھو نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ”بنی نے جس کی بات ڈالی ہے وہ مجھے بھی پسند ہے۔ اچھا کھانا کھاتا ہے۔ گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں نیک اور سیدھا سادا بھی ہے۔ شکل صورت کا بھی دھیوں سے بہتر ہے۔“

”نام بھی تو بتا۔۔۔۔۔۔ یا کیول کن ہی گنوا تار ہے گا۔“

”میں جیون لال کے پتر ارجن کی بات کر رہا ہوں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔۔ راجو کباڑیا۔۔۔۔۔۔“ اس نے شوہر کو حیرت

سے گھورا۔

”کیوں؟۔۔۔۔۔۔ تو راجو کا نام سن کر کس و چار میں گم ہو گئی؟“ رگھو نے پتی کے چہرے کے بھید بھاؤ کو گہری نظروں سے ٹٹوٹا۔

”لڑکا برا نہیں ہے پر تو۔۔۔۔۔۔ گاؤں کے سارے لوگ اسے کباڑیا ہی کہہ کر آواز دیتے ہیں۔ یہ بات کانوں کو بھلی نہیں لگتی۔“

”مجھے بھی بہت سارے سگی ساتھی رگھو کو الا کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ میں نے تو کبھی برا نہیں منایا۔ کوالا ہونا کوئی گالی بھی نہیں ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔۔۔۔۔۔“

”یہ لیکن ویکن چھوڑ بھاگوں۔۔۔۔۔۔ یہ بتا کہ راجو جھے کیسا لگتا ہے۔۔۔۔۔۔؟ یہ بھی سوچ لے کہ بات میرے یار بنی نے ڈالی ہے۔“ رگھو نے الفاظ جما جما کر کہا۔ ”راجو کے سر پر کسی بڑے کا ہاتھ بھی نہیں ہے، رگھو کی پتی بھی کھٹیا سے لگی ہے، گھریا کہنے میں کوئی بڑا بھی ایسا نہیں ہے جو روک ٹوک کرے۔ اپنی کانٹا وہاں جا کر مہارانیوں کی طرح راج کرے گی۔“

رگھو کی پتی نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، کسی و چار میں گم ہو گئی۔ رگھو کی نظریں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو تنک رہی تھیں۔ کچھ دیر تک وہ پہلو بدلتی رہی پھر مدھم لہجے میں بولی۔

”میں کانٹا سے بھی بات چھیڑ کر دیکھتی ہوں۔ اس کے من کا بھید لینا بھی ضروری ہے۔“

”اور اگر اس نے منڈیا ہلا کر ایک بار۔۔۔۔۔۔ نا، کر دیا تو۔۔۔۔۔۔؟“ رگھو کے ماتھے پر ٹپ پڑنے لگے۔

”پھر تو ہمیں کوئی بیچ کا راستہ نکالنا ہو گا۔“

”تو کھل کر بات کر۔“ رگھو نے ذرا سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کیا کانٹا کسی اور کو پسند کرتی ہے؟“

”اس نے اپنے من کا بھید کبھی میرے سامنے نہیں کھولا لیکن جوان لڑکی ہے۔ اس کی مرضی معلوم کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“

رگھو نے ایک بار پھر پتی کو اپنی تجربے کار نظروں سے دیکھا۔ اس نے دنیا دیکھ رکھی تھی، دن بھر بھانت بھانت کے اٹلے سیدھے گا بکوں کو ٹٹنا تار بٹاتا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ لڑکیاں باپ کے بجائے ماں کے زیادہ قریب ہوتی ہیں، ان کے جیون میں آنے والی ہر نئی بات کی بینک سب سے پہلے ماں کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ اس سے بھی رگھو کچھ دیر اپنے من

میں سوچ و چار کرتا رہا پھر دلی زبان میں بولا۔

”تو ماں ہے اس کی۔۔۔۔۔۔ کچھ نہ کچھ تو اندازہ ہو گا جھے؟“

”میں پورے دشواں سے نہیں کہہ سکتی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ بالی عمر میں لڑکیاں سننے بھی دیکھتی رہتی ہیں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ ہر سینا پورا نہیں ہوتا۔ بھوش میں جو لکھا ہو، وہی پورا ہوتا ہے۔“ رگھو کی پتی نے کسمسا کر کہا۔ ”بیچ کیا ہے یہ بھگو ان ہی جانتا ہے لیکن ایک بار مجھے شبہ ہوا تھا کہ اپنی کانٹا کا جھکاؤ کچھ کچھ ریش کی طرف ہے۔“

ریش کا نام پتی کی زبان پر آیا تو جیسے رگھو کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پتی کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

”دوبارہ اس کتے کا نام تیری زبان سے کبھی نہ نکلے۔ تو نہیں جانتی پر میں جانتا ہوں۔“ رگھو منہ سے جھاگ اڑاتا رہا۔ ”پچھلے دنوں میرے باڑے سے جو گائے چوری ہوئی تھی اس میں بھی اسی بیچ ذات اور اس کے لنگے گرگوں کا ہاتھ تھا، مجھے کھوجیوں نے یہی خبر دی ہے۔ جس دن بھید کھل گیا اسی دن ہمارے باڑے میں چا کر کی کرنے والے سارے بٹے کٹے سا نڈا اصل چور اور اس کے سارے کنبے کی عورتوں کو گامجن کرنے میں دیر بھی نہیں کریں گے۔ ملی بھگت کرنے والوں کا بھی رام رام ست ہو جائے گا اور۔۔۔۔۔۔“ رگھو نے مل کھا کر کہا۔ ”کانٹا کو بھی یہ بتا دینا کہ میں جنم جنم کا گولا ہوں، پرکھوں سے یہی کام ہوتا چلا آیا ہے۔ میں بڑی بڑی اڑیل گائے اور بھینسوں کو بھی قابو کرنا جانتا ہوں، اپنی کانٹا تو ابھی بچھیا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے بھگو ان نہ کرے، اس کی چتا کو آگ تو دکھا سکتا ہوں لیکن کسی۔۔۔۔۔۔ کے ساتھ لگن منڈپ کی پوتر گئی کے پھیرے لگانے کی اجازت کبھی نہیں دے سکتا۔“

”ایسی بری باتیں زبان سے کیوں نکال رہا ہے؟“ رگھو کی پتی نے اس کا متھا گرم ہوتے دیکھا تو بات کو سنبھالنے کے کارن بولی۔ ”مجھے کیول ایک شبہ تھا جو زبان سے نکال دیا۔ بیچ کیا ہے؟ اس کا پتا تو کانٹا کو ٹٹولنے کے بعد ہی چلے گا۔“

”ٹٹولنے اور کھوجنے کی بات اب دکرنا۔“ رگھو نے اپنا آخری فیصلہ سنایا۔ ”میں نے بنی سے ابھی کئی بات نہیں کی تھی، مذاق میں اتنا ضرور کہا تھا کہ لگن کی تاریخ کرتے سے ایک امرتسری بھینس راجو کو دینی پڑے گی لیکن اب تو نے ایک کنجر کا نام لیا ہے تو پھر میں بنی کو کل ہی بلا کر راجو کے لیے زبان بھی دے دوں گا۔“

”جو تیرا من چاہے کر لیکن میرے اوپر گری کیوں کھا رہا ہے۔“ جتنی نے رگھو کی دھمکی رگ چھیڑنے کے کارن اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ”آج بہت دنوں بعد تیری واپسی کی راہ تک رہی تھی اور تو نے سارے کا سارا مزہ کر کر کر دیا۔“ رگھو نے جتنی کا جواب سنا تو ایک دم ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ لگاؤٹ بھری آواز میں کہا۔ ”تو نے نام ہی ایسا لیا تھا کہ میری کھوپڑی الٹ گئی۔ ورنہ سچ پوچھ تو پاڑے سے چلتے ہوئے میرا من بھی آج بھنگ گھوٹنے کو گھر رہا تھا۔“

”بس جانے وے۔۔۔۔۔ منہ دیکھے کی باتیں کر رہا ہے۔“ وہ رگھو کو جواب دے کر اٹھلاتی ٹل کھاتی بستر پر پھیل کر لیٹ گئی۔

.....

دن بھر گاؤں کو نمٹاتے نمٹاتے اس روز راجو کچھ زیادہ ہی تھک گیا تھا، رات کے آٹھ بجے تو اس نے گیس جی کو دکان کے دروازے کی اوپری چوکھٹ سے لگے ہک سے اتار کر ایک طرف رکھا پھر دکان بڑھانے میں مصروف ہو گیا۔ آج اس کی بکری بھی اچھی خاصی ہوئی تھی۔ دکان کا سامان سمیٹ کر اس نے گیس جی بھجا کر اندر رکھی، دروازہ بند کر کے اسے تالا لگایا پھر جانے کے لیے قدم تول رہا تھا کہ گھنشیام اس کے راستے میں آ گیا۔

گھنشیام کو دیکھ کر راجو کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ریش کا ٹنگوٹیا تھا باپ کے مرنے کے بعد وہ بھی ریش کی طرح کٹی پتنگ کے مانند آوارہ لڑکوں کے ساتھ دن بھر ادھر ادھر نظریں سینکتا پھرتا تھا۔ ماں اسپتال میں کام کرتی تھی اس لیے اسے ملازمت کی ضرورت بھی نہیں تھی، دن بھر آوارہ گردی کرتا رات کو گھر جاتا تو ماں کی گالیوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑاتے ہوئے پیٹ کا تنور بے شرم بن کر بھرتا پھر آگن میں پڑی کھاٹ پر پاؤں پیار کر سو جاتا۔ ریش کا دست راست ہونے کی وجہ سے اس نے بھی گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں پر دھاک رکھی تھی، کنواری کنیا جس تو اسے دور سے ہی دیکھ کر راستہ بدل دیتی تھیں۔ اس نے بھی لڑکیوں کے ساتھ زبردستی چھیڑ چھاڑ بھی نہیں کی تھی لیکن جس دن سے جیوتی اور اس کے بارے میں کانا پھوکی شروع ہوئی تھی سب ہی نے اس سے کئی کترانا شروع کر دیا تھا۔ جیوتی نے خود کو کئی ساوتری ثابت کرنے کے کارن یہی کھٹا سناکی تھی کہ کھیت پر وہ سانچ ڈھلے فارغ ہونے لگی تھی کہ گھنشیام جانے کہاں سے آ گیا۔ جیوتی نے اس کی ہٹ دھرمی سے بچنے کی خاطر شور مچانے کی دھمکی دی تو گھنشیام نے جھاڑن نما ایک کورا کپڑا اس

کے منہ پر رکھ دیا جس میں نہ جانے کون سی تیز خوشبو تھی جو اس کی ناک سے دماغ تک پہنچی تو جیوتی کو کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ جب ہوش آیا تو گھنشیام اس کے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا، جیوتی پھر کر جانے کے لیے اٹھی تو اسے اپنی بے لباسی کا احساس ہوا۔ وہ سمٹ سمٹا کر دوبارہ بیٹھ گئی۔ گھنشیام اس کے شریر کوکتتا رہا پھر اس کا لباس اس کی طرف اچھال کر بڑی ڈھٹائی سے بولا۔

”لے۔۔۔۔۔ پھن لے اسے، پر اپنی زبان بند ہی رکھا ورنہ میں بھی تجھے کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑ دوں گا۔“

جیوتی کی اس کہانی پر اس کی سکھیوں کو دھواں نہیں آیا تھا اس لیے کہ اس کہانی سے پہلے وہ گھنشیام کو دیکھ کر جالے کیوں بھی سانس بھرتی تھی۔۔۔۔۔ اب بھی وہ گھنشیام کو دور سے آتا دیکھ کر اس طرح لپکا کر نظریں جھکا لیتی جیسے وہ کوئی لیرا نہیں بلکہ اس کا نیا نیا گھر والا ہو۔ اس کے بعد بھی اکثر لڑکیوں کے سچ جیوتی اور گھنشیام کے چپ چپ کر ملنے کی کہانیاں سنائی دینے لگیں۔ ایک دوبار گھنشیام کے ساتھ ریش بھی موچھوں پر تاؤ دیتا نظر آیا۔ اس کے بعد سے لڑکیوں نے جیوتی سے کترانا شروع کر دیا تھا، سب جانتی تھیں کہ ریش اچھے چال چلن والا نہیں ہے پھر یہ بھی مشہور ہو گیا کہ وہ اور گھنشیام نہ صرف لنگوٹیا ہیں بلکہ مل بانٹ کر کھانے کے عادی ہیں۔

بہر حال راجو نے گھنشیام کو سامنے کھڑا دیکھا تو بڑی رکھائی سے بولا۔ ”میں دکان بڑھا چکا ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو اب کل آتا۔“

”ہم ضرورت کی چیزوں کو مول بھاؤ کر کے خریدنے کے عادی نہیں ہیں۔“ گھنشیام کے مقابلے میں راجو زیادہ ہاتھ پاؤں کا بھاری بھر کم تھا اس لیے گھنشیام نے ذرا تپ تول کر کہا۔ ”جو چیز پسند آتی ہے اسے دوسرے طریقوں سے بھی حاصل کر لیتے ہیں۔“

”کل کر بات کر۔۔۔۔۔“ راجو نے اسے ترجیحی نظروں سے دیکھ کر کھرا انداز اختیار کیا۔ ”تو جانتا ہے کہ میں کھرا کام کرنے کا عادی ہوں، زیادہ لوگوں سے گھٹانا ملتا بھی پسند نہیں کرتا۔“

”لال پیلا کیوں ہو رہا ہے میری جان۔“ گھنشیام نے راجو کے تیور دیکھ کر کینچلی بدلی۔ ”میں تو تجھے بدھائی دینے کے کارن آیا تھا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کیول تندو کے ساتھ ہی تیری گاڑی گھنٹی ہے۔“

”بدھائی کس بات کی دے رہا ہے؟“ راجو نے بہ ہر چوری پر تل ڈال کر پوچھا۔

”گھر جائے گا تو تیرے من میں بھی لڑو پھوٹنے لگیں۔“ گھنشیام نے ہونٹ چباتے ہوئے کھٹی کھٹی آواز میں کہا۔ ”رگھو مہاراج نے آج بنسی کا کا کو پاڑے بلا کر تیری لاکھڑائی کی بات پکی کر دی ہے۔“

راجو اپنی سگائی کی بات طے ہونے کی خبر سن کر خوش رہا لیکن اس نے بھانپ لیا تھا کہ گھنشیام کیا کہنا چاہتا ہے، اس لیے ذرا چپچپے انداز میں پوچھا۔ ”کیا بدھائی والی اٹھ تو اگلے من سے کہہ رہا ہے؟“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ تجھے کس بات میں کھوٹ نظر آ رہی ہے؟“

”بات کھوٹ کی نہیں ہے گھنشیام۔“ راجو نے کھل کر کہا۔ ”تو بھی جانتا ہے کہ میں کبڑا ہوں، ٹیڑھی میڑھی چیزوں کو سیدھا کرنے کا سارا داؤ بیچ آتا ہے مجھے۔۔۔۔۔“

”آج تندو نے دکان جلدی بند کر دی شاید۔“ گھنشیام نے ذرا گھما پھرا کر اپنا مقصد بیان کیا۔ ”اس غریب کے ساتھ جو ہوا وہ بھی اچھا نہیں ہوا۔ اس کا اور جیوتی کا گھر مل جاتا تو۔۔۔۔۔“

”جلیبی کی طرح گھما پھرا کر باتیں مت کر۔۔۔۔۔“ راجو کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔ ”میں تیرے اس سے آنے کا کارن سمجھ رہا ہوں لیکن ایک بات میری بھی گانٹھ سے اٹھ لے۔ میں تندو نہیں، راجو کبڑا ہوں۔ بھتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے بجائے میں اپنے دشمن کے خون سے اشان کرنا زیادہ پسند کروں گا۔ یہی بات تو داپس جا کر اپنے ہوتے ساتوں کے کان میں بھی ڈال دینا۔ اب چل ہٹ راستے سے۔۔۔۔۔ بڑا آیا بدھائی دینے والا۔“

راجو سینہ تان کر اسے گھورتا ہوا چلا گیا تو گھنشیام سیدھا ریش کے پاس گیا جو آباوی سے دور ایک اجڑے مکان کے اندر بیٹھا اپنے گروں کے ساتھ تاڑی پینے میں مگن تھا۔

”تو کدھر چلا گیا تھا؟“ ایک ساتھی نے پوچھا۔ ”میں مجھے سارے میں کھوجنے کے بعد آیا ہوں۔“

”میں اپنے یار کے ایک ضروری کام سے گیا تھا۔“ گھنشیام نے ریش کے برابر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کیا رہا؟“۔۔۔۔۔ ریش نے تاڑی کے ایک لمبے گھونٹ کے بعد بھری ہوئی سگریٹ کا سٹا لگاتے ہوئے راری سے گھنشیام کی طرف دیکھا۔ ”دے آیا تو اس۔۔۔۔۔ گے یار کو سگائی کی سندیس۔“

”وہ پرانا کبڑا یا ہے استاد۔۔۔۔۔ بدھائی والی بات سننے ہی وہ بات کی تیک اتر گیا۔ ایک دم اس طرح بھونکنے لگا جیسے کسی نے کتے کی دم پر سوتے میں پاؤں رکھ دیے ہوں۔“

”کیا کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔؟“ ریش نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ جواب میں گھنشیام نے سرچ مسالا لگا کر راجو کی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا تو ریش گلاس کی پٹی کھچی تاڑی ایک ہی سانس میں ڈکار گیا۔ کسی زخمی ناگ کے مانند ٹل کھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ خلا میں گھورتے ہوئے بڑے زہریلے لہجے میں بولا۔

”جیوتی اور تندو کی سگائی کی رام کہانی تو شہنائی کو بجنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی تھی پر۔۔۔۔۔ کانتا اور راجو کبڑا بے کی لگن منڈب آؤں سجے گی۔ پوتر آگنی کے چکر بھی کانٹے جائیں گے اور سہاگ رات کا ملن بھی ہوگا۔“

”تم۔۔۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو استاد۔“ گھنشیام نے بڑے اچھبے سے کہا۔ ”زیادہ تو نہیں چڑھ گئی؟“

”ہاں جانی۔۔۔۔۔ تیری اور اس کبڑا بے کی بات سن کر کچھ ایسا ہی لگا۔“ ریش نے چٹکارا لیتے ہوئے کہا۔

”گھنشیام تمہاری کانتا اور راجو کبڑا بے کی سگائی کی بات کر رہا ہے استاد۔“ ایک ساتھی نے ریش کو دوبارہ یاد دلانے کی کوشش کی تو اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے آنکھ جھپکا کر سرسراہٹ آواز میں کہا۔

”ہاں پیارے۔۔۔۔۔ میں اسی کانتا رانی کی بات کر رہا ہوں جس سے میں نے جیون میں پہلی بار پریم کیا تھا۔ وہ ہر نی بھی میرے ساتھ میل کرنے کے سنے دیکھ رہی تھی پر تو رگھو بھاڑ دھیں ہمیشہ میلی نظروں سے دیکھتا رہا ہے، وہ پرانا گدھ بنسی کا کا بھی میرے اور کانتا کے سچ دیوار بن گیا تو۔۔۔۔۔ پھر مجبوری کے نام شکر بے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟“

”یہ تم دل پھٹنے کی بات کیوں کر رہے ہو ریش بھائی۔“ ایک اور ساتھی نے ریش کو بانس پر چڑھانے کے کارن کہا۔ ”کانتا تمہارے سوا ہمارے ہوتے کسی اور کی ہو جائے۔۔۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”تم بس ایک اشارہ کر دو استاد۔“ گھنشیام نے دوسرے ساتھی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”ہم اس ڈالی ہی کو جڑ سے کاٹ دیں گے جس پر رگھو اپنی مینا بھدکانے کے سنے دیکھ رہا ہے۔ پھر نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسریا۔“

”تو کس بات کی چنا کر رہا ہے؟“ ریش نے سینہ ٹھونک کر کہا۔ ”جیوتی والی رام کہانی ایک بار پھر دہرائی جائے گی۔ سارے جیون کا روگ کون پالے، میں نے کانتا سے کہا

تھا کہ میرے ساتھ بھاگ چلے پروہ بھی اپنے پتا کی پک نیچے کرنے کو تیار نہیں ہوئی سالی۔ میں نے بھی تیری طرح سارا سین پاٹ اپنی کھوپڑی میں تیار کر لیا ہے۔ منگل سو تو کانا کے گلے میں راجو کباڑیا سی ڈالے گا پر تھو اس کی تھ پہلے میں اتار دوں گا۔ اس کے بعد وہ بھی بھاڑے کی سائیکل کی طرح چلتی رہے گی۔ سب مل بانٹ کر کھاتے رہیں گے۔ تیری جیوتی کا کچھ بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔

”یہ ہونی نا بات۔“ گھنٹھام نے مسکرا کر کہا۔ ”اس..... راجو کباڑیا کی نظریں بھی جھکی رہیں گی جو آج چھاتی ٹھونک کر مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔“

”اس کی چٹا بھی مت کر۔“ رمیش مل کھا کر بولا۔ ”کانا کی نظریں تنہی ہو لینے سے پھر راجو کی مردانگی بھی دوسرے راستے سے نکال دیں گے۔ ساری ہیکڑی بھول جائے گا حرام کا جتنا۔“

رمیش کے دو ایک ساتھی بھی کانا کی اٹھتی جوانی دیکھ کر ہاتھ مل رہے تھے۔ رمیش کے چیلے تھے اس لیے انہوں نے کبھی کانا پر ہاتھ ڈالنے کی بھول بھی نہیں کی..... اب رمیش کا فیصلہ سن کر ان کے من میں بھی لذو پھوٹنے لگے تھے۔

♦♦♦♦♦

نندو اس روز دکان بند کر کے جانے کے لیے پر تول رہا تھا کہ راجو نے اسے روک کر پوچھا۔

”یہ آج تو نے اتنی جلدی دھندا کیوں بند کر دیا؟“

”ایک ضروری کام نمٹایا ہے۔“

”سچ کہہ رہا ہے؟“ راجو نے اسے غور سے دیکھا تو

نندو بھی ہنس دیا۔

”ایسی بات نہیں ہے یار..... میں سائیکل کا کاروبار کرتا ہوں اس لیے سلوشن بھی سوچ و چار کر کے خرچ کرتا ہوں۔

ٹیوب خالی ہو جائے تو جوڑ بھی فٹ نہیں بیٹھتا۔“

”اب بھی سنبھل جانتو۔“ راجو نے دوستانہ لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”جیوتی کے علاوہ گاؤں میں اور

بھی بہت ساری لڑکیاں ہیں، کہیں دیکھ بھال کر اپنا گھر آباد کر لے۔ پرانی ہانڈیوں میں کب تک منہ مارتا پھرے گا۔“

”جب ادھر والے کو منگور ہوگا تو وہی چھپر پھاڑ کر کوئی رشتہ بھی بھیج دے گا۔“ نندو نے بات ٹال کر پوچھا۔ ”یہ بتا کہ تیری اور کانا کی لگن کب ہو رہی ہے؟“

”جیوتی کا کال ملتا ہے کہ وہ رہے تھے کہ ایک دو دن میں وہ پنڈت جی سے مل کر مہورت نکلو انھیں گے۔“

”یہ پنڈت پجاری بھی بغیر دان پن کے جلدی کی

مہورت نہیں نکالتے۔ ہاں، مٹھی گرم کر دو تو پھر یہ بگلا بھگ کوئی شہ گھڑی بھی جلدی تلاش کر لیتے ہیں۔“

”چٹا مت کر۔“ راجو نے مسکرا کر کہا۔ ”جب رگم نے ہاں کر دی ہے تو وہ اور جیوتی کا کال مل کر مہورت بھی نکلو انھیں گے۔“

دو چار بات کر کے نندو رام رام کر کے چلتا بنا لیکن اس کی جیب میں کاندھ کی وہ گولی اب بھی کھلبلی مچا رہی تھی جو ایک بچہ اس کی دکان پر پھینک گیا تھا۔ وہ جیوتی کا ایک سندھیس تھا جس نے اسے اندھیرا پھلتے ہی اپنے مکان کے پچھواڑے آنے کو نکھاتا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب جیوتی نے اسے گھر کے آس پاس آنے کا اشارہ دیا تھا ورنہ ان کی ملاقاتیں آبادی سے دور ہی کسی ایسی جگہ ہوتی تھیں جہاں پکڑے جانے کا خطرہ نہ ہو..... جب سے نندو کو وہ گولی ملی تھی وہ اس پر بہت سوچ و چار کر چکا تھا۔ جیوتی کے بارے میں وہ اچھی طرح جان چکا تھا کہ گھنٹھام کے زور زبردستی کرنے کے بعد اس کی ساری تن پھن بھی نکل گئی تھی۔ ماں نے دوا دارد کر کے آگے آنے والے خطرے بھی دور کر دیے تو وہ بھی ناگن بن کر سب کے شریر میں اپنا زہر اتارنے کی عادی ہو گئی۔ نندو یہ بھی جانتا تھا کہ گھنٹھام کے بعد رمیش اور اس کے ایک دوستی ساتھی بھی بہتی ندی میں ڈبکی لگا چکے تھے خود نندو نے بھی اپنے ٹوٹے سپنوں کی ارمی جیوتی کے شریر کی آگ سے جھنڈی کی تھی لیکن..... اسے یہ بھی کھٹکا تھا کہ جیوتی نے کہیں رمیش یا کسی اور کے اشارے پر نندو کو بڑی مچھلی کو قابو کرنے کے کارن چار سمجھ کر نہ بلایا ہو؟ اس کے اور راجو کے درمیان جو یارانہ تھا وہ بھی سب جانتے تھے۔ کانا کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد رمیش کے پیٹ میں مرد بھی ضرور ہوئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے رمیش ہی نے جیوتی کو مجبور کر کے کوئی جال بننے کی کوشش کی ہو..... اور بھی بہت ساری بھول بھلیاں نندو کے اندر کھل مل کر رہی تھیں۔ ایک بار اس نے سوچا بھی کہ جیوتی کی گولی کو گولی مار کر سیدھا گھر چلا جائے لیکن اس کے تن کی آگ بھی اسے قدم اٹھانے پر مجبور کرتی رہی۔

راستے میں رک کر اس نے ایک سرے نما ہوٹل سے گرم گرم کڑک چائے کی ایک پیالی حلق کے نیچے اتاری پھر جیوتی کے مکان کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ جیوتی کے مکان کے پچھواڑے سوائے ایک پرانے مندر کے کوئی اور مکان نہیں تھا اس لیے وہ اسی مندر کی اوٹ میں جا کر رک گیا۔ کسی خطرے کو بھانپنے کے کارن بار بار دائیں بائیں بھی دیکھتا

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جیوتی اس کے پہنچنے سات آٹھ منٹ بعد پچھلے دروازے سے نکل کر اس کے مہا آگئی۔

”کسی نے تجھے ادھر آتے تو نہیں دیکھا؟“ اس نے اسے پہلا سوال کیا۔

”نہیں..... پر تو نے آج مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟“ نندو نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”اگر تیری ماں کو بھنگ مل گئی تو.....“

”اس کی چٹا مت کر۔“ جیوتی نے سرسراہتی آواز میں جواب دیا۔ ”ماں ہری رام کی نئی لگائی کے گھر بچہ جنوانے کے نام سے گئی ہے، صبح سے پہلے واپس نہیں آئے گی۔“

”اوہ.....“ نندو نے اسے لچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج میدان صاف ہے۔“

”ہاں..... لیکن میں نے تجھے ایک اور کام سے بلایا ہے۔“ جیوتی اس کا ہاتھ تھام کر مندر کی بجلی پکی دیوار سے لپک لگا کر بیٹھ گئی۔ ”مجھے یہ بتانا ہے کہ کانا تیرے متر کے ساتھ پوتر گئی کا پھیرا لگانے کو تیار نہیں ہے۔“

”پھر.....؟“ نندو نے اسے نئی نظروں سے دیکھا۔

”میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”میری بات سمجھنے کی کوشش کر بدھو..... کانا پتا کے مائے زبان نہیں کھول سکتی۔ وہ جس کے سپنے دیکھ رہی ہے رگھو کا مر جائے گا لیکن اس کے ساتھ کانا کا رشتہ بھی نہیں کرے گا۔“ جیوتی ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھ کر نندو کا ہاتھ دباتے دے پڑی۔ ”رمیش نے کانا کو ساتھ بھگانے کی پٹی بھی ہالٹی تھی لیکن اس نے گھرا جواب دے دیا۔ اب میں نے نا ہے کہ رمیش کوئی دوسرا منتر پھونکنے کی تیاری کر رہا ہے۔“

”دوسرے منتر سے تیری کیا مراد ہے؟“ نندو سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”جب کانا پتا کے آگے مجبور ہے اور یار کے ساتھ

ہو منتر ہونے کو بھی تیار نہیں ہے تو پھر رمیش کیا کر سکتا ہے؟“

”پہلے وجہن دے کہ تو میرا نام کہیں سچ میں نہیں لائے گا۔“

”ٹھیک ہے..... تیرا نام میری زبان پر نہیں آئے گا۔“ نندو نے وجہن دیا تو جیوتی نے بڑے دور کی بات کہی۔

”بھری ہوئی سگریٹ کو ایک بار ماچس کی جلتی تلی لے تو پھر سب کو سٹا لگانے کا ادھیہ کارل جاتا ہے۔“

”تو.....“ نندو نے اسے گہری نظروں سے گھورا۔ ”یہ گانے والی بات زبان پر کیوں لا رہی ہے؟“

”اس لیے کہ میں بھی تیری نظروں کے سامنے بیٹھی

ہوں۔“ جیوتی نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”تیری بات اور ہے۔“ نندو بات کی گہرائی بھانپ کر آہستہ سے بولا۔ ”تیرا جھکاؤ زیادہ نہ سہی..... لیکن تھوڑا تھوڑا گھنٹھام کی طرف بھی تھا اس لیے تو ان..... کے جال میں پھنس گئی۔“

”پھر تو بھی تو دوسروں کی طرح پریمیوں کا چولا اتار کر میرے ساتھ نوج کھسٹ کرنے لگا۔“ جیوتی نے مل کھا کر سچ بات کہی تو نندو کی موٹی عقل میں ساری بات آگئی۔ اس نے جیوتی کو رام کرنے کے کارن اسے پیار سے بانہوں میں لے کر کہا۔

”تو سچ کہہ رہی ہے میری بلبل، لیکن کیا رمیش بھی.....“

”میں پورے دھواں سے نہیں کہہ سکتی لیکن اتنا جانتی ہوں کہ اس نے ایک آخری بار کانا سے بھی ملنے کی ہنسی کی ہے۔“

”یہ بات تجھے کس نے بتائی؟“

”بیٹھ گھنٹھام کی بات کیوں کر رہا ہے مورکھ.....! جیوتی تھلا کر بولی۔ ”اگر رمیش نے ایک بار کانا کی نظریں جھکا دیں تو اس کی ماں بھی بیٹی کا پٹنا ڈھانپنے کے کارن مجبور ہو جائے گی۔“

”اب پوری طرح سمجھ گیا۔“ نندو نے سنبھل کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”تو راجو کے کان میں بھی یہ بات ڈال دے۔ ہو سکتا ہے کہ پھر وہ کوئی اپائے تلاش کر لے۔“

”نہیں..... یہ بات اگر راجو کو معلوم ہو گئی تو وہ کانا کا دھیان ہی من سے نکال دے گا۔“

”پھر..... تیری کھوپڑی میں اور کیا سایا ہے؟“

”جب کانا اس کے ساتھ بھاگنے کو تیار نہیں ہوئی تو.....“ نندو کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ جیوتی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”چٹا نہ کر تو نے ایک بات بتادی ہے تو میں بھی کان کھڑے رکھوں گا۔“

”تیری مرضی.....“ جیوتی مل کھا کر جانے کے لیے اٹھنے لگی تو نندو نے اس کی بانہ تھام کر پھنسی پھنسی آواز میں

کہا۔ ”کیا ساگر کنارے بلا کر مجھے پیاسا لوٹا دے گی؟“

”کل ملنا، اسی پرانی جگہ.....“ جیوتی نے ہاتھ چھڑا کر سنجیدگی سے کہا۔ ”تیرے اور راجو کے کارن میں بھی کانا کا دھیان رکھوں گی۔ پر بات وہی ہے کہ کانا بھی کہیں میری

طرح زور زوری میں کالج کی چوڑی کی طرح ٹوٹ کر بکھر نہ

خدارا © خدارا شوگرمریض ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی دینی گولیاں ہی کھاتے رہتا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبہ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP دی پی شوگر نجات کورس منگوائیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0308-6627979
0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

”چکنی چڑی باتوں سے دل بہلانے کی کوشش مت کیجئے۔“ کانتا نے گل کر دل کی بات کہہ ڈالی۔ ”تو اور تیرے ماہی اگر اس کباڑیے کو جان سے مار دیتے تو اس کا، کانتا بھی سے نکل جاتا۔“

”بھلی کبھی تو نے.....“ رمیش نے اسے نظر بھر کر ایگیا۔ ”میں اسے ٹھکانے لگا کر پھانسی چڑھ جاتا تو تیری لگن کی اور کے ساتھ ہو جاتی۔ مجھے کیا ملتا؟“

”سودا کرنے کی بات کر رہا ہے.....؟“ کانتا نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”اب بھی سے ہے، بول..... تجھے لگا چاہیے؟“

”بوتر آگنی کے پھیرے لگانے سے پہلے میں تیرے سر پر سے نہیں کھیل سکتا لیکن تو نے بھی اتنا موقع بھی نہیں دیا کہ میں تجھے چھاتی سے لگا کر اپنے دل کی دھڑکنیں ہی سناسکتا۔“

”تو آج دل بھر کر سنالے اپنے من کا حال۔ لیکن وجہ دے کہ تو میرے ساتھ دھوکا نہیں کرے گا۔ اور پہلی رات میں اس کانٹے کو بھی نکال پھینکے گا جو ہمارے پیار کے لگا آگیا ہے۔“

”ٹھیک ہے..... تیرے کارن رمیش یہ بھی کر گزرے گا۔“ رمیش نے بڑے دبنگ لہجے میں کہا پھر کانتا کو بہلا بہلا کر اندر کوٹھری نما کرے میں لے آیا۔

”یہاں کی چابی تجھے کہاں سے ملی؟“ کانتا نے اندر لے کر حیرت کا اظہار کیا۔

”باہر کسی کی نظر ہم دونوں پر پڑتی تو بدنام بھی ہو سکتے تھے۔ اسی کارن میں نے آج باہر لگا تالا بھی توڑ دیا۔ دو گھنٹی آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

”میرا اتنا خیال ہے تو پھر راستے کا ہتھر بھی ہٹا۔“ کانتا نے رمیش کو اکسانے کی کوشش کی۔

”چتا مت کر میری رانی۔ آج کے بعد ساری راتیں بھی سرک جائیں گی۔“ رمیش نے اسے دل کی دھڑکنیں سنانے کے لیے سینے سے لگایا تو کانتا کی دھک دھک بھی اسے سنائی دینے لگی پھر کانتا نے خود کو سنبھالنے کی خاطر رمیش کی بانہوں سے دور ہو جانا چاہا لیکن رمیش کی گرفت کی کمر کے گرد اور تنگ ہوئی تو خود کانتا بھی اس طوفان کو نہ دیکھ سکی جس نے اس کے اندر بھی ٹھانیں مارنا شروع کر دیا۔ ماسوجوں کا بھاد ٹھم گیا تو کانتا نے آنکھیں چراتے ہوئے لڑ سے سسکتی آواز میں پوچھا۔

”یہ تو نے کیا کر دیا؟“

”مجھے شاکر دے میری رانی۔“ رمیش نے مکاری سے

جواب دیا۔ ”وہ ہرنی کے روپ میں ناگن بھی ہے اس لیے ابھی تو اس کے قریب بھی مت آنا۔ ایک دو بار میں اس کا زہم نکال لوں پھر تو بھی عیش کرنا۔“

وہ دونوں ابھی باتیں کر رہے تھے کہ گھنشیام لپکتا ہوا سامنے آگیا۔ الٹی آنکھ جھپکا کر سرسراتے لہجے میں بولا۔

”استاد..... وہ آرہی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تو جا کر باہر جمونہڑی میں دیک جا۔ ادھر ادھر نظر رکھنا۔“

گھنشیام اگلے قدموں باہر نکل گیا تو رمیش نے دیک سے کہا۔ ”تو بھی ادھر کہیں دائیں بائیں چھپ کر بیٹھ جا۔“

دیک کو ہدایت دینے کے بعد رمیش بھی نکل کر باہر آگیا۔ اس نے بھی دور سے کانتا کو آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی طرف آرہی تھی۔ قریب آگئی تو رمیش نے منہ لٹکا کر کہا۔

”میں تو نراش ہو کر اب واپس جانے کی سوچ رہا تھا۔“

”مجھے بھی تجھ سے یہ امید نہیں تھی کہ تو بیچ منجھدار میں مجھے اکیلا چھوڑ دے گا۔“ کانتا نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”تیرے بلانے پر میں اس سے آ تو گئی ہوں لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تو رمیش نے اسے نظر بھر دیکھا، پیار سے بولا۔

”تو چپ کیوں ہو گئی میری رانی؟“

”خبردار جو تو نے پھر بھی مجھے رانی کہا۔“ کانتا ایک دم ہی بکھر گئی۔ ”رانی سمجھتا تو اتنی جلدی کسی کباڑیے کے مقابلے میں ڈر کر میدان بھی کبھی نہ چھوڑتا۔“

”پر تیرے پتانے اس بوڑھے گدھ بنسی کا کا کوزبان جو دے رکھی ہے۔ اس کا کیا ہو سکتا ہے؟“

”رہنے دے لگی لپٹی کی باتیں۔“ کانتا جل کر بولی۔

”راجو کا پتا صاف کر دیتا تو باپو بھی اس کو شمشان سے گھسیٹ کر دوبارہ نہیں لاسکتا تھا۔“

”یہ..... یہ تو کیا کہہ رہی ہے.....؟“ رمیش نے اسے حیرت سے گھورا۔

”سچ کہہ رہی ہوں۔ تو نے جو اتنے سارے سانڈ پال رکھے ہیں وہ بھی سب مٹی کے مادھو ہیں۔“ کانتا کسی زنگی ناگن کی طرح مل کھا کر بولی۔ ”میرے پاس زیادہ سے نہیں ہے۔ تو نے کیوں بلایا تھا؟“

”کیوں..... کیا اب مجھے اتنا ادھیکار بھی نہیں رہا کہ تجھے آخری بار دل بھر کر دیکھ سکوں۔“

جائے۔“

جیوتی اپنی بات پوری کر کے چلی گئی تو نندو کی کھوپڑی میں بھی بڑی دیر تک کھد بدھوتی رہی۔

گھنشیام دو گھنٹوں سے کھیتوں کے قریب اس جمونہڑی نما کوٹھری میں دبا بیٹھا تھا جہاں پہلے فصل کی رکھوائی کرنے والا رکھوالا اپنی لٹھ سمیت ہر وقت چوکنار ہوتا تھا۔ بعد میں کھیت کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کے چاروں طرف کانٹوں کی باڑھ لگا دی گئی تھی۔ ایک ہی لکڑی کا دروازہ تھا جس میں تالا لگا ہوا تھا۔ کھیت کے مالک کا لڑکا دیکھ نیا نیا جوان ہو رہا تھا۔ رمیش نے پہلی فرصت میں اس سے دوستی گانٹھ لی تھی اس لیے دروازے کی ایک چابی رمیش کے پاس بھی رہنے لگی۔

اس وقت شام کا جھپٹا ہوتا ہی رمیش بھی دیکھ کر ساتھ لے کر اس کی دیواروں والے کمرے میں پہنچ گیا جہاں کھیت کا مالک ہفتے دس روز میں دیکھ بھال کرنے کی غرض سے آتا تو گھڑی دو گھڑی کمر سیدھی کر لیتا۔ اسی کے آرام کی وجہ سے وہاں مونجھ کی رسی سے مٹی ہوئی ایک چار پائی بھی موجود تھی جس پر ایک بچے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

”اس سے تمہیں یہاں کیا کام آن پڑا ہے؟“ دیکھ نے رمیش سے پوچھا تو رمیش ہنس کر بولا۔

”تو نے بھی جنگلی ہرنی کو گلیں کرتے دیکھا ہے؟“

”یہ گاؤں ہے۔ یہاں ہرنی کہاں سے آگئی؟“

دیکھ نے تعجب سے کہا۔

”چار نہیں میری جان.....“ رمیش آنکھ مار کر بولا۔

”میں دو ٹانگ وانی ہرنیوں کی بات کر رہا ہوں جو دن بھر ادھر ادھر کوبلے منکاتی پھرتی ہیں..... کبھی تو نے کسی ہرنی کو شکار کیا ہے.....؟“

”باپو سے ڈر لگتا ہے۔“ دیکھ نے بڑے مصوم لہجے میں ٹھنڈی سانس بھری۔ ”انہوں نے نئی واری چتاؤنی دے رکھی ہے کہ اگر میں نے کسی کی طرف میلی نظر ڈالی تو وہ کھال ادھیز کر بھوسا بھر دے گا۔“

”تو اس کی چتا مت کر..... ایک بار میری شکاری ہوئی ہرنی سے تو بھی پیٹ پوجا کر لے پھر تجھے ایسا سواد ملے گا کہ سارا جیون میرے نام کی مالا جیتا رہے گا۔“

”اس سے بھی کیا کوئی ہرنی ادھر آنے والی ہے؟“

دیکھ نے شرما کر سوال کیا۔

”ہاں.....“ رمیش نے استادوں والے انداز میں

کہا۔ ”میں تیری عزت کا خیال رکھوں گا۔“
کانتا خود کو سمیٹ کر آہستہ سے اٹھی پھر نظریں چراتی
لبے لبے قدم بڑھاتی واپس لوٹ گئی۔ اس کے جانے کے بعد
دیکھنے والے نے سامنے آ کر عجیب انداز میں کہا۔

”یہ چھوری تو رکھو گوالے کی پتری ہے۔“
”تو نے ٹھیک پہچانا۔“ ریش نے سینہ تان کر کہا۔
”یہ اسی گوالے کی منہ زور بچھیا تھی جو کل تک کسی کو ہٹنے پر
ہاتھ نہیں دھرنے دیتی تھی لیکن اب یہ بھی دلتی چلانے کی
بھول نہیں کرے گی۔ دوسری بار ادھر آئے تو..... تو بھی اپنی
بیٹھک کا بھاڑ اول بھر کر وصول کر لیتا۔“

ریش، دیکھ کا ہاتھ تھامے باہر نکلا تو چونکے بغیر نہ رہ
سکا۔ گھنشیام جھونپڑی کے سامنے زمین پر پڑا۔ ”ہائے،
ہائے“ کر رہا تھا، ریش لپک کر اس کے قریب گیا۔
”جیسے کیا ہو گیا؟“

”ادھر کوئی پہلے سے چھپا کھڑا تھا استاد۔“ گھنشیام نے
تھملا کر کہا۔ ”کوئی نامزد تھا حرام کا پلا۔ پیچھے سے سر پر کسی
ٹھوس چیز سے وار کر کے نکل گیا۔“
”کون ہو سکتا ہے؟“ ریش نے دھمکتے لہجے میں سوال
کیا۔

گھنشیام کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس
لیے وہ پھر سر تھام کر ”ہائے..... ہائے“ کرنے لگا۔

♦♦♦♦♦

راجو کے گھر کا وہ کمرہ پھولوں سے مہک رہا تھا، بندیا
اور جمنائے دہن بنی کانٹا کا ہاتھ تمام کمراس اچلے بستر پر بٹھا
دیا جس پر گلاب کی پتیوں بکھری نظر آرہی تھیں۔ جاتے
جاتے جمنائے خاص طور سے کانٹا کے کانوں میں دو چار ایسے
جیلے بھی کہے جس سے وہ شرما کر رہ گئی۔ بندیا اس کا ہاتھ پکڑ کر
باہر لے گئی تو کانٹا نے گھونٹ کی اوٹ سے کمرے کو دیکھا پھر
سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

وہ خود بھی اس وقت اوپر سے نیچے تک مہک رہی تھی۔
پنڈت کے مہورت نکالتے ہی جیوتی کی ماں نے اس کے
شریر پر چدن اور مندلی کی مالش شروع کر دی تھی۔ مالش
کرتے سے ایک دن اس کا ہاتھ کولہوں سے رپٹ کر پیٹ کی
طرف جانے لگا تو کانٹا لجا کر رہ گئی۔ جیوتی کی ماں نے ہنس کر
کہا تھا۔

”بھلا داتی سے پیٹ کیا چھپانا۔ کل بھگوان کی کرپا سے
تیرے پیر بھاری ہوئے تو میں ہی کام آؤں گی۔ اس سے کوئی
شرم نہیں کرتی، سارا اکھا یا پیا کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔“

کانٹا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اس کی
تجربے کی باتیں سنتی رہی، جب شادی کو دو دن رہ گئے
اس نے کانٹا کی مالش کرتے ہوئے بڑی رازداری سے
کہا تھا۔

”جیسے آج بڑے گر کی بات بتا رہی ہوں۔ پتی کا
ڈھیل دینا درندہ گڈی کٹنے میں ایک بار دیر ہو جائے تو پھر مرد
ہمیشہ اسی کا عادی ہو جاتا ہے۔ سارے دکھ ناریوں کو جھیلنے
پڑتے ہیں۔“

”یہ تو گڈی کٹنے والی کیا بات کر رہی ہے؟“ کانٹا نے
معصومیت سے پوچھا۔ ”وہ تو بسنت کے تہوار پر اڑائی جاتی
ہیں۔“

بعد میں جب اس نے گڈی لڑانے والی بات کا
مطلب ذرا کھل کر بتایا تو کانٹا اٹھ کر بھاگ گئی لیکن آج وہ
گڈی لڑانے والی بات اس کے ذہن میں رہ رہ کر کانٹے کی
طرح چبھ رہی تھی۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل سے سوچ رہی تھی
کہ اس نے تو ریش کو اس کی چکنی چڑی باتوں میں آ کر پہلے
ہی ڈھیل دے دی تھی۔ اسی ڈھیل کے کارن اس کی گڈی تھی
کٹ چکی تھی اور اب..... اب اگر یہ بات کسی طرح راجو کے
کانوں تک پہنچ گئی تو کیا ہوگا؟ وہ ان ہی وچاروں میں گم تھی
جب کوئی دے قدموں آ کر اس کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔
کانٹا نے گھونٹ کی اوٹ سے دیکھا تو اس کے دل کی
دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔

کل تک وہ راجو کو پسند کی نظروں سے نہیں دیکھتی تھی
مگر آج..... آج وہ اسے اپنے جیون کی نیا کامیون ہار کچھ
رہی تھی۔ اس نے ایک ہی نظر میں طے کر لیا تھا کہ راجو کو تن
من سے اپنا لے گی..... راجو نے اس کو دل سے چاہا تھا۔
کبھی اس کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی تھی، من میں با
کر امیدوں اور آشاؤں کے سہارے اسے پوجتا رہا۔ کبھی
قریب آ کر کھوجنے کی کوشش نہیں کی..... اور ریش!.....
دل بھانے کی بات ضرور کرتا رہا، کبھی اس نے بھی کانٹا کو
چھونے کی بھول نہیں کی مگر..... راجو کے ساتھ لگن کا سن کر
اپنی اصلیت پر اتر آیا تھا۔ اس نے دھوکے سے کانٹا کو
آخری بار ملنے کو بلایا پھر اس کے دشواس کو ٹھوکر مار کر اس
کے جیون میں ایسا زہر گھول دیا جس کا کوئی علاج نہیں
تھا..... وہ بات اگر راجو کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تو پھر
کیا سوچے گا؟ اسے شاکر دے گا؟ یا پہلی ہی رات اس
سے سارے رشتے ناتے توڑ کر گھر کی دہلیز سے باہر نکال
دے گا؟..... راجو کے گھر سے نکل کر وہ کہاں جائے گی

ہوئی گڈی کی طرح ہوا میں ڈولتی رہے گی؟ کیا رکھو
ہتری سمجھ کر شاکر دے گا یا وہ بھی منہ پھیر کر اپنے گھر
اور بند کر لے گا..... کیا وہ بھی جیوتی بن کر جیون بھر میلی
ہاں کا نشانہ بنتی رہے گی؟ کانٹے کی چوڑی کے انوسار
مٹ کر بکھر جائے گی؟ وہ دل ہی دل میں اپنے بھوش کا
ہام سوچ رہی تھی جب راجو نے پہلی بار اسے بڑے پیار
سے مخاطب کیا۔

”تو نے دیکھا کانٹا رانی..... جن کے پیار میں کھوٹ
لگن ہوتا..... جو من میں بسا کر کسی دیوی کی پوجا کرتے
ہیں۔ وہ (جیت) ہمیشہ ان ہی کی ہوتی ہے..... پوتر اگنی
کے پھیرے کاٹ لینے کے بعد اب تو میرے جیون کا ایک
حصہ بن گئی ہے۔ یہ پوتر سمبندھ بڑا اٹوٹ (پکا) ہوتا ہے۔
م دونوں کھل مل کر اسے اور سندر بنا دیں گے، کیوں؟
لہک ہے نا۔“

کانٹا نے کوئی جواب نہیں دیا..... راجو کی باتوں میں
ارت ہی امرت تھا۔ اسے خبر تھی کہ کانٹا، ریش کا سپنا دیکھ
رہی تھی لیکن اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا..... کانٹا کے
ہاتھ کا دھم سے کاغذ کاٹ کر جیون کو سندر بنانے کی بات کر
رہا تھا اور دوسری طرف ریش تھا جس نے اپنے پیار کو اپنے
ہاتھوں رووند کر منی میں ملا دیا تھا۔

”منش کے رشتے ناتے بھگوان آکا ش پر بناتا ہے۔“
راجو نے اسے خاموش دیکھ کر دبی زبان میں کہا۔ ”میں جانتا
ہوں کہ تو نے کسی اور کو چاہا تھا..... ہو سکتا ہے کہ منی کا کا کے
گھر پر تیرے پتانے میرا تیرا لگن کر دیا ہو لیکن اگر اب بھی تو
ہوینکار کرنے کو تیار نہیں ہے۔ تو میں زور زبردستی بھی نہیں
مروں گا۔ ایک بات اور دھیان سے سن لے میری..... جو
سے پیار کرتے ہیں انہیں تن کی لوبھ (لاج) بھی نہیں
لی۔ تو ایک بار کہہ کر دیکھ، میں خود تیرا ہاتھ تمام کمراس کے
لے کر دوں گا جس کا نام.....“

”چپ ہو جا راجو.....“ کانٹا نے تڑپ کر کہا پھر سنبھل
ہوئی۔ ”جو سمبندھ بھگوان نے میرے بھاگے (قسمت)
لکھ دیا ہے اب میں اسی کو پوجنا اپنا دھرم سمجھوں گی، تو اسے
مے دل کی آواز سمجھ لے۔“

کانٹا کی بات سن کر راجو نے پہلی بار آگے کھسک کر
ہاتھ تمام لیا۔ اس کا گھونٹ اٹھا کر بڑی اپنایت سے
”ایک بات اور گروہ سے باندھ لے۔ جیوتی کے ساتھ جو
اچھا نہیں ہوا لیکن اس نے ایک بھول کر دی۔ اگر وہ
لکھ دیا تھا اس کے بعد بھی تمام لیتی تو تندو اس کے

سارے دکھوں کی دوا بن جاتا۔ مرد کے مقابلے میں ناریوں کا
دل زیادہ نرم ہوتا ہے، وہ اتھانے میں بھول چوک کر جاتی ہیں
اور مرد وہ ہوتا ہے جو کسی کو اپنانے کے بعد ہر صورت میں اس
کی رکھشا کرتا ہے۔ تو بھی اب کسی بات کی چننا مت کرنا۔ اگر
کوئی میلی نظر اب تیری طرف اٹھی تو تیرا راجو گڈی نظروں کو
باہر نکال کر پیروں تلے رگڑ دے گا۔ اس لیے کہ تو اب میری
عجبت ہے۔“

کانٹا کا دل دھک سے رہ گیا، اس کے من میں چور تھا
اس لیے اس نے نظریں اٹھا کر راجو کو بہت غور سے دیکھا،
اسے ٹٹولنے کے کارن مدھرسروں میں بولی۔
”میں نے کہا نا کہ میں تجھے اپنا دیوتا سمجھ کر تیری پوجا
کروں گی..... کیا تجھے دشواس نہیں آیا؟“

”دشواس نہ ہوتا تو میں منی کا کا کو تیرا رشتہ مانگنے کے
لیے درمیان میں لاتا۔“ راجو نے اور قریب ہو کر کانٹا کے
مہکتے جسم کو اپنی مضبوط ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”شادی کے
پوتر بندھن میں بندھنے کے بعد پرش یا ناری کو کبھی پلٹ کر
پیچھے کی اور (طرف) نہیں دیکھنا چاہیے۔ زیادہ کریدنے سے
اچھی بھلی ہانڈی کا سوا دھبھی جاتا رہتا ہے۔“

”تو..... تو ٹھیک کہہ رہا ہے راجو۔“ کانٹا نے راجو کی
ہاتھوں میں سر چھپا کر جواب دیا۔ ”اب تو بھاگے سے مجھے مل
گیا ہے تو بھی تیرے کسی دشواس کو ٹھیس لگانے کی بھول نہیں
کروں گی۔“

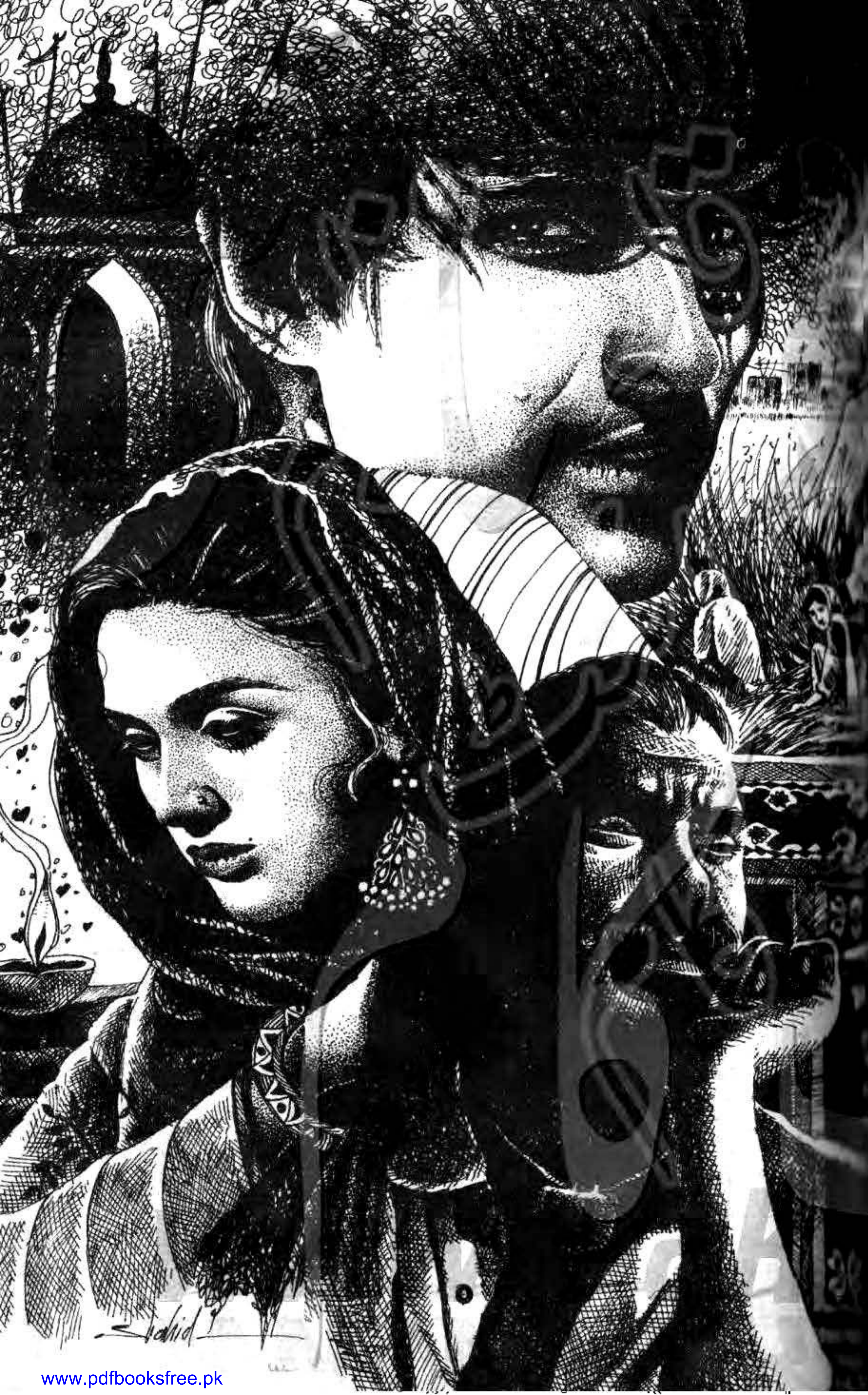
”کتوں کے بھونکنے کی پردا بھی نہ کرنا۔ وہ بھونکنے
کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔“

کانٹا کے من میں ایک بار پھر اس خوف نے سرا بھارا
کہ کہیں ریش اور اس کے درمیان بھول سے بیچ پڑ جانے
والی بات کی بجائے راجو کو تو نہیں مل گئی لیکن اسے زیادہ سوچ
وچار کرنے کا موقع نہیں ملا۔ راجو نے اٹھ کر کمرے کی تمام
روشنیاں بجھا دیں پھر اس کے قریب آ گیا۔ اتنا قریب جس کا
ادھیکارا سے دھرم اور سماج کے علاوہ ان کے پرکھوں نے بھی
سوچ سمجھ کر دیا تھا۔

اس رات کانٹا نے جیوتی کی ماں کی بتائی ہوئی تمام گر
کی باتوں کو دھیان سے نکال کر اپنے آپ کو پوری طرح راجو
کو سونپ دیا.....

اگلی صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس سے بھی اس نے خود
کو راجو کی مضبوط ہاتھوں کی پناہ میں پایا۔ جو گہری نیند میں
لبے لبے خراٹے لے رہا تھا۔





ناصر ملک مسافر

قسط نمبر: 4

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زاد سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود پرانا، پرچہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور ابلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضاتوں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہو جاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کر کے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہو جاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساس زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کر دینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گل و گزار سے راہ پر خاریک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

کسی آن بھی خنجر والا ہاتھ نیچے آنے والا تھا۔ اُس پر میری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں نے بے بسی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور زیر لب کلمہ طیبہ پڑھنے لگا۔ چند

ساعتیں گزر گئیں۔ کھالے کا ہاتھ نیچے نہیں آیا تھا۔ میں آنکھیں کھولیں۔ اُس کا اٹھا ہوا ہاتھ فضا میں ساکت تھا۔ ایک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاید یہی مدد مجھ تک آن پہنچی

T

”پروین کہاں ہے؟“

”وہ رات بھر تمہارے سرہانے بیٹھی جاگتی رہی ہے، اب تمہارے لیے ناشتا تیار کرنے گئی ہے۔ آئی ہی ہوگی۔“

”دوسرے لوگ؟“

”انہیں یہ مشکل میں نے یہاں سے بھگایا ہے۔“

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ پروین میرا پرہیزی ناشتا لے آئی۔ اُس کے عقب میں غزالہ، شانو اور چاچا چراغ دکھائی دیے۔ پروین نے چنگیر اور برتن میز پر رکھے۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر فرط جذبات سے مجھ پر جھکی اور دیوانہ وار چومنے لگی۔ میرے بازو کے زخم کا بھاؤ کرتے ہوئے لیٹ گئی۔ وہ رو بھی رہی تھی، مسکرا بھی رہی تھی اور یقین کر رہی تھی کہ میں بالکل تندرست ہوں۔ ڈاکٹر شاہ جی کی ہدایات کے مطابق اُس نے مجھے ساگودانہ کھلایا، دودھ پلایا اور میرا منہ اپنے دوپٹے سے صاف کیا۔

ناشتے کے بعد ڈاکٹر شاہ جی نے مجھے دو انجکشن دیے۔ ٹیبلٹیں چیک کیا۔ سر میں شدید درد کی شکایت پر اُس نے غزالہ کو فستے داری سوئی کہ وہ میرا سر دبائے۔ اُس نے ہدایت پر عمل کیا۔ روح تک سیمائی کا اعجاز اُترنے لگا۔ میں خود پر جھکے ہوئے اُس کے چہرے کو یک نیک دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب تک کسی نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میرے ساتھ ہوا کیا تھا۔ مجھ سے واقعے کی تفصیل جاننا تو دور کی بات، کسی نے اس موضوع پر آپس میں بھی بات نہیں کی تھی۔ میں نے غزالہ سے پوچھا ”کھانا نہیں آیا؟“

”رات تو یہیں تھا، اب دکھائی نہیں دیا۔“ اُس نے منہ بنا کر کہا۔

میں نے پروین سے پوچھا تو اُس نے بتایا ”ناسی صفو اور چاچا بخوش آئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ وہ تیز بخار میں پھنک رہا ہے۔“

”دوا دارو لیا اُس نے؟“

”جہیں کیا، وہ دوا کی لے یا زہر پھاگے؟“ غزالہ نے تلخی سے کہا۔

میں خاموش ہو گیا۔

”تم کھالے کے گھر کیا لینے گئے تھے؟“

”کھالے سے ملے گیا تھا۔“

وہ تشکیک آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں اُسے بتانا چاہتا تھا مگر اُس نے میرے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا، بولی۔

”ابھی نہیں..... ابھی تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ جب ٹھیک ہو جاؤ گے تب پوچھوں گی۔“

دو پہر تک کمرے میں میلا لگا رہا۔ نور پور کا کم ویل فھنص، میری عیادت کو آیا۔ تین بجے کے قریب ڈاکٹر شاہ نے میرے کمرے میں لوگوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ میرے پاس اُس کے علاوہ غزالہ اور چاچی رہ گئیں۔

غزالہ نے مجھے دلیا وغیرہ کھلایا، پانی پلایا اور چاچی نظریں بچا کر میری پیشانی کو ان گنت مرتبہ چوما۔ میں آنکھیں بند کیں تو اُس نے آنکھوں کو چوما، بولی۔ ”میرا چاہتا ہے کہ میں اُس کیلئے کا گلا گھونٹ دوں۔“

”کس کیلئے؟“ میں چونکا۔

”کھالے کو ہمارا..... اور کس کا۔“

”اس کا تصور نہیں ہے، تصور میرا اپنا ہی تو تھا۔“

وہ دانت پیس کر خاموش ہو گئی۔ اُسے میری بات اہ نہیں لگی تھی۔

ڈاکٹر شاہ جی نے قریب آ کر پیشانی پر ہاتھ رکھا، مسکرایا اور بولا ”لگتا ہے کہ اب تمہاری دوا کی بند بھی کر دی جائے تو تم دو چار گھنٹوں میں ہی فٹ فاٹ ہو جاؤ گے۔“

میں اُس کا کتنا یہ سمجھ گیا، جھینپ کر بولا ”ڈاکٹر جی! اب ایسی بھی بات نہیں۔“

غزالہ شرمسار ہو کر مجھ پر مزید جھک گئی۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ڈاکٹر شاہ جی ایسا ہی کوئی اور جملہ کر کر غزالہ کو میرے اور قریب کر دے مگر وہ خاموش ہو گیا تھا۔

ایسے میں بخت خان کمرے میں داخل ہوا۔ غزالہ کے سر پر ہاتھ رکھنے کے بعد میری طرف بڑھتے ہوئے بولا ”ڈاکٹر شاہ! آپ کی مطلوبہ میڈیسن آگئی ہیں۔“

اُس نے اپنے ہاتھ میں تھا ہوا لفافہ میرے پیروں کے قریب چار پائی پر رکھ دیا پھر میری عیادت میں زچہ گیا۔ اُس کی آمد کو محض چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ کھانا، مراد بخش دیوانہ بھی آگئے۔ چاچی اور غزالہ اپنا سامان سمیٹ کر کمرے سے نکل گئیں۔ مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ وہ ساٹھ والے کمرے میں جا بیٹھی تھیں۔

دونوں میری چار پائی کی پابندی کے پاس آ کر گئے۔ بخت خان اور ڈاکٹر شاہ جی نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا سنا اور کچھ کہے کمرے سے نکل گئے۔ عیاں تھا کہ انہوں نے ہم کو کھانا کھانے کا موقع دیا تھا۔

مراد بخش نے کہا۔ ”شہرے خان! لگتا ہے کالی حالت میں ہو۔ ہے ناں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ مجرموں کی طرح

مسافر

کھالے کو پہرہ دیکھا۔ وہ کافی بدلا بدلا دکھائی دیتا اس لیے کہ میں نے اُسے نہایت مختلف انداز میں لپکتا۔ میں نے کہا ”کھالے! دور کیوں کھڑے ہو، آؤ ناں۔“

وہ لب بستہ کھڑا رہا۔ مراد بخش نے کہنی چبھوئی۔ وہ پھر لمبے سے مس نہ ہوا۔ میں نے کہا ”میں اٹھ نہیں سکتا، تم بٹھرتے ہو، اس لیے میرے قریب چلے آؤ۔ میں بہت اٹھ کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میرا کوئی گھر نہیں تھا۔ میں نہ تو نمک حرام ہوں اور نہ ہی یار مار..... مگر لے مجھے صفائی کا موقع ہی نہیں دیا۔“

وہ بڑی آہستگی سے چار پائی پر ٹپک گیا۔ میں نے کہا۔

”ہا کی کوئی عدالت بغیر صفائی طلب کیے سزا نہیں سناتی مگر لے سناؤ۔ میں بلو کو اپنی بہن سمجھتا ہوں، بالکل پروین کی ج۔ وہ بھی مجھے اپنا بھائی ہی سمجھتی تھی مگر نہ جانے کیا ہوا کہ ہنگ گئی۔ بچی ہے ناں ابھی..... مگر میں اُسے سمجھا لیتا، سے روک لیتا۔ مگر برا یہ ہوا کہ میری کمر میں چوٹ آگئی اور

بدن شل ہو گیا جس کی وجہ سے وہ حد سے بڑھ گئی۔“

اُس نے میری بات خاموشی سے سنی۔ منہ سے کچھ نہیں

کہا۔ اچانک پلٹ کر میرے پیروں کو تمام کر چار پائی پر

ٹپک گیا۔ دیوانہ دوسری چار پائی پر براجمان ہو گیا تھا۔ چند

لمحوں میں کھالے کی سسکیاں پورے کمرے میں گونجنے لگیں۔ مجھے اپنے پیروں پر نمی کا احساس ہوا۔ میں نے پکارا۔

”کھالے! یہ کیا کر رہے ہو؟ ادھر میرے پاس آؤ ناں!“

اُس پر میری پکار کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے دو چار

اُسے باز رہنے کے لیے کہا مگر وہ ٹپک سے ٹپک نہ ہوا تو خاموش ہو گیا۔ اُسے اپنے دل کا غبار نکالنے کا موقع دیا۔

وہ یر گزر گئی۔ اُس نے سر اٹھایا۔ مجھے اُس کی حالت زار

س آئی۔ وہ میرے کہنے پر میرے پہلو میں چار پائی کی

پا کر ٹپک گیا۔ اُس کا سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔

سر اٹھا کر بولا۔ ”شہرے خان! تم مجرم نہیں ہو، میں مجرم ہوں۔ جو چاہے سزا دے لو۔ میرا سر تمہارے ہٹکا ہوا ہے۔“

میں نے اُسے معاف کر دیا۔ باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔

نے مجھے بتایا کہ وہ اور ڈاکٹر شاہ جی مجھے اٹھا کر اسپتال

گئے۔ اُس نے ڈاکٹر صاحب کو بغیر حیل و حجت تمام

من و من کہہ سنایا تھا اور اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی۔ خالہ

پہ والدین کے سامنے غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے

بہ گناہی پر تصدیقی مہر ثبت کر دی تھی۔ اس جرم کی

پاداش میں اُسے اچھی خاصی مار کھانا پڑی تھی۔ کھالے کے بقول، وہ ابھی تک چار پائی پر پڑی کر اور ہی تھی۔ بعید نہیں تھا کہ چاچا چراغ اور بخت خان کھالے کو پولیس کے حوالے کر دیتے مگر کھالا اور اُس کے والدین اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے چاچی اور چاچا چراغ کے پیروں میں گر گئے تھے۔ قدموں میں گرے ہوئے محترف کو گلے سے لگانا ہماری علاقائی روایات کا حصہ تھا۔

بات پورے نور پور میں پھیل گئی تھی۔ زبانوں کی بیساکھیوں پر چلتی ہوئی لمبی مسافت طے کر گئی تھی۔ ہر کوئی اُسے اور خالہ کو لعن طعن کر رہا تھا اور وہ اپنے آہنی کیلچے پر زبانوں کے زخم سنبھالے عداوت کی اتھاہ گہرائی میں گر کر سنبھلنے کی کوشش میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ پشیمانی اور پچھتاوے نے اُسے تیز بخار میں جھونک دیا۔ میں چونکا، کے رد عمل کو قطری سمجھتا تھا، یہ بھی سمجھتا تھا کہ اگر اُس کی جگہ میں ہوتا اور میری جگہ وہ ہوتا تو میں وہی کرتا جو کچھ اُس نے کیا تھا، اس لیے میں نے اُسے دل سے معاف کر دیا۔ وہ میرا شکر تھا۔ اُسے شاید میرے اس رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ اُس کی عداوت کو تحلیل کرنے میں مراد بخش کے ذومعانی فقروں نے بڑا کام دکھایا۔

بخت خان اور ڈاکٹر شاہ جی کو مراد بخش بلا لایا۔ محفل جم گئی۔ ایسے میں گزشتہ شب کا تذکرہ چھڑ گیا۔ بخت خان اور مراد بخش نے مزار کی نگرانی کی تھی۔ اس مرتبہ صرف ٹرپل تھری نہروں والی کار دل جیت شاہ کے ہاں آئی تھی۔ اُسے ایک آدمی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اُس نے پون گھنٹا دل جیت شاہ کے خاص حجرے میں گزارا تھا۔

ڈاکٹر شاہ جی نے میری کمر اور گردن کے پیچھے مضبوطی سے ہاتھ جمائے اور سہارا دے کر بٹھا دیا۔ درد کی ایک کینٹیلی لہر پورے بدن میں پھر گئی۔ ضبط کرنے کے باوجود منہ سے سسکاری نکل گئی۔

دیوانہ جھٹ سے بولا ”یار یہ کیا؟ ہر وقت سوانیوں (عورتوں) کی طرح چیختے رہتے ہو، کوئی ایک مردانہ ادا بھی اپنے پاس رکھ چھوڑو۔“

میں نے ہنسنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ چند ہی لمحوں میں میری پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ میں نے کراہ کر کہا۔

”ڈاکٹر جی! بیٹھا نہیں جاتا، لٹا دیں مجھے۔“

اُس نے میری درخواست پر توجہ نہیں دی، سمجھایا۔ ”خود کو بٹھائے رکھنے کی پوری کوشش کرو۔“

میری چار پائی کے نیچے یورین بیگ دکھائی دیا۔ تب پتا

چلا کہ مجھے کبھی ٹر پاس کی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ غیر معمولی طویل دورانیہ گزرنے پر بھی حاجت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں بہ مشکل تین یا چار منٹ بیٹھا رہ سکا پھر ہار گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے میرے چہرے پر نگاہ ڈالی اور مسکراتے ہوئے لٹا دیا۔ کمرے سے اُبھار کا احساس ہوا۔ پہلے نہیں ہوا تھا۔ شاید کپڑے کا کوئی گولا دباؤ دینے کے لیے میرے تلے رکھا گیا تھا۔

ایک محفل اجڑ گئی، دوسری سب گئی۔ میرے اہل خانہ میرے ارد گرد آن بیٹھے۔ مجھے برہیزی غذا کھلانے کے بعد جائے پلائی گئی، دوائیں کھلائی گئیں اور مختلف ادویات کے انجکشن دیے گئے۔ غزالہ مجھ سے ناراض تھی کہ میں نے کھالے کو معاف کیوں کیا؟ اُس کی خواہش تھی کہ وہ دو چار مہینے جیل کی دال روٹی کھا آتا تو شاید انسان بن جاتا۔ وہ میری اور کھالے کی دوستی کو پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ وہ مخصوص ذرا نیورائٹ قماش کا آدمی ہے۔ اُس کے خیال میں وہ اعتماد کے لائق ہرگز نہیں تھا۔

میں اگلی صبح کھالے اور دیوانے کے سہارے کوشی کے صحن میں ہولے ہولے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر قدم پر دباغ میں دھمک پیدا ہوتی تھی۔ پورے جسم میں چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ مراد بخش دیوانہ کہہ رہا تھا۔ ”ہر کام میں خدا کی مصلحت ہوتی ہے۔ جو کرتا ہے، بھلا ہی کرتا ہے۔ فی الوقت انسان کو درست نہیں لگتا مگر جب اُس کے اثرات سامنے آتے ہیں تو اس اشکرا اُٹھتا ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ کھالے نے گھورا۔

”میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بیٹی کے کٹے کی ضرب نے ہمیں ایک بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا۔ اگر شہر اٹھیک ٹھاک ہوتا تو تم اپنی بے غیرتی کی عظیم مثال قائم کر کے اپنا ہاتھ کبھی نہ روکتے اور اب تک شہر اُٹھ بے چارہ..... چی چی.....“

روح بالائے بریں ہوتی، جسم زیر زمین ہوتا اور تم سرکار کے راج محل میں تخت نشین ہوتے.....“ مراد بخش نے اپنے ہاتھ سے جلی پینے کا مٹھکہ خیر اشارہ کرتے ہوئے اس انداز سے کہا کہ میں اور کھالا اپنی ہی نہ روک بائے۔

کھالا بولا۔ ”ایسی کی تیسری تیرے منحوس شاعر کی..... اپنی منظر کشی اپنے پاس رکھو۔ اللہ سوہنے نے ہم دونوں پر خاص کرم کیا ہے۔“

میں بڑی احتیاط سے قدم بڑھا رہا تھا مگر پھر بھی ہانپ گیا۔ رُک کر سانسیں ہوار کرتے ہوئے بولا۔ ”مگر کھالے! ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔ میرے کانوں میں تمہاری دیکھن کی نہ آواز پڑی تھی اور نہ ہی ہارن سنائی دیا تھا۔ شاید چوٹ

نے میرے ذہن کو بھی متاثر کیا تھا۔“

وہ بولا۔ ”نہیں، دیکھن نہ ہوا لے گل پر ٹھہر گئی تھی۔ ۱۔ حرام زادی کا اگلا مائر پچھ رہا تھا۔ کتنی ابا کی دکان پڑی تھی۔ میں اور سبھی مسافر وہیں اتر گئے تھے۔ ارادہ نہ تھا اور شید و سچنی لے کر پل پر جائیں گے اور مائر بدل دیکھن کو اڑے پر لے آئیں گے۔“

میں نے تنہی انداز میں سر ہلایا۔ دل میں سوچا کہ جس وقت کو نہایت کم دورانیہ قرار دے رہا تھا، وہ اتنا مختصر نہیں تھا۔ میں خالدہ کے حصار میں کم دیش نصف گھنٹے تھا۔ میں نے کسی کو بالخصوص مخاطب کیے بغیر پوچھا۔ ”شاہ جی کیا کہتا ہے، کیا میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا؟“

مراد بخش بولا۔ ”وہ کہتا ہے کہ تمہاری ہڈی پل پل جا بجا رہے۔ یہ زانگ کچھ بگاڑیں گے کیا تیرا کے مصلحت کھالا تو کیا، کھالے کا باپ بھی ہوتا تو اپنے دوسری ہتھوڑ سے تمہاری ناک کی ہڈی تک نہ توڑ پاتا..... فکر نہ کرو! کہتا ہے کہ تم کل برسوں تک تھارو پر بیٹھ گھوڑے کی طرح سے بائیں کرنے لگو گے۔“

کھالے نے پھر کر کہا۔ ”انسان کا بچہ بن و گرنہ ہاتھ کی دوں گا اور دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔ اپنے دل بھڑاس سیدھے لفٹوں میں نکالا کرتا کہ میری سمجھ میں آتا کہ تو کیا بکواس کرتا ہے؟“

میں خاصا سنبھل گیا تھا۔ رانوں اور پنڈلیوں کے درمیان میں چھین کم ہو گئی تھی۔ کمر اور بازو دکھتا تھا۔ میں نے کھالے سے فرمائش کی کہ مجھے کوشی سے باہر لے جائے۔ دونوں باہر نلے آئے۔ ہم چلتے ہوئے اسپتال میں آ گئے۔ ڈاکٹر جی اپنے کمرے میں موجود تھا۔ مرلیض معائنہ اور معالجے کے لیے آرہے تھے۔ وہ اس وقت خاصا مہم ہوا کرتا تھا۔

حیات خان نے عیادت کو آنے میں خاصی تاخیر کی۔ پہلے تو مجھے اُس کے ہمدردانہ رویے میں منافقت لگتی تھی۔ ہوا مگر کچھ دیر کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف اسے رکھے گئے رویے پر متاسف تھا بلکہ ایک بھیا تک غلط فہمی نتیجے میں پیدا ہونے والی جان لیوا صورت حال پر بھی تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے اُس کی پیشکش پر کوئی توجہ نہیں دی مجھے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں چار دن گئے۔ جب میری ریڑھ کی ہڈی کا معائنہ کرنے کے بعد شاہ جی نے اطمینان بھرے انداز میں کہا ”اب تم مکمل فٹ ہو تو میں نے گھر کا قصد کیا۔ اسپتال کی حدود میں

ہنے کی بدولت مجھے اس ماحول سے بوریت ہونے لگی دو تین دنوں کے بعد میرے بازو کے زخموں کے ٹانگے لے جانے لگے۔ ران کے ایک جبکہ پنڈلی کے دو زخموں کی اسچنگ کی گئی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی کے بقول خنجر کا پھل ابا ہڈی کو چھو گیا تھا مگر دونوں زخموں میں کوئی بھی عصبی ٹھس کٹا تھا اور نہ ہی کوئی بڑی شریان یا ورید زخمی ہوئی اس نے میرے زخموں کو خراب ہونے سے بچائے مجھے لیے شہر سے بخت خان کے ذریعے مہنگی انٹی بائیوٹک ایت منگوائی تھیں۔ مجھے دوائی کی باقاعدگی کے اثرات پر بھی دیا اور یہ تنبیہ کی کہ ٹانگے کھلنے تک میں کوئی بھاری اہم نہیں کروں گا۔

اگلی شام کو کھالا میرے گھر پہنچ گیا۔ رکی گفتگو کے بعد میں نے جیب میں سے ایک تہ کیا ہوا زقہ نکالا اور میری پتیلی رکھ دیا۔ انگریزی میں لکھا ہوا ایک جملہ میری آنکھوں کے سامنے جھلکا گیا۔

”مجھے بدھ کی شام کو پانچ بجے چمن زار عسکری میں ملو۔“ میں نے استفہامیہ نظروں سے کھالے کو دیکھا۔ ”اسا لکھا ہے؟“ اُس نے قاخرانہ انداز میں سر ہلایا۔

میں سوچ میں غرق ہو گیا۔ اُس نے کھالے کو کیوں بلایا؟ وہ کھالے کو اتنی اہمیت کیوں دینے لگی تھی؟ یہ اور اس جیسے ل سوالات زہرے کیڑوں کی طرح میرے ذہن میں گھومتے۔

اُس نے میرے پہلو میں کہنی چبھوئی۔ ”کیوں؟ اچھا لگایا؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں کھالے! ایسی بات نہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ تمہاری خان زادی تمہیں کس مصیبت اٹانے کا ارادہ رکھتی ہے۔“

”یعنی وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی بلکہ وہ مجھے بے وقوف لگتا ہے۔ تم یہی کہنا چاہتے ہو؟“ کھالے نے شکوہ بار لہجہ لیا۔ ”تم یہ سوچتے ہو کہ لڑکیوں کو تم جیسے چٹی چڑی والے مجھے لگتے ہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ غریبوں کے لیے دنیا میں ہلو میں نرم گوشہ نہیں ہے؟ ہاں ہاں! شہرے خان! یہ لی سوچ ہے۔ مانا کہ کالے، کمین اور غریب شخص سے محبت نہیں کرتا۔ وہ بھی نہیں کرتی مگر کھیلنا چاہتی ہے۔ ابا کر دل بہلانا چاہتی ہے۔ میرا کیا جائے گا، کیا ہاں گا؟ نہیں..... وہ اپنے طور سے کھیلتی رہے، میں اس میں کھیلا رہوں گا۔ جب اُس کا دل بھر جائے گا ارادہ بھی بدل جائے گا۔ اور تم تو یقیناً ڈرپوک شخص

ہو۔ ڈرتے رہو گے مگر زندگی میں کچھ بھی نہیں کر پاؤ گے۔“ مجھے اُس کی سوچ پر حیرانی ہوئی۔ اُس نے آنے والے چند ہی لمحوں میں مجھے بڑی طرح اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ پھر مجھے خاموش پا کر اُس نے میرا کندھا ٹھونکا۔ ”اوئے! تجھے سانپ سونگھ گیا یا زبان پر تالا لگ گیا، بولتا کیوں نہیں گوی؟“

میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ ”کھالے! تم ایک لڑکی کی خاطر اپنے ماں باپ اور بہنوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہو۔ کیا تمہیں کسی پر ترس نہیں آتا، ہیں.....؟“ وہ بھڑک گیا۔ ”میں اسما کے لیے نہیں، کسی اور مشن کی تکمیل کے لیے کھیل رہا ہوں۔“

مجھے اچھٹا ہوا۔ ”کیا مطلب؟ کیا مشن ہے تمہارا؟“ وہ پُر سوچ انداز میں بولا۔ ”مجھے ملتان میں کسی اچھی سی نوکری کی تلاش ہے۔ ملاقات کے دوران اُس سے فرمائش کروں گا کہ وہ میرے لیے کوئی مناسب سی نوکری تلاش کرے تاکہ میں اُس کے قریب رہ سکوں۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ مجھے ملتان میں بلا چکی ہے۔“

”بکواس نہ کرو، تم کہیں نہیں جاؤ گے اور اس غلط فہمی میں مت رہو کہ وہ تمہارے جیسے کن نئے عاشق کے لیے نوکری تلاش کرے گی۔“ میں نے مصنوعی بے پروائی سے اپنا فیصلہ سنایا۔ ”تم نور پور میں رہو، ملتان چلے جاؤ یا کہیں بھی جا کر ایڈ جسٹ ہو جاؤ، مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا..... سمجھتے تم!“

”اچھا!“ وہ استہزاء سے لہجے میں بولا۔ ”میرے دل کی دُنیا سوچ میں ہے، تم جانو، نہ جانو، مجھے فرق نہیں پڑتا۔ یہاں چوری چھپے اسما کا دیدار میسر آتا ہے، وہاں جب جی چاہے گا، مل لیا کروں گا۔ یہ کوئی معمولی بات ہے؟ ویسے بھی سیانے کہتے ہیں کہ ترقی کرنے کے لیے اپنا گھر بار چھوڑنا پڑتا ہے۔ میں نے بھی گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اباں ابا سے بات بھی کر لی ہے۔ جب میں انہیں تنخواہ کی رقم بھیجا کروں گا تو مارے خوشی کے اُن کی باجھیں کانوں سے جا لگیں گی۔ ایک تم ہو کہ میری خوشی دیکھ کر کالے غواہ ہو گئے ہو۔ ہاں!“

کوئی جواب دیے بغیر، میں نے اُس کے چہرے پر خوشی کے ان گنت عکس، جوش اور ہیجان کی ملی جلی کیفیت دیکھ کر خاموشی کی چادر اوڑھ لی کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ وہ اپنی مستی میں مست، اپنی محبت کی ترنگ کے بہاؤ میں رقصاں کافی دیر تک مسرت بھری بہکی بہکی باتیں کرتا رہا، خواب جتا رہا اور میں ہاں، ہوں میں جواب دیتا رہا۔ پھر یہ طے پایا کہ میں اُس کے ساتھ ملتان جاؤں گا جہاں وہ اسما سے چمن زار میں ملاقات کرے گا اور میں

والے کیمین کی کھڑکی پر جھکا، میں بھی کیمین کی طرف چل پڑا۔ ٹکٹ لیتے ہوئے پارکنگ ایریا کا جائزہ لیا۔ تفریح کے لیے آنے والوں کا ہجوم تھا۔ کوئی ٹیلی کار میں بیٹھ رہی تھی، کوئی نکل کر کیمین کی طرف آ رہی تھی۔ اک جہان حیرت سجا ہوا تھا، بساط شوق بچھی ہوئی تھی اور میں کھالے کی پشت پر نظریں جمائے پھول پودوں میں گھری روش پر چل رہا تھا۔ یہ مقام کا سب سے خوب صورت پارک تھا۔ زمانہ طالب علمی میں اپنے کلاس فیلوز کے ہمراہ بار بار یہاں آیا تھا مگر آج سب کچھ نیا محسوس ہو رہا تھا۔ یہاں بچوں، بڑوں اور خواتین کی دل بستگی کے لیے ان گنت اہتمام کیے گئے تھے۔ اگر کھالے نے خاندانوں اور ان کے بچوں کو نہ دیکھ رکھا ہوتا تو یہاں دوڑتے کودتے بچوں اور چلتی پھرتی عورتوں کو دیکھ کر یقیناً اگشت بدنداں ہو جاتا۔

جھیل کے وسط میں ایک جزیرہ بنا ہوا تھا جس کے چاروں اطراف لوہے کی مضبوط ریٹنگ لگی ہوئی تھی۔ ایک کمان دار چوبلی پل جزیرے کو پارک سے ملاتا تھا، ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے جزیرے پر گئے۔ کافی دیر تک کارآمدی جاری رکھا۔ کھالا جھیل کے کنارے پر ناگہانیں پسار کر بیٹھ گیا۔ اس نے جگہ کے انتخاب میں خاصی چالاکی سے کام لیا تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ گیٹ میں داخل ہونے والے ہر چہرے کا طواف کر سکتا تھا۔ میں اُس کے عقب میں، جھیل سے کچھ فاصلے پر، ایسا دہ پنگھوڑے کے پاس جا کھڑا ہوا اور بچوں کو کھیلنے ہوئے دیکھنے لگا۔

اسانے وقت کی پابندی کو ملحوظ رکھا تھا۔ عین مقررہ وقت پر گیٹ میں داخل ہوئی۔ شان بے نیازی سے چلتے ہوئے جھیل پر آئی۔ کھوجتی ہوئی نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ کھالے کو دیکھ کر جھیل کا چکر کاٹ کر اُس کے قریب پہنچ گئی۔ کھالا فرط محبت سے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ جھک کر سلام گو ہوا۔ کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے مگر کھالے کی محبت اندھی نہیں تھی، اسٹینس کے فرق کو دیکھ کر مودب ہو رہی تھی۔ دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی اور نہ ہی میں اُن کے لبوں کی حرکات سے موضوع سخن اخذ کر پایا تھا۔ کھالے نے اپنا صاف پھیلا کر گھاس پر پھیلا یا اور اُسے بٹھا دیا۔ خود چند قدموں کی دوری پر گھٹنوں کے بل گھاس پر بیٹھ گیا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”اے الو کے پٹھے! نماز پڑھنے کا ارادہ ہے کیا؟“

وہ اکیلی آئی تھی۔ اگر ذرا نیور ساتھ آیا تھا تو وہ باہر پارکنگ میں ہی رُک گیا تھا۔ وہ ڈرنگس شاپ کی طرف متوجہ

رہی مزدوری سے نجات مل گئی۔“

میں نے پوچھا، ”یہ یارن خان کیسا آدمی تھا؟“
اُس نے یارن خان کی تعریفوں میں دیوانے کی طرح، آسمان کے قلابے ملا دیے۔ چونکہ یارن خان یہاں نہیں تھا اور میں اُس سے یوں بے تکلفی سے پوچھ چھچھ کر سکتا تھا اس لیے شریف چچی والے کو اُس کے بارے میں کہنے لگا۔ اُس کی معلومات کے مطابق حیات خان نے اپنی زندگی کے ایک ہفتہ بعد اُس نے اچانک ہی ”کار“ قصد کیا تھا۔ وہاں جا کر شادی کر لی اور پھر وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ شریف چچی والا ایک مرتبہ یارن خان سے ملنے کے لیے لاہور جا چکا تھا مگر اُس کے گھر کا پتا سمجھانے سے اُس نے انکار کر دیا۔ وہ ان پڑھ آدمی تھا، ایک وزنگ کارڈ ہاتھ میں تھا۔ پوچھتا پوچھتا یارن خان کی کوئی تک پہنچا تھا اور کی گاڑی میں بیٹھ کر لاری اڈے گیا تھا۔

میں اس فضول کام سے خاصا دل برداشتہ اور مایوس ہوا۔ یارن خان کا میرے والدین کے قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرے برعکس ڈاکٹر شاہ جی پر امید تھا اور مجھے اس کام کی ہمت نہ تھی۔

آج کھالے کی مراد برآنے والی تھی۔ اپنے کاشکارانہ اور فراغت پا کر طے شدہ پروگرام کے تحت میں اس انتظار میں بخشو لوہار کی دکان پر آ بیٹھا۔ کچھ ہی دیر میں اُن کی دکان آتی ہوئی دکھائی دی۔ مخصوص وقت گزار کر، کاشکار کا دوسرا پھیرا لے کر میں اور کھالا چوک قریبی پہنچے۔ کاشکار خان ڈرائیور کے حوالے کی۔ وہ پہلے فرید آباد کے لیے بیڈ فورڈ بس چلاتا تھا۔ اس کی بس چند دن قبل اُلٹ گئی جس کی وجہ سے اُسے باڈی میکر کے ہاں ہفتہ بھر کے لیے لپکا کرنا پڑا۔ ان دنوں فارغ تھا اور وین اڈے پر بیٹھ رہی بندوں کی پھینک بھٹکتا تھا۔ دیہاڑی بن جاتی تھی۔ ہم مظفر گڑھ کے لیے بس میں بیٹھے۔ مظفر گڑھ سے جانے کے لیے ڈیرا اڈا والی وین پر سوار ہو گئے۔

میں کھالے نے مجھے چند سنہری ہدایات دیں۔ اُس درپیش آنے والی ہر ممکن صورت حال پر مجھے مفید رد عمل گاہ کیا۔ میں نے اُس کی باتیں ذہن نشین کر لیں۔ اس ل کی دنیا سے میں بے خبر تھا۔ اپنے دل کی جاننا تھا جو اور جوش میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

ہم ہم چمن زار کے بڑے سے گیٹ کے سامنے وین کے قریب سے سو چار بجے کا وقت تھا۔ دن منجھل ہونے لگا تھا۔ چند لمحے رُک رہا۔ جب کھالا گیٹ کے قریب ٹکٹ

تک گھر میں پڑا رہا۔ اُس کے کیوں نے مجھے اتنا مارا تھا میں کئی دن تک چار پائی سے اتر نہیں سکا تھا۔ پھر میرا ایک میرا پتھر آگیا۔ اسلم پنوار بصیرے میں رہتا تھا اور مظفر گڑھ کی ایک دھماکے والی مل میں کام کرتا تھا۔ اُس نے جب ۱۱ سنا تو مل میں لوکری کی پیش کش کی۔ اندھا کیا جائے، آنکھیں..... میں نے ہائی بھری۔ میں نے تیاری بھی کر لی مگر اسی دن جس دن میں مظفر گڑھ جانا چاہتا تھا، تمہارے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہائے اللہ! وہ دن دوبارہ نہ دکھانا۔“

اُس کے دونوں ہاتھ کانوں سے چپک گئے۔ آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔ کچھ دیر یہی کیفیت رہی، پھر بولا۔ ”بس پھر“ تھا، نور پور سب (دیران) ہو گیا۔ دوسرے دن حیات خان اسپتال سے مہلتیں اٹھا کر لایا۔ ہم سبھی کفن دفن میں رُکے رہے۔ فارغ نہیں ہوئے تھے کہ بڑا خان فوت ہو گیا۔ مجھے پھر ایک آدھ دن رکننا پڑا۔ قل خوانی کے بعد میں اپنا بستر اٹھا کر مظفر گڑھ چلا گیا۔ جا کر مل میں بھرتی ہو گیا۔“

میں نے پوچھا، ”تو پھر تم کب واپس آئے؟“
وہ بولا، ”شاید کبھی نہ آتا، اپنے گھر والوں کو وہیں بلانا مگر مجھے چوٹ لگ گئی تھی جس کی وجہ سے واپس آ گیا۔“

”چوٹ؟“
”ہاں! میں وہاں رنگ کھاتے میں ڈال رہی تھی ہوا تھا۔ یہیوں والی ٹرائی میں مال بھر کر دوسرے کھاتے میں لے جا رہا تھا۔ ایسے میں میرا پاؤں پھسل گیا اور چوٹ (کولہا) نکل گیا۔ کوئی دو مہینے چار پائی پر پڑا رہا۔ ٹھیک ہونے پر جب مل گیا تو پتا چلا کہ میری شفٹ کا حساب ہو گیا تھا اور سارے درکار سامان اٹھا کر شیخوپورے کی کسی مل میں چلے گئے تھے۔ اُس نے تفصیل بتائی۔“

اُسے مزید کریدنے پر مجھے کوئی خاص بات معلوم ہوئی۔ وہ میرا مطلوبہ شخص نہیں تھا۔ میں شریف چچی والے ملا۔ باتوں ہی باتوں میں اُسے اپنی پٹری پر چڑھایا تو اُس کے پوٹے منہ کا ٹیپ پلیئر فر فر چلنے لگا۔ ”شہرے خان ا بڑھی تھا۔ کہاں جانا تھا میں نے، اُسے (شال) میں محمود (نیک، لٹا) (جنوب) میں شاہ جمال تک، ڈھار (مشرق) نور کبڑا اور ڈلا (مغرب) میں غازی گھاٹ تک رندا، آ اور تیشہ اٹھائے گلی گلی پھر کر ہو کا لگا لگا کرتا تھا۔ نئی چار پائی اور پیر حیاں بنایا کرتا تھا۔ مرمت بھی کرتا تھا۔ گھر سے آ کر تو کبھی دو مہینے بعد لوٹتا، کبھی چار کے بعد۔ بڑے خان کا چار پڑھ کر نکلتا تھا، چار مہینے بعد واپس ہوئی تھی۔ یہ تو اللہ کرے سروار یارن خان کا۔ اُس نے مجھے دکان بنا دی

خطرہ کے پیش نظر اُس کی پہرے داری کروں گا۔ گاؤں میں اندھیرا پھیلنے کے ساتھ ہی ہماری محفل اُجڑ گئی۔
میں نے ڈاکٹر شاہ جی کی ہدایت کے مطابق کھوج لگانا شروع کر دیا تھا کہ میرے ماں باپ کے امدادہ ناک قتل کے فوری بعد نور پور سے کون رخصت ہوا تھا۔ چونکہ میں کسی کو بھی چوٹ کا تا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں اپنے والدین کے قاتل کی تلاش میں ہوں، اس لیے میں نے کچھ احتیاطیں بروئے کار رکھ لی تھیں۔

جس دن میرے والدین کے انتقال کو تین دن گزرے تھے، اُس دن سردار حیات خان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں نے اُس کے انتقال کو حوالہ بنا لیا تھا۔ اس طرح دو آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ ایک تو مقابل کے ذہن میں فوری طور پر وہ دورانیہ ابھر آتا تھا۔ دوسرا فائدہ یہ ہو رہا تھا کہ میرا مطلع نظر پوشیدہ رہتا۔

میری جستجو کے نتیجے میں تین اشخاص سامنے آئے جو اس واقعے کے فوری بعد نور پور سے چلے گئے تھے۔ افسر علی، شریف چچی والا اور سردار یارن خان..... مجھے ایک طرح کی مایوسی ہوئی کیونکہ ان تینوں کا تعلق کسی بھی انداز سے میرے والدین کے قتل سے جوڑا نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر شاہ جی کو ان تینوں کے بارے میں بتایا تو اُس نے کہا، ”خود کو غیر جانب دار رکھ کر اپنا کام آگے بڑھاؤ۔ ان تینوں افراد سے ملو۔ اپنی ذہانت کو بروئے کار لاتے ہوئے غیر محسوس انداز میں انہیں ٹٹولو۔ بہ ظاہر غیر متعلق دکھائی دینے والا فرد بھی ہمارا نارگٹ ہو سکتا ہے۔“

میں نے افسر علی سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ افسر علی میری گلی میں مشرقی کنارے پر رہائش پذیر تھا۔ بے ضرر اور معصوم بندہ تھا۔ وہ یقیناً میرا مطلوبہ شخص نہیں تھا۔ اُس نے مجھے بتایا، ”میں اُن دنوں یارن خان کے مال ڈنگر چرایا کرتا تھا۔ ایک دن خان کی ایک گائے ریوڑ سے علیحدہ ہو کر کھو گئی۔ میں رات بھر اُسے تلاش کرتا رہا مگر وہ نہ ملی۔ صبح جب خان کو پتا چلا تو اُس نے مجھے بھانے والے بڑے کیکر پر الٹا لٹکا دیا۔ تین بندوں نے مل کر میری تونی لگائی (مارا پٹا)۔ اس پر بھی خان کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تو اُس نے میری انگوٹی بھینس چھین لی اور مجھے نوکری سے نکال دیا۔“

میں اُس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔ سچ جھوٹ کی پرچھائیوں میں امتیاز کر رہا تھا۔ اُس کے پل پل بدلتے تاثرات غماز تھے کہ وہ سچ بول رہا تھا۔ ”شہرے خان! وہ بڑا ظالم انسان تھا۔ میں کافی دن

تھی۔ ہاتھ لہرا کر دکھار کو بلا رہی تھی۔ ایک لڑکا بھاگ کر دونوں کے قریب گیا۔ آرڈر لے کر پلٹ گیا۔ چند ہی لمحوں بعد میں نے دونوں کو آکس کریم کھاتے دیکھا۔ جی ہی جی میں کھالے کو مخاطب کیا۔ تمہارے برے دن آگئے ہیں کھالے استاد! سردیوں میں قلفہ کھاؤ گے تو کئی دنوں تک کھانتے چھینکتے رہو گے۔

مجھے کھالے کی قسمت پر رشک آیا اور میں غزال کو یہاں لا کر آکس کریم کھلانے کا منصوبہ ترتیب دیجے گا۔ وہ یقیناً اس دنیا کو دیکھ کر پریشان ہو جائے گی۔ اس نے ابھی تک شخص پور کی دنیا ہی دیکھ رکھی تھی۔ وہاں اور یہاں کے سچ زمین و آسمان کا فرق حامل تھا۔ اسما اور کھالے کو دیکھ رہا تھا، اپنی محبت کی تصوراتی آبیاری کر رہا تھا کہ چانک میں چونک پڑا۔ قیمتی پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک بڑے بالوں والا ہیرو ٹائپ آدمی دونوں کے سروں پر جا کھڑا ہوا تھا۔ میں ہنگموڑے کے آہنی اسٹینڈ کے ساتھ کمرٹکا کر کھڑا تھا۔ اُن کے قریب جانا چاہتا تھا مگر پھر کھالے کی ہدایت یاد آگئی اور میں نے اپنے بڑھتے ہوئے قدم روک لیے۔

نودار دے اسما کو مخاطب کیا پھر دونوں کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں۔ مجھے اسما کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پریشان اور براہم دکھائی دیتی تھی۔ کچھ گڑبگڑ ہو گئی تھی بھی کھالا ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اسما کو بھی اٹھنا پڑا۔ کھالے نے کچھ کہتے ہوئے ہیرو ٹائپ لیے تڑکے شخص کی طرف انگلی اٹھائی۔ یہ اس کا دھمکی دینے کا مخصوص انداز تھا۔ ہیرو نے اسے دونوں ہاتھ چھاتی پر رکھ کر پیچھے کی طرف دھکا دیا۔ ایسے ہی وقت میں اس کی چینی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

کھالا چند قدم پیچھے ہٹا پھر سنبھل کر آگے بڑھا اور اس نے دائیں ہاتھ کا زوردار تھپڑ ہیرو کے منہ پر دے مارا۔ چنانچہ کی آواز سنائی دی۔ ہیرو چند لمحوں تک اپنا بایاں ہاتھ گال پر رکھے اسے خوں آشام نظروں سے گھورتا رہا پھر چیختے ہوئے حملہ آور ہو گیا۔ دونوں دیوانہ وار ایک دوسرے سے ٹھٹھم گھٹاتے۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اینٹوں کی روش پر آ گیا۔ اب میں تینوں کے کافی قریب تھا۔ کئی لوگ متوجہ ہو گئے تھے اور میری طرح میدان جنگ کی طرف بڑھنے لگے تھے۔

اسما نے دونوں کو روکنے کی کوشش کی مگر پھر سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ کھالے نے ہیرو کے لائے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں جکڑا اور پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ وہ کمان کی صورت خم کھا

گیا۔ اس نے کھالے کو لات مارنا چاہی مگر کھالے نے پہلے ہی اپنا داہنا ہاتھ اٹھنا اس کے پیٹ کے نیچے مارا۔ وہ جھلکا اٹھا۔ اس نے گالیاں دیتے ہوئے کھالے پر کموں بارش کر دی۔ کھالا اس کے بالوں پر اپنی گرفت قائم نہ کر سکا اور اسے چھوڑ کر بے اختیار سینے اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر رہ گیا۔ ہیرو کو موقع مل گیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنی ٹانگہ اٹھا کر ایڑی کی ٹھوک کھالے کی پشت پر ماری۔ وہ منہ کے لی گرا مگر اس نے اٹھنے میں غیر معمولی مستعدی دکھائی۔ اچھے میں دھپ کی زوردار آواز کے ساتھ ہیرو کا بیچ اس کے جڑے پر لگا۔ دار کار گر رہا تھا۔ کھالا ڈر گیا اور ڈھلوال گھاس پر جمیل کے پانی تک لڑھکتا گیا۔ میرے دائیں بائیں کئی لوگ اکٹھے ہو گئے تھے اور ہر کوئی ایک دوسرے سے اس لڑائی کا پس منظر دریافت کر رہا تھا۔

اسما معاملے کی سنگینی کو بھانپ چکی تھی۔ اس کی چینی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”موبی! افارگا ڈسک۔۔۔۔۔“

میدان کا زوردار گرم تھا۔ اس کی آواز پر دونوں میں سے کسی نے کان نہ دھرے۔ مجھے ہیرو ٹائپ شخص کے نام کا پنا چل گیا۔ اس کا ٹک نیم موبی تھا۔ پورا نام محبوب، محب یا مندر ہو سکتا تھا۔

میں نے بے بس کھڑی اسما کی آنکھوں میں غمی تیرل دیکھ لی تھی۔ وہ اچانک پلٹی اور تیز تیز قدموں سے ہیرو کی گیت کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اس کا یہاں نہ کنا کسی بھی طور مناسب نہیں تھا۔

موبی کھالے کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے کھالے کو دھکیل کر جمیل میں پھینکا چاہا مگر دھوکا کھا گیا۔ کھالے نے بڑا پھرتیلا دیہاتی داد کھلیا تھا۔ اس نے موبی کی دونوں ٹانگوں کو پکڑا اور بغل میں سر دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دو تین چکر لیے، اسے گھما کر جمیل میں پھینک دیا۔ چھپاک کی زوردار آواز سے موبی پانی میں گرا، زیر آب گیا پھر سر جھٹک ہوا پانی کی را پر نمودار ہوا۔ اب صورت حال کافی بدل گئی تھی۔ وہ جمیل سے نکلتا جا رہا تھا مگر کھالے کی پے در پے ٹھوکریں اسے واپس پانی میں دھکیل دیتی تھیں۔ چند ہی ٹھوکروں نے اس کے چہرے کو خون سے رنگ دیا۔ ایسے میں لوگوں نے کھالے کو پکڑ لیا۔ پانی سے نکلنے کی کوشش میں معروف اجنبی کو نہ صرف گال لال دے رہا تھا بلکہ لوگوں کی گرفت سے نکلنے کے لیے بری طرح مچل رہا تھا۔ موبی پانی سے باہر آیا تو اس کی حالت بہہ خراب تھی۔ لباس پانی میں بھیگ کر بدن سے چپک گیا تھا۔ بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور اس کی تمام شان و شوکت

ہرے کی جلد کئی جگہوں سے پھٹ کر خون اگلنے لگی کی وجہ سے شرٹ کا اگلا حصہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے گالوں سے نوازا اور منٹ لینے کی دھمکیاں دیتے ہوئے تیز چلتا ہوا دور ہو گیا۔ اس کا رخ بھی چن زار کے گیت کی طرف تھا۔

لوگوں نے کھالے کو چھوڑ دیا۔ لوگ ماجرا پوچھ رہے ایسے میں ایک آدمی نے جلدی سے کہا۔ ”پولیس آ رہی ہے۔“

لٹا شامی یہ دیکھے بغیر کہ پولیس کس طرف سے آ رہی ہے ہلک اٹھے۔ چند ہی لمحوں بعد میں اور کھالا اکیلے رہ گئے۔ ہاتھ گھبراہٹ ہوئی نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ تین سپاہی تیز قدموں سے چلتے ہوئے گیت کی طرف سے جاتے وقوع کی طرف آتے دکھائی دیے۔ میں نے کھالے کو آنکھ کے زور سے بھاگ جانے کا کہا۔ اس کی آنکھوں میں خوف پر چھائیں لرزی اور وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے زوں والے احاطے کی طرف بھاگ نکلا۔ پولیس والوں نے اسے فرار ہوتے ہوئے دیکھ لیا، وہیں سے سیدھ کی اور مجھے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اُن کی رفتار چٹکی کھاتی تھی کہ وہ کھالے کی گرد کو بھی نہیں پہنچ پائیں گے۔ چھوٹی سی دی پہاڑی کے عقب میں جا کر فرض نبھانے والے تینوں دی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں سخت گھبرایا ہوا مگر چونکہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا، اس لیے میں نے کٹنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ کھالے کا صافہ ہنوز گھاس پر پڑا اسے جھاڑ کر کندھے پر ڈالا اور وہیں گھاس پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر گزر گئی۔ اچانک میرے کانوں میں بوٹوں کی گونجی۔ گردن موڑ کر دیکھا۔ تینوں سپاہی کھڑے ہانپ رہے تھے۔ ایک بولا۔ ”اوئے جوان! یہاں لڑنے والے کون تھے؟“

میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں شخص نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی، لمبے بال اور لمبا قد اس کا۔۔۔۔۔ دوسرا۔۔۔۔۔“

میں نے کھالے کا حلیہ بھی بیان کر دیا۔ وہ منہ بنا کر بولا۔ ”انہیں جانتے نہیں ہو کیا؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اسی اثنا میں بھاگ جانے والے تماشا نیوں نے پھر حلقہ لپٹا۔ پولیس والوں نے بالخصوص کسی کو مخاطب کیے بغیر ”تم میں سے کوئی جانتا ہے اُن لوٹروں کو؟“

ایک دس گیارہ سالہ بچے نے مسکرا کر کہا۔ ”میں بتاؤں

سپاہی متوجہ ہوا۔ خوش ہو کر بولا۔ ”تم جانتے ہو؟“

”جی انگل!“ بچہ شرارت آمیز معصومیت سے ۱۱

”ایک شان مائیکل تھا، دوسرا انڈر فیکر۔۔۔۔۔ سچ اکل امروہ آگیا دونوں کا ایکشن دیکھ کر۔“

اس کے ایک ہم عمر ساتھی نے کہا۔ ”آج انڈر فیکر دم دہا کر بھاگ نکلا۔ شان مائیکل ازدار گریٹ ریسلر!“

لوگوں کی بے ساختہ مسکراہٹوں پر سپاہی کھسیا گیا۔ تفریح کی غرض سے آنے والے کسی کو نہیں جانتے، اپنی موج سستی میں گم ہوتے ہیں۔ سبھی نے انکار کیا۔ ایک سپاہی بولا۔ ”چلو شریف علی! دونوں ہمیں دیکھ کر بھاگ گئے ہیں۔ ان بے چاروں کو کیا علم کہ وہ کون تھے۔ چلو بھی مجمع ختم کرو۔۔۔۔۔ چلو شاباش۔۔۔۔۔ اگر اُن دونوں میں سے کوئی دکھائی دے تو فوراً ہمیں گیت پر مطلع کرنا۔ ٹھیک ہے ناں!“

اس نے ڈنڈا لہرا کر تماشا نیوں کو تتر بتر کیا اور وہ گیت کی طرف بڑھ گئے۔ میری جان میں جان آئی۔ میں پہاڑی کے پاس ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر تا کا بھاگی کرنے لگا۔ کھالا دکھائی نہیں دیا۔ کہیں چھپ گیا تھا یا چن زار سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مجھے وہ ہیرو ٹائپ شخص بھی کہیں نظر نہ آیا۔ وہ اپنے ڈیل ڈول سے ہار ماننے والا نہیں لگتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو بلانے کے لیے بھاگ نکلا تھا یا کھالے سے نمٹنے کے لیے کوئی اسلحہ لینے گیا تھا۔

میرا خیال ٹھیک نکلا۔ لمبے بالوں والا موبی دو ساتھیوں سمیت آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ چڑیا گھر والی سمت سے برآمد ہوا تھا۔ اس نے شرٹ پہن اُتار چھینکی تھی اور اب ہائی نیک بنیان پہن رکھی تھی۔ ہال سوکھ چکے تھے جبکہ پینٹ ابھی گیلی تھی۔ تینوں نے جاتے وقوع پر گھبرائے ہو کر اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ کھالا وہاں ہوتا تو دکھائی دیتا۔ موبی کو لمحوں پر ہاتھ رکھے وہیں رُک گیا جبکہ اس کے دونوں ساتھی بارک میں ادھر ادھر گھومنے لگے۔ مجھے اُن کی حماقت پر فنی آئی۔ جس نے کھالے کو دیکھ رکھا تھا، وہ وہیں کھڑا تھا جبکہ وہ جو اس کی شکل سے نا آشنا تھے، اسے تلاش کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

موبی مضطربانہ انداز میں ٹپکتے ہوئے میرے قریب آیا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”زندہ نہیں چھوڑوں گا حرا زادے کو۔“

میں نے پوچھا۔ ”آپ کس کو تلاش کر رہے ہیں؟“

اس نے غصہ بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور ہٹکارا بھر کر وہ

بازار میں گھس گیا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا کافی دور تک نکل گیا۔ سمت کا دھیان رکھتے ہوئے چکر کاٹ کر دوسرے بازار میں سے گزرتا ہوا دوبارہ سڑک پر آ گیا۔ ایک ہی وقت میں مجھے نیلے رنگ کی پولیس دین اور سٹی بس دکھائی دیں۔ میں نے فی الفور بس میں گھس کر خود کو پولیس والوں کی متلاشی نظروں سے اوجھل کر لیا۔ بس مسافروں سے کچھ بھر رہی ہوئی تھی۔ میں بہ مشکل اپنی جگہ بنایا تھا کہ بس روانہ ہو گئی۔ بس شیر شاہ بائی پاس سے آرہی تھی۔ ملتان کے وسطی بس اسٹاپ ڈیرا اڈا کی طرف جارہی تھی۔ یعنی میں پھر پارک کی طرف جارہا تھا۔ اس کے سوا میرے پاس چارہ کار نہیں تھا۔ میں نے پارک کے داخلی گیٹ کا جائزہ لینے کی کوشش کی مگر رش کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بس وہاں پر مسافروں کو اتار کر آگے بڑھ گئی تو میرے دم میں دم آیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد میں ڈیرا اڈا کے چوک میں اتر گیا۔

میں سامنے ایک ہوٹل دکھائی دیا۔ محفوظ ہونے کا احساس پاتے ہی بھوک ستانے لگی۔ دوپہر میں کھایا ہوا کھانا اچھل کود اور سفر کی دھکم پیل میں ہضم ہو گیا تھا۔ ہوٹل میں گھس کر ایک خالی میز پر بیٹھ گیا۔ کھانے کا آرڈر دیا اور کھالے کے بارے میں سوچنے بیٹھ گیا۔

نہیں معلوم تھا کہ وہ کس حال میں تھا۔ پہلے فائر کی آواز سنتے ہی میں نے اسے فرش پر لیٹے دیکھا تھا۔ دوسرے فائر کی آواز پر موتی کو خون میں لت پت تڑپتے دیکھا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی نکلتا تھا کہ موتی کا نشانہ چوک گیا تھا۔ وہ بدولت لڑائی میں وہ کھالے سے ہزیمت اٹھانے کے بعد اپنے ہسٹول سے بھی دستبردار ہو گیا تھا اور کھالے نے، جب کوئی بات بنتی نہیں دیکھی، اسے گولی مار دی ہوگی۔ اگلا منظر جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ ہسٹول لہراتا ہوا وہاں سے بھاگ رہا تھا۔ اس کے متعاقب اس کی دھمکی سن کر رُک گئے تھے۔ پھر خدا جانے وہ پولیس والوں کی گرفت میں آ گیا تھا یا بھاگ نکلا تھا۔ اس کی پھرتی اور دلیری کو مد نظر رکھتے ہوئے اغلب اُمید تھی کہ وہ جیل دے کر اب تک نور پور پہنچ چکا ہوگا۔ موتی زندہ تھا یا مر گیا تھا؟ اس بارے میں کچھ کہنا محض قیاس تھا۔

کھانا کھانے کے دوران بھی میرے ذہن میں گزشتہ واقعات کی فلم اپنی تمام تر ہولناکیوں سمیت چلتی رہی۔ تیز پتی دالی چائے پیتے ہوئے پہلو میں ایک نئی کک جاگ گئی۔ اگر کھالا ہاتھ نہیں لگا تھا تو اب تک پولیس میری اور کھالے کی تلاش میں نور پور پہنچ چکی ہوگی۔ موتی کی موت واقع ہونے کی صورت میں موتی کے ساتھیوں نے اس کی نشاندہی کر دیتا تھی

میں نے اُچھل کر اپنی کہنی پوری قوت سے اس کے سر ماری۔ وہ ہائے کی دردناک آواز حلق سے خارج کرتا ہوا بوس ہو گیا۔ ایسے ہی وقت میں پھر فائر کا ہولناک دھماکا ہمارے گونجا جس کے ساتھ ہی ایک سماعت شکن انسانی چیخ اُٹھ گئی۔ میرا دل دھل گیا اور میں اپنی کہنی کو مسلتے ہوئے ہلکے کھالے کی طرف دوڑا۔ پارکنگ کا وسیع ایریا اس نے انسانوں سے کچھ بھر ا ہوا تھا۔ لوگوں نے، جو وہاں آدھے تھے، اپنی اپنی گاڑیاں وہاں سے نکال لی تھیں اور اب یہ وہ سڑک پر تماشا کی بنے کھڑے تھے۔ میں آدمیوں کے گچ میں سے نکل کر جونئی اس جگہ پر پہنچا جہاں کچھ لمحے قبل کالا زمین پر گر ا ہوا تھا، تو دیکھا کہ کایا پلٹ چکی تھی۔ کھالے مابجہ پر موتی زمین پر گرا خون میں لت پت تڑپ رہا تھا کھالا چند قدموں کی دوری پر مجھے دو کاروں کے بیچ میں ماسک ہوا دکھائی دیا۔ اس کے عقب میں دو پولیس والے دوڑ رہے تھے۔ کاروں سے آگے نکل کر وہ رُکا، پلٹا اور فضا میں نل لہرانے لگا۔

اپنے تعاقب کاروں کو خوفزدہ کر کے خود سے دور رکھنے لیے اس نے ایک ہوائی فائر کیا اور حلق کے بل چیخا۔

لہر دار! جو بھی میرے قریب آیا، زندہ نہیں بچے گا۔“ اس کے پیچھے بھاگنے والے جہاں کے تہاں رُک گئے وہ سڑک کے کنارے بنے ہوئے فٹ پاتھ پر دوڑنے لگا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے اپنے داہنی جانب ایک سیاہی وجود کی احساس ہوا۔ چونکہ یہ وقت معاملہ لمبی کا نہیں اس لیے میں نے لمبی جست بھری اور کھالے کی مخالف میں، مظہر گڑھ جانے والی سڑک پر رُک کی لگا دی۔ یہ میرا سائنہ اقدام تھا جو میرے حق میں بہتر ثابت ہوا کیونکہ کھالے خالی تھا اور گیٹ پر تعینات پولیس اہلکار اس وقت گم میں ہنگامی صورت حال سے نبرد آزما تھے۔ میرے میں بوٹوں کی خوفناک دھمک اور وہ گیا، پکڑو، جانے نہ دے، میسی ملی جلی آوازوں کا شور مچا تھا جس نے میری رفتار کو گما مہیز کر دیا تھا۔ چند ہی منٹوں میں، میں اپنے پیچھے لے والوں سے کافی مہلت حاصل کرنے میں کامیاب تقریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کرنے کے اس پوش علاقے سے نکل کر پھر ہجوم آبادی میں داخل آ گیا۔ یہاں میرے لیے چھپنا قدرے آسان تھا۔ میں ک کراپنے تعاقب کناڈں کا جائزہ لیا۔ وہ خاصے فاصلے لے دیے۔

کھالے دھوکا دینے کی غرض سے ایک تنگ اور مصروف

میں بے اختیار حلق کے بل چیخا۔ کھالے! ذرا سنبھل کے.....“

ساتھ ہی میں نے کھالے کو ہاتھ کے اشارے سے اٹھا کر موتی اس پر بائیں سمت سے حملہ آور ہونے والا ہے کھالے نے موتی کو دیکھا تو اچانک ٹھہر گیا جبکہ موتی کا ایک ساتھی موتی کے تعاقب میں جبکہ دوسرا میری طرف دوڑ پڑا میرے اعصاب تن گئے۔ ابھی تک میرا اور کھالے کا تعلق چھپا ہوا تھا، خیر تھی۔ اب طشت از بام ہو گیا تھا لہذا خیر رہی تھی۔ موتی کا ساتھی کاروں کے بیچ رُک زیک کے انداز میں دوڑتا ہوا خطرناک ارادے کے ساتھ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک فائر کی خوفناک آواز فضا میں گونج اُٹھی۔ غیر ارادی طور پر میں نے کھالے کو دیکھا تو میرا سانس سینے میں ہی کہیں گھٹ کر رہ گئی۔

میری نظروں کے سامنے کھالا فائر کی آواز کے ساتھ ف اُچھل کر زمین پر اوندھے منہ گر گیا جبکہ موتی اس کے سر پر کھڑا ہسٹول ہاتھ میں لہرا کر چیخ رہا تھا۔ میرے کانوں میں اس کی بے ہنگم چیخ دھڑک رہی تھی مگر سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پارکنگ ایریا میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ لوگ چلانے ہوئے وہاں سے دور بھاگ رہے تھے۔

اسی اثنا میں موتی کا ساتھی میرے قریب پہنچ گیا۔ میں چونکہ کھالے کی طرف متوجہ تھا جو یقینی طور پر گولی کھا کر زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اس لیے موتی کے ساتھی کے پہلے اور سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکا اور زخار پر زور دار مکا لگتے ہی ہاتھ کے بل لڑھک گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے رقصاں ہو گئے۔ میں جب تک سنبھل کر اٹھتا، حملہ آور مجھ پر دوہا، حملہ کر چکا تھا۔ وہ مجھے رگیدتا ہوا جمیل کی آہنی رینگ لے گیا اور گردن سے پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ اس کے اس مسلسل عمل سے میری کمر بار بار رینگ کی ابھری ہوئی نوکوں سے ٹکرا رہی تھی اور شدید تکلیف کا احساس میرے دپے میں اترتا جاتا تھا۔

یہ وقت میں نے اسے پیچھے دھکیلا۔ وہ چند قدم پیچھے پھر پوری قوت سے ٹکرا مارنے کی غرض سے میری سمت بڑھا میں بچنے کی ہی مستعدی سے ایک جانب ہٹ گیا۔ وہ اپنی جھونک میں رینگ سے ٹکرایا اور دہرا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں رینگ کے نوکیلے راڈ چبھ گئے تھے۔ میں نے اسے کھ کا موقع دیے بغیر پوری قوت سے اسے لات ماری۔ اس کرسیدھا ہوا، پلٹا پھر میرا طوفانی مکا چہرے پر وصول کر زمین پر بیٹھ گیا۔

گیا۔ میں نے کہا: ”ابھی پولیس والے آپ کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔“

”پولیس والوں کی تو.....“ اس نے نہایت واہیات لہجہ میں کہا، پھر ٹھٹک گیا، بولا: ”تم کتنی دیر سے یہاں ہو؟“ میں نے کہا: ”جب آپ کی لڑائی ہو رہی تھی، تب یہاں آیا تھا۔“

اس نے مجھ میں دلچسپی لی۔ بولا: ”میرے ساتھ لڑنے والا کدھر گیا؟“

اصولاً اسے پوچھنا چاہیے تھا کہ اسے مار مار کر ادھ موا کرنے والا کہاں گیا مگر وہ مار کھانے والی بات کو سرے سے گول کر گیا تھا۔ ایسا اعتراف کرنے سے اتنا پرچوٹ پڑتی تھی۔ میں نے مخالف سمت میں ہاتھ کا اشارہ کیا: ”ادھر بھاگ گیا۔ پولیس والے اس کے پیچھے لگے تھا مگر وہ کون تھا؟“ وہ بولا: ”میں اس حرا مزادے کو نہیں جانتا۔“

”پھر لڑائی کیوں ہوئی تھی؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ خاصا خوب زو انسان تھا مگر کھالے کی ٹھوکروں نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ایسے میں اس کے ساتھی بے نیل مرام لوٹ آئے۔ ان کی باہمی گفتگو کو سن کر مجھے علم ہوا کہ اس ہیر و تاپ شخص کا پورا نام محبوب الحسن تھا۔ تینوں کھالے کو غائبانہ گالیاں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ کھالے نے کسی طرف سے بھی سر نہیں نکالا تھا۔ غالب خیال یہی تھا کہ وہ اپنا کام کر کے رخصت ہو گیا تھا۔ میں نے بھی چمن زار سے نکلنے کا ارادہ کر لیا۔ اس کا انتظار فضول تھا۔ پارکنگ ایریا میں موتی اور اس کے دونوں ساتھی ایک کار میں بیٹھے دکھائی دیے۔ وہ اب بھی کھوجتی نظروں سے گیٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ناگاہ پارکنگ میں کھڑی ایک فور ویل جیپ کے بونٹ کے بار سے جھانکتا ہوا کھالے کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ موتی کی کار سے کچھ ہی فاصلے پر چھپا کھڑا تھا۔ چونکہ موتی اور اس کے ساتھی میری طرف متوجہ تھے، اس لیے میں اسے کوئی اشارہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرا دماغ بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ یقیناً کھالا موتی کی کار کو نہیں پہچانتا تھا اس لیے وہ ارد گرد دیکھ کر جیپ کے عقب سے نکل کر میری جانب بڑھنے لگا۔

ایسے ہی وقت میں موتی کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے کار سے اُترا اور کھالے کی طرف دوڑ پڑا۔ میں بری طرح ٹھہرا گیا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں بڑا سا خوفناک ہسٹول دبا ہوا تھا جسے وہ دوڑتے ہوئے لہراتا جاتا تھا۔

مرتبہ سرکودائیں بائیں جھٹک کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور پچھپھڑوں میں لمبی سانس اُتارتے ہوئے کموں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ بائیں رخسار کی جلد بھی پھٹ گئی۔

زور آور کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ میرا یہاں سے فی الفور بھاگ نکلنا ضروری تھا۔ میں اچھل کر کھڑا ہوا۔ عین اسی وقت مجھے زور کا دھکا لگا اور میں زور آور کے اوپر سے ہوتا ہوا سڑک پر جا گرا۔ میرا سرکار کے پچھلے ٹائر سے ٹکرایا۔ ذہن بھک سے خالی ہو گیا۔ سر جھٹکا لیکن اپنے اوسان ٹھکانے پر لانے میں کئی قیمتی لمحے میرے ہاتھ سے نکل گئے۔ زور آور کے ساتھی نے جس کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا، مجھے بالوں سے پکڑ کر اٹھالیا۔ تکلیف سے میرے دانت بچھ گئے۔ جونہی اُس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا، میں نے نیچے جھک کر اُس کی ٹانگوں میں ہاتھ ڈالا اور اس کے خون منہ جسم کو اوپر اٹھا کر پوری قوت سے سڑک پر پٹخ دیا۔ اُس نے اٹھنے میں دیر نہیں کی مگر کمر پر ہاتھ رکھ کر پھر ڈھے سا گیا۔ میں نے فٹ بال کو لگ مارنے کے انداز میں دایاں پیر اُس کے منہ پر دے مارا۔ وہ چوٹ کھا کر پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ میں نے دیوار کی جانب چھلانگ لگائی اور پیروں کے فٹ پاتھ پر ٹکتے ہی مارکیٹ کی مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔

اپنے عقب میں اچانک بلند ہونے والے شور نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ ہماری لڑائی کو دیکھنے کے لیے بہت سے تماشا شای دہاں جمع ہو گئے تھے۔ میں ایک ذرا ٹھہرا، پلٹا اور دیکھا۔ میدان صاف تھا۔ کار میں بیٹھا ہوا ڈرائیور کار کا دروازہ کھولے کھڑا بیٹھ رہا تھا۔ اُس کی بیچ اچانک ہی پولیس سائرن میں دب گئی۔ تیز ہوڑ کی ہولناک آواز سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا اور میں اچھل کر فٹ پاتھ پر ایک طرف کو دوڑ پڑا۔ مارکیٹ ختم ہو گئی۔ کوشیوں کا دراز سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں فٹ پاتھ سے اتر کر سفید رنگ کی ایک جدید طرز کی کوشی کی دیوار اور سڑک کے بیچ بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی کیار یوں اور پودوں کو پھلانگتا ہوا زیادہ دور تک نہیں پہنچ پایا تھا کہ دوسوڑ سائیکوں پر سوار سیاہ وردی پوش میرے سر پر پہنچ گئے۔ ایک نے مجھ سے آگے نکل کر تیزی سے ٹرن لیا اور کوشی کے گیٹ کے سامنے بنے ہوئے بارکنگ وے پر موڑ سائیکل روک لی۔ دوسرے نے مجھے دائیں پہلو سے آن گھیرا۔ میں نے سراپیمہ نگاہوں سے اُنہیں، پھر پیچھے کی سمت دیکھا۔ پولیس دین کو بالکل قریب پا کر ناچار مجھے رکنا پڑا۔ پارکنگ وے پر ٹھہرے ہوئے پولیس اہلکار نے اپنا ہیلمٹ اُتارا،

میں نے کہا: ”مگر تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟ میں نہیں نہیں جانتا اور نہ ہی تم سے کبھی ملا ہوں۔ کوئی غلط نہیں.....“ اُس نے غرا کر کہا، ”جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو ورنہ.....“ میں نے ایک نظر پستول کی نال کو دیکھا، اُس کی آنکھوں میں پچھلی بربریت کو پرکھا اور اُسے سنبھلنے کا موقع دے بغیر پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔ اُسے شاید مجھ سے ایسی بھرتی کی توقع نہیں تھی، اس لیے دھوکا کھا گیا۔ پستول پر اُس کی گرفت مضبوط تھی مگر اب وہ مجھ پر قافز نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ہم دونوں کے ہاتھوں میں دبے ہوئے پستول کی نال کا رخ آسمان کی طرف تھا۔ میں نے دایاں گھٹنا پوری قوت سے اُس کی ٹانگوں کی بیچ دے مارا۔ وہ ’اوغ‘ کی آواز نکال کر گھٹنوں کے مل فٹ پاتھ پر ڈھے گیا۔ میرا دوسرا دار اُس کے سینے پر پڑا۔ پستول پر اُس کی گرفت دم توڑ گئی اور وہ کمر کے مل سڑک پر جا گرا۔ میں پستول کو ہاتھ میں سیدھا کر ہی رہا تھا کہ اُس کے ساتھی نے، جسے میں جلد بازی میں بھلا بیٹھا تھا، پوری قوت سے میری گردن کے عقبی حصے پر مکا دے مارا۔ اُس نے شاید اپنے بدن کی پوری طاقت کے پر صرف کر دی تھی مگر نہ میں زمین پر چت کرے ہوئے زور آور پر دھڑام سے گر گیا۔ پستول میرے ہاتھ سے نکل کر فٹ پاتھ پر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ زور آور کے حلق سے دبی دبی چیخ برآمد ہوئی اور اُس نے مجھے بانہوں کے حصار میں جکڑ کر پٹخ لیا جبکہ اس کے ساتھی نے مجھ پر ٹھنڈوں کی بارش کر دی۔

میں بہ یک وقت دو محاذوں پر نبرد آزما تھا۔ زور آور صرف نام کا زور آور نہیں تھا بلکہ اُس کی آہنی گرفت کے سبب میری سانس رکنے لگی تھی جبکہ اُس کے ساتھی کی پے در پے لگنے والی ٹھوکروں نے مجھے دن میں تارے دکھادیے تھے۔ میں نے سانس روک کر، دونوں ٹانگیں اٹھا کر پوری قوت سے گدھے کی طرح جھاڑیں۔ مجھے جرسی والے کی پوزیشن کا علم نہیں تھا مگر میرا ’ٹکا‘ کام کر گیا۔ میری دوتی اُس کے سینے کے کندھوں پر پوری قوت سے لگی تھی اور اُس کا سر دکان کی دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔ اُس کے حلق سے لگنے والی چیخ سن کر ار آور نے دانت پیستے ہوئے اپنی بانہوں کی جکڑن میں ٹانگ حد تک اضافہ کر دیا۔ میں نے خود کو چھڑانے کے اپنی پوری قوت صرف کر ڈالی مگر اُس کی بانہوں کا حلقہ نہ اُٹکا۔ اور کچھ نہ سوچا تو میں نے اُس کے ماتھے پر زور دار رسید کی۔ اُس کی گرفت پل بھر کو کمزور ہوئی۔ میں نے ہاتھ تین چار ٹکریں رسید کیں تو اُس کے ہاتھ کھل گئے۔ لی کی جلد پھٹ گئی اور خون رسنے لگا۔ اُس نے دو تین

اس لیے میں جزل بس اسٹینڈ پر سے بس یا دیکھن پکڑا۔ ارادے سے کسی رکشے کو دیکھ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں میرے قریب سے ایک ڈارک کار نہایت کم رفتار سے گزری۔ چند قدم آگے جا کر ابریک لگ گئے۔ میں اُسے نہایت سرسری انداز میں رکشے کا انتظار کرنے لگا۔ میں سمجھا تھا کہ کار والے مار سے کچھ خریدنے کے ارادے سے رُکے تھے مگر تب طرح چونکا جب کار ریورس ہو کر عین میرے سامنے گئی۔ کار کے دونوں دروازے یکبارگی کھلے اور دو افراد معمولی تیزی سے اتر کر میری جانب بڑھے۔ میری چمپل نے خطرے کا الارم بجادیا۔ جب اگلے گیٹ سے نکل کر تک پہنچنے والے شخص کا چہرہ دکھائی دیا تو میرا دل دھک رہ گیا۔ وہ موبی کا ساتھی تھا جسے میں نے پارک کی رینگ پاس پہلوانوں کے سے انداز میں خوب ٹھونکا بجایا تو پچھاڑ کے رکھ دیا تھا۔

ناساعد اور کبیدہ خاطر صورت حال کی سبب کو سمجھنے مجھے بہت دیر ہو چکی تھی۔ دونوں میرے سر پر پہنچے تھے۔ میرے بارگزیہ نے سیاہ رنگ کا لیدر کوٹ پہن رکھا جبکہ اُس کے ساتھی نے ہلکے رنگ کی فیس سی جرسی پہن رکھی۔ اسے میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ سیاہ کوٹ میرے مقابل ٹھہر کر خشونت بھری نظروں سے مجھے گھور لگا۔ میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور بے پیچھے ہٹ کر کہا: ”کیا بات ہے؟ کون ہو تم لوگ اور اس مجھے کیوں گھور رہے ہو؟“

جرسی والا اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا: ”زور کیا تم نے پہچاننے میں کوئی غلطی تو نہیں کی؟“ ”نہیں.....“ زور آور نے کڑی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی کوٹ کی پاکٹ سے اپنا ہاتھ نکال لیا۔ میرے جسم کا خون میری آنکھوں میں پہنچا۔ اُس کے ہاتھ میں ننھا سا پستول دبا ہوا تھا جس کی نال ہم سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ ”کوئی بھی حرکت کرو گے اور ڈھیر کر دوں گا۔ چلو..... گاڑی کی طرف چلو!“

اُس کے سنگین اور تھکسانہ لہجے نے اُس کے عزائم آنا نانا آشکار کر دیے۔ وہ مجھے اغوا کر کے کہیں لے ہا تھا۔ کہیں مار پیٹنے کا ارادہ رکھتا تھا یا مجھے پولیس کی تحویل دینے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ ابتدائی خوف اور کیفیت سے میں اتنی دیر میں چھٹکارا حاصل کر چکا تھا تیس لمحوں میں اُن کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔

جو کھالے کے بارے میں معلومات فراہم کر سکتی تھی۔ اگر موبی مرنے سے بچ گیا تھا تو بذات خود اس کا نام پولیس کو دے دیتا۔ یعنی دونوں سورتوں میں ہم قانون کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ہاں! تیسری صورت یہ نکلتی تھی کہ اس کا کھالے کے بارے میں لب کشائی نہ کرتی مگر یہ ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔

شکم میرا بی نے ذہن کی آبیاری کر دی تھی۔ سوچنے کی صلاحیتیں عود کر آئیں۔ بھائی دینے لگا تھا کہ مجھے منہ اٹھائے نور پور نہیں جانا چاہیے۔ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر نور پور کے حالات کا جائزہ لیتا چاہیے یا اس کا کھالے کو ڈھونڈنا چاہیے۔ دونوں میں سے کوئی بھی مل جاتا تو حالات سے آگاہی ہو جاتی۔ ایک نئی پریشانی جاگ پڑی، میرے پاس اس سے رابطے کی کوئی سہیل نہیں تھی۔ نور پور میں سیلور سگنلز نہ ہونے کی وجہ سے کسی کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ ابھی تک نور پور اور اطراف میں کسی جگہ پر بھی کوئی سیلور ٹاور نصب نہیں ہوا تھا۔ دل کو ایک ذرا تسلی ہوئی کہ خانزادوں کے پاس کارڈ لیس فونز کی سہولت موجود تھی۔ میں امیر نواز اور بخت خان سے رابطہ کر کے نور پور کے حالات کے بارے میں دریافت کر سکتا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر ’یو‘ شکل کی مارکیٹ کے کارنر میں واقع ایک ’بی سی او‘ پر پہنچا۔ امیر نواز کا نمبر ایک چٹ پر لکھ کر دکاندار کو دیا۔ اُس نے ہتھیری کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو پایا۔ پھر میں نے بخت خان کا نمبر دیا۔ میری بد قسمتی شاید پورے جو بن پر تھی کیونکہ بخت خان کا نمبر بھی نہیں لگا۔ دکاندار نے کہا: ”نہیں بھائی صاحب! شاید متعلقہ ایکس چینج بند ہے یا لائن میں گر بڑ ہے۔“

میں مایوس ہو کر پھر سڑک پر آن کھڑا ہوا۔ نور پور کے خانزادوں کے لینڈ لائن نمبر چوک قریبی میں تھے جہاں پر انہوں نے کارڈ لیس فون کے اونچے ایریل نصب کر رکھے تھے۔ چوک قریبی والی ایکس چینج آئے روز فنی خرابیوں کا شکار ہوتی رہتی تھی جس کا داویلا امیر نواز بہ کثرت کرتا رہتا تھا۔

رات خاصی گہری ہونے لگی تھی۔ دکانیں بند ہونے لگیں۔ زیادہ دیر تک یہاں ٹھہرنا میرے لیے کسی نئی پریشانی کا پیش خیمہ بن سکتا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں سے کھالے کو ڈھونڈ نکالنا ممکن تھا نہ ہی اُس کے اتفاقاً مل جانے کی امید پر تکیہ کرتے ہوئے شب کا بآوارگی میں گزاری جاسکتی تھی۔ ڈیرا اڈا سے روانہ ہونے والی دیکھیں چمن زار والے راستے سے مظفر گڑھ جاتی تھیں۔ مجھے پکڑ لیے جانے کا خوف لاحق تھا

ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور مجھ پر تان لیا۔ میرے پہلو میں کھڑے ہوئے لمبے تڑنگے سپاہی نے بھی ایسا ہی کیا۔ جونہی میری نگاہ دین کی روف و نڈ میں کھڑے ہوئے سپاہی کے ہاتھ میں دبی شارٹ گن پر پڑی، میرے اوسان خطا ہو گئے اور رہے سبے مزا خمانہ ارادے بھی دم توڑ گئے۔

میرے سامنے کھڑے سپاہی نے لکارا۔ ”تم میرے نشانے پر ہو۔ جتنا بھاگنا تھا، بھاگ لیا۔ ہاتھ اپنے سر پر رکھ لو۔ چلو شاہاں!“

میں نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ سڑک پر کھڑا ہوا موٹر سائیکل سوار اتر کر میرے عقب میں آیا۔ کمر پر ریوالور کی ٹال کا احساس بڑا تکلیف دہ تھا۔ اس دوران پولیس کی موبائل دین سے دو تین سپاہی اتر کر اُس ملائم گھاس والے چھوٹے سے لان میں آ گئے۔ اُن میں سے ایک، جس کے شناختی بیج پر ملک ارشد لکھا ہوا تھا، نے مجھے سر تا پا کریدیاتی نظروں سے گھورا اور استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”بڑی پھرتی دکھائی تم نے؟“

میں بڑی طرح پھنس گیا تھا۔ میرے پاس سوائے خاموش رہنے کے کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ ملک ارشد نے اپنے ساتھیوں کو میری جامہ تلاشی لینے کا حکم دیا۔ بڑے ماہرانہ انداز میں میری تلاشی لی گئی۔ قدیرے بھاری تن و توش والے نے میری جیب میں موجود تمام رقم نکالی اور گنے بغیر اپنی جیب میں ڈال لی۔ اسی اثنا میں زور آور کی ڈارک بلو کار بریکوں کی تیز چرچاہٹ کے ساتھ پولیس دین کے متوازی آن رُکی۔ چند ہی لمحوں میں زور آور اور اُس کا ساتھی میرے سامنے کھڑے خشکیں نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

”تمہارا ساتھی کہاں ہے؟“ زور آور نے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑ کر زور وار جھٹکا دیا۔

میں نے اطراف میں کھڑے پولیس والوں کو دیکھا۔ اگر وہ موجود نہ ہوتے تو میں زور آور کو اُس کی گستاخی کا مزہ چکھا دیتا۔ کوشش کے باوجود اپنے لہجے کی تلخی پر قابو نہیں پاسکا اور جھنجھلا کر بولا۔ ”میرا کوئی ساتھی ہوتا تو وہ میرے ساتھ ہوتا۔“ اُس کا جارحانہ رویہ دیکھ کر میرے اعصاب تن گئے۔ شکر ہوا کہ وہ دانت پیس کر، میرا گریبان چھوڑ کر ملک ارشد کی طرف گھوم گیا۔ پاٹ دار آواز میں بولا۔ ”ملک! اسے اریسٹ کرلو۔ یہ مولی کے قاتل کا ساتھی ہے۔“

”فکر نہ کر زور آور!“ ملک ارشد نے کہا۔ ”اس کے فرشتے بھی چیخ چیخ کر بتائیں گے کہ وہ نامراد کہاں روپوش ہوا ہے۔“ زور آور کے الفاظ میں پنہاں سنگینی میرا دل دہلا گئی۔

مولی مرچکا تھا۔ کھالے قاتل اور میں قاتل کا معاون قرار پا چکے تھے۔ میں نے اپنے دفاع میں کہا۔ ”یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں اور اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔“

ایک گن بردار زور سے ہنسا۔ ”الو کے پٹھے! یہ دوڑا دوڑی ماں کی وصیت پر کر رہے تھے کیا؟“

اُس کا لہجہ بڑا کٹھن تھا۔ اُس نے میرا جواب سننے بغیر اپنے بوٹ کی ٹھوک میرے گھٹنے کے عقبی حصے میں ماری۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گھٹنوں کے بل گھاس والی زمین پر گر گیا۔ ملک ارشد نے میرے پیٹ میں ٹھوکر رسید کی۔ شاید یک طرفہ اعلان جنگ ہو گیا تھا کیونکہ سبھی اہلکاروں نے مجھ پر یلغار کر دی تھی۔ کچھ دیر تک تو میں نے اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر مارے، منت سماجت کی اور اپنی بے گناہی کا رونا رویا، پھر تھک گیا اور اپنا چہرہ بانہوں میں لے کر گھڑی بن کر ادھر ادھر لڑھکنے لگا۔

جب مجھے پٹنے والے تھک گئے، تب ایک بھاری بھر کم آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”ادئے ملک! تین سو دو لگوانے کا ارادہ ہے کیا؟ بس کر۔ بہت ہو گئی۔ اسے وینک میں ڈال اور لاک اپ میں ڈال آ۔“

نہایت تکلیف دہ ٹھوکروں کی برستی ہوئی بارش رُک گئی۔ میں گھاس پر پڑا تھا اور میرے حلق سے متواتر کراہیں پھوٹ رہی تھیں۔ اُنہوں نے چند ہی منٹوں میں میرا منہ سر ایک کر دیا تھا۔ جسم کا شاید ہی کوئی ایسا عضو تھا جس پر ٹھوکریں نہیں لگی تھیں۔ کبرخت آواز پھر کانوں میں پڑی۔ ”اوئے نامراد! اب اٹھ کھڑا ہو..... زیادہ مکر نہ کر ورنہ.....“

میں نے کھڑا ہونے میں اپنی تمام تر قوتیں مجتمع کر دیں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بہ مشکل ایک ٹائیے کو کھڑا رہ پایا، پھر لہرا کر پہلو کے بل گر گیا۔ ملک ارشد کی ٹھوکر پسلیوں پر لگی۔ میں بلبلا کر رہ گیا۔ بھاری آواز والے نے آگے بڑھ کر میری بغل میں ہاتھ ڈالا اور کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی اور حلق سے کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ جب میں کوشش کے باوجود بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ پایا تو اُس نے مجھے دھکا دے کر زمیں بوس کرتے ہوئے کہا۔ ”کھوٹے دا پتر نہ ہو تو! سرکاری تواضع کی ہمت نہیں تھی تو محنت مزدوری کرتا، کوئی کام دام سیکھ لیتا۔ اوئے جوان! اسے کھینچ کر وینک میں ڈال دے۔ چل، جلدی کر۔ ابھی وی آئی پی سو وینک کے لیے روڈ کلیئر کرنا ہے۔ ہری اپ.....“

میرا ایک بازو ملک ارشد نے پکڑا، دوسرا بازو ایک

بھاری مونچھ بردار سپاہی نے سختی سے پکڑا اور مجھے بے رحمی سے کھینچے ہوئے دیکھن تک لائے۔ باریک جبری والی سڑک پر کھینچنے کی وجہ سے میرے جسم کا پچھلا حصہ بڑی طرح چھل گیا تھا۔ میں چیخ رہا تھا اور بے ربط انداز میں انہیں بتا رہا تھا کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر وہ ماننے پر آمادہ نہیں تھے۔

میرے ساتھ پولیس والوں کا رویہ ایسا تھا جیسے ان کے ہاتھ کوئی اشتہاری مجرم لگ گیا تھا جس کی نوک پلک ستوارتا ان کے فرائض منصبی میں شامل ہو۔ سرعام انجام پذیر ہونے والے تماشے کو دیکھنے کے لیے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے جنہیں ایک سپاہی کی دھاڑ، چلو بھئی، مجمع ختم کرو اور ٹریفک بلاک نہ کرو نے منتشر کر دیا تھا۔

مجھے دیکھن کے عقبی حصے تک لا کر وہ مجھے چھوڑ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔ ملک ارشد اور بڑی مونچھوں والے نے مجھے کھینچ کر دیکھن میں ڈال دیا۔ میرے جسم کا زیریں حصہ پہلے سڑک اور مابعد دیکھن کے ڈالنے سے رگڑ کھا کر بڑی طرح چھل گیا۔ دیکھن کے فرش پر پھینک کر وہ آٹنے ساٹنے سیٹوں پر براجمان ہو گئے۔ انہوں نے سخت بھرے انداز میں مجھ پر اپنے پاؤں رکھ دیے۔ حوالدار نے مونٹر سائیکل سواروں کو ہدایات دیں، ڈرائیور کو تھانے چلنے کا حکم دیا اور خود دیکھن کے کیمین میں اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ دیکھن اشارت ہوئی اور ان دیکھی منزل کی طرف رداں رداں ہو گئی۔

پچکولوں کے بل پر جو نبی میرا جسم فرش پر ہلاتا جلتا، درد کی شدید ٹیسیں اٹھتیں۔ منہ سے چیخ بھی نکل جاتی۔ ملک ارشد نے دایاں پیراٹھا کر زور سے میری پسلیوں پر مارا۔ ”منہ بند رکھو ورنہ ہمیشہ کے لیے خاموش کرادوں گا۔“

میں نے دانت بھینچ لیے۔ آج تک ایسی تذلیل اور مار پیٹ سے واسطہ نہیں پڑا تھا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے میں ہمیشہ حالات کی زد پر ایسی ٹھوکریں کھاتا چلا آ رہا تھا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ریخت خوردہ بدن کی تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے میرا بدن کسی بڑے ٹرالر کے ان گنت پہیوں تلے آ کر کچلا گیا ہو اور اس کے درست ہونے کا امکان تک نہ رہا ہو۔ مجھ پر لمحہ لمحہ گراں گزر رہا تھا جبکہ ملک ارشد اور مونچھ بردار سپاہی جس کا نام فرید علی تھا، آپس میں کسی وفاقی منسٹر کی آمد پر رائے زن تھے۔ اچانک فرید کو میرا خیال آ گیا، بولا۔ ”اس حرامی چڑے کا کیا کرتا ہے؟“

”جا کے حوالات میں ڈال کر روزنامے میں درج کر دیتے ہیں۔ پھر سب انسپکٹر جانے اور اس کا کام۔ نہیں کیا؟“

فرید علی نے میرے پیٹ پر پاؤں کا زور بڑھا دیا ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”وہ اس کھوتے کو چڑی کا بچہ کہہ رہا تھا۔ میرا بچی چاہا کہ اُسے کہوں کہ اس چڑی کے بچے کو اٹھا کر دیکھن میں ڈال دے۔ چپ رہا کیونکہ وہ تھانیدار صاحب کے سامنے بال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتا ہے۔“

چھوٹے تھانیدار کے چھوٹے پن پر ملک ارشد بھی شکوہ کناں ہو گیا۔ بولا۔ ”بیچے سے ترقی کر کے اوپر جانے والا افسر اور کیمین سے خان یا چودھری بننے والا شخص ہمیشہ بچ اور گری ہوئی حرکتیں ہی کرتا ہے۔“

”اگر ایسا نہ ہو تو پوچھنا کیسے جائے؟“

”ہاں یار! تم سچ کہتے ہو۔ اس چڑے کی پاکٹ سے جو ملا، اُس کے چیلے نے اپنے پاس رکھ لیا اور کھٹکھٹلی ہماری جھولی میں ڈال دی ہے کم بختوں نے!“

تکے تھانیدار کے سامنے ”جی، جی“ کرنے والے اُس کی عدم موجودگی میں غبار دل نکال رہے تھے۔ وہ دیکھن کے اگلے حصے میں بیٹھا تھا۔ کیمین دور چلا گیا ہوتا تو وہ غلیظ گالیوں سے سرفراز کرنے میں بھی لیت دلال سے کام نہ لیتے۔

اچانک ملک ارشد نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”مونٹی کو تم لوگوں نے کیوں گولی ماری؟“

میں کراہا۔ ”میں مونٹی کو جانتا تک نہیں جی!“

”اچھا! پھر تو تم زور آور کو بھی نہیں جانتے ہو گے؟“ اُس کے لہجے میں طنز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

جواباً نفی میں سر ہلا کر ملتجیانہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

وہ بولا۔ ”تمہارا تعلق کس گینگ سے ہے؟ پھیکے چھل کے لونڈے ہو؟“

یہ نام میرے لیے قطعاً اجنبی تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ فرید علی نے ڈانٹ کر کہا۔ ”پانچ سیر کا سر ہلاتے ہو، ایک چھٹانک کی زبان نہیں ہلا سکتے۔ سیدھی طرح بات کرو ورنہ ہمیں لمبالیٹ کر دوں گا۔“

میں نے تھوک نگلا۔ بولنا چاہا مگر زبان تالو سے چپک کر رہ گئی۔ اُس نے مجھے لمبالیٹ کرنے کی دھمکی دی تھی جبکہ میں پہلے ہی اُن کے پیروں تلے چت پڑا تھا۔ ملک ارشد نے اوپر تلے دو چار نام اور گنوائے۔ میں کسی کو بھی نہیں جانتا تھا۔ ناموں کی ساخت ایسی تھی کہ میں سمجھ گیا کہ وہ مختلف جرائم پیشہ لوگوں کے گروہوں میں سے کسی جتنے کے ساتھ میرا تعلق کریدنا چاہتا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ میں کس گینگ کا رکن تھا۔ اُس کے انداز استفسار سے معلوم پڑتا تھا کہ زور آور اور

مل مونٹی کا تعلق کسی کریمنل گینگ سے تھا اور وہ اپنی تھمتیش انازا سی نقطہ نظر سے کر رہا تھا۔

فرید ٹھنکی انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”یہ یہاں کا وارداتی ہون لگتا۔ یا تو نیا کسی گینگ میں شامل ہوا ہے یا کسی اور شہر سے آیا ہے۔ کیوں بے بھولے بد معاش! کہاں سے آئے؟“

”اُلا ہور سے؟“

مجھے اپنی آواز بھی اجنبی سی لگی۔ ”میں مظفر گڑھ سے آیا ہوں۔“

”وہاں بھی یہی کام کرتے تھے؟“

میں نے بے دھیانی میں پوچھ لیا۔ ”کون سا کام؟“

اُس نے اپنی داہنی پٹیلی کو گردن کے متوازی حرکت دیتے ہوئے مخصوص اشارہ کیا۔ ”یہی..... کرایے پر خون لڑا بے والا دھندا!“

میں نے جبرٹے بھینچ لیے، بولا۔ ”میں ایسا نہیں ہوں۔“

اُس نے مصنوعی ہمدردی سے ”سچ، سچ“ کی اور پچکارنے کے سے انداز میں کہا۔ ”تم تو واقعی ایسے نہیں ہو۔ تم تو بس ذرا ’داک شاک‘ کرنے گھر سے نکلے تھے اور ہم نے تمہارے ماتھ دیادتی کی کہ پکڑ کر ذرا پیار شیار کر دیا۔ ہے ناں؟“

میں نے بے بسی سے آنکھیں موند لیں۔ ایسے میں دھن اد پر تلے تین چار موڈ کاٹ کر ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ فرید اور ملک ارشد اترنے سے پہلے مجھ پر اپنے پلے لائے جسموں کا پورا وزن ڈال گئے۔ فرید کا ایک ہمدردی سے پر چند ٹانہوں کے لیے تھا تھا۔ تب میں نے بڑی مشکل میں تنگ آئی کڑوی قے کو باہر آنے سے روکا تھا۔

سب انسپکٹر دکھائی دیا۔ مجھ پر ایک نگاہ تحفہ ڈال کر ان کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے ادبھل ہو گیا۔

ارشد نے مجھے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ چونکہ اُن کی ظالمانہ لہجہ دس نے حکم کی بے چوں چوں تعمیل کا سبق مجھے ازبر ادیا تھا، اس لیے دونوں ہاتھ سیٹوں پر ٹکا کر اٹھنے کے لیے م کی تمام تر توانائی خرچ کر دی۔ عضو عضو سے ندائے ج بلند ہوئی مگر میں اٹھ کر بیٹھنے اور پھر دیکھن کے ڈالے کا اُلے کر اینٹوں کے فرش پر اترنے میں کامیاب ہو گیا۔

لموں تک دیکھن سے فیک لگا کر ہانپتا رہا اور اطراف کا دھنپتا رہا۔ میں قدیم دور کی سالخورہ عمارت پر مشتمل کی حدود میں کھڑا تھا۔ میرے ارد گرد ملک ارشد اور علی کے علاوہ ان گنت وردی پوش موجود تھے۔ سپاہی لے کر سب انسپکٹر تک ہر عہدہ متحرک تھا۔

میری سراسیم، منت آمیز اور وحشت انگیز نگاہوں کے

جواب میں دونوں طنزیہ نظروں سے مجھے گھورتے رہے۔ فرید علی بولا۔ ”اب کیا یہاں ہی کھڑے رہنے کا ارادہ ہے برخوردار؟“

میں نے التجا کی۔ ”سربچی! میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔“

ملک ارشد نے ڈپٹ کر کہا۔ ”نہیں کیا تو اب کر لو..... کون روکتا ہے تمہیں؟..... اب بک بک بند کر دو اور گاڑی اڑے پر لگاؤ۔“

میرے احتجاج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے فرید نے مجھے تھانے کی حوالات کی طرف دھکیلا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ حوالات کا منہ دیکھنے جا رہا تھا۔ آج تک لوگوں کی زبانی اس سرکاری مہمان خانے کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اور کچھ دیر قبل پولیس والوں کا جو رویہ مجھے دیکھنے کو ملا تھا، اُسے مد نظر رکھتے ہوئے میں خاصا دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ ٹریلر اتنا ڈراؤنا تھا، فلم کیسی ہوگی؟ یہ سوچ کر دل لرز رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں حوالات کا سلاخوں والا دروازہ کھول کر مجھے دھکا دے دیا گیا۔

میں ٹوٹے پھوٹے پلستر والے فرش پر گرا۔ نڈھال انداز میں اٹھا۔ سامان سے بکسر عاری عام طول و عرض کے کمرے کا ایک نظری جائزہ لیا۔ دیوار سے فیک لگائے دس بارہ افراد دکھائی دیے جن کے چہروں پر لکھی ہوئی عبارتیں بادی النظر میں ایک جیسی تھیں۔ ایک تیز چبھتی ہوئی آواز کانوں میں پڑی۔

”جیوندادارہ باجھا (بادشاہ)! دسداد سدارہ بھائی.....“

مجھے علم نہ ہوسکا کہ بیٹھے ہوؤں میں سے کس نے مجھے اس تعقیب آمیز انداز میں خوش آمدید کہا تھا۔ ایک مرل مرل، سیاہ ہونٹوں اور غیر معمولی حد تک بڑھے ہوئے بالوں والے نے مجھ پر طنزیہ نظر اچھالی۔ ”اڑے غنچے! ایسی غصے بھری خنجر سے نہ دیکھ..... ماڑا قصور نہ ہووت، نہ ہم نے تجھے دعوت دے کر یہاں بلایا ہووے ہے.....“

میں نے اُسے گہری نظروں سے گھورا۔ وہ ہتھیلیوں کے بل اٹھا اور پاس آ کر مجھے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ چھوٹے قد کا دبلا پتلا شخص تھا۔ مجھے اٹھانہ پایا تو ہانپتے ہوئے بولا۔ ”اڑے او جالمو! ماڑا ساتھ دیجوناں، ماڑے سے نہ اٹھایا جاوت اے۔ جالم (ظالم) پلے پو سے ساڈ کے ماتق بھاری ہے۔“

اس کی اعانت کے لیے ایک قدرے جسیم شخص پاس آ گیا۔ دونوں نے مل کر مجھے کھڑا کیا۔ قدم قدم چلاتے ہوئے دیوار تک لائے۔ بوسیدہ روٹی والے گدے پر بٹھاتے ہوئے جسیم شخص نے پوچھا۔ ”پولیس والے تمہیں کیوں پکڑ کر لائے ہیں؟“

پر تم کیا جانو..... جگالی کرنے والے مہینے!" اپنے لہجے سے وہ خاصا پڑھا لکھا انسان معلوم ہوتا تھا مگر بہت زیادہ پینے کی عادت نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اپنی رو میں بولے جارہا تھا۔ اُسے یہ دھیان بھی نہ رہا کہ اُس کی بے ربط اور لالچی باتوں پر کوئی توجہ دے رہا تھا یا نہیں۔ امیر شاہ نے ایک طنزیہ نظر اُس پر ڈالی، میری پہلی میں آہٹکی سے کہنی چھوئی، بولا: "سینے پر چاء پکے پاناں پکے۔ لاڈلے ڈاکٹر کے منہ کی کیتلی اُٹلے لگت ہے۔ سالاکھیں کا..... جرور کسی دن گٹر کی میر بھی کرے گا..... آہ! ماڑے کو جگالی کرنے والا آکھت ہے۔"

اچانک تھانے کی چہل پہل میں اضافہ ہو گیا تھا مگر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حالات کا بیرونی دنیا سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ کسی نے بھی ادھر آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ حوالا تھوں کے لیے چھپر ہوٹل کا لڑکا کھانے کا آرڈر لینے کے لیے آ گیا۔ ہوٹل پر صرف دال اور گوشت پکا ہوا تھا۔ چونکہ میرے پاس پیسے موجود نہیں تھے، اس لیے میں خاموشی سے بیٹھا رہا۔ روٹیاں اور سلور کی کٹوریاں جب سلاخوں سے گزر کر حوالا تھ کے سالخورہ فرش پر پھینچیں، سبھی اُٹھ کر ایک بڑا سادارہ بنا بیٹھے۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

امیر شاہ نے استغناء مہینہ نظروں سے مجھے دیکھا: "اڑے باکے! کیا دون (دورخ) میں کچھ نہیں ڈالے ہے؟"

میری خاموشی کو اقرار جان کر وہ اپنی پلیٹ اور روٹیاں اٹھا کر میرے پاس آ بیٹھا۔ کھانا کھانے کے بعد سب کے لیے کڑک جائے آگئی۔ عام حالات میں شاید میں ایسی چائے کبھی نہ پیتا مگر اُس وقت وہ کڑوی سیل اور بے دودھ کی چائے بھی دودھ جتنی محسوس ہوئی۔ بخار کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ تکلیف اور اینٹھن میں کچھ کی واقع ہو گئی تھی۔ میں امیر شاہ کے کہنے پر کھڑا ہوا۔ قوت ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے محدود جگہ میں چہل قدمی کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ میں، میں کافی حد تک سنبھل گیا۔ میں اور امیر شاہ دوسرے حوالا تھوں سے قدرے الگ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ مجھے سلاخوں میں سے وہی وگین مکن میں آ کر زکٹی دکھائی دی جس پر مجھے تھانے میں لایا گیا تھا۔ سب انسپکٹر، ملک ارشد اور فریدی علی کی ٹھکی ٹھکی صورتیں دکھائی دیں۔ وہ حوالا تھ کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئے۔ امیر شاہ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا پورے غور مشاہدہ کر رہا تھا، پوچھنے لگا: "انہی جالموں نے تجھے دیو چا تھا کیا؟" میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا: "ہاں! کیا اب پھر یہ لوگ مجھے ماریں گے؟"

میں کا احساس بتدریج بڑھنے لگا۔ سر کے مخصوص درد اور ن کی از حد گرمی نے مجھے باور کرا دیا کہ میرا جسم ہولے ہولے بخار پکڑنے لگا تھا۔ میں متفکر ہو گیا۔ اس حالت میں، میرے پاس دوا دارو کی سہولت میر نہیں تھی، بخار کا ہونا خطرناک تھا۔ میں نے اپنے ساتھ جڑ کر بیٹھے ہوئے فقرہ "میں سے مانگ کر بروٹن کی ایک اور گولی معدے میں اتاری۔ ڈاکٹر منور شاہ کی طویل رفاقت کے باعث مجھے علم تھا یہ دوا درد اور تکلیف میں آرام پہنچانے کے ساتھ ساتھ بخار کے زور کو بھی توڑنے کی زبردست اہلیت رکھتی تھی۔

حوالات کی مسافر خانے جیسی عجیب دنیا کو اپنی آنکھوں سے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ جتنے اشخاص وہاں موجود تھے، فضا میں اتنی ہی بولیاں رچی ہوئی تھیں۔ کئی زبانیں، کئی لہجے اور کئی خیالات یکجا تھے۔ شام تک میرے بخار نے خاصی شدت اختیار کر لی۔ دہلے پتکے شخص، جس کا نام امیر شاہ معلوم ہوا تھا، نے تھانے کے قریبی چھپر ہوٹل سے چائے اور ایک ہس منگوائے۔ پیرا میڈیٹا مول کی گولیوں کا پورا پتا منگوا یا۔ پانی کے ساتھ دو گولیاں مجھے کھلا کر زبردستی کیک رس کھلائے اور پائے پلائی۔ باوجود اس کے کہ وہ میرا کچھ نہیں تھا، ہمارے مابین دوستی تو کجا، شناسائی کا رشتہ بھی موجود نہیں تھا، پھر بھی اُس کا ہمدردی آمیز رویہ دیدنی تھا۔ معدے میں کچھ پڑا تو جان میں جان آئی۔

امیر شاہ کہہ رہا تھا: "اڑے یہ ڈاکٹر ہے سالہ، ہو میو ہٹک ڈاکٹر! بیٹھا دارو بیوت پر کسی مجلوم (مظلوم) کو صلح نہ مارے ہے..... ادھر اپنے ہو میو پیٹھک دارو خانے میں بھی سارا دن بچے (حزے) لوٹے، ادھر بھی بچے لوٹے ہے۔"

ڈاکٹر ہاتھ اٹھا کر بولا: "اڑے! ہے جناب شیخ کا لافہ بھی عجیب سارے جہان سے، جو یہاں ہو تو شراب ہے وہاں ہیو تو ثواب ہے....."

اس کا لہجہ لڑکھارہا تھا: "ایک لقمہ منہ میں ڈال کر سارا ن بکریوں کی طرح منہ چلانے والے دارو کی شان کو کیا مانیں۔ ہو میو پیٹھک کی یہی ایک دوائی دنیا کی ہر دوائی پر ماری ہے۔"

وہ بات کرتے کرتے ایک طرف لڑھک گیا۔ پھر سنبھل بیٹھ گیا، بولا: "ہاں بھاری ہے! جس طرف بھی جاتی ہے، گ لگاتی جاتی ہے۔ برف پگھلا دیتی ہے۔ بھٹلے سینے پر لال رکھ کر چائے پکا لویا اصل مرغ کوڑکا لگا لو..... ہاں ی ہے۔ ہائے! شمع بولی بہ صد انداز یہ دیوانے سے....."

تھا۔ اگر عام حالات میں وہ مجھ سے ملا ہوتا تو میں اُس کی شخصیت سے خاصا لطف اندوز ہوتا۔ اس دقت مجھے چونکہ کُل شے اچھی نہیں لگ رہی تھی، اس لیے اُس کا انداز گفتگو بھی ناگوار گزر رہا تھا۔

"اڑے جہان پر رکھناں گولی کو۔ یہ چکی بجاتے میں درداں بیڑاں جن لیوے ہے۔ ایک دم فسٹ کلاس کر کے گھوڑا بنا دیوے ہے۔ لو بابا!" میں نے پانی کی مدد سے گولی حلق میں اتاری اور کٹورا فرش پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

میرے دونوں اطراف میں قطار باندھے بیٹھے ہوؤں نے میری شخصیت پر، شکل سے جھلکتے بھولپن پر اور جسم کے عریاں حصوں پر دکھائی دینے والے نیلوں پر رائے زنی شروع کر دی۔ ایسے میں کمرے کے کونے میں پھیل کر لیٹے ہوئے شرابی نے سلاخوں والے جنگلے کے باہر کھڑے سپاہی کو مخاطب کیا: "اڑے کالے گھوڑے..... ہم سے بھی لائن مارناں یار۔ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔"

وہ شاید اُس کا کوئی جاننے والا تھا کیونکہ اُس کی آواز سن کر ہنستا ہوا قریب آیا اور سلاخیں تمام کر مستفسر اندہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"اس خطرناک اشتہاری مجرم کو کہاں سے پکڑ لائے ہو؟"

"میں نہیں جانتا۔ پکڑ کر لانے والے لوٹیں گے تو پتا چلے گا کہ اس نے کیا واردات کی ہے۔" پولیس والے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا اب ایسے لوٹے بھی بد معاشیاں کرنے لگے ہیں یا قانون کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں؟"

اُس نے کندھے اُچکائے: "ایس اچھا اوصاحب کچھ ہی دیر میں آنے والے ہیں۔ اُن سے پوچھ لیتا۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا: "اُس سے کیا پوچھوں گا؟ وہ تو نرا ہو میو پیٹھک تھا نیدار ہے۔"

میرے پہلو سے میرے بھی خواہ کی آواز پھوٹی: "اڑے واہ جی! کیا بات کرت ہے۔ ہو میو پیٹھک تھا نیدار..... انگریزی دواؤں سی گرمی ناں ہووت، دلسی دارو سی ٹھنڈک ناں ہووت..... ایک دم فسٹ کلاس بول بچن مارے ہے تم نے اتنی ڈاکٹر صاحب!"

"ابے تو چپ رہ پلے!" ڈاکٹر کہلائے جانے والے نے اُسے ڈانٹا اور پھر سپاہی سے محو کلام ہو گیا۔ گولی نے کافی افادہ دیا۔ جسم کی تکلیف کم ہوئی تو سر میں

"اڑے جا برے نامراد! خبر نہیں آوے کیا؟ موتیا آنکھوں پہ اُتر آیا مگرے پڑ گئے تیری خبر (نظر) کو..... غنچہ ہے ابھی بے چارہ۔ کھل کر مسکراوے گا تو پتا چلے گا ناں!"

میرا بدن ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔ ردھیں روٹیں سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ شدید پیاس لگی تھی۔ ارد گرد نظر دوڑائی۔ حوالا تھ کمرے کے ایک کونے میں گھڑا دیکھ کر بے ساختہ میرے منہ سے نکلا: "پپ..... پانی....."

گھڑے کے قریب بیٹھا ہوا شخص پانی بھر لایا۔ جستی کٹورا خاصا میل آلود اور پچکا ہوا تھا۔ کراہت کا احساس ہوا۔ کراہت کو آنکھیں بند کر کے بھگایا جاسکتا تھا۔ پیاس سے جان نہیں چھڑائی جاسکتی تھی اس لیے میں نے کٹورا تمام کر آنکھیں بند کر لیں۔ پانی حلق سے اُترتا تو کچھ سکون کا احساس ہوا۔

میرے پہلو سے جڑ کر بیٹھے ہوئے مہینہ شخص نے مجھ سے پوچھا: "کہاں سے آوت ہے لاڈے میاں..... اڑے غنچہ! کیا جرم تیرے کھاتے میں پاوت ہے ان خبیثوں نے؟"

میں نے اُسے بغور دیکھا۔ اس کی عمر چھٹی دہائی میں داخل ہو چکی تھی۔ بے تحاشا پان خوری کی عادت نے اُس کے دانتوں کو چاٹ لیا تھا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ہمدردی کا غالب عنصر دکھائی دیا۔ مجھے خاموش پا کر حوالا تھ کی کٹڑ میں بیٹھے ہوئے فریبی ہائل شخص نے جھومتے ہوئے کہا: "قانون کے رکھوالے چراغ لے کر رُخ زبیا ڈھونڈنے نکلے ہیں۔ کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹے۔ کبھی رُخ زبیا تو کبھی رُخ نامراد اُٹھالاتے ہیں۔ ہفتہ بھر سے یہی تماشا دیکھ رہے ہیں یہاں پر۔"

اُس کا لڑکھڑاتا لہجہ اور متورم چہرہ بتاتا تھا کہ وہ شراب پیے ہوئے تھا۔ میں نے دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر کو خاموشی چاہتا تھا۔ جب سے ملتان کی حدود میں قدم رکھا تھا، پے در پے مصیبتوں سے دوچار ہو رہا تھا۔ مجھ سے جڑ کر بیٹھے ہوئے نے مجھے جھنجھوڑ کر دریافت کیا: "اڑے بابا! جیالوں نے کیا مالش والش بھی کری ہے؟" میں نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

"درد ہووے ہے کیا؟ بول ناں....." میں نے آہستگی سے کہا: "پورا جسم دکھ رہا ہے۔" اُس نے اپنے پہلو کی جیب میں سے بروٹن کی گولیوں کا بولسٹر پیک نکالا۔ ایک ٹیبلٹ نکال کر تھماتے ہوئے اونچی آواز میں بولا: "او جان من! اک جرا (ذرا) پانی کا کٹورا باکے کے لیے بھرت ناں!" اُس کی آواز خاصی باریک تھی۔ لہجہ بھی بڑا عجیب سا

دوست کو گولی مار کر بھاگ گیا ہے۔ میں نہ تو کسی موبی کو جانتا ہوں، نہ زور آور کو اور نہ ہی میرا کوئی ساتھی ہے۔ سرجی! میں تو ایک سیدھا سادا کسان ہوں۔ زمینوں پر مل چلاتا ہوں۔ زمینوں کا اگلا ہوا تاج کھا کر سو جاتا ہوں۔“

اُس کی نظریں مجھے اپنے بدن کے آر پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اُس نے برآمدے میں کھڑے ہوئے اہلکار کو ہاتھ کے اشارے سے پاس بلایا، پوچھا۔ ”اُسے کون لاک اپ میں ڈال گیا ہے؟“

وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ ”اُسے سب انسپکٹر صاحب کہیں سے پکڑ کر لائے تھے۔ اُن کے ساتھ ملک ارشد اور فرید علی تھے سراً“

”زور آور بھی آیا تھا؟“

”جی سر! بہت غصے میں تھا۔“

”کیا کہتا تھا؟“

”کہہ رہا تھا کہ اسے الٹا لٹکا کر پوچھا جائے کہ اس کا ساتھی کہاں چھپا ہوا ہے۔“

”اُن تینوں میں سے کوئی یہاں موجود ہے؟“ اُس کا اشارہ سب انسپکٹر، فرید اور ملک ارشد کی طرف تھا۔

”نہیں سر..... دی آئی پی مودمنٹ کی کوریج کے لیے گئے تھے۔ لوٹے تو خاصے تھکے ہوئے تھے، گھروں کو چلے گئے۔“

تھانیدار نے سر کو ہولے سے حرکت دی، پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ ”تمہیں کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”خان مارکیٹ کے باہر سے، سراً“

”کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”مظفر گڑھ سے پرے ایک بستی میں رہتا ہوں جی!“

میرے عقب میں امیر شاہ کے قہقہے کی تیز آواز گونجی۔

تھانیدار نے اُسے ڈانٹا۔ وہ بہ مشکل اپنی ہنسی روک کر بولا۔

”اڑے باجھا! ماڑا کیا، ماڑا کھاتہ تو جرموں سے بھرا پڑا ہووت پر ان کرموں مارے دیہاتیوں پر تو رحم کرو ناں بابا..... ماں بہن کی چوڑیاں گھرے خریدنے دو ناں..... اپنے وجیر (وزیر) سے فون پر پوچھ لیو، اس پر کون سی دفعہ لاگو ہووت ہے صاحب؟“

اُس کے طنز پر تھانیدار ایک باریگ تمللا اٹھا۔ اُسے ڈانٹ کر خاموش رہنے کا حکم دیا اور مجھ پر ایک سرد نگاہ ڈال کر وہ اپنے کردار کو سنبھالتے ہوئے سلاخوں سے پرے ہٹ گیا۔ سرکاری وردیوں کی سیاہ دھند سلاخوں سے چھٹ گئی۔

چند لمحوں کے بعد ایک سپاہی سلاخوں کے سامنے دکھائی دیا۔ اُس نے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا پکڑا ہوا تھا۔ تالے میں چابی

ہے تھے۔ ہو میو پیٹھک ڈاکٹر کے بڑے بڑے پھیپھڑوں سے پھوٹنے والے خراٹے خاصے ڈراؤنے تھے۔ جونہی گھومتی ہوئی نیلی بقی والی وگین تھانے کی حدود میں داخل ہوئی، میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ شاید تھانیدار گشت سے لوٹا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد سلاخوں کے باہر بوٹوں کی دھمک گونجی۔ ایک لمبا ترنگا شخص پانچ سات اہلکاروں کے جلوس میں چلتا ہوا حالات کے دروازے پر آ کر قہم گیا۔ اُس کی آن بان کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تھانیدار تھا، اس تھانے کا بے تاج بادشاہ۔ اُس کی ٹٹوتی ہوئی نظروں نے فوراً مجھے تار لیا۔ ساکت کھڑا مجھے گھورنے لگا۔ اُس کے چہرے پر سیاہ اور سفید بالوں والی ڈاڑھی بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ اُس کی قد آور شخصیت بڑی بارعب تھی۔ اُس نے اپنے دائیں ہاتھ کھڑے سپاہی سے میرے بارے میں پوچھا تو اُس نے بتایا کہ مجھے موبی کے قتل کے سلسلے میں سب انسپکٹر حالات میں ڈال گیا ہے اور خصوصی نگرانی کی تاکید کر گیا ہے۔

میں نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔ ”سرجی! مجھے بے گناہ پکڑ کر مارا پٹا گیا ہے اور یہاں لا پھینکا گیا ہے۔“

وہ چونکا۔ میرا اندازہ تھا کہ اُسے میرا مؤدبانہ اور پڑھا لکھا لہجہ عجیب لگا تھا۔ مجھے بہ غور دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی بات کو دہرایا تو وہ غہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کوئی تو دجہری ہوگی تم پر شک کرنے اور تمہیں گرفتار کرنے کی؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں خان مارکیٹ میں داخل ہونے لگا تھا کہ ایک ڈارک بلو کار میرے قریب آن رکی۔ اُس میں سے دو آدمی اترے۔ وہ مجھے کسی غلط فہمی کی بنا پر زبردستی کہیں لے جانا چاہتے تھے جبکہ میں جانے پر تیار نہیں تھا۔ وہیں ہماری لڑائی ہوئی۔ پولیس والے آگئے اور انہوں نے مجھے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ پھر ڈالے میں ڈال کر یہاں لے آئے۔“ میں نے اپنی پوری کوشش کی تھی کہ میرا بے حد معصوم اور شائستہ رہے اور میں اپنی کوشش میں صاف کامیاب رہا تھا۔

”تمہیں اغوا کرنے والے کون تھے؟ کیا تم انہیں جانتے ہو؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں نے دونوں کو زندگی میں مرتبہ دیکھا ہے جی۔ ایک کا نام زور آور ہے اور دوسرے کا نام مجھے علم نہیں۔“

”زور آور.....“ اُس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے سے میں سکڑ گئے۔ ”زور آور کو کیا غلط فہمی تھی؟“

”وہ کہہ رہا تھا کہ میرا ساتھی اُس کے کسی موبی نامی

نہ جانتا جو راور یا موبی کو..... گونگا ہووت تو..... سمجھا؟“ دیکھنے میں وہ استاد آدمی لگتا تھا۔ نہ میں نے اُس سے دریافت کیا تھا کہ وہ کس جرم کی پاداش میں حوالات میں بند تھا اور نہ ہی اُس نے بتانے کی زحمت کی تھی۔ میں حالات کے ایسے گرداب میں آن پھنسا تھا کہ میرا شعور مکمل طور پر میرا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اپنے گھروالوں اور بالخصوص پروین کی پریشانی کا خیال آتا تھا۔ کھالا یاد آنے لگتا تھا۔ پولیس والوں کی متوقع مار پیٹ کا خیال بھی دل کو ہولانے دے رہا تھا۔ گھبراہٹ اور اضطراب کے عالم میں امیر شاہ پر بھی خاطر خواہ توجہ نہیں دے پا رہا تھا مگر اُس نے میری بے زخی کے باوجود مجھے بڑی ڈھارس بندھائی تھی۔ اُس نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے یہ تسلی بھی دی تھی کہ وہ تھانیدار کے سامنے میری بے گناہی کی بات کرے گا۔ اگر تھانیدار پھر بھی نہیں مانے گا تو وہ اپنی میڈم سے کہہ کر مجھے حوالات سے نکلا دے گا۔ میرے استفسار پر اُس نے میڈم کا نام ’میڈم شکیلہ‘ بتایا اور مزید بتایا کہ وہ ایسی عورت ہے کہ جس کے نام پر شہر کے سبھی تھانوں کے گیٹ آن واحد میں کھل جاتے ہیں۔

رات دس بجے کے قریب سبھی اٹا غنیل ہو گئے۔ امیر شاہ بھی نیند کے گہرے استغراق میں چلا گیا مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں اُس کے کمر میں گھسا ہوا، دیوار سے پشت ٹکا کر سامنے والی دیوار کے اکھڑے ہوئے پلستر کو دیکھ رہا تھا۔ باری باری کئی شاہتیں آنکھوں میں ابھرتیں، اپنا اپنا مقدمہ پیش کر کے ادھمکے ہو جاتیں۔ چاچی، فرزاند، شانو، پروین اور غزالہ کی بے چینیوں پر دل کڑھ کر رہ گیا۔ چونکہ کھالا مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ایسا غوطہ لگا لیا کرتا تھا اس لیے اُس کے گھروالوں کے لیے اس کا غیاب کوئی نئی بات نہیں تھی مگر میرے گھروالوں کے لیے میرا نور پور سے اس طرح جانا نئی بات تھی۔

میں خواستخواہ کھالے کی یاری کی آبیاری کرنے کے ارادے سے ملتان چلا آیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس اجنبی شہر میں ایسے خطرناک لمحات میری تاک میں تھے۔ مسلسل بھاگ دوڑ، غیر متوقع وحشیانہ مار پیٹ اور گرفتاری نے مجھے بد حال اور بے حال کر دیا تھا۔ مجھے جو آیات اور دعائیں یاد تھیں، دل ہی دل میں تمام پڑھ ڈالیں۔ خدا سے مدد مانجی۔ اپنے آپ سے عہد کیا کہ یہاں سے نکلتے ہی کھالے کی سچت کا خیال دل سے نکال کر سیدھا نور پور چلا جاؤں گا اور آئندہ اس غلطی کا اعادہ نہیں کروں گا۔

حوالات کی بدبودار فضا میں کئی اقسام کے خراٹے کھانا

”نہیں لاڈے بابا! یہ سور کے بچے تھک کر آدے ہیں۔ اپنے ہو میو پیٹھک بابو جی کے چروں میں حرام کا مال ڈالیں گے اور جا کر مرداروں کی طرح سو جاویں گے..... یہ خرسی مارے کتے کے مافق لوگ ہوویں، نہ ہڈی چھوڑیں نہ آنتیں چھوڑنے سے باج (باز) آویں۔ آخ تھوہ!“

اُس نے سلاخوں کے پار زمین پر زور سے تھوک دیا۔ کچھ دیر تک آنکھوں سے آگ برساتے ہوئے چلتے پھرتے سپاہیوں کو دیکھتا رہا پھر چونک کر بولا۔ ”اڑے بابا! تم سے کیا برآمدگی کرت ان خیشوں نے؟“

میں اس کے سوال کو سمجھ نہیں پایا تو اُس نے وضاحت کی۔ میں نے بتایا کہ میرے پاس سوائے پیسوں کے کچھ بھی نہیں تھا جو انہوں نے نکال کر اپنے پاس رکھ چھوڑے ہیں۔ وہ بڑا متاسف ہوا۔ بولا۔ ”اُن سالوں کو موبی بدجی (بدبھمی) بھی نہیں ہووت ہے۔ دیکھ تو جرا (ذرا) ان کے بڑے بڑے پیٹوں کو..... لکڑیجھم، لوہا جھم.....“

پھر امیر شاہ کے خلوص بھرے استفسار نے مجھے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اپنا فرضی نام بتایا۔ خود پر مبنی ہوئی کہانی کو بلاگم و کاست بیان کر دیا۔ وہ پورے انہماک سے سنتا رہا۔ بارہا اُس کی پیشانی پر ٹکڑو ٹکڑو کی غماز لکیروں کا جال بنا، پھر جلد میں تحلیل ہو گیا۔ میری داستان کے تسلسل میں اُس نے کہیں بھی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ خاموش ہوا تو وہ لمبی سانس سینے میں اتار کر، جیب میں سے پان کا پیک نکال کر منہ میں ڈال کر، دھیمی آواز میں بولا۔

”اڑے لاڈے! تو ان جالوں میں برا پھنسا ہووت.....“

چچ چچ..... مگر شکر کرت بابا کہ اس جو راور (زور آور) کی گولی سے بچ نکلتا ہو۔ سالہا ہو میو پیٹھک تھانیدار جو راور کا لے پالک کتا ہووت ہے۔ اس کے کہنے پر تہبھاری چڑی ادھیڑ دیوت۔ ہائے غنچے! تو برا پھنسنے ہے۔“

میں نے بے بسی سے کہا۔ ”اب کیا ہوگا؟“

”جو بھی ہووت، جرا (ذرا) اچھا نہ ہووت.....“ اُس نے تشویش آمیز انداز میں کہا۔ ”تم جانتا ہو کہ موبی کا خونی کدھر ہووت ہے؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“ وہ کچھ دیر تک خوش بیٹھا رہا پھر اُس نے تقہمی انداز میں سر ہلایا، اپنا سختی سا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور کہا۔ ”تم فکر نہ کرت ہے لاڈے میاں! ماڑے کو سب ٹھیک کرنا آدے ہے۔ ہو میو پیٹھک تھانیدار جو بھی آکھت، تو زبان نہ کھولت..... غنچے! یہ دل پر لکھت کہ تم نہ جانے کسی خونی کو تم

د سوسائٹی ڈائجسٹ میں ایک نیا نمبر

جاسوسی ڈائجسٹ

ایک نیا نمبر

تاکہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

کے لیے 600 روپے

امریکا کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

معلومات کے لیے بہترین تجویز ہو سکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویزا یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ: شریعہ (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 نیو نیٹس ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

مل آ کر تھم گئی۔ اُس کی تاب و حکمت اور پردہ قار شخصیت نے مجھ پر آن واحد میں سکتہ ساطاری کر دیا تھا۔ میرا شاہ پہل کر دونوں سپاہیوں کے بیچ کھڑا ہوا اور بولا: ”میڈم! یہ سہ ماہی غنچہ..... اس کو جالموں نے خواجہ قتل کے الزام میں عریض ہے۔“

وہ چند لمحوں تک مجھے گھورتی رہی، پھر ایک ادا سے چلتی ہوئی تھانیدار کی میز تک گئی اور دونوں ہاتھ شیشے پر ٹکا کر کھڑی ہوئی۔ اُس کی شخصیت کا اثر تھا یا اُس کے رسوخ کا دبہ..... دفتر میں موجود بھی افراد بالکل خاموش تھے۔ اُس نے زور آور کو بہ غور دیکھا، پھر تھانیدار سے مخاطب ہوئی: ”اعظم صاحب! میں اس جوان کو لینے آئی ہوں۔“

تھانیدار نے ایک طویل سانس طلق میں اتاری اور شائستگی سے بولا: ”یہ موبی کے قتل میں ملوث ہے۔“ ”موبی ہماری سوسائٹی کا بڑا بڑا قاتل ہو گیا۔ اب اُس کی جگہ زور آور بڑا ہے۔ چاہے تو اپنے پاس کے خون کا بدلہ لے، چاہے تو ملنے والی کمانڈ کے مزے لوٹے۔ کیوں زور آور؟“ اُس کی آواز بڑی جاندار اور خوب صورت تھی، الفاظ میں کہاں بربریت مشاقت تھی۔

زور آور نے کہا: ”آپ کو اس مسئلے میں دخل نہیں دینا چاہیے میڈم! موبی ہمارا ساتھی تھا اور قتل کا بدلہ لینا ہمارا حق ہے۔“

”اور پولیس کی مدد لینا کیا ہماری سوسائٹی کے لیے مناسب ہے؟“ میڈم کی آواز میں زبردست کاٹ تھی: ”اعظم صاحب! میں اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔ مگر نہ بچے، کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں سنبھال لوں گی، آپ پر کوئی آنچ لیس آئے گی اور..... میں اس کی بھرپور قیمت چکاؤں گی۔“

پھر ایک ادا سے زور آور کی طرف مڑی: ”اور زور آور! موبی زندہ دل جوان تھا۔ اُس کی موت کا مجھے رنج ہے۔ تم اُس قاتل کی تلاش جاری رکھو۔ اگر یہ جوان واقعتاً ملوث ہوا، اسے اس کے بارے میں علم ہوا تو میں تمہاری مدد کروں گی اسے پوائنٹ آؤٹ کروں گی۔ ٹیک کیرا“

میں ہونٹوں کی طرح کبھی کے چہروں کا طواف کر رہا دیکھ رہا تھا کہ میڈم کھلوانے والی جوان العمر لڑکی کے منہ تھانیدار، تھانیدار نہیں رہا تھا اور زور آور کے طعمرات اب بھی نکل چکی تھی۔ اُس کے جبرٹوں کے اعصاب مسلسل ک رہے تھے اور آنکھوں سے میرے لیے وحشت اور لپک رہی تھی مگر مجھ پر ہاتھ اٹھانے اور رہا ہونے سے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ تھانیدار نے زور آور کی طرف

ہور ہی تھیں۔ میرا اندازہ یکسر غلط نکلا تھا۔ اُس نے میری معصومیت پر ذرا بھرتیقین نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا: ”سرجی! میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ میری نہ تو کسی سے دشمنی ہے اور نہ دوستی..... ان لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”یعنی تم تعاون پر آمادہ نہیں ہو؟“

میرے پاس اُس کے سفاک سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”قتل..... ایک شہری کا قتل..... اس سے بڑا جرم کیا ہو سکتا ہے، کوئی بھی نہیں۔“ تھانیدار کے لہجے کی سنگینی میں درشتی شامل ہو گئی: ”ایک شہری قتل ہو گیا ہے۔ تمہیں قاتل کے ساتھ نہ صرف دیکھا گیا ہے بلکہ تم نے اُسے کوردینے کی پوری کوشش کی ہے۔ زور آور کو مارا پیٹا بھی ہے، کیا میرے پاس کوئی گنجائش رہتی ہے تمہاری بات کا یقین کرنے کی؟“

زور آور کچھ کہنا چاہتا تھا مگر تھانیدار نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے چپ کر دیا اور میرے عقب میں کھڑے ہوؤں کو مخاطب کر کے کہا: ”اسے آپشنل روم میں لے جاؤ۔ ہاں! فرید اور ملک ارشد سے کہو کہ یہ مجھے صبح فر فر پوتا ہوا ملے۔ اوکے؟“

انہوں نے بہ یک زبان ”جی سر!“ کہا اور مجھے پیچھے کی طرف کھینچا۔ میں بے اختیار قدرے بلند آواز میں بولا: ”سرا آپ میری بات کا یقین.....“

میری بات پوری ہونے سے قبل ہی میری گردن پر زور کا ہاتھ پڑا اور آنکھوں کے سامنے تارے تارے ناچ اُٹھے۔ کم بخت سپاہی کا ہاتھ خاصا بھاری تھا۔ ایسے ہی وقت میں جب میں حواس باختہ پلٹ رہا تھا، میرے کانوں میں میرا شاہ کی آواز گونجی: ”اڑے واہ باچھا کے ستر پو! غنچے پر ہاتھ جھاڑو ہو..... ایک جرا (ذرا) سی دیر کو زکرت ناں بابا!“

دروازے کے عین پتھوں بیچ میرا شاہ کھڑا کھائی دیا۔ اُس نے مجھے کھینچ کر باہر لے جانے والے سپاہیوں کا راستہ روک رکھا تھا۔ فاتحانہ نظروں سے تھانیدار کی طرف دیکھا، ہاتھ سے کمرے کے باہر کسی کی طرف اشارہ کیا اور بولا: ”اڑے باچھا جی! دیکھو تو کون ملنے آت ہے تم سے؟“

نہ صرف میرے بلکہ تھانیدار اور زور آور کے نزدیک بھی میرا شاہ کی ڈرامائی آمد تعجب خیز تھی۔ وہ دونوں ایک جھٹکے سے کھڑے ہوئے۔ تھانیدار نے قدرے سخت لہجے میں کہا،

”میرا شاہ! اب یہ یا ڈراما کیا ہے؟“

میرا شاہ نے باہر گیلری میں دیکھا اور ہکا بیک دروازہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ایک دروازہ قامت لڑکی ایک شان استغنا سے چلتی ہوئی دفتر میں داخل ہوئی اور عین میرے

گھماتے ہوئے اُس نے ذومعنی مسکراہٹ اُچھالتے ہوئے کہا: ”میرا شاہ! لگتا ہے تمہاری سفارش پھر آن پہنچی ہے۔ چلو! باہر آؤ۔ صاحب نے تمہیں بھی بلوایا ہے۔“

میرا دل مٹھی میں آ گیا۔ میرا غم گسار رہائی پانے والا تھا۔ اک آس لگی تھی، وہ بھی بجھنے لگی۔ میرا شاہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، ایک آنکھ دبا کر کہا: ”فکر نہ کرت اڑے لاڈلے! تیرے پر آج نہ آنے دیوت ہے میرا شاہ.....“

وہ گیٹ سے باہر نکلا تو میں نے سلاخیں تمام لیں۔ اُسے تھانیدار کے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر ماتھا سلاخوں پر ٹکا کر ساکت ہو گیا۔ میں نے نادانی میں ادھلی میں سر دیا تھا، موسلوں نے میری جان مٹھی میں بھر لی تھی۔ کافی دیر گزر گئی۔ ادھر میرا شاہ ایس ایچ او کے دفتر سے نکلا، ادھر زور آور اپنے تین چار ساتھیوں سمیت تھانے کے بیرونی دروازے میں دکھائی دیا۔ وہ تیر کی طرح ایس ایچ او کے کمرے کی طرف گیا جبکہ میرا شاہ نے مجھے دیکھ کر انگلیوں سے دکتری کا نشان بنایا اور پھر وہ دایاں ہاتھ لہرا کر ”بائی بائی“ کرتے ہوئے تھانے کا گیٹ عبور کر گیا۔

وہ چلا گیا تھا، مایوسی کی بات تھی۔ زور آور تھانے تک آن پہنچا تھا، خطرے کی بات تھی۔ حوالات میں موجود بھی اپنے اپنے انداز سے میرا شاہ پر محو گفتگو تھے۔ کسی کو میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا اور مجھے چشم تصور میں پولیس کے بدنام زمانہ تارچر روم میں اُلٹا لٹکا ہوا ”شہر یار“ دکھائی دے رہا تھا جس سے کھالے کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا۔

کوئی نصف گھنٹے کے بعد دو سپاہیوں نے مجھے حوالات سے نکالا، میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنائی اور ایس ایچ او کے سامنے پیش کر دیا۔ کشادہ اور سرکاری آرائش کے حامل دفتر میں ایس ایچ او کے سامنے والی کرسی پر زور آور براجمان تھا جبکہ دیوار کے ساتھ قطار میں رکھی گئی کرسیوں پر اُس کے چاہنے والے براجمان تھے۔ میرے ہاتھ پشت پر ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے جبکہ میرے عقب میں دونوں سپاہی یوں چوکے کھڑے تھے جیسے انہیں میرے بھاگ جانے کا خطرہ ہے۔ تھانیدار اور زور آور کی تیز چہیتی ہوئی نظریں مجھ پر جمی ہوئیں۔ تھانیدار نے کہا: ”اگر تم کچھ چھپائے بغیر اپنے رشتہ کا نام بتا دو، یہ بتا دو کہ وہ اس وقت کہاں ہے تو تمہارے ساتھ رعایت برتی جاسکتی ہے، ورنہ تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔“

اُس کی نظریں مجھے اپنے بدن سے پار ہوتی محسوس

دیکھا، کچھ سوچا، پھر اپنے سپاہیوں کو میری رہائی کا حکم صادر کروا دیا۔ چند ہی لمحوں میں کھٹاک کی مخصوص آواز کے ساتھ میری ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔

مجھے چند ثانیے تو یقین نہ آیا کہ میں قتل کے الزام میں گرفتار ہونے کے بعد اتنی مختصر اور قلیل مدت میں رہائی پا چکا ہوں، جب ایک شان بے نیازی سے میڈم دفتر سے نکلی اور میرا شاہ نے مجھے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا تو میں چونک گیا۔ بے اختیار اُس کے ساتھ ٹھٹھا ہوا گیلری میں آیا۔ میڈم محن میں سے گزر رہی تھی اور تھانے میں موجود اہلکار بھیٹھی لگا ہوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ حسن کا اتنا کامل شاہکار تھی کہ نظر ہٹائے سے نہیں ہٹتی تھی۔ تمکنت کا یہ عالم تھا کہ دیکھتے رہتا بھی محال تھا۔

میرا شاہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا، ہنس کر بولا: ”اڑے بابا! کیا دیکھتے ہو؟ یہ ماڑی میڈم شکیلہ ہوت ہے۔ جہاں ہاتھ ڈالت، سانس سچ لیت ہے۔ تم آج (آزاد) ہے، جاوے۔ جنگی (زندگی) میں دُعا کرنا ماڑے لیے..... ماڑے کرم اچھے ہو جاویں گے ناں!“

میں نے متفکرانہ انداز میں اُسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ میڈم کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ہم تھانے سے باہر آئے۔ وہ سیاہ رنگ کی چمکدار پراڈ جیب میں بیٹھ گئی۔ شیشہ تھوڑا سا کھلا۔ میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے میرا شاہ کو اپنے پاس بلا یا، کچھ کہا اور شیشہ چڑھا دیا۔ جیب روانہ ہو گئی تو میرا شاہ نے پلٹ کر نشیوں کے سے انداز میں میرا ہاتھ تھاما، چوما اور عجیب سے انداز میں ہنستے ہوئے کہا: ”یہ جالم جمانہ! (ظالم زمانہ) بڑے رُوپ دکھاوت ہے، بہرِ رُوپ دکھاوت ہے۔ ماڑا چہرا بھی جھوٹ مافق، تم بھی جھوٹ مافق..... سالہ جمانہ جھوٹا، بہرِ رُوپ..... جاؤ، اپنی چودہ گشت مناؤ ناں جی۔ وہ دیکھو، سالہ جور آور خشی کتے کی طرح تڑپ تڑپ جاوت ہے۔“

اچانک اُس کی نظر تھانے کے کھلے مین گیٹ میں سے گزر کر حوالات کے سلاخوں والے دروازے پر پڑی۔ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا: ”اوہ جالم ہو میو پیتھک ڈاکٹر..... ماڑے کو بھول ہی گیا کہ تم بھی ادھر پڑے ہووت ہو۔“

وہ مجھے وہیں ٹھہرنے کا حکم صادر کرتے ہوئے تھانے میں گھس کر حوالات کی طرف بڑھ گیا۔ سلاخیں تھامیں اور شرابی ڈاکٹر کو آوازیں دے کر جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ سونے والا شاید اپنی زندگی کی تمام ترجیح کو بھی بچ کر انشا غفل ہوا تھا۔ امیر شاہ کی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوئیں تو وہ بہ آواز بلند گالیاں دیتا ہوا میرے پاس آ گیا، بڑبڑایا۔

”سالہ! خردوں کے مافق سووے ہے۔ قبرستان میں کھڑا کر کسی کو اتنی اونچی آوازیں (آوازیں) دیویں تو کئی مردے کانوں پر ہاتھ رکھے آجاویں۔ وہ مردار ناں جاگے ہے۔“ میں میرا شاہ کی تقلید میں قدم بڑھاتا، دل ہی دل میں اُسے دعا میں دیتا ہوا چل رہا تھا اور جلد از جلد تھانے سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ لاحق تھا کہ پھر مجھے پکڑ نہ لیا جائے اور مار مار کر رہی سہی کسر نہ نکال دی جائے۔

اندھیرے کی دبیز چادر شہر نے اپنے اوپر لپیٹ لی تھی۔ تھانے کے باہر کی دنیا خوابیدگی کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اکا دکا کانیں اور سگریٹ پان کے کھوکھے کھلے ہوئے تھے۔ امیر شاہ نے ایک کھوکھے پر رُک کر دو تین پان پیک کرائے، سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس خریدی۔ سگریٹ سلگائی اور فضا میں منہ کھول کر دھواں چھوڑتے ہوئے خاصی بلند آواز میں بولا: ”ماڑے کو سال چھ ماہ میں ایک نہ ایک چکر تھانے کا جرو (ضرور) لگ جاوے۔ قسمت میں بہر پھیر ہے۔“

آدھے کلومیٹر کی مسافت طے کر کے ہم ایک بارونق چوک میں پہنچے۔ چوک کی ایک کڑ مرغ کی بخنی اور انڈے بیچنے والوں نے اپنے تصرف میں لے رکھی تھی۔ ریڑیوں پر پہلوان ٹما بے بال و پر مرغ لٹک رہے تھے اور فضا میں بھینی بھنک رہی ہوئی تھی۔ دو تین ہوٹل، ایک کال سینٹر اور چند شبانہ نوعیت کی دکانیں کھلی تھیں۔

ہم ایک بخنی فروش کے چوبی تختے پر بیٹھ گئے۔ اُسے ایلے ہوئے انڈوں اور بخنی کا آرڈر دے کر رنگ بہ رنگ برقی قمقموں کی روشنی میں جو کلام ہو گئے۔ میں بے دھیانی کے عالم میں ”ہوں، ہاں“ کرتا ہوا متحرک لوگوں کو دیکھتا رہا۔ انڈے اور تیز مصالحے دار بخنی نے جسم میں کچھ حرارت پیدا کر دی۔ ایسے میں زور آور کی ڈارک بلو کار ہمارے قریب آن رُکی۔ شیشہ اُترا اور زور آور کا چہرہ دکھائی دیا۔ اُس کی سفاک آواز میرے کانوں میں پڑی: ”سی یو اگین مسٹر..... انتظار کرنا زور آور کا!“

میرے بولنے سے پہلے میرا شاہ نے ہاتھ لہرا کر کہا: ”ماڑے کو نہ چھیڑ جور آور..... یہ چھیڑ چھاڑ جرا بھی اچھی نہ ہووت ہے۔“

زور آور نے دانت کچکپائے اور شیشہ چڑھا لیا۔ کار آگے بڑھ گئی۔ میرا شاہ نے میرے کندھے پر عادتاً ہاتھ مارا، بولا: ”اڑے او غنچے! فکر کا ہے کا ہووے تیرے کو۔ ہم ادھر ہی ہووت ہے۔ یہ سالہ تیرے کو ہاتھ بھی نہ لگا پادے گا۔ یہ مگری میرا شاہ کی میڈم کی ہووت ہے۔“

مسافر

میں زور آور سے ڈرا نہیں تھا اور نہ ہی میں اتنا اتنا تھا گماں سے چپ ہو جاتا۔ ڈر قانون کے ہر کاروں کا اور اپنی حالت زار تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور لاری اڈے لی سمت جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اُسے یہ بھی بتایا کہ میرے پاس کرایہ وغیرہ کے پیسے نہیں ہیں۔ وہ قہقہہ لگا کر بولا: ”لاڈے میاں! فکر نہ کرے ہے۔ اگلے چوک پر تانگے کمرے ہو دیں۔ جالم رکشے والے تو چڑی سچ لیت ہیں۔“

پھر میرے کو اس وقت کہاں جانا ہووے۔ بھلے غنچے! میڈم کا فکر یہ تو ادا کرے جاوت، جنگی (زندگی) میں پھر بھی ضرورت (ضرورت) آن پڑت ہے بندے پر۔ ہیں؟“ اُس نے بڑی معقول بات کی تھی۔ مجھے اپنی محنت کا فکر یہ ادا کرنا چاہیے تھا ورنہ میرا ملتان سے بھاگ نکلتا بدھنچا ہی میں شمار کیا جاتا۔ میں نے کہا: ”ہاں! مجھے واقعی میڈم ٹکلیہ کے پاس جانا چاہیے۔“

وہ خوش ہو گیا۔ لاری اڈے جانے کا ارادہ بدلا تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک نیم خوابیدہ رکشا والے کو بلا لیا۔ رکشے کی ٹریس ٹریس فضا میں گونج اُٹھی اور مجھ پر ایک مرتبہ پھر پریشان کن سوچوں کی یلغار ہو گئی۔ کھالے کا کوئی پتا نہیں تھا۔ وہ کس حال میں تھا۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ کسی اور تھانے کی حوالات میں پڑا ہو۔ میں نے میرا شاہ سے کہا: ”کیا میرے یار کھالے کو تلاش کیا جاسکتا ہے؟“

میرا شاہ منہ میرے قریب کر کے بولا: ”ہو میو پیتھک ڈاکٹر کہوے تھا کہ دنیا لاڈے خانوں سے بھری ہووت ہے۔ وہ سچ کہوے تھا۔ تم بھی لاڈے خان ہووے، غنچہ ہووے۔ کہہ جو دیا کہ فکر مت کیجیو ماڑی بات پہ یقین ناں ہووے ہے۔ ہے ناں؟“

میں نے کہا: ”قتل کا معاملہ ہے میرا شاہ! میں کیسے بے فکر ہو سکتا ہوں۔ میرے نصیب ہار گئے ہیں شاید۔ ادھر میں ملتان میں آ کر مصیبت میں پھنس گیا ہوں جبکہ میرے گھر والے میری وجہ سے پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔“

”یار! ایک بات تو بتا دے ناں!“ وہ میری طرف لہرے جھک کر بولا: ”کوئی انداجا (اندازہ) ہے کہ تیرا لہ، تیرا یار کہاں ہووے ہے اس سے؟“

میں نے مایوسی سے کندھے اُچکائے: ”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

”کہنا جرووری ناں ہووے، سوچنا لاجم (لازم) دے ہے یار لاڈے!“ وہ دانش مندانہ انداز میں سر تے ہوئے بڑا عجیب لگ رہا تھا: ”وہ اگر دھریا جاوے گا تو

پولیس تیرے کو بھی دیوچ لیوے گی۔ ہاں!“ چائے پینے تک خاموشی چھائی رہی۔ اُس نے ایک اور پان منہ میں ٹھونسا۔ ساتھ ہی ایک سگریٹ سلگا لیا۔ قدرے دھیمی آواز میں بولا: ”اب تم کہاں جاوت ہے؟“

میں نے اُسے خالی نظروں سے گھورا۔ ”میرا پوچھنے کا مطلب ہووے کہ تم اپنی بستی میں اب جاوے تو پکڑا جاوت ہے۔ ادھر بھی وہ غنڈے مافق جور آور (زور آور) تمہارے پیچھے کتوں کی طرح لگا ہووے ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا: ”مگر میں نے اپنے گاؤں کے بارے میں تو کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ حتیٰ کہ تمہیں بھی علم نہیں ہے۔ پھر وہ کیسے وہاں تک پہنچے گا۔“

وہ بولا: ”تیرا سا بھی تیرے گھر کا بتا جانت ہے ناں؟“ ”ہاں!“ میں نے سر ہلایا، اس کے ساتھ ہی ٹھہرا گیا۔ مجھ تک کھالے کے ذریعے بہ آسانی پہنچا جاسکتا تھا۔

”اگر وہ پکڑا جاوت ہے تو کالے خاکی بھوتوں کو ادھر کی راہ دکھا دیوے ہے۔“ وہ اپنا سر اور چھاتی ایک تال سے ہلاتے ہوئے بولا: ”تین سو دو میں تو جالم وردی پوش بجلی کے مافق پھرتیاں دکھاوے ہیں۔“

میری خاموشی پر وہ نتیجہ خیز انداز میں بولا: ”تم ماڑا یار ہووے ہے اور یار کے لیے تو دل کی کھولی بھی ہر دم کھلی ہووے ہے۔ تمہارے کو ادھر میڈم کی کوٹھی پہ ایک آدھ دن رہنا ہووت ہے۔ پھر گھر کی راہ لیوت ہے۔ ٹھیک ہے ناں؟“

میں نے اُسے اچنبھے سے دیکھا۔ اُس کے کھنچے اعصاب والے چہرے پر سنجیدگی ثبت تھی۔ آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیں لرز رہی تھیں۔ کوئی منٹ بھر کا دورانیہ یوں ہی گزر گیا۔ پھر مجھ پر نظریں ساکت کر کے بولا: ”تم ابھی غنچہ ہو۔ تم دنیا کو نہیں جانتے ہو۔ یہ موٹی دنیا بڑی جالم ہے۔ چنگی میں پکڑ کر کھنچ لیوے ہے اور پھول نہ بننے دیوے ہے۔ اوپر باج (باز) نیچے جالم شکاری..... تم ایسے پھنسے ہووت لاڈے!“

وہ سچ کہہ رہا تھا۔ مجھ پر شدید مایوسی کا غلبہ ہوا جو چہرے سے بھی عیاں ہو گیا اور میں رکشے سے جھانک کر پیچھے کی سمت دوڑتی بند دکانوں کی بتیاں دیکھنے لگا۔ سڑکوں کا لامتناہی سلسلہ..... رکشے کی ناگوار آواز اور سوئے ہوئے محل کی طرح خوابیدہ شہر کی خوبصورت کوٹھیاں..... کوئی نصف گھنٹے کے بعد رکشا ایک محل نما کوٹھی کے جہازی سائز کے گیٹ پر آن رکا۔ امیر شاہ نے ڈرائیور کو فارغ کیا اور میرا بازو تھام کر گیٹ کی طرف بڑھا۔ گیٹ بند تھا۔ اُس نے گیٹ کے ستون پر لگی ہوئی کال بیل کا بٹن دبایا۔ دور کہیں مترنم گھنٹی بجی۔ کال بیل

کے بڑے سے بڑے بن میں نصب انشکام میں سے بھاری آواز برآمد ہوئی۔ ”کون؟“

”ظاہر خان! میں امیر شاہ ہوں۔ گیٹ کھولو۔“

”اوائے چڑی مار کا بچہ! تم کو نیند کیوں نہیں آتا!“

بولنے والے کا لہجہ چٹکی کھا رہا تھا کہ وہ پٹھان تھا۔

”بکواس نہ کر، درواجا (دروازہ) کھول۔ بڑے جبروری کام سے آوت ہوں۔“ امیر شاہ کے لہجے سے ہلکا سا تحکمانہ تاثر جھلکتا تھا۔

ہلکی سی ”کٹاک“ کی آواز کے ساتھ ہی انشکام خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد گیٹ کا بھلی دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ ایک چہرے نے جھانک کر ہمارا جائزہ لیا۔ کم روشنی کی وجہ سے اُس کے خدوخال دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ امیر شاہ نے قدرے تیز آواز میں کہا: ”ماڑے کو اکیس رے مشین پر بٹھاتے ہیں کیا؟“

جھانکنے والا شرمسار ہو کر غائب ہو گیا۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کونٹھی میں داخل ہو گئے۔ ظاہر شاہ نامی طویل قامت پٹھان اپنے کندھے پر کلاشن کوف جیسی گن لٹکائے گیٹ لاک کر کے ہمارے پیچھے چلا آیا۔ کونٹھی کے بڑے دروازے کو عبور کر کے ہم ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں آگئے جس کے تینوں اطراف میں گیلریاں دکھائی دے رہی تھیں۔ امیر شاہ نے پوچھا۔

”اپنی میڈم سووت ہیں کیا؟“

ظاہر شاہ نے آنکھیں دکھائیں۔ ”انسان کا بچہ بن امیر شاہ! تھوڑا دیر پہلے میڈم صاب آیا تھا، اب سوئے گا نہیں تو کیا غلیل سے چڑیوں کا شکار کرے گا۔ تم ادھر مہمان خانے میں جا کر سو جاؤ۔ اپنے یار کو بھی ادھر ہی لے جاؤ۔ جب میڈم صاب جاگے گا تو اُس کو ام بتا دے گا۔ چلو، اپنا چڑی مار کے شکل تم کرو۔“

دونوں کے درمیان کچھ دیر نوک جھوک چلتی رہی۔ امیر شاہ فوری طور پر میڈم سے ملنا چاہتا تھا جبکہ ظاہر شاہ اُسے دائیں ہاتھ والی گیلری میں دھکیل کر بولا: ”چلو ادھر کمرے میں۔ ام تمہارے لیے مز قہوہ بنا کر لاتا ہے۔ عقل ٹھکانے لگے گا تو سمجھ آئے گا کہ یہ کسی سے ملنے کا ٹیم نہیں ہے۔“

امیر شاہ میرا ہاتھ تھام کر، ظاہر شاہ پر غصہ بھری نگاہ ڈال کر بادل نا خواستہ خوبصورت فرشی ٹائیلوں والی گیلری میں داخل ہو گیا اور آخری کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میں جو اُس کی تقلید کر رہا تھا، کمرے کی آرائش دیکھ کر انگشت بدنداں تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک جہازی

سائز کا خوب صورت بیڈ پڑا تھا۔ کمرے کے انتہائی گوشے میں ہاتھ روم کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ کمرہ خاصا کشادہ اور ڈال ڈوال، کار پینڈ تھا جو کونٹھی میں رہنے والی میڈم ٹھیک نامی عورت کی امارت کا منہ بولتا مظہر تھا۔

میں بیڈ پر بیٹھنے سے ہچکچا رہا تھا کیونکہ میرا لباس بہت میلا پھیلا تھا۔ امیر شاہ نے میرے تال کو تڑپا لیا۔ بازو سے ہڈ کر بیڈ پر پہنچ لیا۔ بولا: ”تم ماڑے یار ہو۔ ماڑی لہر (نظر) تن پر نہیں ہووے، سوہنے بچے من پر ہووت ہے۔“

میٹرس بڑا آرام دہ تھا۔ بیٹھتے ہی آدھا دھنس گیا۔ کمرے ہی دیر میں ظاہر شاہ قہوے کے تین پیالے ٹرے میں رکھے آن دارد ہوا۔ ہم نے قہوہ پیا، کچھ باتیں کیں اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی امیر شاہ کے خرا لے کمرے میں گونجنے لگے جب کہ میں اپنی کبیدہ خاطر حالت پر کڑھنے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ میرے حالات میری دسترس سے نکل گئے تھے۔ اپنی زندگی کے بارے میں، میں نے ج لاٹھ عمل مرتب کر رکھا تھا، وہ نظروں کی حد سے بھی کہیں پرے ہو گیا تھا۔ نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی اور نیند کی پ فریب دادی میں اتر گیا۔

آنکھ کھلی تو دیوار گیر کلاک میں نو بج رہے تھے۔ میں اُچھل کر بیڈ سے اُترا۔ اپنے دائیں طرف لیٹے ہوئے امیر شاہ کو دیکھا تو اُسے ندارد پایا۔ وہ میرے جاگنے سے چشمہ اُٹھ کر کہیں چلا گیا تھا۔ سر بھاری بھاری سا تھا۔ جسم درد میں لپٹ کر خاصا بو جھل محسوس ہو رہا تھا۔ گزشتہ دن کی تمام سرگرمیاں ٹیسوں کی شکل میں مجھ میں نہائی ہوئی تھیں۔ میں نے پردہ ہٹا کر کھڑکی کے باہر دیکھا۔ اُجلی دھوپ میں ہر شے چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں دیر تک سونے کا عادی نہیں تھا مگر بھاگ دوڑ کے طویل دورانیے نے میرے معمول میں ریخت بھردی تھی۔

میں ہاتھ روم جانے کا سوچ رہا تھا جب دروازہ کھلا اور امیر شاہ کی شکل دکھائی دی۔ اُس نے ہینگر میں لٹکا ہوا کمرے کلر کا سوٹ اور جوتے وغیرہ اُٹھا رکھے تھے۔ میں نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا، وہ بولا: ”ماڑے کو معلوم تھا کہ تم گدھے کے مافق جبرورت سے جیادہ (زیادہ) اثنا غلیل ہووت ہے، اس لیے میڈم کو جا کر تمہارے بارے میں سب باتیں کر دیوت ہیں۔ ماڑی میڈم بڑے کھلے دل کی مالک ہووے ہے۔ اُس نے بجا (بازار) سے کپڑے منگوا لیے ہیں۔ نہا کر سوٹ پہن لیوے اور پھر بابو بن کے میڈم ملاقات کرے ہے۔“

میں کپڑے اٹھائے ہاتھ روم میں گھس گیا۔ نفیس لنگ کے سفید رنگ کے ریک پر شیونگ کا سامان قرینے رکھا ہوا تھا۔ میں نے ڈاکٹر شاہ جی کی رفاقت میں اپنی ہائی سیکر رکھی تھی۔ وہ تجربہ کام آ گیا۔ جدید طرز کا پرائس ہائس ہاتھ روم میری آنکھیں کھول رہا تھا، میں کھلی کھول اس حیرت کدے کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ پہلے امیر شاہ اور پھر میڈم ٹھیک نامی امیر زادی مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہوئی ہے۔ میں خاص آدی نہیں تھا۔ یہ دنیا میرے جیسے عموئی اہمیت کے لوگوں سے کچھ بچ بھری ہوئی ہے۔ ایسے میں خود گولنے والی غیر معمولی توجہ میری چھٹی حس کو جگا رہی تھی۔

میں جب ہاتھ روم سے برآمد ہوا تو میری جون ہی بدلی ہوئی تھی۔ تمہیں دیہاتی اور گنوار شخص دکھائی دے رہا تھا۔ ’ہاس‘ کی گرے کلر کی لٹھے کی قیمتی سوئنگ، سیم کلر کا ویسٹ کوٹ، چمکدار سیاہ جوتے..... مجھے اپنا آپ ہلکا پھلکا، خوب صورت اور خوشگوار لگنے لگا۔

میر شاہ نے غسل اور پہنچ کی رحمت نہیں اٹھائی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر آنکھیں چپائیں۔ ”اڑے واہ لاڈے ہاں! اب تو تم زے غنچے نظر آوت ہو۔ ماڑی میڈم کو ہی نہ لے اُڑت کہیں!“

اُس کی آنکھوں میں رچی ہوئی شوخی اور چست کیے گئے فقرے کے سبب میں جھینپ گیا۔ ایک باوردی ملازم نے بلوریں روم ٹیبل پر ناشتے کے لوازمات چن دیے۔ میں امیر شاہ نے بے حد آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر پیٹ کی ٹاپ کو شانت کیا۔ اس دوران مجھے امیر شاہ اپنے مخصوص از میں میڈم سے ملنے اور اُس کے ساتھ گفتگو کرنے کے داب سمجھا تا رہا۔

اُس کی ہدایات کا خلاصہ یہی تھا کہ وہ بہت تیز نظر اور ہوشاس عورت تھی۔ اپنے سامنے بولے گئے جھوٹ کو کوٹنے کا پکڑ کر ذہن تک رسائی حاصل کر لیتی تھی۔ جتنی مہربان تھی، اُس سے کہیں زیادہ منتقم مزاج تھی۔ امیر شاہ نے مجھے سمجھایا اگر میں اُسے اپنی شخصیت اور زور بیاں سے مطمئن کرنے کا مایاب ہو جاؤں تو وہ چٹکی بجانے کی سی دیر میں میرے م مسائل حل کر دے گی۔ خوش ہو کر میرے روم روم میں اُن کی خوشبو بھروے گی، وغیرہ وغیرہ۔

مجھے دولت کی ایسی طلب لاحق نہیں تھی کہ میں اُسے خوش لے چل پڑتا۔ مجھے اس مصیبت سے نجات دہکار تھی جو بنا ہمد دے میری زندگی کی دلیز تک چلی آئی تھی۔ میڈم ٹھیک نامی مارت کی تھوڑی سی نمائش اور رسوخ کا مظہر دیکھ چکا تھا۔

اگر وہ میرے کام آنے کا ارادہ کر لیتی تو کام آ سکتی تھی۔ میں نے اُس کے نام پر ہتھکڑیوں کے کھلتے ہوئے قفل کو دیکھ لیا تھا۔ تھانیدار اور زور آور کی بھی ہوئی شکلوں کو دیکھ کر سمجھ لیا تھا۔ امیر شاہ مضبوط، امیر اور بھاری بھر کم شخصیت کا مالک نہیں تھا کہ وہ تھانیدار پر کوئی پھبتی کسے کی جرأت کرتا مگر وہ اپنے مخصوص انداز میں آواز سے کہتا تھا۔ ظاہر تھا کہ اُس کے منہ میں میڈم کی زبان حرکت کرتی تھی جس پر قانون کار کھولا۔ قفل نہیں لگا سکتا تھا۔

تجسس اور حیران کی ملی جلی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ گیارہ کے لگ بھگ ملازم نے آ کر بتایا کہ میڈم ہم دونوں کو اپنے کمرے میں بلا رہی ہے۔ امیر شاہ نے میڈم کے کمرے کے دروازے تک کے مختصر سفر میں اپنی ہدایات کا اعادہ کیا اور مطمئن ہو کر مجھے میڈم کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ اپنے آرامتہ و پیراستہ کمرے میں صوفے پر بیٹھی دکھائی دی۔ اگر میں نے اُس کے شاب کی لپک اور حسن کی تاب کو پہلے دیکھ نہ رکھا ہوتا تو میری آنکھیں فرط حیرت سے پھٹ جاتیں۔ نازک اندام، سرخ و سپید جلد اور تھیکے نقوش والی لڑکی پر ’میڈم‘ کا لفظ کسی بھی طور چٹا نہیں تھا۔ اُس کا لباس جاذب نظر، مسکراہٹ بے حد جاندار اور بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں مثبت عجیب سی سرد مہری.....

میں نے امیر شاہ کی تقلید کرتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں اُسے سلام کیا اور کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سلام کا جواب دینے کے بجائے بڑی گہری اور سرد نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ سرے پاؤں تک کریدا۔ پھر امیر شاہ سے مخاطب ہوئی۔ ”میر شاہ! اس کے باوجود کہ تم نے مجھے اس جوان کی کہانی بڑی تفصیل سے بیان کر دی ہے، میں چاہوں گی کہ اس کے منہ سے سنوں۔ کیا خیال ہے؟“

وہ بولا: ”ماڑے کو اعتراض (اعتراض) نہیں ہووے میڈم! تمہاری مرضی (مرضی) ہووے تو اس کڑوے بیان (بیان) کو چھل کر دیکھت ہے۔ ماڑے کو تو یہی پتا ہووے ہے کہ تم اس غنچے کی مدد کرے ہو۔ بس!“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ تم اس طرح کر دو کہ گاڑی لے کر مظفر آباد چلے جاؤ۔ مخدوم جی کے ٹھکانے سے مال وصول کر کے جگت پور کے سائیں مراد قریشی تک پہنچا آؤ۔ دیکھنا، سائیں بڑا نامراد آدی ہے۔ بیٹھے منہ زہر کی پھانک کھلاتا ہے۔ رقم کی تسلی دہیں بیٹھ کر کر لیتا۔ پچھلی مرتبہ کی طرح دھوکے میں نہ آ جانا۔ اُسے خان بازو خیل ہر ماہ نوٹوں کی سپلائی دیتا ہے، دھیان رکھنا۔“

مجھے اُس کے اچانک بدلنے والے تاثرات پر حیرت ہوئی مگر میں نے زیادہ توجہ نہیں دی اور بولتا رہا۔ وہ اس کے تذکرے پر بھی چونکی اور اپنے غیر معمولی سرما ہونٹ سکیڑ کر بولی: ”کیا سردار حیدر خان کی بیٹی کی ہاتھ کرتے ہو؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور سلسلہ کلام جوڑ لیا۔ میرے بیان کے بیچ میں وہ گا ہے گا ہے کوئی سوال کر دیتی، کچھ پوچھ لیتی، میں جواب دے کر مطمئن کر دیتا۔ جونہی میری کہانی ختم ہوئی، وہ بولی: ”شہر یار! تمہاری بیان کردہ کہانی کے اکثر کرداروں کو میں جانتی ہوں۔ تم نے کہیں جھوٹ بولا ہے تو اُس کی تصحیح کر لو کیونکہ میں ویریٹی کیشن کروں گی۔“

میں نے کہا: ”میڈم! آپ جس طرح چاہیں، پرکھ لیں۔ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“ وہ عجیب مزاج رکھتی تھی۔ کافی دیر تک مجھے یک ٹک دیکھتی رہی، پھر بولی: ”ہاں! اب تم ادھر صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟“

میں نے بیٹھ کر کہا: ”میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔“ اُس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

”ہو سکتا ہے، زور آور نے کسی اور تھانے میں موبی کے قتل کا مقدمہ درج کروایا ہو، قاتل تک پہنچنے کے لیے مجھے دھریا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میرا دوست کھالا گرفتار ہو جائے اور اُسے مار پیٹ کر میرا نام پتا پوچھ لیا گیا ہو۔ جونہی نور پور پہنچوں، گرفتار کر لیا جاؤں اور موبی کے قتل کے مقدمے میں ڈال کر جالان کر دیا جاؤں۔“

وہ بولی: ”ہاں! اگرچہ تم نے قتل نہیں کیا مگر اعانت جرم کے الزام میں ہی تمہارا کباڑا ہو جائے گا۔“ کچھ دیر کے سکوت کے بعد اس نے کہا: ”پھر؟“

”تم کھالے کی موجودہ پوزیشن سے بھی لاعلم ہو، ہے نا؟“ کچھ دیر کچھ سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

”جی میڈم!“ میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا، ”میں نہیں جانتا کہ وہ کس حال میں ہے۔“

”اسما سے اُس کے تعلقات کی نوعیت کے بارے میں ایک مرتبہ پھر بتاؤ۔ اسما کس حد تک اُس کی ذات میں انوالو ہے؟“

میں نے، جو کچھ میں جانتا تھا، دہرایا۔ وہ لمبی ’ہوں‘ کر کے خاموش ہو گئی۔ ایسے میں اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ صوفے پر نیم دراز تھی۔ میں نے اُسے بہ غور دیکھا۔ وہ

اُس نے سینے پر ہاتھ رکھا، جھکا اور سر تسلیم خم کرتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ اُس کی تعظیم کرنے کا انداز بڑا مضحکہ خیز اور مسخرانہ تھا۔ مجھے عجیب لگا مگر میڈم نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ عادی ہو چکی تھی۔

وہ پلٹا ہی تھا کہ میڈم نے کہا: ”اور ہاں! وہ انسپکٹر اظہر کو بھی راضی کر دینا۔ بہت عزت کرتا ہے۔“

میر و شاہ نے دوبارہ سر تسلیم خم کیا اور پلٹ گیا۔ اُس کے جانے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئی: ”ہاں! تمہارا نام کیا ہے؟“

اُسے بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھتے پایا تو میں قدرے گڑبڑا گیا مگر میں نے سنبھلنے میں دیر نہیں کی۔ ایک طویل سانس خارج کی اور مستحکم لہجے میں کہا: ”میڈم! میرا نام شہر یار ہے۔“

”دیری گڈ!“ اُس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”یہ ہوئی نا بات۔ شہر یار بڑا کیوٹ نام ہے۔ تمہاری آپ جیتی بھی بڑی کیوٹ ہوگی۔ کچھ چھپاؤ گے تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ مجھے اچھا سامع جان کر شروع ہو جاؤ۔ تم یہاں کیوں ہو؟ مجھے اس سوال کا تفصیلی جواب درکار ہے۔“

میری بات طویل تھی۔ خود اعتمادی بھی لوٹ رہی تھی۔ اس لیے میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا: ”کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟“

اُس نے ایک ادا سے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔ ”نہیں۔ ابھی یہ طے نہیں ہوا کہ تم قابل اعتماد ہو۔ جب تم نے خود کو سچا اور مخلص ثابت کر دیا، تمہیں اپنے سامنے بٹھاؤں گی۔“ اُس کے ہاں لفظوں کی اداسی بڑی رواں اور کامل تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ خاصی پڑھی لکھی تھی۔ بڑی بڑی شفاف آنکھوں سے پھوٹی نادیدہ شعاعیں ذہن تک اُترتی محسوس ہوتی تھیں۔ میں نے نور پور سے اپنی کہانی کا آغاز کیا۔ بغیر کوئی آمیزش کیے، جھوٹ بولے، اُسے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ وہ شیشے کے ایک نفیس گلاس کو گا ہے گا ہے لبوں سے لگا کر پانی کا گھونٹ بھرتی، پھر میری طرف متوجہ ہو جاتی۔ وہ تب مسکرا دیتی جب میں اُسے دیکھنے کے بعد چند لمحوں کے لیے اپنی ردائی کھوپٹیٹھا تھا۔ ایسے میں میری توجہ اُس کے خدو خال کی ندرت اور شخصی نکھار پر مرکوز ہو جاتی تھی۔

جب میری کہانی میں عشرت عرف عاشی اور جیت شاہ کا کردار داخل ہوا، وہ بڑی طرح چونکی۔ صوفے کی ٹیک چھوڑ کر بولی: ”اوہ..... وہ والا نور پور۔ اچھا، ٹھیک ہے، تم اپنی کتھا جاری رکھو۔“

جب میری کہانی میں عشرت عرف عاشی اور جیت شاہ کا کردار داخل ہوا، وہ بڑی طرح چونکی۔ صوفے کی ٹیک چھوڑ کر بولی: ”اوہ..... وہ والا نور پور۔ اچھا، ٹھیک ہے، تم اپنی کتھا جاری رکھو۔“

بلاشبہ بہت خوب صورت تھی۔ پیرٹ کمر کی کڑھائی دار قمیص، گہرے میز رنگ کی شلوار اور اسی رنگ کا میٹنگ دوپٹا اُس کی شخصیت کے گرد زبردست مقناطیسی حصار کھینچ رہا تھا۔ وہ گھریلو، سادہ اور کیوٹ دکھائی دیتی تھی مگر میر و شاہ نے اُس کی طاقت اور رسوخ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ بیان کرتا تھا کہ وہ بہت پختی ہوئی، زیرک اور زمانہ ساز عورت ہے۔

”تم نور پور میں رہتے ہو، نور پور کے معاملات سے بخوبی واقف ہو گئے؟“

”میں سمجھا نہیں میڈم؟“

”وہاں ایک نہیں، کئی بڑے رہتے ہیں۔ یارن خان، وریام خان، حیات خان اور ان سب سے بڑا کردار دل جیت شاہ۔۔۔۔۔ یہ لوگ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتے ہیں مگر دولت ہے کہ دن بدن ان کے پاس جمع ہوتی جاتی ہے۔ آخر ایسا کیا ہنر ہے ان لوگوں کے پاس؟“ اُس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، کہاں ”میڈم! میں انہیں جانتا تو ہوں، ان میں اٹھتا بیٹھتا بھی ہوں مگر ان کے کسی ہنر سے آگاہ نہیں ہوں۔ میرے لیے تو یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ آپ ان سب لوگوں کو جانتی ہیں۔“

”نور پور میں کسی کو بھی ان کے کرتوتوں کا علم نہیں ہے؟“ اُس کے لہجے سے حیرت مترشح تھی۔

”کون سے کرتوت؟“ وہ مجھے بہ غور دیکھ رہی تھی۔ منہ سے کچھ نہ بولی، تقبیبی انداز میں سر ہلانے لگی اور پھر اُس نے اپنی آنکھیں موند کر اپنا سر صوفے کی پشت پر رکھ دیا۔ کوئی پانچ منٹ کا دورانیہ اسی حالت میں تمام ہوا۔ پھر اچانک اُس نے آنکھیں کھول کر مجھ پر گاڑ دیں۔ بولی: ”شہر یار اتم مستقبل میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

میرے جی میں آئی کہ میں اُس پر اپنا وہ دکھ بھی آشکار کر دوں جس نے آج تک مجھے چین نہیں لینے دیا تھا اور اُس سے مدد طلب کروں مگر جھجک آڑے آئی اور کچھ نہ کہہ پایا۔ وہ بولی: ”تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نو میڈم! میں اندھیرے میں ہوں۔“

”جس نے تمہاری زندگی میں یہ اندھیرا طاری کیا ہے، اُسے جلا دو۔ تاریکی چھٹ جائے گی۔“

یہی تو میری مشکل تھی۔ میں اُس شخص کی تلاش میں ناکام ثابت ہوا تھا۔ مجھے اُدھیر بن میں جتلا پا کر اُس نے موضوع گفتگو بدلا۔ ”اچھا چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ، تم

میرے لیے کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہو؟“

دنیا کا نظام کچھ لو اور کچھ دو پر چلتا ہے۔ اس نے ہمدردی تھی، اُسے حق حاصل تھا کہ اپنی اعانت کی کچھ قیمت طلب کرتی۔ میں نے کبیدہ دلی سے کہا: ”میڈم! میں تو غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک دم مسکرائی، بولی: ”یہ اندازہ تو مجھے گو ہے۔ میرے سوال کو نئے رخ سے سمجھنے کی کوشش کرو۔“ احسان کا بدلہ احسان سے چکانے کی ہمت رکھتے ہو؟“

میں اُس کے کس کام آسکتا تھا؟ سوچ کر دل بیٹھنے لگا۔ ”میرے پاس دینے کے لیے، سوائے اپنے خون کے کچھ نہیں ہے۔“

اُس کی مسکراہٹ میں مزید گہرائی سمٹ گئی۔ آنکھیں لم باز ہو گئیں۔ قدم سے شوخی سے بولی: ”دیہاتی خون میں جھوٹ نہیں رہتا۔ منافقت اور دھوکا شامل نہیں ہوتا۔ تم مجھے خون دو، بڑی بات ہے۔ میں اُسے بدن سے کیسے کشید کر دوں گی، یہ میرا کام ہے۔“

پھر اُس نے اپنے بائیں جانب پڑی ہوئی چھوٹی سی بلوریں تپائی پر سے اتر کر کام ریسیور اٹھایا۔ کوئی نمبر پیش کیا، کان سے لگا کر کسی کو فوراً کمرے میں پہنچنے کا حکم صادر کیا۔ چہ لمحوں بعد ایک باوردی ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ وہ حاکمانہ انداز میں بولی: ”شبو! مہمان کو گیٹ روم میں لے جاؤ۔ اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ ہاں! ٹیلی فون کی ایکسٹنشن اشاعت کر دینا۔ کہیں فون کرنا چاہے گا تو کر لے گا۔“

پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولی: ”شہر یار! اب تم گیٹ روم میں جا کر آرام کرو۔ کسی شے کی ضرورت ہو تو روم میں موجود اتر کر کام کا بزر بجا دینا۔ شبو کمرے میں ٹیلی فون لگا دے گا۔ تم اپنے گاؤں میں کسی کو فون کر کے اپنے گھر میں اپنی خیریت کی اطلاع کر دینا مگر ایک دھیان رکھنا کہ میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ اُدھے؟“

”بہت شکریہ میڈم! میں شاید آپ کے احسانات کا بدلہ کبھی چکا نہیں پاؤں گا۔“ میں نے کہا اور شبو کی معیت میں اُس کے کمرے سے نکل کر اسی گیٹ روم میں آ گیا جہاں میری اور امیر شاہ عرف میر و شاہ کی شب ببری کا ہنگامی اہتمام ہوا تھا۔ شبو، جس کا نام شبیر یا شبیر ہو سکتا تھا، نے فون کی سہولت مہیا کی۔ گیلری میں بی بی وی لاؤنچ اور لائبریری کے دروازے کھلتے تھے۔ گیلری کا آخری دروازہ ایک بڑے اور خوبصورت لان میں کھلتا تھا۔ شبو نے حق میزبانی ادا کرتے ہوئے مجھے بہت سی کارآمد معلومات فراہم کیں

آٹھ بڑے چھوٹے کمرے پر مشتمل یہ حصہ گیٹ لگھلاتا تھا۔ میڈم کے سامنے خاموش گود کھائی دینے والا عینیت میں خاصا باتونی ثابت ہوا تھا۔ میرے استفسار پر نے میر و شاہ کی واپسی کا وقت بتانے سے معذوری ظاہر کی۔ میں اس سے مل کر یہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے فون پر امیر نواز سے مدد کرنے کی کوشش کی مگر قریشی چوک والی ایکس پیسج میں ہلکی خرابی عود کر آئی تھی جس کی وجہ سے ’نوں، نوں‘ کی مددہ آواز نے ہی میرا استقبال کیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ امیر ال کے سیٹ کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہو۔

ایک مسلسل اضطرابی کسک کے باوجود میں خود کو اس جگہ والی محفوظ خیال کرنے لگا تھا۔ گھر والوں کی اداسی، پر دین پریشانی کا احساس، کھالے کی عدم دستیابی اور نور پور میں نہیں آنے والے ممکنہ خطرات نے ذہن کو خاصا پراگندہ کر دیا تھا جبکہ میں ان سوچوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا مسلسل ناکام ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر شاہ جی اکثر کہا کرتا تھا کہ جب سوچ کی چشم کھلے تو کوئی واضح شبیہ بنانے میں کامیاب نہ ہو پارہی ہو تو سوچ سے فی الوقت چھٹکارا حاصل کر کے ذہن کی صحت کو بحال کرنے کی کوشش کی جائے۔ مطمئن، آسودہ اور پہلی ڈگر ہٹا ہوا ذہن ہی قائمہ مند صورت کی تشکیل دے سکتا ہے۔ شاہ جی کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے ان تکلیف دہ عین کو پس پشت ڈال کر دوپہر تک کا وقت میں نے لان، ان کے بیرونی لان، لائبریری اور بی بی وی لاؤنچ میں گزرا۔ اس عرصے میں شبو، ظاہر خان اور دو ملازموں کے وہ مجھے کوئی شخص دکھائی نہیں دیا تھا اور نہ ہی میڈم کی شکل لی دی تھی۔ ظاہر خان خاصا خشک مزاج آدمی تھا۔ اُس کا ہر اٹنے ہاتھ والی گیلری کے آخری سرے پر تھا۔ وہ رات کو لکھی کی چوکیداری کے فرائض سرانجام دیتا تھا اور دن بھر ام کرتا تھا۔ گیٹ پر زوار ہائی شخص یہ طور و اچ میں کم ہارنی گارڈ تعینات تھا۔ اُس کے کاندھے پر وہی کلاشن ل۔ جیسی منی گن لگ رہی تھی جسے میں نے رات کو ظاہر خان اندھے پر لٹکا دیکھا تھا۔

دقت دقت سے میں نے کئی مرتبہ امیر نواز کو فون کیا۔ راجت خان کا نمبر بھی ٹرائی کیا مگر کام نہیں بنا۔ کتنا اچھا کہ نور پور تک سیلور سسٹم پھیل چکا ہوتا تو مجھے وہاں کے سے آگہی حاصل کرنے میں اتنی دشواری کا سامنا نہ ہوتا۔

دو بجے شبو نے میرے آگے پر تکلف کھانا چن دیا۔ میں نے ڈٹ کر کھایا، چائے پی اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔ دو تین گھنٹوں کی نیند، نیم گرم پانی کے غسل اور محفوظ ہونے کے احساس نے میری خود اعتمادی اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو جلا بخش دی تھی۔ مجھے اب میر و شاہ کی آمد یا میڈم کی شکل کے طلب کیے جانے کا انتظار تھا اور اسی انتظار میں شام ڈھل گئی۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے شبو نے پھر پر تکلف کھانا میرے سامنے سجا دیا۔ میں نے اُس سے میر و شاہ کے بارے میں پوچھا تو اُس نے مجھے یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ میر و شاہ آیا تھا اور میڈم سے ملنے کے بعد واپس چلا گیا تھا۔ عجیب بات تھی کہ اُس نے مجھ سے ملنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ جدا ہونے تک وہ مجھ پر بے حد مہربان تھا۔ میڈم سے ملاقات ہوتے ہی میں نہ جانے کیوں اُس کے لیے بالکل غیر اہم ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ نکتہ میری فہم سے بالاتر تھا۔ میں نے شبو سے اُس کا فون نمبر مانگا۔ اُسے زبانی یاد تھا۔ اُس نے ایک پرچی پر لکھ کر میز پر رکھ دیا، بولا: ”کھانے کے بعد آپ اُس سے رابطہ کر سکتے ہیں۔“

میں نے اُس کا موبائل فون نمبر ملایا تو اُس کی تیز آواز کانوں میں پڑی: ”لاڈے خان! ماڑے کو یاد کرے ہو۔ ہے نا!“

میں نے گلہ کیا: ”تم مجھ سے ملے بغیر ہی چلے گئے، کیوں؟“

”ماڑا دھندا ہی بڑا غلط ہووے ہے۔ پاؤں ملتان میں تو کھوپڑی لاہور میں ہووے۔۔۔۔۔ پر تم فکر مند کیوں ہوتے ہو؟“

”میں اکیلا ہوں۔ بور ہو رہا ہوں۔ تم وقت نکال کر یہاں آ جاؤ، کچھ وقت اچھا گزر جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”ماڑے کو مت چھیڑو۔ وقت نکال کر ملنے کے لیے آؤت ہوں۔ اگر کسی چیچ (چیز) کی ضرورت ہو تو شبو میاں سے کہوے ہے۔ وہ اللہ دین کے جن کی طرح فٹافٹ حاضر کر دیوت ہے۔ لاڈے خان! موج کرے۔ میڈم جے میں چھبے کاٹے جبان (زبان) سے جن لیوت ہے۔ ہاں۔۔۔۔۔“

اُس کی نان اسٹاپ زبان چل پڑی تھی۔ میں نے ملنے کی استدعا کو دہرانے کے بعد ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ایک اُمید بندہ کر ٹوٹ چلی تھی۔ اگر کھالے نے امیر نواز سے رابطہ کیا تو اُسے میرا نمبر مل جائے گا اور وہ یقیناً مجھے فون کرے گا۔ ساتھ ہی یاد آ گیا کہ امیر نواز کا فون ہی انینڈ نہیں ہو رہا تھا۔ کھالا اُس سے رابطہ کیسے کر سکتا تھا؟

گیسٹ ہاؤس کے لان میں کھڑے ہو کر کوفی کو دیکھنے سے اُس کے جسم اور وسعت کا قدرے درست اندازہ ہوتا تھا۔ نور پور میں خانزادوں کی حویلیوں کو دیکھ رکھا تھا۔ ذہن نے تصور باندھ رکھا تھا کہ اُن سے بڑی اور گھڑی کوٹھیاں کم از کم اس ملک میں نہیں ہیں مگر جب میڈم کی اس پراسرار کوفی کو دیکھا تو حیرت و دُچند ہو گئی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق تین فلورز پر مشتمل اس عمارت میں کم از کم چالیس کمرے تھے۔ گراؤنڈ فلور، جس میں گیسٹ ہاؤس واقع تھا، کسی بیاباں کی طرح پُرسکون تھا جبکہ فرسٹ فلور پر نقل و حرکت اور ملی جلی آوازوں کا شور بھی کبھار سنائی دیتا تھا۔ شبو، ظاہر خان، زوار اور دو مسکین طبع ملازموں کو میں نے میزبانی کی طرف جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ انہیں محض گیسٹ ہاؤس تک محدود رہنے کی ہدایت ملی ہوئی تھی۔ شبو اور ظاہر خان بے تکلفی کے ابتدائی مراحل عبور کر رہے تھے جبکہ باقیوں نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

رات میرے بستر پر کانٹے چنے ہوئے گزرتی جا رہی تھی مگر میڈم کی طرف سے بلاوائیں نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ مجھے دلاس دینے کے بعد فراموش کر بیٹھی تھی۔ گیارہ کے قریب میں کروٹیں بدل بدل کر اکتا گیا اور ست روی سے چلتا ہوا لان میں آ گیا۔ تراشیدہ ٹھلیں گھاس اوس زدہ ہو کر سردرات کی نصف خنکی اپنے اندر سیٹھی میری طرح جاگ رہی تھی۔ میں نے جوتے اتار دیے اور لان کے آخری سرے تک ٹھٹھا چلا گیا۔ جلتے ہوئے بدن کے ساتھ برف پر چلتا بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ پہلے سا خوف میرے ذہن پر سوار نہیں تھا۔ چونکہ حیات خان کے دارے پر بہ کثرت آنے جانے کی بدولت تھانے کچھری کے معاملات سے کافی حد تک آگاہ تھا۔ لوگ زمین، قبضے اور چھوٹے موٹے جرائم کے سلسلے میں حیات خان سے قانونی اور پچانختی معاونت لینے کے لیے آتے رہتے تھے۔ اُن کے حل طلب مسائل اور خان کے مشورے سنا سنبھالتا رہتا تھا۔ معمولی نوعیت کے قانونی معاملے گھروں کو چاٹ جاتے تھے۔ میں تو قتل کی لرزہ خیز اور سرعام وقوع پذیر ہونے والی واردات میں ملوث ہوا تھا۔ بجا طور پر اگر امیر شاہ اور میڈم میری مدد نہ کرتے تو شاید میری بقیہ زندگی سلاخوں کے پیچھے ہی گزرتی۔ چاچا چراغ میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ میرے کیس کی پیروی کرتے، کوئی اچھا وکیل کرتے یا ضمانت کی کامیاب کوشش کرتے۔ صحیح معنوں میں مجھے اچانک اور غیر متوقع میسر آنے والی کمک ناقابل یقین امداد تھی۔

رات کو گہری نیند سویا۔ صبح ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا

کہ میرا شاہ آن پہنچا۔ وہ خاصا تروتازہ دکھائی دیتا تھا۔ ملا کر صوفے پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا، بولا: ”کیوں رہے کوئی پرالہم تو نہ ہوت ہے اور؟“

میں نے کہا: ”نہیں، البتہ بہت زیادہ بوریت محسوس کر رہا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ ہوتے تو شاید وقت گزرے پتا بھی نہ چلتا۔ کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”کہا تو تھا کہ ماڑا کام ہی ایسا ہے۔ نہ جانے کا پتا نہ آنے کا۔ ابھی میڈم سے مل کر آدے ہوں۔“

”اُس نے کچھ کہا؟“

”ارے صبر تو کر یو دو چار گھڑی لاڈے میاں! جراثا لینے دیوت ہے کہ نہیں.....“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا: ”میرا فقی میڈم بھی لٹو ہو گئی ہے تیرے پر..... ماڑے کو آ ہے کہ لاڈا تو ایک دم نواں گور ہووے ہے، معشوق کے مال تیری چاندی ہو گئی ہے غنچے، چاندی..... سووے تو ہیروں! سچ پر، جاگے تو سونے کی چمچل پہنے، چلے تو نوٹوں کی گڈیوں، خڑے سے پاؤں دھرے..... اڑے کیا کہنے میڈم معشوق کے!“

میں نے اُسے بہ غور دیکھا۔ کہیں مذاق تو نہیں کر رہا تھا مگر اس کے چہرے پر ستائش کے جذبات کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ میں نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ”میں یہاں سے جانے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔“

”جانے کو چلا ہی جاوت ہے پر کچھ باتیں کان کم کے سنا جاوے ہے ٹو!“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور مجھے ا مخصوص انداز میں راز کی باتیں بتانے لگا۔

اُس کی گھنٹا بھر کے دورانے پر مشتمل مخصوص انداز گفتگو کا خلاصہ یہی تھا کہ میڈم کی آنکھوں نے مجھے قاتل اعتبار قرار دیا تھا۔ وہ مجھے اپنے پاں ملازمت دینے کی خواہ تھی۔ میرا شاہ نے تنخواہ کی جو رقم بتائی، وہ اتنی زیادہ تھی مجھے کافی دیر یقین نہیں آیا۔ جب اُس نے اپنی تنخواہ بارے میں بتایا تو میری آنکھیں مزید پھیل گئیں۔ مجھے ا شاہ جی کی تنخواہ بہت زیادہ محسوس ہوا کرتی تھی۔ میڈم نے اُس سے دینی تنخواہ کی آفر کی تھی۔ میرا شاہ نے میرا استفسار پر بتایا کہ میڈم نے ابھی کام کی نوعیت کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، صرف اتنا ہی کہا تھا کہ میں نور علی جاؤں اور ہر دوے چوتھے روز میڈم سے فون پر رابطہ کروں۔ وہ مجھے ڈکٹیشن دے گی۔ جب میں نور پور سے آنے پر آمادہ ہو جاؤں گا، میری کئی نوکری کر دی جائے گی میرا شاہ نے ایک پرچی پر میڈم کا فون نمبر لکھ کر

”منجے! اپنے گاؤں میں جا کر جدگی (زندگی) کے بجے (لوٹو۔ مگر جا کر ماڑے کو دعائیں دیوے گا ناں؟ (ضرور) دیوے گا ماڑا لاڈا.....“

اُس نے اپنی بگلی جیب میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور میری جھولی میں ڈال دی۔ ”سو جاں کرنے کو روکڑا لہ میں ہونا جروری ہووے ہے لاڈے میاں! یہ میڈم کا لہو ہووے۔ چل، اب میرا شاہ تیرے کو لاری اڈے پر لہو آوے۔“

میں عجیب گوگو کی کیفیت میں ڈوبا، نوٹوں کی گڈی کو فون میں سختی سے تھامے بیٹھا میرا شاہ کو دیکھ رہا تھا۔ بجا طور پر اتنی بڑی رقم پہلی مرتبہ میرے ہاتھوں میں آئی تھی۔ میں نے تھوک لٹکا: ”یہ تو بہت زیادہ ہے۔ مجھے تو بس کرایہ.....“

وہ صوفے سے اٹھ کر میرے قریب آ گیا، اپنی عادت کے مطابق میرے کندھے پر دھب مار کر بولا: ”اڑے کیا جیادہ (یادہ) ہووے..... یہ سسری کے نوٹ جیادہ ہیں؟ اڑے پچا تیرے پہ ماڑی میڈم عاشق ہو جاوت ہے۔ وہ لاکھوں کی جواں پر وارد دیوے اور پوچھے بھی نہیں..... ہاں تو!“

اُس نے میری خالی الذہنی کی کیفیت کو تازہ لیا اور ہاتھوں نوٹوں کی گڈی اور فون نمبر والی پرچی سمجھ کر میری بگلی جیب میں ڈال دیں۔ مجھے چونکہ نور پور جانے کی اجازت مل چکی تھی، مالے میں یہاں سے نکلنے کے لیے خاصا بے تاب تھا۔ میڈم کے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میرا شاہ نے بتایا کہ میڈم بہت اہم معروف ہونے کے سبب ملاقات نہیں کرے گی۔ اب جو اگلی بات ہوگی، ٹیلی فون پر ہوگی۔

ہم دونوں گیسٹ روم سے نکل کر پارکنگ میں آ گئے۔ سفید رنگ کی ہنڈا اکارڈ ہمارے لیے تیار تھی۔ ہمارے ہی ڈرائیور نے گاڑی پارکنگ سے نکال لی۔ دس منٹ بعد میں لاری اڈے میں ڈیرا اسٹینڈ کے عین سامنے ک پر کھڑا تھا جبکہ میرا شاہ اپنے مخصوص انداز میں گلے لگا کر رہا تھا، ہاتھ لہرا کر خدا حافظ کہتا ہوا اکارڈ میں بیٹھ کر دس سے اوچھل ہو گیا تھا۔

میں نے غیر محسوس انداز میں اپنی بگلی جیب کو ٹولا۔ سو سو سرخ نوٹوں کی گڈی کی موجودگی کے احساس نے باور دیا کہ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا بلکہ جو کچھ دیکھا سچ دیکھا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ڈیرا جانے والی بس سے نکلتی دکھائی دی اور میں لپک کر اُس میں سوار ہو گیا۔ میں ایک ڈیڑھ بجے چوک قریشی پہنچ گیا۔ شیدو نے مجھے بس سے اترتے ہی دیکھ لیا تھا۔ بھاگ کر میرے پاس

مسافر

آیا، سلام لے کر جھٹ سے پوچھنے لگا: ”اُستاد کہاں ہے؟“ اُس کا اشارہ کھالے کی طرف تھا۔ میں نے کہا: ”کیا وہ ابھی تک نہیں پہنچا؟“

”نہیں تو اوہ تہارے ساتھ گیا تھا، اکیلا کیسے آ جاتا؟“

شیدو ہنسنے لگا: ”سارے گھروالے بڑے پریشان ہیں، تہارے گھروالے بھی بار بار پوچھنے آتے ہیں اُستاد!“

ہم دونوں چلتے ہوئے وین کے قریب آ گئے۔ ڈرائیور عزت خان ہونٹ کے ہاچے پر براجمان تھا۔ ابھی وین کو نکلنے میں دیر تھی۔

موسم بہت اچھا تھا۔ بادل جھوم جھوم کر اٹھیلیاں کر رہے تھے اور کسی دم بھی بارش ہونے والی تھی۔ جب میں نور پور میں پہنچا تو بوند باندی شروع ہو چکی تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی گلی میں داخل ہوا اور میں نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اطراف کا احتیاط بھری نظروں سے جائزہ لے لیا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق پردین اور چاچی نے مجھے دیکھتے ہی سخت باز پرس شروع کر دی۔ اُن کے لہجوں میں جہاں برہمی عیاں تھی وہاں گہرے نفکر اور اندیشے بھی سرسرا رہے تھے۔ اُن کی بلند آوازیں سن کر گھر کے دوسرے افراد بھی وہاں آ گئے اور ہر ایک نے میری آؤ بھگت میں مقدور بھر حصہ ڈالا۔

شانو میرے لیے چائے کا بڑا پیالہ تیار کر لائی۔ میں نے ماقبل شیدو، عزت خان اور اب گھروالوں کی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ نور پور میں میری اور کھالے کی واردات کی خبر نہیں پہنچی تھی اور نہ ہی کوئی ہمارے تعاقب میں یہاں تک آیا تھا۔ میں نے اپنے ٹرنک میں میڈم کی دی ہوئی نوٹوں کی گڈی چھپا کر محفوظ کر دی تھی کیونکہ اتنی بڑی رقم کی موجودگی گھر میں طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔

کچھ دیر سنانے کے بعد بھر پور انداز میں غسل لیا اور کھیتوں میں چلا گیا۔ معمول کے کام کاج میں ہاتھ بٹایا اور شام اپنی سرسری چادر نور پور پر پھیلائے خندہ زن تھی، جب میں وین اسٹینڈ پر پہنچا۔ گریٹ کے گراؤنڈ میں لڑکوں کی ایک ٹولی بڑا سا دائرہ بنا کر بیٹھی دکھائی دی۔ مراد بخش دیوانے کی موجودگی کا شبہ ہوا۔ قریب پہنچ کر میں نے اُسے لڑکوں پر اپنے علم کی دھاک بٹھاتے سنا۔ وہ تھوڑا کھسک کر میرے بیٹھنے کی جگہ بتاتے ہوئے بولا: ”ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ اس وقت سراسیمگی دو بڑا عالمی ادب میں اپنی انفرادی جگہ بنا چکا ہے۔“

ایک لڑکے نے جھٹ سے پوچھا: ”کیا انگریزوں کو

سراٹکی کی سمجھ آتی ہے؟“

وہ تاسف بھرے انداز میں بولا۔ ”یار ایک تو میں تم جیسے جاہلوں سے بڑا تنگ ہوں۔ او میرے بھائی! سراٹکی دو ہڑوں کا ہر زبان میں ترجمہ ہوتا ہے، انگریزی میں بھی۔“ میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”اور اپنے دیوانے کے دو ہڑوں نے تو یورپ کی لڑکیوں کو حواس باختہ کر کے رکھ دیا ہے۔ سنا ہے کہ وہاں مراد بخش دیوانے کے مجھے نصب کیے جا رہے ہیں۔“

مجھے لڑکوں کے چہرے مصنوعی استعجاب سے دمک اٹھے۔ دیوانے کا چہرہ فرط غیظ سے دمک اٹھا۔ اُس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ابے الو کے پٹھے! میں تمہاری چالاکی سمجھتا ہوں۔

میں نے اُس کی پھڑکتی ہوئی رگوں کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔ کانوں کو ہاتھ لگایا اور اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے اُسے دو ہڑا سنانے کی فرمائش کی۔ یہی وہ چاہتا تھا۔ اُس کی گردن اکڑ گئی اور لبوں سے سیکڑوں مرتبہ کے جھڑے ہوئے ’پھول‘ تو اتر سے جھڑنے لگے۔ میں نے کچھ دیر مراد بخش دیوانے کے جھنڈے دو ہڑے سے پھر اُس سے جان چھڑا کر کھالے کی خبر لینے کے لیے ویکن اسٹینڈ کا رخ کیا۔ ویکن آخری پھیرا لے آئی تھی مگر کھالا نہیں آیا تھا۔ چونکہ دیہاڑی دار ڈرائیور عزت خان کو واپس چوک قریشی جانا تھا، اس لیے وہ خالی ویکن لے کر چلا گیا اور میں دل ہی دل میں کھالے کی پریشانی ذہنی بساط پر سمیٹے نڈھال سا ہو گیا۔ وہ نہ جانے اس وقت کس حال میں تھا۔ آج ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں جانے کی سکت نہیں تھی مگر علی الصباح چہل قدمی کے دوران میں ڈاکٹر شاہ جی کے نقش پا پر چل رہا تھا۔

میں نے چمن زار جمیل پر ہونے والے بھیانک واقعے کا تذکرہ گول کر لیا اور اُس کے تقاضے پر عاشی کے بارے میں حاصل کردہ معلوماتی چارٹ اُس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”تمہیں ایک دن مظفر گڑھ میں جا کر گزارنا ہوگا۔ دیکھنا ہوگا کہ عشرت پڑھنے جاتی ہے، کیا پڑھتی ہے اور کسے پڑھانے کی کوشش کرتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگلے ہفتے جاؤں گا۔“

”اس ہفتے کیوں نہیں؟“

”بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات جیت شاہ کے مزار پر مصروف رہوں گا۔“

”نہیں، تم مزار کے نزدیک بھی نہیں جاؤ گے۔ بخت خان جو کھیل کھیلتا ہے، کھیلنے دو اور دو بیٹھ کر تماشا دیکھو۔“

”اگر اُس نے مجھے بلالیا تو؟“

”کوئی سا بھانہ کر دینا۔ کہہ دینا کہ بخار نے آن (د) ہے۔ میرے پاس آ کر سو جانا اور ظاہر کر دینا کہ تم نور سے باہر کسی ضروری کام کے سلسلے میں جا رہے ہو۔“ اُس نے اٹل لہجے میں کہا۔

”مگر کیوں؟“ میں سخت متعجب ہوا۔

”تم ابھی نادان ہو، ضائع ہو جاؤ گے۔“

”شاہ جی! میں بچہ تو نہیں ہوں۔“

”مگر بڑے بھی نہیں ہو، برخوردار! کسی زعم میں رہتا۔ بخت خان بھی آج نہیں توکل پیچھے ہٹ جائے گا۔ میرا جہاں تک خیال ہے، دل جیت شاہ اکیلا نہیں ہے۔ اُس کا ساتھ وریام خان دے رہا ہے جبکہ حیدر خان پشت پناہی کر رہا ہے۔ یعنی بات ہے کہ بڑے خان کی مرضی اور شہ کے بغیر سائیں جیت شاہ کوئی بھی ناجائز کام نہیں کر سکتا۔ جب بخت خان پر اپنے بھائی کے کروت عیاں ہوں گے، وہ مجبوراً پیچھے ہٹ جائے گا اور تب تک تم خان اور دل جیت شاہ کی نظروں میں کانٹے کی طرح چبھ چکے ہو گے۔ وہ تمہیں توڑ دیں گے، جلادیں گے یا پرے پھینک دیں گے۔“

خوف کی ایک سرد لہر میرے بدن میں سرایت کر گئی۔ ڈاکٹر شاہ جی کے اندازے بھی غلط ثابت نہیں ہوتے تھے۔ اگر ایسا تھا تو بہت ہی بُرا تھا۔ واضح تھا کہ وریام خان کے مقابلے میں سردار بخت خان زیادہ دیر سینہ پھر نہیں رہ سکتا تھا۔ ہار جانا، پیچھے ہٹ جانا تو میرا کیا ہوتا؟ وہی ہوتا جو ڈاکٹر شاہ جی مجھ پر قبل از وقت آشکار کر رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”میں یہ نہیں کہتا کہ تم بالکل غیر متعلق ہو جاؤ، نہیں۔۔۔۔۔۔ بخت خان سے مفاد حاصل کرنے کے لیے اُس کی ہاں میں اپنی ہاں ملا دے، رہو، زبانی کلاہی اپنی وفاداریاں گنگنائے رہو مگر جہاں بھی اوکھلی دکھائی دے، موصولوں کے ڈر سے اپنا سر پیچھے ہٹا لیتا۔“ اُس نے میرا شانہ چھپھپاتے ہوئے کہا۔ ”اب چھوڑو! ان باتوں کو، نرم سی مسواک بنالاء۔۔۔۔۔۔ تم کام کم اور باتیں زیادہ کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہو اور اچھی عادت نہیں ہے۔“

میں نے نفی ہی انداز میں سر ہلایا اور ایک ویسی کیکر کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کی باتیں میرے دل کو کھلی تھیں۔ ویسے بھی میں اُس کے اخلاص پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں رکھتا تھا۔

میرا دن واہوں کی زد میں گزر رہا تھا۔ سہ پہر تک چلے

سے متعدد بار ویکن اسٹینڈ کا چکر لگایا۔ بے ساختہ میری لوری چوک کو جانے والی سڑک کا بھی احاطہ کرتی۔ میں کھالے کا خطر تھا مگر اُس نے ابھی تک کسی طرف مڑیں نکالا تھا۔ میری عافیت اُس کی سلامتی سے مشروط اگر وہ ملتان میں پولیس والوں کے ہتھے لگ جاتا تو وہ بھی خیر نہیں تھی۔ ایک پُرسہ دل کوڈ حارس دیتا تھا کہ اگر لاہور گیا تو وہ میرا نام نہیں لے گا۔ میں اُس کی سرشت ٹھہری آگاہ تھا کہ وہ مرنے لگا تھا مگر پولیس کے سامنے ان کھول کر مجھے مصیبت میں مبتلا نہیں کر سکتا تھا۔ خود کو مراف کرنے کے لیے میں ذہنی مسہر میں تیار ہو کر بخت خان کی حویلی پہنچ گیا۔ خان موجود نہیں تھا۔ نوکرانی نے مجھے معمول کے مطابق ملکہ کے کمرے میں پہنچا دیا۔ مہن میں بی دکھائی نہیں دی تھی۔ میں نے اُس کی غیر موجودگی کو بیت نہیں دی کہ وہ کہیں کئی ہوئی ہوگی یا کسی کمرے میں محو فراحت ہوگی۔

ملکہ کمرے کے انتہائی کونے میں رکھی ہوئی جدید سنگار میز کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کی پشت میری ہاں بھی۔ کمر کو اُس کے چمک دار بالوں نے چھپا لیا تھا۔ وہ ی نزاکت کے ساتھ ہیز برش کو پیشانی پر جھوننے والے لوں میں پھیر رہی تھی۔ ایسے میں اُس کی نگاہ آئینے میں مجھ کی پڑی۔ چونک کر پٹلی اور بیڈ پر سے لٹکتے ہوئے دوپٹے کو غار کمر پر رکھتے ہوئے سلام کو ہوئی۔ میں بیڈ کے بڑے ہلی تختے سے لگ کر کھڑا فور شوق سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ان کی طرف نائل لڑکپن کی آخری سرحد پر پہنچ رہی تھی۔ اُن کا رنگ گورا نہیں تھا۔ لہذا اُن سے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کا رنگ گورا نہیں تھا۔ مگر سرخی آمیز تھا۔ گال تھمتاتے تھے۔ آنکھیں بڑی، پلکیں ہری بھری اور ہونٹ نسبتاً موٹے اور گداز تھے۔ وہ گھر والوں کی نظر میں بچی تھی، دیکھنے والے کی نگاہ بچی نہیں رہی تھی۔ کتابیں کھول کر قارئین پر بیٹھ گئی اور اُس نے بیڈ کے بیلوں کے ساتھ کمر کا کر خود کو آسان کر لیا تھا۔ ”سر! کون سی بات کھولوں؟“

”ریاضی یا انگریزی کی۔۔۔۔۔۔ یا جس بھی مضمون میں تم لوگو کمزور محسوس کرتی ہو۔“

وہ بولی۔ ”مجھے ریاضی مشکل لگتی ہے۔“

میں نے نفی ہی انداز میں سر ہلایا۔ اُس نے ریاضی کی کتاب کھول کر مجھے تھما دی۔ کاپی اپنے زانوؤں پر رکھ لی۔ لکھ پڑھانے کا تجربہ نہیں تھا۔ جیسے پڑھا تھا، ویسے پڑھانے کی کوشش کرنے لگا۔ سوال حل کرنے میں اُس کی مدد کی۔

معجزہ

ایک بادشاہ کسی خوفناک مرض میں مبتلا ہو گیا۔ اطباء یونان کے ایک گروہ نے متفقہ طور پر فتویٰ دے دیا کہ اس کی بیماری کی کوئی دوا نہیں ہے البتہ چند خاص صفات رکھنے والے آدمی کے بچے سے اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ بادشاہ نے ایسے آدمی کو تلاش کرنے کا حکم دے دیا۔ ایک وہقان کا لڑکا ایسا ہی مل گیا جیسا کہ طبیعوں نے بتایا تھا۔ بادشاہ نے اس کے ماں باپ کو بلایا اور بہت سی دولت دے کر خوش کر دیا اور انہیں اس بات پر رضامند کر لیا کہ ان کا بیٹا بادشاہ پر قربان کر دیا جائے۔

ادھر قاضی نے فتویٰ دے دیا کہ رحمت کے کسی آدمی کا خون بہانا بادشاہ کی سلامتی کے لیے جائز ہے۔

جب جلاد نے اس لڑکے کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے آسمان کی طرف سراٹھایا اور مسکراتے لگا۔

بادشاہ نے پوچھا۔ ”یہ ہنسی کا کون سا موقع ہے؟“

لڑکے نے کہا۔ ”اولاد کا ناز ماں باپ پر ہوتا ہے جو قاضی کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرتے ہیں اور بادشاہ سے انصاف چاہتے ہیں۔ اب کیفیت یہ ہے کہ ماں باپ نے دنیاوی مال کے لالچ میں مجھے قتل ہونے کے لیے سوہنپ دیا ہے۔ قاضی نے میرے قتل کا فتویٰ دے دیا ہے اور بادشاہ اپنی سلامتی میری ہلاکت میں دیکھتا ہے۔ اب سوائے خدائے بزرگ و برتر کے میں کوئی پناہ نہیں دیکھتا۔ اے بادشاہ تیرے ظلم کی فریاد میں کس کے آگے کر دوں میں تیرے ہاتھ سے تیرے ہی سامنے انصاف چاہتا ہوں۔“

لڑکے کی یہ باتیں سن کر بادشاہ کا دل بھرا آیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگا۔ ”اس بے گناہ بچے کا خون بہانے سے میرا مرجانا بہتر ہے۔“

یہ کہہ کر اس کا منہ چوہا اور گود میں اٹھالیا پھر اسے بہت سال اور دولت دے کر آزاد کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اسی ہفتے کے اندر بادشاہ صحت یاب ہو گیا۔

مینر حسین سکھر

اُستاد کو مرغوں کی لڑائی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اصل مرغوں کی کمزوری تھے جبکہ مجھے اُس کا یہ شوق زہر لگتا تھا۔ مرغوں دیکھتے ہی میرے ماتھے پر بل پڑ جایا کرتے تھے۔

میں نے کہا: ”اب میں چلتا ہوں، کل آؤں گا، تم مار
وقت میں زیادہ سے زیادہ لکھنے کی کوشش کرو گی۔ جتنا زیادہ
لکھو گی، اتنی روانی اور خوب صورتی سے لکھ پاؤ گی۔“

اُس نے ہامی بھری اور بکھری ہوئی کتابوں کو سینے میں رُجھ گئی۔ ایسے ہی وقت میں کمرے کا دروازہ کھلا اور منی بڑی طرح چوتک کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر کھلے دروازے

صدف بی بی کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اُس کے لبوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ ثبت تھی۔ چند لمحے ٹھہر کر وہ کمرے میں داخل ہوئی، مجھ پر، پھر ملکہ پر ایک نگاہ ڈال کر آہستہ روی

”شہرے! کیسے ہو؟“
میں نے قدرے مودبانہ انداز میں کہا: ”ٹھیک ہوں لی“

اُس نے ملکہ کو کن اکھیوں سے دیکھا۔ شاید اُن کے درمیان کچھ پہلے سے طے شدہ تھا، وہ کتابیں وہیں چھوڑ کر نئے قدموں سے ملتے ہوئے کرے سے نکل گئی۔

صاف کا چہرہ تہمتارہا تھا۔ کچھ ایسا تھا جسے میں سمجھ نہیں
 رہا تھا۔ وہ پراشیتاق نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی
 "شہرے انٹوں میگوں بہوں سو حنا لگدس۔"

(شہرے! تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو)
میں دم بخود رہ گیا۔ اُس نے کتنی آسانی سے اتنی بڑی
ت کہہ دی تھی۔ میں جواباً کچھ نہ کہہ سکا تو وہ بولی: ”ہنسیں

لیکھ آویسی: میگوں چھستی نال ڈساجوتوں میگوں کتھاں کجھ دہ
لیتے مل سکدیں جو میں حیڈے نال بہوں ساریاں گلاں
کرنیاں ہن؟

(ابھی ملکہ آجائے گی۔ تم مجھے جلدی سے بتا دو کہ تم مجھے کہاں مل سکتے ہو؟ مجھے تمہارے ساتھ بہت سی باتیں کرنی ہیں)

وہ خوب صورت تھی، اُس کی آواز اور لہجہ اُس سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت تھا مگر اُس کے لبوں سے نکلنے والی باتیں بہت خطرناک تھیں۔ میں نے جلدی سے کہا: ”نہیں! یہ تو میری بہن ہے۔“

”ابا کو پتا نہیں چلے گا۔“ وہ بہ دستور سرائیکی میں ہاتھ لر رہی تھی۔

میں نے کہا - آپ وہ باتیں مجھے روتے ہیں لکھو

”نہیں.....“ وہ قطعیت سے بولی ”تم مجھے جگہ بتاؤ،
 انھر بچا کرواں پہنچتا میرا کام ہے۔ ہمارا ملنا بہت
 آسان ہے۔“

میری حالت دگرگوں تھی۔ کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔
 بے تذبذب کو اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق مفہوم دیتے ہوئے
 "میں کل دس بجے تمہارے گھر آ جاؤں گی۔ اوکے؟"

”میں نے کہا: ”آپ کا وہاں آنا مناسب نہیں ہے بی بی“

کئی سا بیہانہ کر کے گھر میں رہ جانا۔ میں ضرور آؤں گی۔
 ”ہاں؟“

میں نے تیم وادروانے کی طرف دیکھا۔ اسی تک لوی
 ا اور نہیں آیا تھا۔ شاید ملکہ نے راہ سدود کر رکھی تھی وگرنہ
 مجھے اور صدق کو حویلی میں ایسی تنہائی میسر نہیں آ سکتی تھی۔
 اُس کے مہرے سے منع کرنا۔ اتنا آگے اُس کے اُنکھ

یہ کہ سامنے شکست خوردہ ہو گیا اور خاصی کمزور آواز
 بولا: ”اچھا بی!“

وہ ایک بے بسی اور دگروار سے سی چاہتا ہوتا ہے۔ ایک بلی کوڑکی، پٹنی، ادا سے زندہ مسکراہٹ اچھائی اور لہلہا کر بولی ”ولا ملسوں سو حنا!“

ایمان نہ اور عجیب تھا۔ اُس نے چند لمحوں کو ٹھہر کر میرے جواب اٹھار کیا اور پھر جواب نہ پا کر دروازہ کھول کر میری نظروں اوجھل ہو گئی۔ اُس کے جانے کے چند ہی لمحوں بعد ملکہ

مے میں داخل ہوئی اور مغنی خیر انداز میں مسکرا کر بولی۔
 مرا کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“
 میں اُس کی شرارت بھری آنکھوں میں جھانک کر

مارسا ہوا۔ بولا۔ ”مجھے تمہارا اس طرح کرے سے باہر اچھا نہیں لگا۔“

”باجی صدف کو تو اچھا لگا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی شرارت کی پرچھائیں

کھڑی ہوئی۔ منہ سے پچھنہ بولی ٹراوا سے بھجائی کہ
 لے میری بات پر یقین نہیں کیا تھا بلکہ اُس گننا چہرے پر
 ہوئی تحریر کو جمانا تھا جو کمرے سے نکلتے ہوئے صدف

۱ سسپنس ڈائجسٹ

کے چہرے پر رقم تھی۔
ملکہ کی شوخیاں ایک نئے محاذ کی خبر آرائیاں کرنے
لگیں۔ اُس کا سامنا کرنا مشکل محسوس ہوا تو حویلی سے باہر
نکل آیا۔ کھالے کا پتا کیا مگر وہ ہنوز غائب تھا۔ اُس کے گھر
والوں کو بھی اب اُس کا غیر معمولی غیاب پریشان کرنے لگا
تھا۔ صدف سے ہونے والی پرہیزگار ملاقات اگر عام حالات
میں ہوئی ہوتی تو میرے رگ و پے میں سرمستی اور سرشاری
بھر جاتی مگر اب کیفیت خاصی مختلف تھی۔ میرا ذہن پوری
طرح کھالے کی ذات میں الجھا ہوا تھا۔ ڈھارس دینے
کو ابھی تک کوئی موہوم سی خبر بھی تو نہیں ملی تھی۔ اسامہ سے
ملاقات ممکن نہیں تھی اور نہ ہی میں اُس سے رابطے کی کوئی سبیل
نکال سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ میری طرح کھالے کی
موجودہ پوزیشن سے لاعلم ہی ہوتی۔

امیر نواز اپنی حویلی کے مین گیٹ پر کھڑا ملا۔ رازداری سے پوچھنے لگا۔ ”شہرے! کج بجا، کھالا کہاں ہے؟“

اس کا مرکزی کردار متحرک تھا، اس لیے میں نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے لاعلمی کا اظہار کیا۔ خدا جانے اُس نے دل سے میری بات تسلیم کر لی یا نہیں، بہ ظاہر مطمئن ہو گیا، بولا۔

”اُس بے غیرت کو اپنے کھر والوں کی پریشانی اور بابا کی
 وکیل کی ذرا بھر پروا نہیں ہے۔ بابا خاصا گرم ہے۔“

کا۔ کہہ رہا تھا کہ کاؤں میں رہ رہ کر لو ادب لیا ہے۔ دوین
دنوں کی آوارگی سے اُس کی طبیعت کو قرار آ جائے گا۔
اُس نے برا سامنہ بنایا پھر موضوع بدل دیا بولا۔
”اے بھئی۔۔۔ خالہ کے حکم۔۔۔ میں اب مراد بخش دیوانہ جیست

جائے۔ بخت خان کے ام پر میں اور مراد میں دیوانہ بیست
شاہ کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ کوئی سراہا تھ نہیں
لگتا، سمجھ نہیں آتی کہ وہ کیا کرتا ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ
اس کا راجہ کا۔ مشکوک ہے۔

”اُس کا محاسبہ ضروری ہے۔“ اُس نے پُر ارادہ لہجے میں کہا۔ ”وہوانے کا خیال ہے کہ جت شاہ کے پیچھے جائے

”وہ کہتا ہے کہ اگر جیت شاہ کا دونوں خانوں سے کوئی

کھرا تعلق نہ ہوتا تو وہ گا ہے۔ بے گاہے دونوں حویلیوں کا چکر ضرور لگاتا مگر وہ یوں ظاہر کرتا ہے جیسے وریام خان اور بابا کو سرے سے جانتا ہی نہیں۔ یہی بات دیوانے کے نزدیک

www.pdfbooksfree.pk

نہلے

سلیم انور

عقل مند ہی ہو یا حماقت، کبھی کسی ایک کی جاگیر نہیں رہی... یہ کبھی بھی کسی سے بھی سرزد ہو سکتی ہے اور اگر مجرم عجلت کا شکار ہو جائے تو ساری ہوشیاری دھری کی دھری رہ جاتی ہے... مگر خوف کے سائے میں وہ جتنی بہادری کا مظاہرہ کر بیٹھی تھی اتنی بے خوف و خطر تو وہ کبھی نہیں رہی..... بہر حال جو بھی ہوا اچھا ہوا... اور ثابت ہو گیا کہ دینے والا جب دیتا ہے تو چھپن پھان کر دیتا ہے۔

ایک ایسے منصوبہ ساز کا قصہ جسے واردات کی سنگینی کا احساس نہ تھا

یہ جمعہ کی سہ پہر تھی اور ابھی پانچ بجنے میں چند منٹ باقی تھے جب میکم دی فرسٹ میٹل بینک کے دروازے پر پہنچا۔

سورج کی تمازت سے میکم کا چہرہ ہمتا رہا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازے کا ہینڈل کھایا اور بینک میں داخل ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت بینک تقریباً خالی ہوگا کیونکہ ویک اینڈ کا آغاز ہو چکا تھا اور ہر کوئی ویک اینڈ پر جانے اور چھٹیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے بے تاب تھا۔ ویسے بھی اس بینک میں عملے کی کمی تھی۔

میں پڑی۔ ”اوائے بد بخت! اٹھ دو بج..... ڈیکھ جیڑے لہہ کتھ دو بج ستے ہن!“
(بد بخت ابیدار ہو جا اور دیکھ کہ تیرے نصیب سو گے ہیں)

اس کے ساتھ ہی چاچی کی چٹخیں بتدریج بلند ہونے لگیں۔ دروازہ کھولا تو وہ گرنے کے سے انداز میں اندر داخل ہوئی اور میرے سینے پر دو ہتھوڑ مار کر بین کرنے کے سے انداز میں چلانے لگی۔ میں ہونٹوں کی طرح یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اُس کے منہ سے اٹنے والے ہولناک الفاظ کی سرے سے سمجھ نہیں آرہی تھی مگر یہ بھائی دے رہا تھا کہ میری خوابیدگی کے دوران ایسا کوئی واقعہ رو پڑا ہو گیا تھا، جسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے چاچی کو بانہوں میں بھر لیا، اُس کے کندھوں کے اوپر سے کھلے گھٹن میں دیکھا۔ کوئی نظر نہیں آیا۔ سورج نکلنے کو تھا۔ اس وقت تو کمر میں چہل پہل ہوا کرتی تھی۔

”چاچی! ہوش کر.....“
”اب ہوش کرنے کا کیا فائدہ..... عزت کی چادر تار تار ہو گئی ہے پترا“

اُس نے بھر میرے سینے پر پوری قوت سے دو ہتھوڑ مارا۔ میں لڑکھڑا کر پسپا ہوا، پھر خود کو سنبھال کر چاچی کو سنبھالنے لگا جو دم بہ دم بکھرتی جاتی تھی۔ میں نے اُسے چارپائی پر دھکیلا۔ دلا سا دینے کی ناکام کوشش کی پھر قدرے فیسے سے پوچھا: ”کچھ بتاؤ بھی سہی چاچی! میرا دماغ کھوٹنے لگا ہے۔“

چاچی نے عجیب نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھٹی پھٹی آنکھیں لیے کمر کے بل چارپائی پر گر گئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ چاچی کی بے ہوشی نے سمجھا دیا کہ گھر میں خیر نہیں ہے۔ میں اُسے وہیں چھوڑ کر دوڑتے قدموں سے گھن میں آیا۔ ارد گرد دیکھا۔ یوں لگا جیسے گھر میں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ میں نے پردین کو آوازیں دیں، چاچے چراغ کو پکارا مگر جواب نہ دار..... میں پانی کا کنورا اٹھائے واپس کمرے میں آیا۔ چاچی کے منہ پر چھینٹو مارے۔ وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھی۔ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر چیخ مار کر مجھ سے دیوانوں کی طرح لپٹ گئی۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

”مکھوک ہے۔“
میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔
وہ بولا: ”ہم نے آج رات کو آپریشن ٹائمٹ قرار دیا ہے۔ دو تین بدھ راتیں تمہاری وجہ سے ضائع ہو چکی ہیں۔ مزید انتظار نہیں کیا جاسکتا۔ کیا تم اب پوری طرح فٹ ہو؟“
میں نے کہا: ”ہاں! میں تو فٹ ہوں مگر کھالا.....“
”تب تک وہ آجائے گا ناں! فرض کیا، نہیں آتا، تب بھی ہم اپنا کام کریں گے۔ ٹھیک ہے ناں؟“
”کیا تیاری مکمل ہے؟“

”ہاں تو..... دیوانے نے انہیں گھیرنے کا پورا انتظام کر لیا ہے۔“ امیر نواز نے کہا: ”چاچا بخت خان اور ڈاکٹر شاہ جی بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔“ میں نے ہائی بھر لی۔ ڈاکٹر شاہ جی کی اس آپریشن میں شرکت میرے لیے باعث استغواب تھی کیونکہ اُس نے مجھے دُور رہنے کا مشورہ دیا تھا اور خود آگ کی ان نادیدہ لپٹوں کو ہاتھ میں لینے پر تیار تھا۔

گھر پہنچا تو سبھی کو کھانے میں مشغول پایا۔ حسب معمول پروین نے میرے سامنے کھانا چن دیا۔ اُسے میں نے نسبتاً مشکل اور قدرے ٹڈ حال پایا۔ اُس کا رویہ بھی بدلا بدلا سا تھا۔ مجھے گماں گزرا کہ وہ میرے غیاب کے باعث مجھ سے خفا تھی۔ میں نے اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اُس کے بے تحاشا رونے کا خدشہ تھا۔ رات گئے تک میں بخت خان اور امیر نواز کی طرف سے بلاوے کا انتظار کرتا رہا مگر ماپوس رہا۔ انہوں نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا تھا یا شاید انہیں کسی ذریعے سے خبر ہو گئی تھی کہ آج اُن کی چان بے نیل مرام ثابت ہونے والی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ انہوں نے اپنے پروگرام کے تغیر کے بارے میں مجھے یکسر اندھیرے میں رکھا تھا۔ مقررہ وقت کے ایک کھنٹے بعد تک میں نے جاگ کر انتظار کیا، پھر گہری نیند سو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ نیند میں خواب ملتے ہیں، حقیقتیں روٹنے لگتی ہیں۔ وہ رات بھی ایسی ہی تھی جس کا نشہ دروازے پر ہونے والی تیز اور سماعت شکن دسک پر ٹوٹ گیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ قدرے سراسیمہ نگاہوں سے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ میرے گھر میں اتنی زوردار دسک دینے کا رواج نہیں تھا۔ میں ابھی بستر سے اٹھ ہی رہا تھا کہ پھر دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ ساتھ ہی چاچی کی چیخیں آواز کانوں



میلکم کو علم تھا کہ دیک ایڈ شروع ہونے کی وجہ سے سیکورٹی کے معاملے میں بھی زیادہ احتیاط نہیں برتی جا رہی ہوگی اور دوسری جانب کیشئر کی درازیں بھی رقم سے بھری ہوں گی۔

میلکم ٹھہلا ہوا اس چھوٹے سے کاؤنٹر پر چلا گیا جہاں بینک کی ڈپازٹ سلیپس اور دیگر فارم ڈپلے پر رکھے ہوئے تھے۔ میلکم بہ ظاہر ایک بینک سلب پڑ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ساتھ ہی کن انگیوں سے بینک کے اندر کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔

ایک کیشئر کا کاؤنٹر لین دین کے لیے کھلا ہوا تھا۔ ایک میز کے پیچھے ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی اور دو کسٹمر بینک سے باہر جانے کے لیے دروازے کی جانب جا رہے تھے۔ یہ بہترین موقع ہے، میلکم نے فیصلہ کر ڈالا۔ سب کچھ بہ آسانی ہو جائے گا۔

میلکم کی پوری زندگی ایک گیراج میں بہ طور ملکیت کام کرتے ہوئے گزر گئی تھی۔ اب وہ اس بے لطف زندگی سے اکتا چکا تھا جہاں ہر وقت کپڑے اور ہاتھ پیر گریس میں لت پت رہتے تھے۔ پینتالیس سال عمر ہونے کے باوجود وہ اب بھی خود کو اتنا نوجوان اور توانا محسوس کرتا تھا کہ خود پر مزید کوئی اضافی بوجھ ڈالنے زندگی کی نعمتوں سے بھرپور لطف اٹھا سکے۔ وہ سیاحت، سیر و تفریح، عمدہ لذیذ کھانوں اور اسپورٹس کاروں کا رسیا تھا۔

لیکن اس کی محدود آمدنی ان عیاشیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ یہ تمام حسرتیں اب تک دل میں لیے ہوئے تھا۔ سو اس نے مختلف اسٹورز لوٹنا شروع کر دیے۔ لیکن یہاں سے جو رقم اس کے ہاتھ لگتیں وہ بھی محدود ہوتی تھیں اور اس کی حسرتیں دل کی دل میں ہی رہ جاتیں۔

تب اس نے بڑا ہاتھ مارنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اسی مقصد کی خاطر اس نے دی فرسٹ نیشل بینک کا انتخاب کیا تھا۔ یہ بینک شہر کے ایک پوش علاقے میں تھا۔ میلکم کو یقین تھا کہ اس علاقے میں اسے کوئی نہیں پہچانے گا۔ اسی لیے اس نے اپنا حلیہ بدلنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ عام طور پر اپنے ملکیت کا یونیفارم زیب تن کیے رہتا تھا اور اس کے ہاتھ پیر اور کپڑے گریس میں لت پت رہتے تھے۔

پھر بھی احتیاطاً میلکم نے سر پر سنہریے بالوں کی ایک وگ پہن لی تھی اور جوتوں میں روئی رکھ لی تھی تاکہ ایڑیاں اٹھ جائیں اور اس کی چال بھی قدرے بدل جائے۔

اتنے میں میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی عورت اپنی کمری سے اٹھ کر ہال کی جانب چل پڑی۔ میلکم نے ایک گہری سانس لی اور سمجھ گیا کہ اس کے ایکشن میں آنے کا یہی بہترین موقع ہے۔

وہ سیدھا کیشئر کے کاؤنٹر کی جانب چل دیا۔ اس نے بینک ڈپازٹ سلب جو چند لمحوں پہلے پر کی تھی، اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی اور وہ کاغذ کا پرزہ جیب سے نکال لیا جس پر اس نے پہلے سے پیغام تحریر کیا ہوا تھا۔

جب وہ کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں بیٹھی ہوئی نوجوان عورت نے نشینی انداز میں کہا: ”گڈ آفٹرنون سر۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“ بیزاری اس عورت کے چہرے سے عیاں تھی۔

میلکم نے ایک نگاہ اس عورت کے سینے پر آویزاں نیم ٹیک پر ڈالی۔ اس عورت کا نام رابرٹا تھا۔

میلکم نے خاموشی کے ساتھ اپنا تحریر کردہ پیغام کاؤنٹر پر اس عورت کی جانب کھسکا دیا۔ جلی حروف میں لکھے ہوئے پیغام کو پڑھتے ہی اس عورت کی آنکھوں سے بیزاری یلکھت غائب ہو گئی اور اس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ پیغام میں لکھا تھا۔

”یہ ایک واردات ہے۔ اپنی دراز میں موجود تمام رقم مجھے دے دو۔“

میلکم نے اپنی ڈھیلی ڈھالی چٹون کی جیب میں سے مکڈونلڈز کے کاغذ کا ایک خالی تھیلا نکالا اور کاؤنٹر پر اپنے تحریری پیغام کے برابر میں رکھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔ ”جلدی سے اس پر عمل کرو اور الارم بجانے یا شور مچانے کی حماقت مت کرنا۔“ ساتھ ہی اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کی جانب اشارہ کیا۔

جب اس خاتون کیشئر نے اس کی جیب کی طرف دیکھا تو وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ تمہیں شوٹ کرنے کی نوبت آئے۔“ اس کا لہجہ سرگوشی کے مانند تھا۔

رابرٹا نے ایک لمحے کے لیے تذبذب کیا۔ اس نے گردن گھما کر اپنی ساتھی میری کی میز کی طرف دیکھا لیکن ۱۱ جا چکی تھی۔ رابرٹا کو ٹریننگ کے دوران بھی سکھایا گیا تھا کہ اگر کبھی ڈاکوؤں کا سامنا کرنا پڑ جائے تو وہ چپ چاپ الارم کے حکم کی تعمیل کر دے اور تمام معاملات پولیس پر ہم دے۔ وہ خود ہی اس معاملے کو وینڈل کر لیں گے۔ وہ اچھا طور پر کسی قسم کی بہادری یا حماقت کا اظہار کرنے

پ کرے۔ ”جلدی کرو!“ میلکم نے پھنکارنے کے انداز میں گہمی کی۔ ساتھ ہی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ رابرٹا نے دراز کے کوڈ کو کوچ کیا تو دراز کھل گئی۔

رابرٹا نے دراز میں موجود تمام کرنسی نوٹ تھیلے میں لپیٹا شروع کر دیے۔ اس کی جلد بازی کی وجہ سے چند منٹ دراز سے نکالنے کے دوران فرش پر گر پڑے۔ رابرٹا سا اٹھانے کے لیے نیچے جھکی تو اس کا چہرہ میلکم کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو؟“ میلکم نے زہر آلودہ لہجے میں کہا۔

ساتھ ہی کاؤنٹر پر آگے کی جانب جھک گیا۔ وہ سمجھا رابرٹا شاید خطرے کے الارم کا بٹن دبائے لگی ہے۔

رابرٹا نے چہرہ فوراً ہی اوپر اٹھایا اور پھٹی آنکھوں سے میلکم کو دیکھتے ہوئے کاغذ کے بڑے لفافے کو اوپر سے اٹھاتے ہوئے دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

”مم..... مجھ سے..... چند نوٹ نیچے گر گئے تھے۔“ بکپاتے ہوئے بولی۔ ”میں انہیں تھیلے میں ڈال رہی ہوں۔“

میلکم کے حلق سے ہلکی سی غراہٹ بلند ہوئی۔

”یہ..... یہ لو۔“ اس نے کاغذی تھیلا میلکم کی جانب ہاتھ سے پھینکا۔

میلکم نے اطمینان کا سانس لیا اور ہاتھ بڑھا کر لفافہ اٹھا۔ اس نے رابرٹا کو اس حد تک خوفزدہ کر دیا تھا کہ وہ ان ایکشن لینا تو کجا کوئی بات بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ رابرٹا ہانپ سے مطمئن ہونے کے بعد میلکم نے چاروں طرف ارد ڈالی۔

بینک بہ دستور خالی پڑا تھا اور کوئی کسٹمر دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ ہی کوئی ایسی حرکت ہو رہی تھی کہ کسی کو یہ دیکھا ہو کہ ڈکیتی کی واردات عمل میں آ رہی ہے۔

”تھینک یو، رابرٹا!“ میلکم نے قدرے اونچی آواز کہا اور پھر مسکراتے ہوئے آہستگی سے بولا۔ ”پانچ منٹ پہلے الارم بجانے کی کوشش مت کرنا ورنہ.....“ لہجہ آمیز تھا۔

پھر وہ پلٹا اور تیز تیز قدموں سے بینک کے داخلی دروازے کی جانب چل دیا۔ بینک اب بھی خالی تھا۔ کوئی بھی اس کی جانب توجہ سے رہا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر بینک سے باہر نکل

گیا۔

اس نے اپنی کار بینک سے چند بلاک کے فاصلے پر پارک کی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا اپنی کار تک پہنچا اور کار میں سوار ہو کر اپنے اپارٹمنٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس سے قبل وہ یہ اطمینان کر چکا تھا کہ بینک سے نکلنے کے بعد نہ تو کوئی سائرن بجاتا تھا اور نہ ہی کسی نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ پھر بھی ادھر ادھر فالتو سڑکوں پر گاڑی دوڑانے کے بعد جب اسے تسلی ہوئی کہ پولیس اس کے تعاقب میں نہیں ہے تو تب اس نے اپنی کار اس سڑک پر ڈال دی جو سیدھی اس کے گھر کی جانب جاتی تھی۔

اب وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا کہ کتنی رقم اس کے ہاتھ لگی ہے۔ اسے علم تھا کہ بینک کے کیشئر کی دراز میں بہت زیادہ رقم تو نہیں تھی لیکن یہ ابھی آغاز تھا۔ اگر یہ سلسلہ کامیابی سے جاری رہا تو وہ جلد ہی اچھی خاصی رقم اکٹھی کر لے گا۔ اب اس کام کے لیے اسے شہر کے مختلف علاقوں میں بینکوں کا انتخاب کرنا ہوگا اور پولیس کو دھوکا دینے کے لیے اسے مختلف بہروپ بھی بدلنا ہوں گے۔

لیکن یہ کوئی پرانلم نہیں تھی۔ وہ اپنے بال ڈائی کر لے گا۔ اپنی سوچیں صاف کر لے گا یا پھر رنگین کنٹیکٹ لینسر پہننا شروع کر دے گا۔ بہر حال کسی بھی قیمت پر اس کی یہ آمدنی تیزی سے بڑھتی چلی جائے گی اور پھر جلد ہی وہ اپنے دن کے کام کو خیر باد کہہ دے گا۔ وہ اپنے ملکیت کے کام سے پہلے ہی بری طرح اکتا چکا تھا۔

پھر ایک عمدہ خوش گوار زندگی اس کی منتظر ہوگی اور یہ پر لطف زندگی اس کی دسترس میں ہوگی۔ نئی زندگی کے تصور نے میلکم کے جسم میں سنسنی سی پیدا کر دی۔ وہ گنگناٹا ہوا اپنے اپارٹمنٹ جا پہنچا۔

اس نے اپنی کار پارک کر دی، کاغذ کا تھیلا اٹھایا اور اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔

اس نے دروازے کو اندر سے تالا لگا دیا اور اپنے لیونگ روم کے فرش پر بیٹھ گیا۔ لیونگ روم میں آرائش برائے نام تھی۔ وہ رقم گننے کے ارادے سے کاغذ کے تھیلے کا منہ کھول کر اسے فرش پر اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اچانک کسی نے اپارٹمنٹ کا دروازہ زور زور سے بجانا شروع کر دیا۔

پھر کسی نے بلند آواز سے کہا۔ ”دروازہ کھولو۔“ میلکم خاموش رہا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اس وقت کون آ سکتا ہے۔ ”دروازہ کھولو۔“ وہی آواز پھر ابھری۔

”کون ہے؟“ میلکم نے پوچھا۔
”پولیس!“

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میلکم کا ذہن فوراً حرکت میں آ گیا۔ وہ ڈکیتی کی اس واردات کا اتنی جلدی کسی صورت سراغ نہیں لگا سکتے تھے۔ جبکہ اس نے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے سے پہلے تک اس بات کی اچھی طرح تسلی کر لی تھی کہ کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ کیا واردات کے دوران اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی تھی؟

لیکن اب کیا، کیا جائے؟ میں اس رقم کو کہاں چھپاؤں؟

اتنے میں اس کے دروازے پر ایک زوردار ضرب پڑی اور تالا ٹوٹ گیا۔ ساتھ ہی چار پولیس افسر اپنے ریوالور تانے دھناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان کے ریوالور کی نال میلکم کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

میلکم فرش پر بھونچکا بیٹھا رہ گیا اور اس نے ایک جھٹکے سے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

”میلکم ڈینگ؟“ ایک پولیس افسر نے پوچھا۔
میلکم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تمہیں بینک ڈکیتی کے جرم میں حراست میں لیا جا رہا ہے؟“ یہ کہہ کر ایک پولیس افسر نے میلکم کا بازو اپنی گرفت میں لیا اور اسے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ پھر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔

”لل..... لل..... لیکن.....؟“ میلکم ہکھلانے لگا۔

”یہ کس طرح.....“ جملہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔

”اس کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر کو پہچانتے ہو؟“ ایک پولیس افسر نے کاغذ کا ٹکڑا میلکم کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

میلکم کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔

یہ اس کی اپنی ہینڈ رائٹنگ تھی اور کاغذ کا ٹکڑا وہی تھا جو اس نے بینک کی کیشئر کو تھماتے ہوئے اس سے رقم تحیلے میں ڈالنے کا حکم دیا تھا۔

”تم نے یہ بہت اچھا کیا کہ اس پیغام کے لیے اپنی ذاتی اسے لی ایم رسید استعمال کر لی۔ اس رسید کی پشت پر تم نے اپنا پیغام تحریر کیا تھا۔ تمہاری اس رسید کی بدولت وہ کیشئر جسے تم نے لوٹا تھا، تمہارے اکاؤنٹ نمبر کے ذریعے تمہارا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئی اور اس نے ہمیں تمہارا پتہ فراہم کر دیا۔ ہمیں اس طرح یہاں تم تک پہنچنے میں

کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔“ پولیس افسر نے کہا۔
میلکم نے اپنا سر تھام لیا۔

تب ایک پولیس افسر نے جھک کر فرش پر رکھا کاغذ کا تھیلہ اٹھایا اور اسے کھول کر اندر جھانکنے لگا۔

پھر دوسرے لمحے اس نے غصے سے میلکم کی قمیص کا لٹیر پکڑ لیا اور اسے جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ ”رم کہا ہے؟“

یہ سن کر اس کے ساتھی پولیس افسر نے تھیلے کے اچھا نکا تو اس کی تیوریوں پر ٹل پڑ گئے۔ اس نے تھیلے کو تھیلی پر الٹ دیا۔

تھیلے کے اندر سے آدھا کھایا ہوا سینڈویچ اور کنڈی بار اس کے ہاتھ پر آ گئے۔

”بتاؤ رم کہاں ہے؟“ وہ پولیس افسر بھی میلکم گرجنے لگا۔

میلکم بھونچکا ان سب کا منہ ٹکٹے لگا۔

پولیس کو اپنا بیان قلمبند کرانے کے بعد رابرٹا اپنا پھولا ہوا پرس اٹھا کر اپنے کاندھے پر لٹکایا یا بینک سے نکل گئی۔

بینک سے باہر قدم رکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس حق ڈاکو کا چہرہ بار بار کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔ جب دروازے سے نوٹ

فرش پر گر پڑے تھے اور وہ انہیں اٹھانے کے لیے نیچے بھی تو بکھڑکھڑنے لگا تھا۔ اپنے بیچ کے تھیلے پر نگاہ پڑتے اس کے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا تھا کہ وہ اس کے تھیلے کو بدل دے تو وہ سیر و تفریح منانے کے لیے ایک ویک اینڈ پر ریونیو جیسے تفریحی مقام پر جا سکتی ہے۔

سو اس نے اپنے آدھ کھائے بیچ کے کٹڈ وٹلز کے کاغذی تھیلے کو ڈاکو کے رقم سے بھرے ہوئے کٹڈ وٹلز کے کاغذی تھیلے سے بدل لیا تھا اور اپنے بیچ کا تھیلہ ڈاکو

تھما دیا تھا۔

اور وہ حق ڈاکو تھیلے کو چیک کیے بغیر وہاں چھپت ہو گیا تھا۔

اب تمام کی تمام رقم رابرٹا کے پرس میں موجود تھی وہ ایک پر لطف ویک اینڈ گزارنے کا تصور لیے خوش اپنے گھر کی جانب رواں تھی۔

✱ ✱

جب سے تخلیق کائنات عمل میں آئی ہے اور انسان کو دنیا میں اتارا گیا ہے... تب سے انسانیت اصلاحی مدارج طے کرتے ہوئے معراج انسانیت کی طرف گامزن تو ہے مگر... اصلاح اعمال کے لیے اللہ نے بعثت کا سلسلہ جاری کیا تاکہ خالق و مخلوق کے درمیان پہچان کا رشتہ قائم رہے... ان ہی برگزیدہ بندوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا بھی شمار ہوا۔ جنہیں اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح بادشاہت کے ساتھ ساتھ نبوت بھی عطا ہوئی اور جن وانس، چرند پرند آپ علیہ السلام کے تابع ہوئے... اور ایسا عظیم الشان دربار نصیب ہوا کہ کبھی کسی اور کے حصے میں نہ آیا کہ جہاں ہر مخلوق ہاتھ باندھے کھڑی تھی... سبحان اللہ۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

رضوانہ ساجد

ایک عظیم بادشاہ اور عظیم پیغمبر حضرت سلیمان کی آراء و احیات

حضرت داؤد علیہ السلام اپنے بستر پر تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے کہ آپ کی زوجہ، والدہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے میں داخل ہوئیں۔ ان کے چہرے پر غمراہٹ کے آثار تھے۔ نہیں جاہتی تھیں کہ بیمار شوہر کے آرام میں خلل ڈالیں اور وہ انہیں بتائیں جو وہ سن کر آ رہی تھیں لیکن بات ایسی تھی کہ کہے بغیر رہا نہیں جاسکتا تھا۔

”حضور، کیا آپ نے مجھ سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ سلیمان علیہ السلام آپ کے جانشین ہوں گے۔“

”میں کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ بذریعہ وحی مجھ سے یہی کہا گیا تھا۔“



لام تک پہنچتا ہے۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے واسطے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام میں ذکاوت اور فصل مقدمات میں اصابت رائے کا کمال فطرت ہی سے ودیعت کر دیا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان کے اس جوہر کو پہچان لیا تھا اس لیے بچپن ہی سے انہیں امور مملکت میں شریک کار رکھتے تھے موصاف مقدمات میں ان سے ضرور مشورہ لیا کرتے تھے۔

آپ حسن رشد کو پہنچتے تو نبوت اور بادشاہت دونوں آپ کی طرف منتقل ہو گئیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے آپ کی تخت نشینی پر آپ کو نصیحت فرمائی۔

”اے میرے بیٹے سلیمان (علیہ السلام) اپنے باپ کے خدا کو پہچان اور پورے دل اور روح کی مستعدی سے اس کی عبادت کر کیونکہ خدا سب دلوں کو جانتا ہے اور جو کچھ خیال میں آتا ہے، اسے پہچانتا ہے۔ اگر تو اسے ڈھونڈے تو وہ تجھ کو مل جائے گا اور اگر تو اس کو چھوڑے تو وہ ہمیشہ کے لیے تجھے رد کر دے گا۔ سو ہوشیار ہو کیونکہ خداوند نے تجھ کو مقدس کے لیے ایک گھر بنانے کو چنا ہے۔ سو اہمیت باعہدہ کر کام کر۔“

حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ خیال ہمیشہ رہتا تھا کہ اتنی وسیع سلطنت کے باوجود وہ ابھی تک ایسی عمارت (بیت المقدس) کی تعمیر نہیں کر سکے ہیں جہاں متبرک صندوق (تابوت سکینہ) رکھا جائے جس میں تورات بھی ہے اور موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کے تبرکات بھی محفوظ ہیں۔ یہ صندوق ایک خیمے میں رکھا ہوا ہے اور میں ایک محل میں رہتا ہوں۔ ان کا یہ خیال، خیال ہی رہا کیونکہ وحی الہی سے انہیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں بیت المقدس کی تعمیر کے حق میں نہیں۔

”خدا آپ کو ایک فرزند عطا کرے گا جو صلح سلامتی سے حکومت کرے گا۔ وہی خدا کے پیکر کی تعمیر کرے گا۔“ حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ پیکر کی تعمیر ان کے ہاتھوں نہیں ہوگی لیکن یہ سن کر خوشی بھی ہوئی تھی کہ ان کے بعد ان کا بیٹا تخت پر بیٹھے گا اور صلح سلامتی کے ساتھ حکومت کرے گا اور وہی پیکر کی تعمیر بھی کرے گا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا وقت وفات قریب تھا۔ انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو قریب بلایا اور وصیت فرمائی۔ ”میں اسی راستے جانے والا ہوں جو سارے جہان کا ہے۔ اس لیے تو مضبوط ہو اور مردانگی دکھا اور جو موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں لکھا ہے اس کے مطابق اس کی راہوں پر چل اور اس کے حکموں پر چل تا کہ تجھے کامیابی ہو۔ خدا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر تیری اولاد اپنے طریق کی حفاظت کر کے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان سے میرے حضور راسخی سے چلے تو اسرائیل کے تخت پر حیرے ہوں۔ آدمی کی کمی نہ ہوگی۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام تخت پر بیٹھ چکے تھے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا انتقال ہوا۔ توریت نے اسے اس طرح بیان کیا۔ ”اور داؤد (علیہ السلام) اپنے باپ دادا کے ساتھ سو گیا اور داؤد کے شہر میں دفن ہوا اور کل مدت جس میں داؤد علیہ السلام نے اسرائیل پر سلطنت کی، چالیس برس کی تھی۔ سات برس تو اس نے جبرون میں سلطنت کی اور 33 برس یروشلم میں اور حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے باپ داؤد علیہ السلام کے تخت پر بیٹھا اور اس کی سلطنت نہایت مستحکم ہوئی۔“

حضرت داؤد علیہ السلام ایک عظیم مملکت کے مالک تھے۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے گرد و نواح کی ان تمام سرزمینوں، درخت میدانوں، ہشاداب چراگاہوں پر قبضہ کر لیا تھا جنہیں بنی اسرائیل صدیوں سے حسرت کی نگاہ سے دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ تمام زرخیزی و شادابی بغیر جنگ و جدال کے ہاتھ آئی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ بنی نہیں، اللہ کے نبی بھی تھے لہذا اللہ تعالیٰ نے انہیں بعض خصوصیات اور امتیازات سے نوازا اور اپنی نعمتوں میں سے بعض ایسی نعمتیں عطا فرمائیں جو ان کی زندگی مبارک کا امتیاز بنیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام دونوں کو یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ وہ چرند پرند کی بولیاں سمجھ لیتے تھے۔

”اور بے شک ہم نے داؤد (علیہ السلام)، سلیمان (علیہ السلام) کو ”علم“ دیا اور ان دونوں نے کہا، حمد اللہ کے لیے ہی زیبا ہے جس نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہم کو فضیلت عطا فرمائی اور سلیمان علیہ السلام، داؤد علیہ السلام کا وارث ہوا اور اس نے کہا۔ ”اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولیوں کا علم دیا گیا ہے اور ہم کو ہر چیز بخشنی مائی ہے۔ بے شک! یہ خدا کا کھلا ہوا فضل ہے۔“ (سورہ نمل)

اس کا یہ مطلب نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ (حضرت سلیمان علیہ السلام) اپنے قیاس کے ذریعے ان کی مختلف قسم کی آوازوں سے صرف ان کے مقصد اور مراد کو سمجھ لیتے تھے اور اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ نہیں ہرگز نہیں بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام

”اگر ایسا ہے تو ادوینا (حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک اور صاحبزادے) کیوں بادشاہ بن بیٹھا ہے؟“ ابھی حضرت داؤد علیہ السلام حیران بھی نہیں ہو پائے تھے کہ آپ کے چند پیشہ بھی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ ان میں ایک نے آگے بڑھ کر کچھ کہنے کی ہمت کی۔

”اے میرے مالک بادشاہ کیا تو نے فرمایا ہے کہ میرے بعد ادوینا بادشاہ ہوا اور وہی میرے تخت پر بیٹھے کیونکہ اس نے تل اور موٹے موٹے جانور اور بھیڑیں کثرت سے ذبح کی ہیں اور سلیمان (علیہ السلام) کے سوا بادشاہ کے سب بیٹوں اور لشکر سرداروں کی دعوت کی ہے اور کہتے ہیں ادوینا بادشاہ جیسا رہے۔ کیا یہ بات میرے مالک بادشاہ کی طرف سے ہے؟“

حضرت داؤد علیہ السلام اب بڑھاپے کی منزل میں تھے۔ کمزور تھے اور بیمار بھی۔ آپ کے بیٹے ادوینا نے اسی کا فائدہ اٹھا کر بادشاہت پر قبضہ کرنا چاہا تھا جبکہ خدا اس تخت پر اسے دیکھنا چاہتا تھا جو بادشاہ بھی ہو اور نبوت کے اعزاز سے معزز بھی۔ اس کے خدا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتخاب کیا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک مرتبہ پھر اپنے اور خدا کے وعدے کو دہرایا اپنی زوجہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”مجھے یہی بتایا گیا ہے۔ خدا کا کہا بھی غلط نہیں ہوتا۔ تیرا بیٹا سلیمان (علیہ السلام) ہی میرے بادشاہ ہوگا اور وہی میری جگہ میرے تخت پر بیٹھے گا۔ میں آج کے دن ویسا ہی کروں گا۔“

والدہ، سلیمان علیہ السلام کو خوش خبری مل گئی تھی۔ وہ وہاں سے ہٹ گئیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے مشیروں کو حکم دیا ”میرے بیٹے سلیمان علیہ السلام کو میرے فخر پر سوار کرادو اور اسے نیجون (ایک چشمہ) کو لے جاؤ۔ وہاں کا بن اس کا کریں کہ وہ اسرائیل کا بادشاہ ہو اور تم نرسنگا پھونکنا اور کہنا کہ سلیمان علیہ السلام بادشاہ جیسا رہے۔ پھر تم اس کے پیچھے پیچھے چلے آنا وہ آکر میرے تخت پر بیٹھے کیونکہ وہی میری جگہ بادشاہ ہوگا اور میں نے اسے مقرر کیا ہے۔“

حضرت داؤد علیہ السلام کے وفادار سرداروں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو فخر پر سوار کرایا جیچوں پر لے آئے۔ رسم مطابق کاہنوں نے تل کا سینک لیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو مسح کیا۔ نرسنگا پھونکا اور سب لوگوں نے کہا کہ سلیمان علیہ السلام بادشاہ جیسا رہے۔ پھر ہدایت کے مطابق سب لوگ ان کے پیچھے پیچھے آئے۔ ناچتے گاتے، جشن مناتے، بانسریاں بجاتے شہر داخل ہوئے تو زمین ان کے شور و غل سے گونج اٹھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نہایت ادب و احترام سے اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام کے تخت پر بٹھا دیے گئے اور فضا بار پھر مبارک سلامت کے خوش آئند الفاظ سے گونج اٹھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے بے آواز بلند فرمایا۔

”خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو، جس نے مجھے ایک وارث بخشا جو میری آنکھوں کے سامنے آج میرے تخت پر بیٹھے۔“ قرآن مجید نے اسی جانشینی کو وراثت داؤد سے تعبیر کیا ہے۔

”اور سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کا وارث ہوا۔“ (سورہ نمل)

ابن کثیر کہتے ہیں یہاں وراثت سے مراد مالی وراثت نہیں ہے ورنہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اور بھی بہت سی اولاد تھی، کیوں محروم رہتی۔“

نبی کی فطرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ مال جیسی حقیر شے پر ان کی وراثت کا انتساب ہو۔ اس لیے کہ جن ہستیوں کا مقصد جیا جلیق و ارشاد اور راہ خدا کی دعوت ہو وہ کب گوارا کر سکتی ہیں کہ علوم و نبوت کے علاوہ ایک ادنیٰ شے ان کی وراثت قرار پائے۔

جس ہستی کو اللہ تعالیٰ شرف نبوت سے سرفراز کرتا ہے اس کو یہ منصب جلیل سن رشد کے بعد عطا فرماتا ہے تاکہ وہ دنیوی اسما کے لحاظ سے بھی عمر طبعی کا وہ حصہ ملے کر لے جس میں عقل و ہمتگی میں استواری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ طریقہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حق میں بھی کارفرما رہا چنانچہ سن رشد کے بعد ان کو حکومت و خلافت کے ساتھ ساتھ منصب نبوت بھی عطا ہوا۔ قرآن مجید اس کی گواہی کے لیے موجود ہے۔

”بے شک! ہم نے (اے محمد) تیری طرف وحی بھیجی جس طرح ہم نے نوح علیہ السلام کی جانب وحی بھیجی اور اس کے بعد دوسرے پیغمبروں کی طرف وحی بھیجی اور ابراہیم کی جانب، اسماعیل، یعقوب اور اس کی اولاد کی جانب اور عیسیٰ کی اور ایوب کی اور یونس علیہ السلام کی اور ہارون کی اور سلیمان علیہ السلام کی جانب وحی بھیجی۔“ (سورہ نسا)

”بے شک! ہم نے داؤد اور سلیمان علیہ السلام کو علم (نبوت کا علم) دیا۔“ (ص)

حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام کے فرزند ہیں لہذا ان کا نسب بھی یہود کے واسطے سے حضرت یعقوب

ام کی ہیبت تھی۔ آپ کی سلطنت شمال میں گیلیلی جنوب میں مصر کی حد تک شمال مشرق میں دریائے فرات تک، جنوب مشرق میں لمن تک اور مغرب میں بحیرہ روم تک پھیلی ہوئی تھی۔



وہ دونوں طوائفیں تھیں۔ ان دونوں کو ایک ہی مقدمہ درپیش تھا۔ ایک ہی وقت میں وہ دونوں حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئیں۔ ان میں سے ایک کہنے لگی۔

”اے میرے مالک! میں اور یہ عورت دونوں ایک ہی گھر میں رہتی ہیں۔ اس کے ساتھ گھر میں رہتے ہوئے میرے ایک بچہ ہوا۔ تیسرے دن ایسا ہوا کہ یہ عورت بھی زچہ ہو گئی اور ہم ایک ساتھ ہی تھے۔ اس عورت کا بچہ رات کو مر گیا۔ یہ بد بخت رات کو اٹھی اور میرے بیٹے کو میری بغل سے لے کر اپنی گود میں لٹالیا اور اپنے سرے ہوئے بچے کو میرے برابر لٹا دیا۔“

”تجھے کیوں نہ معلوم ہوا؟“

”اس لیے کہ میں سورہی تھی۔“

”پھر کیا ہوا آگے؟“

”صبح کو جب میں اٹھی کہ اپنے بچے کو دودھ پلاؤں تو کیا دیکھتی ہوں کہ وہ مرا پڑا ہے۔ میں نے غور کیا تو وہ میرا لڑکا نہیں تھا۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام نے دوسری عورت سے فرمایا۔ ”اب تو بتا، تیرا کیا کہنا ہے؟“

”میں تو صرف یہی کہہ سکتی ہوں کہ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ جو زندہ ہے یہی میرا بیٹا ہے اور مرا ہوا اس کا بیٹا ہے۔ یہ میرا بیٹا جھیننے کے لیے مجھ پر الزام لگا رہی ہے۔ اپنا بیٹا مار دیا اور میرا بیٹا تھمایا نے کی کوشش کر رہی ہے۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام نے پہلی عورت سے پوچھا۔ ”تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ جو مر گیا وہ تیرا نہیں اس کا بیٹا ہے جبکہ تین دن کے بچے کی کوئی ایسی شناخت بھی نہیں ہوتی۔ کہیں تو اس پر الزام تو نہیں لگا رہی ہے؟“

وہ عورت رونے لگی۔ ”مالک! میں طوائف ضرور ہوں لیکن ایک ماں بھی تو ہوں۔ میں دل کی آنکھوں سے دیکھتی ہوں، مردہ بچہ ہرگز میرا نہیں۔“

”تیری اس بات کو کون مانے گا؟“

”کیا میرے آنسو مجھے سچ ثابت نہیں کرتے؟“

”ہو سکتا ہے تو اپنے بچے کے غم میں رو رہی ہو اور زندہ بچہ حاصل کرنا چاہتی ہو۔“

”مالک! جب آپ بھی یہ کہیں گے تو مجھے انصاف کہاں ملے گا۔“

وہ دونوں عورتیں آپس میں جھگڑ رہی تھیں۔ دونوں کا اصرار تھا کہ جو بچہ زندہ ہے وہ اس کا۔ جب کوئی کسی کی بات ماننے کو تیار نہیں ہوئی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک تگوار منگوائی۔

اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”اس جیتے بچے کو چیر کر دو ٹکڑے کر دو اور آدھا ایک کو، آدھا دوسری کو دے دو۔“ یہ حکم سنتے ہی پہلی عورت چیختی چلاتی تگوار کے سامنے آ گئی۔

”مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ اے بادشاہ! یہ بچہ اسی کو دیدے مگر اسے مارت۔ مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں ہوگا کہ یہ مارا جائے۔“

دوسری عورت خاموش کھڑی تھی جیسے اس حکم کا اسے دکھ ہی نہ ہوا ہو۔

پہلی عورت کی ماتا بھی جو اسے پیچھے چلانے پر مجبور کر رہی تھی جبکہ دوسری عورت کو معلوم تھا کہ یہ بچہ میرا نہیں اس لیے وہ پرسکون تھی۔

یہی وہ نکتہ تھا جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھانپ لیا اور حکم دیا کہ بچہ پہلی عورت کو دیا جائے کیونکہ یہی اس کی

ماں ہے۔ اب دوسری عورت کو قبول کرنا پڑا کہ وہ جھوٹی تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایسے ہی دانش مندانہ فیصلوں نے لوگوں پر ان کا رعب طاری کر دیا۔ لوگ ڈرنے لگے کہ اگر انہوں نے کسی کے ساتھ ظلم کیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکمت و دانائی انہیں اپنی گرفت میں لے لے گی۔ بنی اسرائیل جو ہمیشہ سرکشی پر آمادہ رہتے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام کے خوف سے لڑائی جھگڑوں سے تائب ہو گئے۔ ایسا انصاف ملا تو خوشحالی لازمی تھی، تو ریت کا بیان ہے۔

”یہود اور اسرائیل کے لوگ کثرت میں سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند تھے اور کھاتے پیتے اور خوش رہتے تھے اور

..... پرندوں کی باتوں کو اسی طرح سمجھتے اور سمجھاتے تھے جیسے ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے۔ یہ خلاف عقل سہی لیکن ایک معجزہ تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کو عطا ہوا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر جرار سفر میں تھا کہ یہ لشکر ایک ایسی وادی میں پہنچا جہاں چوٹیاں بے شمار تھیں اور پوری وادی ان کا سکھن بنی ہوئی تھی۔ چوٹیوں کے بادشاہ نے لشکر کے اس کثیر انبوہ کو دیکھ کر اپنی امت سے کہا کہ تم فوراً اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ سلیمان علیہ السلام اور اس کے لشکر کو کیا معلوم کہ تم اس کثرت کے ساتھ وادی کی زمین میں رینگ رہی ہو۔ نہ معلوم ان کے گھوڑوں اور پیادوں کے نیچے تم میں سے کتنی تعداد بے خبری میں روندی جائے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے چوٹیوں کے بادشاہ کی یہ باتیں سنیں تو ان کو ہنسی آ گئی اور اس کے عاقلانہ حکم کی داد دینے لگے۔ یہ واقعہ قرآن میں بھی بیان ہوا ہے۔

”اور جمع ہوا لشکر سلیمان (علیہ السلام) کے لیے جن، انسان اور پرندوں سے اور وہ درجہ بدرجہ فریسنے کے ساتھ آگے پیچھے چل رہے تھے حتیٰ کہ وہ وادی نملہ پہنچے تو ایک چوٹی نے کہا، اے چوٹیو! اپنے گھروں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں سلیمان علیہ السلام اور اس کا لشکر تم کو پس ڈالے۔“

چوٹی کی یہ بات سن کر سلیمان (علیہ السلام) ہنس پڑا اور کہنے لگا، اے پروردگار! مجھ کو یہ توفیق دے کہ میں تیرا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر انعام کیا ہے اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جو تجھ کو پسند آئے اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔“

مفسرین ”وادی نملہ“ شام میں بتلاتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک امتیاز یہ بھی عطا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ”ہوا“ کو ان کے حق میں مسخر کر دیا اور وہ ان کے زیر فرمان کر دی گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جب چاہتے تو صبح کو ایک مہینے کی مسافت اور شام کو ایک مہینے کی مسافت کی مقدار سفر کر لیتے تھے۔ یہ تسخیر صرف اس نوعیت کی نہیں تھی کہ ان کے تخت کو اڑا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانی بلکہ آپ کا حکم اس درجہ چلتا تھا کہ تیز و تند ہوا آپ کے حکم سے نرم اور خوشگوار ہو جاتی تھی لیکن اس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ آپ ایک دن میں اتنا سفر طے کر لیتے تھے جتنا ایک شخص گھوڑے پر سوار ہو کر ایک ماہ میں فاصلہ طے کرتا ہے۔ تخت سلیمان علیہ السلام آج کل کے تیز رفتار جہاز سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ہوا کے کاندھے پر اڑا چلا جاتا تھا۔

عقل پرست انسانوں کی نگاہ میں یہ بات بعید از عقل ہے لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ عام قانون قدرت تو یہ ہے کہ انسان ہوا میں نہیں اڑ سکتا۔ ظاہری اسباب کے بغیر تخت سلیمان علیہ السلام کس طرح اڑ سکتا تھا؟ لیکن قدرت کے کچھ خاص قوانین بھی ہیں جو ان نفوس قدسیہ کے لیے مخصوص ہیں جنہیں انبیاء علیہم السلام کہا جاتا ہے۔ خاص طور پر جب قرآن اس کی گواہی دیتا ہے تو یقین کے ساتھ کوئی راستہ نہیں رہ جاتا۔

”اور مسخر کرو یا سلیمان (علیہ السلام) کے لیے تیز و تند ہوا کو کہ اس کے حکم سے زمین پر چلتی تھی جس کو ہم نے برکت دی تھی اور ہم ہر شے کے جاننے والے ہیں۔ (انبیاء)

”اور سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کرو یا ہوا کو کہ ایک مہینے کی مسافت (طے کراتی) اور شام کو ایک مہینے کی مسافت (سب) اور مسخر کرو یا ہم نے اس (سلیمان) کے لیے ہوا کو کہ چلتی ہے وہ اس کے حکم سے، نرمی کے ساتھ جہاں وہ پہنچنا چاہے (ص) آپ کا ایک بڑا امتیاز جو کائنات میں کسی کو نہیں ملا یہ تھا کہ ان کے زیر نگیں صرف انسان ہی نہیں تھے بلکہ جنات بھی تابع فرمان تھے اور آپ ان سے اسی طرح کام لیتے تھے جیسے کوئی مزدوروں اور غلاموں سے لیتا ہے۔

قرآن پاک میں آپ کی شان و صفات کے بارے میں مذکور ہے۔

”اور دیووں (شیطانوں کی جماعت کو بھی ان کے تابع کر دیا تھا کہ ان) میں سے بعض ان کے فرمان سے غوطے مارتے تھے اور اس کے سوا اور کام بھی کرتے تھے اور ہم ان کے نگہبان تھے۔“ (الانبیاء)

”اور طاقت ورجات کو بھی (ان کے زیر فرمان کیا) یہ سب معمار عمارتیں بنانے والے اور غوطہ خور تھے“ (ص)

”وہ جو کچھ چاہتے یہ ان کے لیے بناتے مثلاً قلعے اور جسے اور (بڑے بڑے) لگن جیسے تالاب اور اپنی جگہ سے نہ ہننے والی بھاری دیگیں۔ اے داؤد کی اولاد (میرا) شکر کرو اور میرے بندوں میں سے شکر گزار تھوڑے ہیں۔“ (سبا)

آپ کے عہد حکومت میں اسرائیل کا عروج نقطہ کمال پر پہنچ چکا تھا۔ دور و نزدیک کے سب بادشاہوں کے دلوں پر آپ کے

مگر اپنے ہاتھ آسمان کی جانب پھیلا دیے۔

”اے خداوند اسرائیل کے خدا تیرے مانند نہ تو اوپر آسمان میں نہ نیچے زمین پر کوئی خدا ہے۔ تو نے اپنے بندے داؤد اسلام کے حق میں وہ بات قائم رکھی جس کا تو نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ تو نے اپنے منہ سے فرمایا اور اپنے ہاتھ سے اسے پورا کیا۔ آسمانوں کے آسمان میں بھی تو نہیں ماسکتا تو یہ گھر کچھ بھی نہیں جسے میں نے بنایا۔ اے خدا اس دعا اور فریاد کو سن لے جو تیرا مدد آج کے دن تیرے حضور کرتا ہے۔“

اور تو اپنے بندے اور اپنی قوم اسرائیل کی مناجات کو جب وہ اس جگہ کی طرف رخ کر کے کریں من لینا۔ اور من کر معاف کروینا۔ اگر کوئی کوئی تیرے مذبح کے آگے قسم کھائے تو تو آسمان پر سے سن کر عمل کرنا اور اپنے بندوں کا انصاف کرنا۔ جب تیری قوم اسرائیل اپنے دشمنوں سے شکست کھائے اور پھر تیری طرف رجوع کرے تو تو آسمان پر سے سن کر اپنی قوم اسرائیل کا گناہ معاف کر دینا اور ان کو اس ملک میں جو تو نے ان کے باپ دادا کو دیا پھر لے آنا۔

اگر ملک میں کال ہو۔ اگر وبا ہو۔ اگر باؤ سموم ہو غرض کسی ہی بلا ہو۔ اگر یہ قوم تجھ سے معافی کی طلب گار ہو تو اسے معاف کروینا۔ اگر تیرے لوگ خواہ کسی راستے سے تو ان کو بھیجے اپنے دشمن سے لڑنے کو نکلیں اور وہ اس گھر کی طرف جسے میں نے تیرے نام کے لیے بنایا ہے رخ کر کے دعا کریں تو تو آسمان پر سے ان کی دعا اور مناجات سن کر ان کی حمایت کرنا۔ اگر تو ان سے ناراض ہو کر انہیں دشمن کے حوالے کر دے اور پھر وہ تیری طرف رجوع کریں تو تو آسمان پر سے جو تیری کونٹ گاہ ہے ان کی دعا اور مناجات سن کر ان کی حمایت کرنا۔“

یہ اور اس جیسی دعائیں کر چکے تو آپ مذبح کے سامنے سے جہاں وہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلائے ہو گئے تھے اٹھے اور کھڑے ہو کر اسرائیل کی ساری جماعت کو بلند آواز سے برکت دی۔

”خداوند جس نے اپنے سب وعدوں کے موافق اپنی قوم اسرائیل کو آرام بخشا مبارک ہو۔ خداوند ہمارا خدا ہمارے ساتھ رہے۔ جیسے وہ ہمارے باپ دادا کے ساتھ رہا اور ہمیں ترک کرے نہ چھوڑے۔“

بزرگوں کی ایک جماعت صیون روانہ ہوئی جہاں تابوت سکینہ رکھا ہوا تھا۔

کاہنوں نے صندوق اٹھایا اور خیمہ اجتماع کو اور ان سب مقدس ظروف کو جو خیمے کے اندر تھے، لے آئے۔ جیسے ہی صندوق پہنچا ساری جماعت نے صندوق کے سامنے کھڑے ہو کر اتنی بھیڑ بکریاں اور بیل ذبح کیے کہ ان کی کثرت کے سبب ان کا شمار یا حساب نہ ہو سکا۔

جب کاہن یہ صندوق رکھ کر الہام گاہ سے باہر نکلے تو ہر طرف ابر چھا گیا۔ اس میں ایسا جلال تھا کہ کاہن اپنے قدموں پر کھڑے نہ رہ سکے۔

اسی وقت دجی الہی نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اپنے حصار میں لے لیا۔

”میں نے تیری دعا اور مناجات جو تو نے میرے حضور کی ہے سن لی اور اس گھر میں جسے تو نے بنایا ہے اپنا نام ہمیشہ تک رکھنے کے لیے میں نے اسے مقدس کیا اور میری آنکھیں اور میرا دل سدا وہاں لگے رہیں گے۔ اب رہا تو، سو اگر تو جیسے تیرا باپ داؤد چلا اے ہی میرے حضور خلوص دل اور راستی سے چل کر اس سب کے مطابق جو میں نے تجھے فرمایا عمل کرے اور میرے آمین اور احکام کو مانے تو میں تیری سلطنت کا تخت اسرائیل کے اوپر ہمیشہ رکھوں گا جیسا میں نے تیرے باپ داؤد علیہ السلام سے وعدہ کیا اور کہا کہ تیری نسل میں اسرائیل کے تخت پر بیٹھنے کے لیے آدمی کی کمی نہ ہوگی لیکن تم یا تمہاری اولاد اگر تم میری پیروی سے برگشتہ ہو جاؤ اور میرے احکام اور آمین کو جو میں نے تمہارے آگے رکھے نہ مانو بلکہ جا کر اور معبودوں کی عبادت کرنے اور ان کو سجدہ کرنے لگو تو میں اسرائیل کو اس ملک سے جو میں نے ان کو دیا ہے کاٹ ڈالوں گا اور اس گھر کو جسے میں نے اپنے نام کے لیے مقدس کیا ہے اپنی طرف سے دور کر دوں گا۔“

ان وعدوں کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام..... راہ راست پر چلتے ہوئے شہر کی تعمیر اور خصوصاً اپنے لیے شاندار محل کی طرف متوجہ ہوئے۔

اس محل کی تعمیر میں تیرہ برس خرچ ہوئے۔

یہ محل انہوں نے لبنان کے جنگلوں کی لکڑی سے بنایا۔ اس کی لمبائی سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی اور وہ اروں کے چار ستونوں کی چار قطاروں پر بنا تھا اور ستونوں پر دیوار کے شہتیر تھے۔ ہر قطار میں پندرہ شہتیر تھے۔ کھڑکیوں کی تین

سلیمان علیہ السلام دریائے فرات سے فلسطینیوں کے ملک تک اور مصر کی سرحد تک سب مملکتوں پر حکمران تھے۔ وہ ان کے لیے ہدیہ لاتی تھیں۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام کے رتھوں کے لیے چالیس ہزار تھان اور بارہ ہزار سوار تھے۔ ان کے منصب داروں میں سے ہر ایک اپنے مہینے میں سلیمان علیہ السلام کے لیے اور ان سب کے لیے جو سلیمان علیہ السلام کے دسترخوان پر آتے تھے، رسد پہنچاتا تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس خوش حالی اور تاملوری کے باوجود ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ وہ اب تک خدا کا گھر بیکل (مسجد اقصیٰ) تعمیر نہیں کر سکے ہیں جبکہ حضرت داؤد علیہ السلام سے خدا کا یہ عہد تھا کہ تیرا بیٹا جس کو میں تیری جگہ تخت پر بٹھاؤں گا وہی میرے نام کے لیے گھر بنائے گا، اب حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکومت کرتے چار برس ہو گئے تھے۔ یہ خیال روز بہ روز شدت اختیار کرنے لگا تھا۔ ایک روز انہوں نے اپنے تمام منصب داروں اور عہدے داروں کا اجلاس طلب کیا اور ان کے سامنے اپنا منصوبہ رکھ دیا۔

”آپ لوگ جانتے ہیں کہ میرے والد حضرت داؤد علیہ السلام اپنے خدا کے نام کے لیے گھر نہ بنا سکے کیونکہ ان کے گرد ہر طرف لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اب خداوند میرے خدا نے مجھ کو ہر طرف امن دیا ہے۔ نہ تو کوئی مخالف ہے نہ آفت کی مار۔ اب کوئی نہیں ہے جو مجھے اس کی تعمیر سے روکے۔ اب میں دیودار اور صنوبر کی لکڑی جمع کروں گا اور بڑے بڑے پتھروں سے عمارت تعمیر کروں گا اور اس کے گرد عظیم الشان شہر آباد کیا جائے گا۔“

تمام منصب داروں نے خوشی خوشی اس خدمت کو قبول کیا اور اپنے تعاون کا یقین دلایا لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام جانتے تھے کہ جس عظیم تعمیر کا وہ خواب دیکھ رہے ہیں وہ انسانوں کے بس کا نہیں۔ وہ انسانوں کے ہی نہیں جنات کے بھی بادشاہ تھے لہذا انہوں نے ارادہ کر لیا کہ یہ کام وہ جنات سے لیں گے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی خواہش تھی کہ مسجد اور شہر کو بیش قیمت پتھروں سے بنوائیں اور اس کے لیے دور دراز سے حسن اور بڑے بڑے پتھر منگوائیں۔ اس زمانے کے محدود وسائل و وسائل آپ کی خواہش کی تکمیل کے لیے ناکافی تھے۔ یہ کام صرف ”جن“ انجام دے سکتے تھے۔ آپ نے انہیں طلب کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ مسجد کی تعمیر کے لیے کام کریں۔ وہ دور دور سے خوبصورت اور بڑے بڑے پتھر جمع کر کے لاتے رہے۔ کاریگروں نے ان پر نقش و نگار کندہ کیے۔ لبنان سے دیودار اور صنوبر کی لکڑی منگوائی گئی اور مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

خداوند تعالیٰ کو لکڑی اور پتھروں کی عمارت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا چنانچہ کلام الہی حضرت سلیمان علیہ السلام پر نازل ہوا۔

”یہ گھر جو تو بناتا ہے سو اگر تو میرے آمین پر چلے اور میرے حکموں کو پورا کرے اور میرے فرمانوں کو مان کر ان پر عمل کرے تو میں اپنا وہ قول جو میں نے تیرے باپ داؤد علیہ السلام سے کیا تیرے ساتھ قائم رکھوں گا اور میں بنی اسرائیل کے درمیان رہوں گا اور اپنی قوم اسرائیل کو ترک نہیں کروں گا۔“

یہ گھر جب تعمیر ہوا تو اس کی لمبائی ساٹھ ہاتھ اور چوڑائی تیس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی اور بیکل کے سامنے ایک برآمدہ اس گھر کی چوڑائی کے مطابق تیس ہاتھ لمبا تھا اور اس گھر کے سامنے اس کی چوڑائی دس ہاتھ تھی۔ جھروکے بنائے گئے تھے جن میں جالیاں جڑی ہوئی تھیں۔ گرد گرد منزلیں اور حجرے بنوائے۔ فرش صنوبر کے تختوں سے بنایا گیا تھا۔ فرش سے دیواروں تک دیوار کے تختے لگائے گئے تھے۔

اس گھر کے اندر بیچ میں الہام گاہ تیار کی تاکہ خداوند کے عہد کا صندوق وہاں رکھا جائے۔

جب سات سال کی مدت میں یہ عمارت بن کر تیار ہو گئی تو آپ نے اسرائیل کے بزرگوں اور قبیلوں کے سب سرداروں کو اپنے پاس برو شلم طلب کیا۔ تمام لوگوں کو مخاطب کر کے آپ نے کلام کیا۔

”میرے باپ داؤد علیہ السلام کے دل میں تھا کہ خداوند اسرائیل کے خدا کے نام کے لیے ایک گھر بنائے لیکن خدا نے اسے روک دیا کیونکہ یہ اعزاز میرے حصے میں آنا تھا۔ خداوند کے وعدے کے مطابق میں اسرائیل کے تخت پر بیٹھا ہوں اور میں نے خداوند اسرائیل کے خدا کے نام کے لیے اس گھر کو بنایا ہے اور میں نے یہاں ایک جگہ اس صندوق کے لیے مقرر کر دی ہے جس میں خداوند کا وہ عہد ہے جو اس نے ہمارے باپ دادا سے جب وہ ان کو ملک مصر سے نکال لایا ہوا تھا تھا۔“

اس خطاب کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسرائیل کی ساری جماعت کے روبرو خداوند کے مذبح کے آگے کھڑے

آپ اس کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ اس شخص نے یہی سمجھا ہوگا کہ کوئی مزدور آگیا۔
 ”یہ سامان اٹھاؤ گے؟“ اس شخص نے کہا۔
 ”کیوں نہیں اٹھاؤں گا۔ مزدوری ملے گی تو میں اپنے کھانے کے لیے بھی کچھ خریدوں گا۔ یہ بتاؤ جانا کہاں ہے۔“
 ”شاہی محل تک۔ میں وہاں شاہی باورچی ہوں۔ یہ سارا سامان وہیں کے لیے لے جا رہا ہوں۔“
 ”تمہارے بادشاہ کا نام کیا ہے؟“
 ”آلمون“

یہ نام سنتے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام پر ظاہر ہو گیا کہ وہ دشمن ملک میں آگئے ہیں۔ یہاں بنی عمون کی حکومت تھی۔ یہ لوگ بنی اسرائیل کے موروثی دشمن تھے۔ آپ نے شکر بھیجا کہ ابھی تک اپنے بارے میں انہوں نے اس شخص کو کچھ نہیں بتایا۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ کچھ بتائیں گے بھی نہیں۔
 شاہی محل میں پہنچ کر شاہی باورچی نے آپ کے ہاتھ پر اجرت رکھ دی۔
 ”یہ تو میری ایک روز کی اجرت ہوگئی۔“ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اگر آپ کے ذریعے میری آمدنی کا کوئی مستقل بندوبست ہو جائے تو آپ کی مہربانی ہوگی۔ آپ شاہی باورچی ہیں۔ آپ کو اتنا اختیار تو ہوگا۔“
 ”اختیار تو ہے۔“ باورچی نے کہا۔ ”لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کر کیا سکتے ہیں۔“
 ”آپ مجھے اپنے مددگار کے طور پر رکھ لیں۔“
 کچھ دنوں میں جب بھوک کی کمزوری دور ہوئی۔ سچے کپڑے بھی جسم پر آگئے تو آپ کی وجاہت ظاہر ہونے لگی۔ محل میں جو بھی آپ کو دیکھتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ یہ خبریں بادشاہ تک بھی پہنچیں کہ ایک شخص نیا ملازم ہوا ہے لیکن کسی طرح بھی ملازم معلوم نہیں ہوتا۔ بادشاہ کو شک ہوا کہ یہ کوئی اسرائیلی تو نہیں جو جاسوس بن کر یہاں آگیا ہو۔ اس نے آپ کو اپنے پاس طلب کر لیا۔ اب شاہی باورچی کو اپنی جان کی فکر ہوئی کہ اگر یہ شخص واقعی اسرائیلی نکلا تو میری خیر نہیں۔ اس نے آپ سے ایک مرتبہ پھر پوچھنے کی کوشش کی۔
 ”اے شخص! سچ بتا تو اسرائیلی تو نہیں۔ اگر ہے تو ابھی بھاگ جا۔ میں کہہ دوں گا کہ تو میرے پاس سے بھاگ گیا اور تیری جان بچ جائے گی۔“

”میں جو بھی ہوں تو اس کو چھوڑ دے۔ مجھے بادشاہ کے پاس لے چل۔ میں اسے مطمئن کر دوں گا۔ میں خود بھی سلامت رہوں گا۔ تیری جان بھی بچ جائے گی۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ تیری جان بچا لوں گا۔“
 شاہی باورچی ڈرتے ڈرتے انہیں بادشاہ کے پاس لے گیا۔ خود ایک کونے میں کھڑا رہا اور بادشاہ نے آپ سے سوال جواب شروع کر دیے۔
 حضرت سلیمان علیہ السلام حکمت و دانائی کا مجموعہ تھے۔ گفتگو کے پھول برسائے تو بادشاہ سحر زدہ سا ہو کر رہ گیا۔ یہ پوچھنا ہی بھول گیا کہ وہ اسرائیلی تو نہیں؟
 صرف اتنا کہہ سکا۔ ”تم جیسے قابل آدمی کے لیے یہ زیبا نہیں کہ باورچی کے مددگار کے طور پر کام کرو۔ آج سے تم شاہی باورچی خانے کے داروغہ کے طور پر کام کرو گے۔“
 شاہی باورچی خوش ہو گیا کہ میری جان بھی محفوظ رہی اور نوکری بھی۔
 محل میں باتیں تو بن ہی رہی تھیں۔ یہ سن کر لوگوں کو اور بھی تعجب ہوا کہ بادشاہ نے اس اجنبی کو داروغہ مطبخ بنا دیا ہے ارکان شاہی کو جستجو ہوئی کہ اس شخص کو دیکھا تو جائے۔
 کئی شہزادے ان سے ملنے آئے تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ کی وجاہت اور گفتگو دونوں نے پورے محل کو اپنے حصار میں لے لیا۔
 بادشاہ کی ایک بیٹی شہزادی لغامہ بھی تھی۔ یہ باتیں سن کر اس کا دل بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب کھینچنے لگا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کس طرح ان سے ملاقات کرے۔ پھر ایک دن یہ ترکیب اسے سوچ گئی۔ وہ دل ہی دل میں مسکرائی اور محل کے اس حصے میں پہنچ گئی جہاں اس کے خیال میں داروغہ مطبخ یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہونا چاہیے تھا۔
 حضرت سلیمان علیہ السلام نے شہزادی کی آمد کا سنا اور پھر اسے اپنے سامنے دیکھا تو اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
 ”میرا نام شہزادی لغامہ ہے۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام

”آپ کی آمد کا شکر یہ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے یہ زحمت کیوں کی؟“
 ”میں ایک کھانے کی فرمائش کرنے آئی ہوں۔ آپ باورچی سے کہہ کر وہ کھانا تیار کر امیں۔“
 ”شہزادی صاحبہ، آپ کا حکم ملتا تو میں خود حاضر ہو جاتا۔ آپ نے زحمت کیوں کی۔“
 ”میں اپنا کام خود کرنے کی عادی ہوں۔ مجھے جب بھی کوئی فرمائش کرنی ہوگی، میں خود آؤں گی۔“
 ”مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ مالک اپنے نوکر کے پاس خود چل کر آئے۔“
 ”آپ کو اچھا نہ لگے لیکن مجھے اچھا لگے گا کہ میں آپ سے ملاقات کرنے کے لیے روزانہ آؤں۔ آپ کو کوئی اعتراض ہو نہیں ہوگا؟“

”آپ کی خواہش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے لیکن کیا اس سے باتیں بنانے والوں کو سہولت حاصل نہیں ہو جائے گی؟“
 ”میں شہزادی ہوں۔ میرے سامنے کون سرائھا سکتا ہے۔“
 ”نقصان آپ کو نہیں مجھے ہوگا۔ بہت سے حاسد ہوں گے جو یہ دیکھیں گے کہ مجھے اہمیت مل رہی ہے تو وہ میرے دشمن بن جائیں گے۔ کہیں مجھے نوکری ہی سے ہاتھ دھونے نہ پڑ جائیں۔“
 ”میں آپ پر کوئی آج نہ آنے دوں گی۔“
 شہزادی اب روز اپنی فرمائش کے بہانے آپ سے ملاقات کے لیے آنے لگی تھی۔ ہر ملاقات میں آپ کی کوئی نہ کوئی خوبی اس پر ظاہر ہو جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ ملاقاتیں محبت میں تبدیل ہو گئیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اندازہ تھا لیکن شہزادی کے دل میں کیا ہے، ان پر ظاہر نہیں ہوا تھا کیونکہ شہزادی نے ابھی تک اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔
 ایک روز شہزادی، آپ سے ملاقات کر کے واپس آرہی تھی کہ ملکہ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ ملکہ تک خبریں پہنچی تو رہی تھیں لیکن اب اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔
 ”اس کا مطلب ہے جو باتیں میں سن رہی تھی وہ ٹھیک ہیں۔“ ملکہ نے کہا۔
 ”آپ کیا باتیں سنتی رہی ہیں؟“
 ”یہی کہ تو داروغہ مطبخ سے ملنے جاتی ہے۔“
 ”میں اپنی پسند کے کھانے کا حکم دینے جاتی ہوں۔“
 ”مجھ سے جموٹ مت بول۔ یہ کام تو تجھے کسی کنیز سے لینا چاہیے۔ تو ایک معمولی باورچی کے پاس خود چل کر آتی ہے۔“
 ”وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ ضرور کچھ چھپا رہا ہے ورنہ وہ کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔“
 ”کہیں کا بادشاہ تو نہیں ہے۔ تو شہزادی ہے اس سے تیرا میل جول ٹھیک نہیں۔“

اس وقت تو شہزادی چپ ہو گئی لیکن اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جانا نہیں چھوڑا۔ تب ملکہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ شہزادی کو اپنے پاس آنے سے منع کر دیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام..... کو یہ سن کر انہی آگئی۔
 ”میں ایک معمولی سا نوکر ہوں اور وہ ایک شہزادی۔ میں بھلا انہیں کیسے منع کر سکتا ہوں۔ یہ کام تو آپ کر سکتی ہیں۔ وہ یہاں آئیں گی تو میں انہیں نہیں روک سکتا۔“
 ملکہ کے چلے جانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام سوچ میں پڑ گئے۔ وہ سوچنے لگے کہ بات بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ میری نوکری تو گئی۔ رہنے کا ایک ٹھکانا بن گیا تھا۔ دیکھو اب کہاں جانا پڑتا ہے۔
 اگلے روز شہزادی آئی تو آپ نے اسے منع کر دیا۔
 ”ملکہ کا حکم ہے کہ آپ میرے پاس نہ آیا کریں۔ آپ کے آنے سے جو مصیبت مجھ پر آئے گی اسے میں برداشت کر لوں گا لیکن جس مصیبت سے آپ دوچار ہو جائیں گی وہ مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا۔“
 ”میں ہر مصیبت برداشت کر لوں گی لیکن آپ کے پاس آنا نہیں چھوڑوں گی۔ آپ کو ملکہ کے حکم کا پاس ہے، میری خواہش کا احترام نہیں۔“

”میں تو آپ کو اونچ نیچ سمجھا رہا تھا۔ اب جو ہو سو ہو۔“
 ”اگر آپ کو محل سے نکال دیا جاتا ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ محل سے نکل جاؤں گی۔ ہر عیش کوٹھوکر مار دوں گی۔“

شہزادی یہ کہہ کر چلی گئی۔ اب تک وہ اشاروں اشاروں میں ماں کو سمجھاتی رہی تھی لیکن اب اس نے کھل کر اپنے عشق کا اظہار اپنی ماں کے سامنے کر دیا اور زور دیا کہ داروغہ مطہر سے اس کی شادی کرادی جائے۔
یہ ایسی فرمائش نہیں تھی جسے شاہی خاندان پر آسانی پورا کر سکتا۔ ملکہ کے ذریعے یہ خبر بادشاہ تک پہنچ گئی۔ بادشاہ کے غضب سے سراٹھایا۔ اس نے ملکہ سے صاف کہہ دیا کہ وہ اس شخص کو قتل کرادے گا۔ ملکہ بھی چپ ہو گئی تھی لیکن باورچی سے معلومات کرنے کے بعد سب کے منہ اتر گئے۔

باورچی نے بتایا۔ ”وہ شخص اسراغیلی معلوم ہوتا ہے اور کسی اچھے خاندان کا ہے۔ اگر اس قتل کی خبر سلیمان..... (ع) (السلام) تک پہنچی تو وہ اسے معاف نہیں کرے گا۔“
یہ سن کر بادشاہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔

کئی روز کے غور و فکر کے بعد بادشاہ نے یہ طے کیا کہ اس شخص کو شہر سے نکال دیا جائے لیکن ملکہ نے مخالفت کی۔
”اگر بات یک طرفہ ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ ہماری بیٹی بھی اس کے عشق میں گرفتار ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ ان دونوں کی شادی کر دی جائے۔“

بادشاہ مجبور ہو گیا لیکن اپنے غم کو نہ دیا۔ اس نے ملکہ کو خوش کرنے کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کی شادی شہزادی سے کر دی۔ بہت کچھ جواہرات بھی شہزادی کو دیے لیکن ایک رات اس نے شہزادی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو بلا کر حکم دیا کہ وہ محل سے چلے جائیں بلکہ یہ شہر ہی چھوڑ دیں۔ اس نے ایک آدمی بھی ان کے ساتھ کر دیا جو انہیں ایک صحرا میں چھوڑ آیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے خدا پر بھروسہ کر کے آگے بڑھتے رہے۔ پوری رات گزر گئی۔ دن کا کچھ حصہ بھی گزر گیا لیکن صحرا ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ اب انہیں فکر ہونا شروع ہوئی۔ شہزادی بھی پریشان مگی بالآخر دوسرے دن صبح کے وقت انہوں نے خود کو ایک گاؤں کے قریب پایا۔ یہاں کے لوگ ہمدرد تھے کہ انہیں ایک بڑھیا نے اپنے گھر میں پناہ دے دی۔ یہ بستی سمندر کے کنارے تھی اور یہاں ماہی گیر آباد تھے۔ وہ دن رات اپنے گرد مچھلیاں ہی مچھلیاں دیکھتے تھے۔

ایک روز شہزادی نے کہا کہ ہمیں بڑھیا کے دسترخوان پر کھاتے ہوئے کئی روز ہو گئے ہیں۔ آپ بازار جا کر مچھلی خرید لائیں تاکہ ہم اس بڑھیا کی دعوت کریں۔

آپ بازار گئے اور ایک بڑی مچھلی خرید کر لے آئے۔ شہزادی نے مچھلی کا پیٹ چاک کیا تو پیٹ سے ایک انگوٹھی نکلی اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو فوراً بلایا۔

”یہ دیکھیے یہ کیسی انگوٹھی ہے۔“
”یہ تمہیں کہاں سے ملی؟“
”میں نے مچھلی کا پیٹ چاک کیا تو یہ انگوٹھی نکلی۔ کسی کی مری ہوگی مچھلی نے کھالی ہوگی۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام نے رب کا شکر ادا کیا۔ شہزادی پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اندر کمرے میں گئے اور خدا کے حضور سجدے میں گر گئے۔ خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی تھی۔ انگشتری ان کے قبضے میں تھی۔

رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو شہزادی کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ سن کر حیران ہو رہی تھی لیکن یقین نہ کرنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

انگوٹھی آنے کے بعد ”جن“ ایک مرتبہ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع ہو گئے تھے۔ انگوٹھی ملنے کا مطلب بھی یہ تھا کہ آزمائش کے دن پورے ہو چکے۔ انہوں نے جنوں کو حکم دیا کہ وہ انہیں اور شہزادی کو یروشلم کے شاہی محل میں پہنچا دیں۔ یہاں پہنچاؤ نقشہ ہی بدلا ہوا تھا دربان آپ کو دیکھتے ہی تعظیم کے لیے جھک گئے۔ یہ سب جنوں کے بادشاہ اشمید کی کوہی سلیمان علیہ السلام کے رہے تھے۔ انہیں یہ خبر ہی نہیں تھی کہ سلیمان علیہ السلام برسوں سے غائب تھے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

جنوں کا بادشاہ اب کسی غلام کی طرح ان کے سامنے کھڑا تھا اور معافی کا خواستگار تھا۔ آپ نے اسے معاف کر دیا کیونکہ آپ کے نزدیک جو کچھ ہوا تھا خدا کی مرضی سے ہوا تھا۔

(جاری ہے)

کیہتھرین اپنی نئی پڑوسن کو خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ اپنی کار میں سے اپنا سامان نکال کر ان کے برابر کے محل میں منتقل کر رہی تھی۔ اس کا سامان مختصر اور چند ہندو بکسوں پر مشتمل تھا۔

کیہتھرین اس وقت بھی خاموش رہی جب اس کے لہر کین نے اس سنہری زلفوں والی حسینہ کو سامان اٹھا کر منہ میں مدد کی پیشکش کی۔ کیہتھرین کو اپنے شوہر کی اس دلچسپی والی تشویش نہیں ہوئی اس لیے کہ کیہتھرین کو معلوم تھا کہ اگلے لمحے تک اس کا شوہر کین موت کے منہ میں پہنچ جائے گا۔

یقیناً کیہتھرین کو اس حقیقت کا علم بھی تھا کہ سنہری لمبوں والی اس کی نئی پڑوسن اس کے شوہر کین کی محبوبہ تھی اور

ان کا معاشرہ گزشتہ چھ ماہ سے جاری تھا اور اس حسینہ کو ان کے ابا رٹمنٹ کپلیکس میں منتقل کرنے کی اسکیم صرف اس لیے تیار کی گئی تھی کہ انہیں ایک دوسرے سے ملنے کے بہتر مواقع میسر آجائیں اور کیہتھرین کو کسی قسم کا شبہ بھی نہ ہو۔

کیہتھرین سوچنے لگی کہ کین اسے کس حد تک احمق سمجھتا ہے؟ ظاہر ہے اسے بالکل ہی گاؤدی خیال کرتا ہے۔ جیسی تو وہ اپنی محبوبہ کو اپنے پڑوسن میں لے آیا تھا اور نہ صرف گاؤدی بلکہ اس حد تک مہربان بھی سمجھتا ہے کہ وہ دونوں کو آسانی کے ساتھ گل چھرے اڑانے کی اجازت دیدے گی؟

بے شک وہ اتنی احمق بھی نہیں تھی کہ کین کی بے وفائی پر خاموش بیٹھی رہتی۔ جوں ہی اس پر کین کے معاشرے کا

ایک سنگدل اور شہساز کی خوش فحیاں

شطرینج کی بساط ہو اور شاطر کھلاڑی ہو تو کھیل میں ہار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر... کھیل اور جرم میں فرق تو ہوتا ہے... بس اسی ذرا سے فرق نے اسے کھلاڑی سے اناڑی بنا دیا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صدمہ کی داستان بن کر وہ خود کو کتنا تنہا محسوس کر رہی تھی۔ بہر حال تیرا اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، یہ سقم الگ کہ نشانہ بھی خطا گیا۔

جیت ہار شرعباس



ماخذات: قصص القرآن - قصص الانبیاء - توریت

سسپنس ڈائجسٹ 244 جون 2012ء

انکشاف ہوا وہ اس اپارٹمنٹ کمپلیکس کی دیکھ بھال کرنے والے نو جوان میکس کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

میکس نو جوان، پرکشش اور توانا مرد تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میکس کا خیال ذہن میں آتے ہی کیتھرین کی آنکھیں جھلک اٹھیں۔

اسی لیے وہ کین کو قتل کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کین اسے بھی طلاق نہیں دے گا۔ اس کی ایک اہم وجہ تھی۔ وہ لاٹری کے انعام کی ایک لاکھ ڈالر کی نصف رقم سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا جو وہ ہر سال وصول کیا کرتے تھے۔ لاٹری کی شرائط کے مطابق وہ ہر سال انعام کی کل رقم میں سے ایک لاکھ ڈالر وصولی کے حق دار تھے اور وہ اس رقم کو آپس میں آدھا آدھا بانٹ لیا کرتے تھے۔

اور یہی وجہ تھی کہ کیتھرین بھی کین کو طلاق نہیں دے سکتی تھی۔ اس صورت میں وہ بھی انعامی رقم سے محروم ہو جاتی۔ ریاست کے طلاق کے قوانین کے مطابق طلاق کی صورت میں تمام نقدی اور جائیداد دونوں میں برابر برابر تقسیم ہو جائے گی اور کیتھرین چاہتی تھی کہ اس سے قبل کہ وہ اس انعامی رقم کا آدھا حصہ لے کر اسے چھوڑ کر چلا جائے، وہ کین کو قتل کر دے گی۔

میکس کو کیتھرین اور کین کو ہر سال موصول ہونے والی انعامی رقم کا کوئی علم نہیں تھا۔ اسی لیے کیتھرین کو یقین تھا کہ میکس اس سے سچا پیار کرتا ہے۔ جیسی اس نے کیتھرین سے التجا کی تھی کہ وہ اپنے شوہر کو چھوڑ دے اور اس کے ساتھ شادی کر لے۔

کیتھرین نے سوچ بچار کے بعد ایک ایسا طریقہ سوچ لیا تھا جس پر عمل کر کے وہ یقینی طور پر میکس کے ساتھ تمام انعامی رقم کی مالک بھی بن سکتی تھی۔ یہ درحقیقت ایک سادہ سا پلان تھا۔

کین کو سوئمنگ پول کے ایک المناک حادثے میں ڈوب کر مر جانا تھا۔ وہ روزانہ رات گئے اپارٹمنٹ کمپلیکس کے سوئمنگ پول میں تیراکی کیا کرتا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا جس کی گواہی اپارٹمنٹ کمپلیکس کے درجنوں رہائشی دے سکتے تھے۔ ایسی ہی ایک رات پانی میں ڈوب کر اس کی موت واقع ہوئی تھی اور اگلے روز صبح کسی کو اس کی لاش سوئمنگ پول میں تیرتی ہوئی مل جاتی۔ کوئی بھی اتنا غلط نہیں تھا کہ کیتھرین پر کسی قسم کا شبہ کرتا۔

اگر رات کو کسی نے اسے باہر دیکھ بھی لیا ہوتا تو وہ بھی رپورٹ کرتا کہ وہ رات گئے اپارٹمنٹ کمپلیکس کے جامنگ ٹریک پر روزانہ چہل قدمی کیا کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ اور

پیروں میں وزن بندھا ہوتا تھا جو چہل قدمی کی کڑی ورزش کے فوائد بڑھانے کے لیے ہوتا تھا۔

وہ گزشتہ کئی ماہ سے ان اوزان میں اضافہ کرتی جا رہی تھی تاکہ اپنا کل جسمانی وزن یہ شامل ان اوزان کے کین کے ایک سو چالیس پونڈ وزن کے برابر لے آئے۔

کیتھرین کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ جبکہ سے اس وقت پانی میں اتر جائے گی جب کین سوئمنگ پول میں اپنی معمول کی تیراکی کر رہا ہوگا۔ پھر اس بہلاوے کے ساتھ اس کی جانب بڑھے گی جیسے اپنی خواہش کی تکمیل چاہتی ہو۔ پھر اسے زیر آب دبوچے رہے گی۔ کین ان کی شادی کے بیس برس کے تمام عرصے میں بلا کا سگریٹ نوش رہا تھا۔ لہذا کیتھرین کو علم تھا کہ کین کے پیچھے پڑنے کی ضرورت ہو چکے ہوں گے اور ان میں زیادہ دیر تک زیر آب رہنے کی طاقت ختم ہو چکی ہوگی۔

یہ ایک پرفیکٹ پلان تھا۔ کیتھرین نے اس پلان پر عمل کے لیے آنے والی اتوار کی شب کا انتخاب کیا۔ اتوار کی رات بیشتر لوگ جلدی سونے کے لیے چلے جاتے تھے اور اس بات کا امکان کم ہی تھا کہ اس رات کوئی اور سوئمنگ پول کے پاس چہل قدمی یا تیراکی کی غرض سے موجود ہوگا۔ اس نے یہ ایک عادت سی بنا لی تھی کہ جب اپنی چہل قدمی کے لیے نکلتی تو سوئمنگ پول کے پاس رک کر تیراکی کرتے ہوئے کین کے ساتھ ایک آدھ منٹ بات ضرور کرتی تھی۔ اس دوران میں اس نے یہ مشاہدہ کر لیا تھا کہ اس وقت وہاں سے گزرنے والے شاذ و نادر ہی ہوا کرتے تھے۔

اتوار کی اس شب جب کیتھرین سوئمنگ پول کے پاس نمودار ہوئی تو کین نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات بھی نہیں تھی کیونکہ ان دنوں وہ آپس میں بھی کبھار ہی گفتگو کیا کرتے تھے۔

البتہ اس وقت کین نے کیتھرین پر قدرے الجھی ہوئی نگاہ ڈالی جب اس نے کیتھرین کو پول کے پانی میں قدم رکھتے ہوئے دیکھا۔ وہ سیزحیاں اتر کر کمر کے پانی میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ کین پول میں ادھر سے ادھر تیراکی کرنے میں مصروف رہا۔ وہ دونوں آپس میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ اپنا آخری چکر مکمل کرنے کے بعد جب کین کا سانس چڑھ گیا اور وہ ہانپنے لگا تو کیتھرین کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

کیتھرین نے اس کے ساتھ مختصر سی باتیں شروع کر دیں جیسے کہ ان کے درمیان مراسم اب دوستانہ ہو گئے ہوں

ساتھ ہی وہ دیر سے دیر سے اس کی طرف بڑھتی رہی حتیٰ کہ اس کے اس حد تک قریب پہنچ گئی کہ اپنی ٹانگیں اس کے گرد مائل کر سکے۔ پھر اس نے اپنا کین اپنی ٹانگیں کین کے گھٹنوں کے پیچھے لے جا کر پٹنی لگاتے ہوئے ایک زوردار ہونکا دیا۔ کین کے پیر زمین پر سے اٹھ کر گئے اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ پانی میں پیچھے کی طرف گر پڑا۔ جب کیتھرین نے ساتھ ہی اپنے جسم کا پورا وزن کین پر اس طرح ڈال دیا کہ اسے زیر آب دبائے رکھنے میں دیر تک کامیاب رہ سکے۔ کین کا جسم سوئمنگ پول کی تہ میں تھا۔

کین خود کو بچانے کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔ وہ کیتھرین کی اس ٹانگ کو پھینچنے کی کوشش کر رہا تھا جس سے کیتھرین نے اس کی گردن پر مضبوطی سے پیر رکھا ہوا تھا۔ کبھی وہ کیتھرین کی دوسری ٹانگ کو گرفت میں لیتا چاہ رہا تھا جس سے کیتھرین نے پوری قوت سے اس کی کمر کو دبایا ہوا تھا۔ کین کی اس جدوجہد میں کیتھرین کئی مرتبہ ڈمگانی اور اپنا توازن کھوٹے کھوٹے پٹی۔ لیکن کین خود کو اس کے چنگل سے چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اس کی اسی جدوجہد نے بالآخر اسے تھکا مارا۔ اگر کین پر سکون انداز میں اپنی سانس روک کر اپنے ذہن سے کام لیتے ہوئے خود کو کیتھرین کے بوجھ سے نجات دلانے کا کوئی طریقہ ڈھونڈتا تو وہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ کیتھرین اس پٹنی کے ساتھ اس پر اپنا دباؤ برقرار نہیں رکھ سکتی تھی کیونکہ وہ خود بھی پانی میں تھی اور وہ وزن میں بھی اس سے زیادہ نہیں تھی۔

لیکن حسب معمول کیتھرین کو احساس ہو چکا تھا کہ کین اس کے چنگل سے نکلنے کے لیے اپنے ذہن سے نہیں ملے اپنے جسم سے کام لے رہا تھا اور یہی کوتاہی اسے دھوکا دے گئی۔ کیتھرین سے لڑائی کے عمل کی بنا پر اس کا سانس دقت سے پہلے ہی ٹوٹ گیا اور ہاتھ پیر مارنے کی مشقت نے اسے گہرے گہرے سانس لینے پر مجبور کر دیا۔

یہ کین کی ہولناک غلطی تھی۔ گو وہ صرف تین منٹ گہرے پانی میں تھا لیکن اسے احساس ہو گیا تھا کہ ہوا اس کے پیچھے پڑوں میں نہیں پہنچ رہی ہے۔ وہ گھبراہٹ میں مزید گہری سانس لینے لگا۔ بالآخر پیچھے پڑوں میں آکسیجن نہ پہنچنے کی بنا پر وہ بے ہوش ہو گیا۔

کیتھرین نے مزید ایک منٹ تک اس کے پانی میں ادبے ہوئے بے ہوش جسم پر اپنا دباؤ برقرار رکھا۔ جب

اسے یقین آگیا کہ وہ اب بے حس و حرکت ہو چکا ہے تو کیتھرین نے محتاط نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔

جب اسے اطمینان ہو گیا کہ آس پاس کوئی موجود نہیں ہے تو وہ آہستہ آہستہ سوئمنگ پول سے باہر نکل آئی تاکہ کوئی اس کی غلٹ پسندی یا گھبراہٹ کی بنا پر اس کی جانب متوجہ نہ ہونے پائے۔ سوئمنگ پول کے کنارے پہنچ کر اس نے پلٹ کر پول کی جانب دیکھا اور پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے کین کے بے جان جسم سے مخاطب ہو کر قدرے اونچی آواز میں بولی۔ ”تم سے بعد میں گھر پر ملاقات ہوگی، ڈیر!“

پانی کے اوپر تیرتے ہوئے کین کی بے نور آنکھیں خالی نظروں سے اسے تنگ رہی تھیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور پلان کے مطابق ہو گیا تھا۔ کسی نے بھی اسے سوئمنگ پول کے پاس نہیں دیکھا تھا۔ گو بعد میں کیتھرین نے پولیس کو یہی بتایا کہ وہ معمول کی چہل قدمی کے لیے گئی تھی اور سوئمنگ پول کے پاس سے گزری تھی لیکن پولیس نے اس بارے میں کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ ہر شب کی چہل قدمی اس کے روز کے معمولات میں شامل بھی جس کی گواہی ہر کوئی دے رہا تھا۔

کین کی جھنجھٹ و تکفین اسی غم زدہ ماحول میں ہوئی جیسے کہ ہونی چاہیے تھی۔ کیتھرین کو اس بات سے بڑا اطمینان ہوا کہ اس کی سنہری زلفوں والی پڑوسن نے اس غلطی کا مظاہرہ کیا کہ وہ ایک مرتبہ بھی تعزیت کرنے یا دلاسا دینے کے لیے اس کے پاس نہیں آئی۔ کیتھرین کسی کو بھی یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ ان کی ازدواجی زندگی کسی آئیڈیل سے کم تھی۔ اسے ان دنوں اپنی وہ پڑوسن نظر بھی نہیں آرہی تھی اور نہ ہی کیتھرین کو اسے دیکھنے کی کوئی جستجو تھی۔

وہ تو درحقیقت صرف میکس سے ملنا چاہتی تھی اور وہ بھی اس وقت جب معاملات بالکل ٹھنڈے پڑ جائیں اور میکس سے ملنے میں کسی قسم کا کوئی خطرہ یا شبہ نہ ہو۔ کین کی تدفین کے کئی ہفتوں بعد کیتھرین ایک رات میکس کے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کی جانب چل دی جو کمپلیکس کے عقبی حصے میں واقع تھا۔ کین کو قتل کرنے کے بعد سے اس نے میکس کو نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ خود اس طرف آئی تھی۔ میکس نے بھی غلطی سے کام لیتے ہوئے خود کو اس سے دور رکھا ہوا تھا۔

اگر میکس کو اس بات کا علم بھی تھا کہ اس نے کین کو قتل کیا ہے تب بھی اس نے کیتھرین سے کچھ نہیں کہا تھا۔

کیتھرین جب اس کے اپارٹمنٹ کے پاس پہنچی تو دیکھا کہ میکس کی کار پارکنگ لائن میں کھڑی تھی۔ یہ اس



شام کے چھ بجے تھے۔ بیڑا پکنر پلازا فاؤنٹین کے کنارے بیٹھا دولت حاصل کرنے کا کوئی سہل اور اچھوتا طریقہ سوچ رہا تھا۔ فوارے کے ارد گرد تفریح کے لیے آئے ہوئے بے شمار خواتین و حضرات بیٹھے تھے جن کے ساتھ ایک

حرکت گھٹیا

عبدالقیوم شاہ

ہیرے کی قدر جوہری جانتا ہے اگرچہ یہ بات درست ہے مگر... جب روپ بدل بدل کر جوہری ہیرے کی قدر کرنے کی کوشش کرے تو ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسی کہ یہاں... وہ بھی ایسے ہی قدردان تھے یہ اور بات کہ ان کی یہ خوبی گھٹیا حرکت میں بدل گئی... مگر یہ بھی ان کے حق میں غنیمت ہوا... اگر ان کی قدردانی کا راز فاش ہو جاتا تو... سرکاری مہمان خانے میں ان کی اچھی خاصی قدر ہو جاتی۔

ایک ذرا سی چوک سے چوٹا دیے والے دلچسپ واقعات

کے بجائے پوری رقم اپنے نام کرانے اور ہر سال انعامی رقم کا چیک لینے بجائے اپنے نام جاری کرانے کے لیے مجھے کہا کرنا ہوگا؟

”ویل، ابھی وہ بات ہے جس کے لیے میں آپ کو فون کرنا چاہ رہا تھا مسز کین۔ اس بات کی تصدیق کے لیے میں نے اسٹیٹ لائبریری کیشن سے رابطہ کیا تھا۔“ مسٹر رالف نے بتایا۔ ”ویل، ان کا کہنا ہے انعامی رقم کا اب آئندہ کوئی چیک جاری نہیں کیا جائے گا۔“

”کیا مطلب؟“ کیتھرین چونک گئی۔
”مسز کین، مجھے احساس ہے کہ یہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ کے شوہر نے انعامی رقم تنہا کلیم کی تھی۔ اس کے باوجود کہ انعامی رقم آپ دونوں شیئر کرتے تھے۔ اگر انعامی لائبریری ٹکٹ کے مشترکہ مالکان کے طور پر آپ دونوں ہی نے انعام کی رقم کا دعویٰ کیا ہوتا تو پھر آپ کے حصے کی نصف انعامی رقم آپ کو بہ دستور ملتی رہتی۔ لیکن ریاست کے قانون کے مطابق انعام جیتنے والے کی موت کے بعد ریاست انعامی رقم کے اجرا کو موقوف کر دیتی ہے۔ انعام کی بقیہ رقم ریاست کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ ایک مرتبہ جب انعام جیتنے والا مر جاتا ہے تو پھر اس کے شیئر کی ادائیگی نہیں ہوتی۔ لہذا اگر لائبریری ٹکٹ پر انعام کا مطالبہ آپ نے تنہا کیا ہوتا تو تمام رقم آپ ہی کو مل رہی ہوتی لیکن چونکہ یہ مطالبہ آپ کے شوہر نے تنہا کیا تھا، اس لیے آپ کو ان کے نام کا چیک جاری نہیں ہو سکتا اور نہ ہی آپ اس رقم کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔ اب آئندہ اس انعامی رقم کا کوئی چیک ایڈوانس ہوگا۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں یا مسز کین؟“

کیتھرین نے خاموشی کے ساتھ فون کریڈٹل پر رکھ دیا۔ اس کا ذہن ماضی میں اس دن کا تصور کرنے لگا جب اس نے خود یہ لائبریری ٹکٹ خریدا تھا اور پھر اس دن کا جب اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ لائبریری کا انعام جیت گئی ہے۔

”اپنے آپ کو کچھ تو کار آمد بناؤ، کین۔“ اس نے انعام جیتنے کے بعد کہا تھا۔ ”اپنی سست روز زندگی میں کبھی کبھی بھی لیا کرو، کامل آدمی! میں نے تم جیسا نکمٹو کوئی نہیں دیکھا۔ جاؤ، یہ لائبریری ٹکٹ لے جاؤ اور انعامی رقم کا دعویٰ داخل کر دو۔ پھر واپس آ کر مجھے بتاؤ کہ وہ پیاری سی انعامی رقم ہمیں جلد از جلد کب سے ملنا شروع ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے، ڈیئر۔“ کین نے سعادت مندی سے جواب دیا تھا۔ ”جیسے تم کہو، میں ابھی جاتا ہوں۔“



بات کا ثبوت تھا کہ میکس اپنے اپارٹمنٹ میں موجود ہے۔ میکس کا اپارٹمنٹ ایک کمرے پر مشتمل تھا اور کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ ایک اسٹوڈیو کا ڈیج رکھا ہوا تھا۔ کیتھرین کے اندازے کے مطابق میکس اسی کا ڈیج پر سوتا تھا۔ کمرے کے سامنے کی کھڑکی کا پردہ گرا ہوا تھا۔ کمرے کے عقب میں ایک چھوٹی کھڑکی بھی تھی جسے میکس ہمیشہ کھلی رکھتا تھا۔ خاص طور پر رات کے وقت اسے کھلے آسمان کا نظارہ بہت اچھا لگتا تھا۔

کیتھرین دبے پاؤں کمرے کے عقبی حصے کی جانب بڑھنے لگی۔ کمرے کے اندر مدھم سی روشنی جھلک کر رہی تھی۔ عقبی کھڑکی سے کمرے کے اندر کا جائزہ لینے میں کیتھرین کو کچھ وقت لگا کیونکہ اندر بلب کے بجائے شمع روشن تھی۔ تب اسے کا ڈیج پر دو سائے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ مرد کا چہرہ عورت کی سنہری زلفوں میں چھپا ہوا تھا۔ کیتھرین کو ان دونوں کو پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ میکس اور کیتھرین کی وہی پڑوسن تھی جسے اس کا شوہر کین اس سلیپس میں لایا تھا۔

کیتھرین کے دل میں میکس کی ایک لہری اٹھی اور پورا بدن سن سا ہو گیا۔ وہ بہ مشکل تمام کھڑکی سے پیچھے ہٹ گئی۔ وہ دونوں کیتھرین کی موجودگی سے قطعی بے خبر اپنے غفل میں مگن تھے۔ کیتھرین بوجھل قدموں سے اپنے اپارٹمنٹ کی جانب پلٹ گئی۔

اسے بے حد تکلیف پہنچی تھی۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی اور دیر تک جاگتی رہی لیکن پھر اس خیال نے اس کے درد کے احساس کو تقریباً مٹا دیا کہ اب انعام میں ملنے والی تمام رقم اس کی ذاتی ملکیت ہوگی۔ ہر سال ایک لاکھ ڈالرز سے وہ اس جیسے بے شمار میکس خرید سکتی ہے۔

یہ دلی اطمینان حاصل ہونے کے بعد اسے نیند آگئی۔ اگلے روز کیتھرین نے اپنے اٹارنی کو فون کیا۔ ”مسز کین، میں خود بھی آپ کو فون کرنا چاہ رہا تھا۔“ اٹارنی نے کہا۔ ”کوکہ مسز کین کی وصیت بالکل صاف اور واضح ہے اور انہوں نے اپنا سب کچھ آپ کے لیے چھوڑ دیا ہے لیکن ایک معاملہ ایسا ہے جس پر میں آپ سے تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں نے بھی اسی لیے آپ کو فون کیا ہے مسٹر رالف! میں اس بارے میں فکر مند تھی کہ لائبریری کے انعام کی آدمی رقم

کثیر تعداد بچوں کی بھی تھی۔ اکثر بچے چھوٹے چھوٹے سکے فوارے کے گرد بنے ہوئے حوض میں پھینکتے اور پھر خوشی سے تالیاں بجانے لگتے۔

بیٹری نظر حوض کے ساتھ بنی ہوئی کئی منزلہ عمارت کی طرف اٹھتی چلی گئیں۔ پھر تیسری منزل پر لگے ہوئے سائن بورڈ پر ٹک گئیں جس پر نمایاں الفاظ میں ”ڈائمنڈ شاپ“ اور ”ہیروں کے بیوپاری“ لکھا ہوا تھا۔ بورڈ کے ساتھ ہی ایک کھلی ہوئی کھڑکی تھی جو عین حوض کے اوپر تھی۔ ان تمام تفصیل کو دیکھ کر بیٹری کے ذہن میں ایک لا جواب منصوبہ جنم لینے لگا۔

وہ کھلتا ہوا عمارت کے کونے پر واقع ٹیلی فون بوتھ کے اندر گھس گیا اور جونی اسٹوپ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جونی ایک ہوشیار اور فیشن ایبل شاطر، نہایت ہارعب اور پروقار شخصیت کا مالک تھا۔ اگر وہ کسی اسٹور میں داخل ہو جاتا تو سیلز مین دوسرے گاؤں کو چھوڑ کر ایک دم اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اور خوش قسمتی سے مشرقی ریاستوں میں اس کا ریکارڈ بالکل صاف تھا۔ دس سال قبل اس نے کیلی فورنیا میں کئی ایک فراڈ کیے تھے۔ تاہم اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ پولیس والے اتنی پرانی کڑیاں ملانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ رابطہ ملنے کے بعد بیٹری نے کہا۔

”ہیلو جونی، میں بیٹری بول رہا ہوں۔ شکر ہے کہ تم گھر پر مل گئے۔“

”یہاں سے، میں دن کے وقت گھر پر ہی ہوتا ہوں۔ ویسے اس وقت باہر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے قبول فرما رہا تھا۔“

”سنو، میرے پاس تمہارے لیے ایک کام ہے۔“

”کیسا کام ہے؟“ جونی نے پوچھا۔

”فون پر بتانے والا نہیں۔“ بیٹری نے کہا۔ ”اگر تم فارغ ہو تو روڈی اسٹیک بار میں آ جاؤ۔ وہاں بیٹری کے تفصیلی بات ہو جائے گی۔“

”کتنے بجے؟“

”اب سے ایک گھنٹے کے بعد۔“ بیٹری نے کہا۔ ”یعنی سات بجے۔“

”سات بجے نہیں۔“ جونی نے کہا۔ ”مجھے ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے، میں ٹھیک آٹھ بجے وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

”اوکے۔ تو پھر آٹھ بجے ملاقات ہوگی۔“

روڈی اسٹیک بار ایک خاموش اور پرسکون علاقے میں

واقع تھا۔ شام کے وقت وہاں زیادہ رش نہیں ہوتا۔ بیٹری مقررہ وقت سے چندرہ منٹ پہلے ہی وہاں پہنچ گیا اور حقہ جیسے میں واقع ایک کیمین میں بیٹھ کر کافی کا آرڈر دیا۔

آٹھ بج کر دس منٹ پر جونی بار میں داخل ہوا اور گہری نظروں سے اندر کا جائزہ لیا۔ گویا وہاں ڈاکا ڈالنے یا کسی لڑکی کو اغوا کرنے آیا تھا۔ اندر دو یا تین گاڑے بیٹھے تھے۔ بار میں فون پر کسی شخص کے ساتھ تکرار کر رہا تھا۔

کیمین میں داخل ہو کر جونی کرسی پر بیٹھ گیا اور استغناء میں نظروں سے بیٹری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں تو دوست! اب بتاؤ، تم کیسا کام تلاش کر کے لائے ہو؟“

بیٹری نے رسمی گفتگو کو نظر انداز کرتے ہوئے.....

راز داری کے ساتھ کہا۔

”فاؤنٹین پلازا کی تیسری منزل پر جواہرات کی ایک بہت بڑی دکان ہے۔ یقیناً تم نے وہ دکان دیکھی ہوگی۔ اس دکان سے بڑی آسانی کے ساتھ ہیرے چرائے جاسکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ معمولی کوشش سے ہم پچاس ہزار ڈالر کی مالیت کے ہیرے اڑا سکتے ہیں۔“

”بہ ظاہر بڑی پرکشش بات ہے۔“ جونی بولا۔

”منصوبہ کیا ہے؟“

”اندرونی کارروائی تم کرو گے اور میں باہر سے تمہاری مدد کروں گا۔“

”اور پھر میں اندر سے اور اندر چلا جاؤں گا اور تم باہر عیش کرو گے۔“

”تم آرام سے باہر آ جاؤ گے۔“ بیٹری نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ”منصوبہ بالکل سیدھا سادا اور آسان ہے۔ ہم دوپہر کے قریب وہاں جائیں گے۔ اس وقت وہاں زیادہ گاڑے نہیں ہوتے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ دکان تیسری منزل پر واقع ہے۔ تم اندر جا کر ہیرے دیکھنے کی خواہش ظاہر کرنا۔ جب سیلز مین ہیرے نکال کر تمہیں دکھائے گا تو میں مرکزی ہال میں کچھ گڑ بڑ کروں گا۔ قدرتی طور پر سیلز مین کی توجہ ایک آدھ منٹ کے لیے ہال کی طرف ہو جائے گی۔ اس دوران میں تم چند ہیرے پار کر لیتا۔“

”ہیرے پار کر لوں۔ یعنی انہیں نکل لوں، جس طرح خانہ بدوش چھپی کرتے ہیں؟“

”کوئی بے ڈھنگی بات نہیں جونی۔“ بیٹری نے کہا۔ ”پولیس والے اس قسم کی چالوں سے خوب واقف ہیں۔ تم ان ہیروں کو کھڑکی سے باہر پھینک دیتا۔“

”بس؟“ جونی گرجا۔ ”مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تم لی بے ہودہ منصوبہ بنایا ہوگا۔“

”میرے بھائی میں پوری سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا

’پہلی بات تو یہ ہے کہ عام طور پر کھڑکیاں کھولی ہی جاتی ہیں، شاید تمہیں معلوم نہیں کہ تازہ ہوا کے لیے اسٹور ’ڈرائیئر کنڈیشنر‘ لگا ہوا ہے اس لیے کھڑکی کھولنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔“

”آج میں نے اپنی آنکھوں سے کھڑکی کھلی دیکھی۔ آج کل تیل کے بحران کی وجہ سے لوگ بجلی کم خرچ کرتے ہیں۔ ایئر کنڈیشنر بند رکھتے ہیں اور کھڑکیاں کھول دیتے ہیں۔ بہر حال یہ لوگ اس اصول پر پورے خلوص کے ساتھ عمل کر رہے ہیں چونکہ یہ کھڑکی تیسری منزل پر واقع ہے اس لیے وہاں سے کسی کے اندر داخل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ البتہ وہاں سے سامان باہر جاسکتا ہے۔ میرا اشارہ ہال کی طرف ہے۔“

”نہایت غیر معقول بات نظر آتی ہے۔“

”سنو، تم کھڑکی والے کاؤنٹر کے سامنے کھڑے ہونا، اندر سے کھڑکی کا فاصلہ تقریباً دس فٹ ہے۔“ اس نے اند پر..... کھڑکی اور کاؤنٹر کا خاکہ بناتے ہوئے کہا۔ جب ہال کے اندر گڑ بڑ ہو اور اسٹور کے تمام ملازمین کی اوجھ اس طرف ہو جائے تو تم ہیرے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ کسی کا خیال اس بات کی طرف نہیں جائے گا کہ تم نے کھڑکی سے باہر پھینک دیے ہیں، کیونکہ تم کھڑکی کے پیچھے بیٹھے ہو گے اور کھڑکی کاؤنٹر کے پیچھے ہے۔ ہیرے باہر نکلنے کے بعد تم دوسرے شوکیس کے قریب جا کر اندر رکھے ہوئے ہیرے دیکھنے لگ جانا۔ اگر ہیروں کی گمشدگی کا خلاف ہو بھی گیا تو شک صرف تم پر نہیں کیا جائے گا بلکہ پورے موجودہ گمراہ تمام گاؤں پر بھی کیا جائے گا۔ بہر حال تمہاری تلاشی لیں گے اور طرح طرح کے سوالات کریں گے لیکن ظاہر ہے کہ تمہارے پاس سے مال مسروقہ برآمد نہیں ہوگا لہذا تمہیں جانے دیا جائے گا۔ یوں بھی تم ایک معزز“ اور ”پرامن“ شہری ہو۔“

”سوال یہ ہے کہ ان ہیروں کا کیا بنے گا جنہیں میں مڑکی سے باہر پھینکوں گا کیونکہ تم اس وقت ہال کے اندر

”یہی تو اس منصوبے کا خوبصورت ترین حصہ ہے۔“

”معنی خیر انداز میں کہا۔“ اس کھڑکی کے عین نیچے.....

عقل مند نصیحتیں

☆ کبھی اپنی تباہی کی چٹائی نہ بنو۔

☆ اس کی چٹائی میں سے ہی اس کی تباہی ہو۔

☆ کبھی اپنی تباہی نہ اس کے غرور نہ کر، کہ لہ ان میں سے۔

☆ ایک چٹائی آپ کی تباہی ہے۔

جہاد احمد - کراچی

لیڈریز فرسٹ

وہ دونوں بڑی طرح ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا تھے لیکن ان کے والدین ان کی یک جہتی کے خلاف تھے۔ دونوں نے سارے چٹن کر لیے لیکن ان کا گھر بسانے کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہ آیا۔ آخر کار دونوں نے قرعہ چھڑا کر اپنی چوٹی سے کود کر خودکشی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

راوی کہتا ہے کہ مقررہ چوٹی پر پہنچنے کے بعد لڑکے پر خوف اور رقت نے غلبہ پالیا۔ اس کے لیے اپنی ساتھی کی خودکشی کا منظر دیکھنا ممکن نہیں رہا۔ اسے ڈر تھا کہ چٹائی چٹائی لڑکی کے گھاٹی میں گرنے کا اندوہناک منظر دیکھ کر وہ خودکشی سے پہلے ہی مر جائے گا۔

فیصلہ ہوا کہ پہلے لڑکا چھلانگ لگائے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بلند چوٹی سے گھاٹی میں کود گیا۔ لڑکی کے لیے اس کی آخری حالت قابل دید اور قابل رحم تھی۔ اپنے دوست کی آخری چیخوں کے بعد اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اس بے ہودہ انداز میں اپنی جان گنوانے کے بجائے واپس چل دی۔

ایک قبائل ساتھی پہلے سے اس کی نظر میں تھا۔ اس بار گھر والے آڑے نہ آئے اور اس نے گھر بٹالیا۔ سیانوں کے لیے وہ واقعہ عبرت اثر تھا۔ انہوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ عورت قابل اعتبار نہیں، جب بھی کوئی فیصلہ ہو تو عورت کو اس پر پہلے عمل کرنا ہوگا تا کہ اس کے فرار کی راہ مسدود ہو جائے اور مرد بے چارہ مفت میں نہ مارا جائے۔

سیانوں کا یہ مشاہدہ اس قدر مقبول ہوا کہ آج ہر طرف لیڈریز فرسٹ کا اصول کا رفرما نظر آتا ہے۔

(کراچی سے شین وائس کا ایک جدید چٹکا)

نوارہ ہے اور اس کا حوض خاصا بڑا ہے، جب تم میرے کھڑکی سے باہر پھینکو گے تو وہ سیدھے حوض کے اندر جا کر گر گئے۔ نوارہ نے کی وجہ سے پانی کے اندر چھینٹے اڑتے رہتے ہیں۔ اس لیے حوض کے قریب پھرنے والے لوگوں کو ہرگز ہیروں کے گرنے کا پتا نہیں چلے گا اور سچ پر سے ان کے نظر آنے کا بھی کوئی امکان نہیں کیونکہ وہ پانی کی طرح شفاف ہوتے ہیں۔

”بات تو ٹھیک ہے۔“ جونی نے کہا۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ جب حوض پر دھوپ پڑے گی تو۔۔۔۔۔“

اول تو حوض کی یہ تنگ دھوپ پہنچتی ہی نہیں۔“ پیٹر نے کہا۔ ”لیکن اگر دھوپ وہاں تک پہنچ بھی جائے تو جب تک کسی کو معلوم نہ ہو کہ یہ میں ہیرے پڑے ہیں۔ کوئی شخص ان کو دیکھ نہیں سکتا۔ ویسے بھی ہم انہیں زیادہ دیر تک وہاں چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔“

جونی نے سر کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے کہا۔

”بات تو معقول ہے۔ اس منصوبے پر عمل درآمد کب کیا جائے گا؟“

پیٹر نے مسکراتے ہوئے بیڑ کا گلاس بلند کیا اور کہا۔

”کل۔“



ٹھیک سوا بارہ بجے جونی شاہانہ انداز میں ڈائمنڈ شاپ کے اندر داخل ہوا۔ اس وقت وہ اپنا بہترین سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر زبردست سنجیدگی اور متانت نظر آرہی تھی، گویا وہی اس پوری عمارت کا مالک تھا۔ دروازے پر موجود باوردی چوکیدار نے قدرے خم ہو کر دروازہ کھولا اور ادب سے ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔

پیٹر پر ہجوم ہال کمرے سے جونی کی حرکات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اسٹور کا ہیرونی دروازہ شیشے کا بنا ہوا تھا۔ اس لیے وہ اندر ہونے والی تمام کارروائی بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ جیسے ہی جونی حسب پروگرام کھڑکی کے سامنے والے کاؤنٹر پر پہنچا ایک مستعد سیزمین لپک کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر پیٹر نے اطمینان کا سانس لیا کہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی پھر جیسے ہی سیزمین نے جونی کے سامنے ہیروں کی لڑے رگی بیڑ ٹھہلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ کاؤنٹر کے سامنے پہنچ کر وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا اور دھڑام سے فرش پر گر گیا۔ ایک سیزمین اور چوکیدار جلدی سے اس کی مدد کو پہنچ گئے۔ سیزمین نے جھک کر پوچھا۔

”کیا بات ہے جناب! آپ کی طبیعت تو کما ہے؟“

”مم۔۔۔۔۔ میں ٹھیک سے سانس۔۔۔۔۔ اودہ بال میرا۔۔۔۔۔ دم گھٹ رہا ہے۔“ چوکیدار جلدی سے پانی کا گلاس بھر لایا۔ پیٹر نے رک رک کر پانی پی لیا پھر اس نے سر اٹھ کر اس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور بولا۔ ”شاہانہ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی دل کی تکلیف ہو جاتی ہے۔“

”شکر یہ!۔“

”مٹھہرے جناب میں آپ کے لیے کرسی لے آؤ ہوں۔“ ایک سیزمین نے کہا۔ ”شاید آپ خریداری کے لیے تشریف لائے تھے؟“

”شکر یہ۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ مجھے گھر جانا چاہیے۔“ وہ کھڑا ہو گیا اور کوٹ جھاڑتا ہوا بولا۔ ”آپ صاحبان کا بہت بہت شکریہ! میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔“

یہ کہتا ہوا وہ دھیرے دھیرے دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ اس نے جونی کی طرف دیکھنے کی حماقت نہیں کی۔ تاہم اسے امید تھی کہ ہیرے حوض میں پہنچ چکے ہوں گے۔ لفٹ میں بیٹھ کر وہ نیچے آ گیا اور ٹھہلتا ہوا نوارہ کے قریب پہنچ گیا۔ حوض کے ارد گرد دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں جھنجھکی لے کر رہی تھیں۔ ان کے چاہنے والے قریب کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ بابو لوگ ادھر ادھر ٹھہل رہے تھے۔ نوارہ کے پانی چھینٹے اڑتا ہوا واپس حوض میں گر رہا تھا۔ پیٹر کنارے کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ہیرے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن سوائے چھوٹے موٹے سکوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ بہر حال یہ بات خوش کن تھی کہ باہر سے دیکھنے پر ہیرے نظر نہیں آرہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹا انتظار کرنے کے بعد وہ گھر چلا گیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ پولیس جونی سے پوچھ کچھ کر رہی ہوگی۔ دو گھنٹے بعد جونی نے فون کیا۔

”سب ٹھیک ہو گیا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”پولیس کسی طرح چھوڑنے پر تیار نہ تھی لیکن ثبوت کے بغیر وہ روک بھی نہیں سکتے تھے۔“

”یہ بتاؤ کام ہو گیا کہ نہیں؟“

”بالکل ہو گیا۔“ جونی نے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے کہ انہوں نے سچ کے لیے مجھے وہاں روک لیا تھا۔ ایسے کر دو ایک گھنٹے کے بعد روبی اسٹیک بار میں ملو۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں پولیس میرے پیچھے نہ لگی ہو۔“ ایک گھنٹے کے بعد دونوں روبی اسٹیک بار میں اکٹھے

جونی نے پیٹر کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”مات معاملہ بخیر و خوبی انجام پا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ بے کا اگلا حصہ بھی کامیابی کے ساتھ مکمل ہو جائے گا۔“

”پولیس کو تم نے کیا بتایا؟“

”میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے کشیدہ ہیروں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“ جونی نے جواب دیا۔ ”یہ ہے کہ میں نے ہیرے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی تاہم اس دوران اسٹور کے اندر کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ بس ہیرے لوگوں کے ساتھ میں بھی حقیقت حال سے آگاہ ہونے کے لیے ادھر چلا گیا۔ میرے علاوہ اسٹور کے اندر ہمارا کب اور تھے۔ پولیس والے کسی ایک شخص پر بھی شک کا گہوارہ نہیں کر سکے۔ پھر وہ ہم پانچوں کو ایک کمرے کے لیے بلوا کر لے گئے۔ وہ اس بات کی تسلی کرنا چاہتے تھے کہ کسی نے ہیرے نکل تو نہیں لیے۔“

”میں بھی حیران تھا کہ اتنی دیر کہاں لگ گئی۔“ پیٹر نے کہا۔

”خوش قسمتی سے مجھے سب سے پہلے رخصت کر دیا گیا۔“ جونی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”دوسرے گاہکوں کا رویہ کچھ زیادہ ہی مشکوک تھا۔ غالباً وہ گھبرا گئے تھے بلکہ ایک نے تو کسی زمانے میں کار چوری کی تھی۔ یہ تریکارڈ سے نکل آئی۔ پولیس والے یہ سمجھ گئے کہ جو شخص کار چوری کر سکتا ہے، وہ ہیرے بھی چر سکتا ہے۔۔۔۔۔ اتنی کہیں گے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے اچھی طرح میری طرف دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔“

”میرے متعلق کسی نے شبہ کا اظہار تو نہیں کیا؟“

”میں نے پوچھا۔“ میں نے چونکہ گڑبڑ پھیلانی تھی اس لیے ہنسنا ہے کہ کوئی شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ میں نے اسے یہ حرکت کی تھی۔“

”تمہارا کسی کو خیال بھی نہیں آیا۔“ جونی نے کہا۔

”آج رات ہیرے حوض سے نکال لیں گے اور ایک دو روز کے بعد یہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔“

”ہیروں کی تعداد کتنی تھی؟“

”پانچ۔“ جونی نے کہا۔ ”پانچوں بڑھیا کو الٹی کے لیے۔“

شام کے اخبارات نے اس ”پراسرار ڈکیتی“ کی مدق کر دی۔ انہوں نے ہیروں کی قیمت کا تخمینہ پینسٹھ ارڈرز لگایا تھا آخر میں اس بات پر اظہار افسوس کیا گیا مگر پولیس مجرم کا سراغ لگانے میں ناکام رہی ہے۔

آدھی رات کے قریب دونوں حوض پر پہنچ گئے لیکن پیٹر جلد بازی کے حق میں نہیں تھا۔

”دوست جلد بازی میں بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا ہے۔“

”ہوسکتا ہے تمہاری نگرانی کی جارہی ہو۔ اس لیے ایک روز انتظار کر لیتا اچھا ہے۔ ہیرے بہر حال محفوظ ہیں۔“

جونی راضی ہو گیا اور دونوں واپس چلے گئے۔ اگلے روز ہیروں کی چوری کی خبر پرانی ہو گئی۔ بلکہ اس کی جگہ بینک میں ہونے والی ایک ڈکیتی نے لے لی۔

اگلی رات دونوں تقریباً تین بجے حوض کے کنارے پہنچ گئے۔ جونی مارچ لے کر کنارے پر بیٹھ گیا اور پیٹر جوتے اتار کر اور پتلون کے پانچے چڑھا کر حوض میں اتر گیا۔ نوارہ رات کو بند کر دیا جاتا تھا اس لیے حوض کے اندر گھسنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ پیٹر نے دو ہیرے تو اندر جاتے ہی ڈھونڈ لیے۔ پھر تقریباً دس منٹ کے بعد تیسرا ہیرا بھی مل گیا۔

”میرا خیال ہے کہ تین ہی کافی ہیں۔“ پیٹر نے کہا۔

”اب ہمیں چلے جانا چاہیے۔“

”نہیں، نہیں۔“ جونی نے کہا۔ ”جلدی نہیں کرو۔ دو ہیروں کی قیمت کم از کم پچیس ہزار ڈالر تو ضرور ہوگی۔ ذرا اچھی طرح تلاش کرو۔“

پیٹر پھر تلاش کرنے لگا۔ وقتاً دووں ایک تیز روشنی میں نہا گئے۔ ”خبردار!“ ایک آواز سنائی دی۔ ”اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ کوئی حرکت نہیں کرنا۔ ہم پولیس افسر ہیں۔“

”لعنت ہو تمہاری پولیس افسر پر۔“ جونی نے مارچ پھینک کر کہا اور بھاگنے کی کوشش کرنے لگا لیکن دو پولیس افسر اسکو ڈکار سے نکل کر ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے بلکہ ایک نے پستول بھی نکال لیا تھا۔ جونی نے بھاگنے کا ارادہ ترک کر دیا اور خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ پیٹر نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور خاموشی سے باہر نکل کر بولا۔

”آخر تم لوگوں نے ہمیں دھریا لیا؟“

”بالکل دھریا۔“ پستول بردار افسر گرجا۔

”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حوض کے اندر پائے جانے والے سکے ہر ماہ خیراتی فنڈ میں دیے جاتے ہیں۔ ان کو چراتا نہایت ہی گھٹیا حرکت ہے۔ مجھے امید ہے کہ مجسٹریٹ تم دونوں کو کم از کم تین تین مہینے کی سزائے قید دے گا۔ اب ذرا کار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ تا کہ تم دونوں کی تلاشی لے لی جائے۔“



دشت امکان

عاشق و ناطق

وہ کسی مملکت کی

ملکہ نہ سہی لیکن نام کی ملکہ ضرور تھی بلکہ کبھی کبھی ایسی دل لگی اتنی کٹھن آزمائش تخلیق کرتی ہے کہ ”ہمارے ہجر اگر آنکھوں کی پتلیاں قصے سمیٹو گے تولکھو گے... ہزاروں بار سوچو گے ہمیں تحریر کرنے تک ” ذرا پھیلا کر دیکھو تو اس کی کھلی تفسیر بن جاتی ہے... وہ جو کبھی دھوپ، کبھی چھانوں بن کر نظروں ایک مملکت بھی تھی۔ اس کی سے اوجھل ہو جاتا اور چھپ چھپ کر اپنے چاہنے والوں کے تڑپنے کا تمام فوجیں اس کے الفاظ تھے جو اس دیکھتا، وہ جو رشتے آزما کر لطف اٹھانے کا عادی تھا کہ اچانک وقت کے سامنے مضامین بنائے ہاتھ باندھے گردوغبار نے اسے ایسے ڈھانک لیا کہ کوئی بستی صحرا صحرا کھڑے رہتے تھے، جس لفظ کو آواز ڈھل گیا تھا یا راتوں کے اندھیروں میں گم ہو گیا کہ اس کو وقتی، وہ تلبیحات بجالاتا۔ کوئی بڑا معرکہ ہوتا پر چھائی تک کسی کو نہ ملی... ایسے دھندلے تصور کے سنا تو لفظوں کا لشکر لے کر نکلتی اور غنیم کے قلعے سار بھلا کوئی کیسے جیون گزارنے کے سہنے دیکھ سکتا ہے کر کے پٹتی۔ یہی الفاظ تھے جن کے سہارے وہ مگر... کسی نے ایسا سہنا دیکھنے کی غلطی کر ڈالی تھی اپنی حدود سلطنت میں برابر اضافے کرتی جا رہی تھی۔ اور پھر... انداز بیان کچھ ایسا تھا، ہر دل پہ اثر ہو جاتا تھا... اب چپ کا گہرا سا گروہوں وہ شعلہ بیانی بھول گئی... ”کا عکس بن کر رہ گئی۔ جس کے آگے لفظ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے، زندگی کے اس موڑ پر اپنا دکھ بیان کرنے کے قابل بھی نہ رہی۔ بس یہ سچا زندگی کی حکایت ہے اور حقیقت بھی یہی ہے یا تقدیر کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتی جھوٹا؟ جس کی جھولی میں جو ڈالنا ہو بڑا ایسی جرح سے ڈال دیتی ہے... چاہ کرتے تھے کہ

اکثر انہیں وکیل بنانے سے پہلے ہی بھاگ جاتے تھے لیکن جو ہمت کر کے ڈٹا رہتا تھا، اس کی کامیابی یقینی تھی۔ جب انہیں یقین ہو جاتا کہ کیس لانے والا سچا ہے تو پھر قیاس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جتنے پیسے جو دیتا، رکھ لیتے۔

ان تمام تر کوتاہیوں کے باوجود انہوں نے اتنا کر لیا تھا کہ شہر کے ایک بارونق علاقے میں شاندار مکان بنوایا تھا۔ پہلے ایک گاڑی تھی لیکن جب ملکہ کا لُج جانے لگی تو اس کے لیے الگ

اس کا کمر اثرا فیوں سے بھر گیا تھا۔ نمائش کا شوق نہیں تھا لیکن صحافیوں کو اس سے ملنے کا شوق ہو گیا تھا۔ نہ نہ کرتے کرتے بھی کئی بڑے اخباروں میں اس کے کارناموں کی تفصیل آپ و تاب سے شائع ہوئی تھی، حالانکہ اسے یہ تاب نہیں تھی کہ کوئی اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرے۔ نام ہی ایسا تھا کہ مزاج خود بخود شاہانہ ہو گیا تھا۔ زمین پر پاؤں اس طرح رکھتی تھی جیسے اتنا حصہ زمین اس نے فتح کر لیا ہو۔ کچھ لوگ اسے اس کا غرور کہتے تھے لیکن دراصل یہ اس کے اکلوتی ہونے کا خرا تھا یا پھر اس پشمان خون کا ابال تھا جو اس کی رگوں میں گردش کرتا رہتا تھا۔ اس کے والد اکثر کہا کرتے تھے کہ عام انسانوں کی رگوں میں لہو دوڑتا ہے، پشمان کی رگوں میں لہو اچھلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک نامی گرامی وکیل ہونے کے باوجود کروڑوں میں بھی نہیں کھیلے۔ جب ملکہ چھوٹی تھی، اس کے ساتھ کھیلتے تھے۔ کلب جاتے تھے اور دوستوں کے ساتھ برج کھیلتے تھے۔ کھیلنے کی فرصت اس لیے مل جاتی تھی کہ وہ مہینوں برسوں میں کوئی ایک کیس اپنے ہاتھ میں لیتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ کامل یا نا اہل تھے بلکہ اس لیے کہ کوئی جھوٹا کیس لینے کے روادار نہیں تھے۔ پہلے خود تحقیق کرتے تھے کہ ان کے پاس کیس لانے والا

سسپننس ڈائجسٹ 250 جون 2012ء

گاڑی ہو گئی۔

اس کی والدہ اپنے دور طالب علمی کی بہترین مقررہ تھیں۔ شاید یہ انہی کے دودھ کا اثر تھا، جو ملک کی تقریروں میں کل مل گیا تھا۔ جب تک وہ اسکول میں تھی، اس کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے اندر ایک مقررہ چھپی ہوئی ہے۔ اسے بھی یوں معلوم ہوا کہ اسکول میں اکثر تقریری مقابلے ہوا کرتے تھے۔ وہ ان تقریروں کو غور سے سنتی تھی۔ پھر گھر آ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور سنی ہوئی تقریروں میں اپنے خیالات شامل کر کے اس طرح ڈہرائی کہ خود پر خود ہی واری ہو جاتی۔ اس کی ملکہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوتی "یہ سب تو گرجتے ہیں، برستا کوئی تم سے سیکھے۔ یہ کیا کہ اندھیرے کو اندھیرا کہہ لیا۔ لفظوں کی چاندی یوں بکھیرو کہ اندھیرے کی کوکھ سے دن پھولے۔" لفظ بھی تو دوستوں کی طرح ہوتے ہیں اور دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا۔ ہم دوستوں کا انتخاب تو کرتے ہیں، لفظوں کا انتخاب نہیں کرتے۔ دلائل تو ناتراشیدہ ہیرا ہوتے ہیں جنہیں لفظوں سے تراشا جاتا ہے۔ جادو ایک حقیقت ہے لیکن اس کے لیے جادوگر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب بتاؤ جادو اہم ہوا یا جادوگر؟ لفظوں کی ترازو کے بغیر دلائل کا انبار اناج کے انبار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اناج پر تو جانور بھی منہ مار لیتے ہیں۔ دلائل انسانوں سے خطاب کرتے ہیں۔ یہ خطاب مرصع نہ ہو تو گوشت کی پکار بن کر رہ جاتا ہے جو متوجہ تو کرتا ہے، مطلب نہیں سمجھا سکتا۔

اپنے قد سے بڑی ہاتھیں سوچتے سوچتے وہ وقت آ گیا جب وہ اسکول کی دیوار پھلانگ کر کالج کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ اسکول اور کالج کے درمیان ایک سڑک کا فاصلہ تھا لیکن دراصل یہ دو زبانوں کے بیچ کا فاصلہ تھا۔ ملکہ اچانک نہ صرف بڑی ہو گئی تھی بلکہ پہلے سے زیادہ با اعتماد بھی۔

اس نے کالج میں ہونے والے ایک مہائے کے لیے اپنا نام پیش کر دیا۔ اپنے سوا کسی سے ہاتھیں نہیں کی تھیں اور مہائے کے لیے اپنا نام درج کر رہی تھی۔

"اس سے پہلے کسی مقابلے میں حصہ لیا ہے؟"

"اسکول کے زمانے میں تقریریں کرتی رہی ہوں۔" ملکہ نے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔

"اسکول اور کالج کا فرق جانتی ہو؟"

"منبر کوئی بھی ہو، کمال تو خطیب کا ہوتا ہے۔"

"بہت خوب!" مس نوشی نے کہا۔ "پھر تو ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ کمال خطیب کیا ہوتا ہے؟"

"انجیل کمال کے لیے اذن کلام کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"ہم جنہیں ایک موضوع دیتے ہیں، اس پر چند الفاظ بول کر دکھاؤ۔"

"مور جب اپنی دھن میں ناچتا ہے تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ جنگل کا جنگل اس کے ساتھ محور ہوتا ہے، بہر حال آپ موضوع دیں، میں کوشش کروں گی۔"

"جنہیں معلوم ہے مہائے میں قرارداد پیش کی جاتی ہے۔ اس کی حمایت میں بھی تقریریں کی جاتی ہیں اور مخالفت میں بھی۔"

"آپ کوئی بھی لڑکی میرے مقابل لے آئیں۔ وہ حمایت میں دلائل دے میں مخالفت کر لوں گی۔۔۔۔۔ یا وہ مخالفت کرے، میں حمایت کر لوں گی۔"

"دونوں فرائض تم خود ہی انجام دو۔ حمایت بھی تم خود ہی کرو، مخالفت میں بھی تم ہی دلائل دو۔"

"میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ چلنے کی سکت ہو تو دائیں بھی چلا جاسکتا ہے، بائیں بھی۔"

"آکھ او جھل پہاڑ او جھل!" یہ تھی وہ قرارداد جو اس کے سامنے پیش کی گئی۔

ملکہ نے سوچنے کے لیے کچھ وقت طلب کیا اور پھر اس کی آواز نے خاموشی کے تاروں کو چھیڑا۔

"آکھ کا کام دیکھنا ہے اور دل کا کام دیکھتے رہنا۔

جناب صدر! یہ قرارداد اس لیے ادھوری ہے کہ بعض حقیقتیں آکھ سے نہیں، دل سے دیکھی جاتی ہیں یا آنکھوں کے رستے دل میں اتر جاتی ہیں۔ پھر ہم خود تماشا ہوتے ہیں، خود ہی تماشا کی۔ آکھ کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ فریق ثانی کی جسمانی موجودگی ضروری نہیں رہتی۔ محبوب اور محب کا فرق مٹ جاتا ہے۔ یہ لمحہ اس وقت آتا ہے جب محبت سے محبت ہو جائے۔ محبت کسی غرض کی محتاج نہیں ہوتی۔ وجود محبوب شرط ہو تو آکھ پر تہمت۔ شرط مٹ جائے تو دل کے لیے نعمت۔ جذبہ یہ ہو تو پہاڑ کیا ذرہ بھی او جھل نہیں ہو سکتا۔

آکھ او جھل، پہاڑ او جھل پر یقین کرنے والے وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو غرض کے بندے ہیں، بدن کے پجاری ہیں۔ روح سے غافل ہیں، دنیا داروں میں شامل ہیں۔"

مس نوشی اور ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی دوسری

نہیں ان پھولوں کو برستے ہوئے دیکھ رہی تھیں جو ملکہ کے لبوں سے ادا ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت ہی تھی اور خوشی بھی لیکن ابھی تعریفی کلمات کا بے پناہ اظہار کی شان کے خلاف تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اب اگر اس قرارداد کی حمایت کرنی ہو تو کیا کہو گی؟"

ملکہ نے ان کی آنکھوں میں جھانکنا جیسے آئینہ دیکھ رہی ہو۔ پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ "جناب صدر! فاصلے بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ چہرے دھندلا جاتے ہیں۔ ہڈ بے سرد پڑ جاتے ہیں۔ ہاتھ جھوٹ جاتے تو ساتھ جھوٹ جاتے ہیں۔ زخم کتنا ہی گہرا ہو، وقت کے پاس ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ زندگی سفر ہے، جو رکتا نہیں۔ ایک چہرے کی جگہ دوسرا چہرہ لے لیتا ہے۔ دل کی دیوار سے ایک تصویر اترتی ہے تو کچھ دن نشان ضرور رہتا ہے۔ ایک نیس ی ضرور اٹھتی ہے لیکن رفتہ رفتہ نشان مٹ جاتا ہے اور درد کم ہو جاتا ہے۔ کبھی بھولے بسرے یاد آ جائے تو آجائے ورنہ راستہ سنسان پڑا رہتا ہے۔ پھر اس راستے پر کوئی اور مسافر آ نکلتا ہے۔ آکھ کا کام دیکھنا ہے، اسے دیکھتی ہے اور آکھ تو وہی دیکھتی ہے جو سامنے ہو۔ اسی لیے تو کہتے ہیں "آکھ او جھل، پہاڑ او جھل" اگر یہ حقیقت نہ ہوتی تو یہ بھی نہیں ہوتا کہ دو چھترنے والے جب اچانک ملتے ہیں تو وہی ہوتا ہے جو تیل کو ماچس دکھانے سے ہوتا ہے، یعنی دوری نے جس پہاڑ کو آکھ سے او جھل کر دیا تھا، قربت نے اسے پھر موجود کر دیا۔ میں اس قرارداد کی مکمل حمایت کرتی ہوں اور یقین رکھتی ہوں کہ دوری محبت کو کم کر دیتی ہے۔"

اس مرتبہ تو مس نوشی بھل سے کام نہ لے سکیں۔ ہر پورا دیکھی دی اور اپنی ہتھیلیوں کے کٹورے میں اس کا ہر دھڑک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"تم واقعی باکمال ہو۔ اتنی سی عمر میں ایسے پختہ خیالات، الفاظ کا ایسا چناؤ، لہجہ میں ایسا اعتماد۔ آکھ میں جنہیں میڈم سے ملو اؤں۔"

مس نوشی کو اپنی دریافت پر اتنا ناز ہو رہا تھا کہ ہارک سی ملکہ کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے میڈم کے کمرے کی طرف چل دیں۔ اس وقت ان کا وہی حال تھا جو کسی مصور کا اس وقت ہوتا ہے جب وہ کوئی شاہکار مکمل کرتا ہے۔

ملکہ کو اس کالج میں پڑھتے ہوئے ایک سال ہونے لگا رہا تھا۔ اس نے میڈم کو ایک دو بار دیکھا ضرور تھا لیکن

ان کے کمرے میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ہوتا بھی کیسے، میڈم کے پاس جانے سے سزا کا تصور ابھرتا تھا۔ عام طور پر وہی لڑکیاں میڈم کے کمرے کی سرکرتی تھیں جو شرارتوں کی بھیر میں کان سے کھلائی جاتی تھیں۔

میڈم کے کمرے میں سرکرتی لڑکیوں کو سزا سنائی جاتی تھی مگر وہ اپنی قابلیت کا انعام وصول کر لے جا رہی تھی۔

ماٹھے پر پسینے کے قطرے نہیں، کامیابی کے قطرے برے ہوئے تھے۔

"میڈم! یہ ملکہ ہیں۔"

"کیا، کیا ہے انہوں نے؟" میڈم نے چشمہ اپنی آنکھوں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"میڈم! یہ ہمارے کالج کا اثاثہ ہیں مگر افسوس کہ ایک سال بعد دریافت ہوئی ہیں۔ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہیں لہذا ایک سال بعد کسی میڈیکل کالج میں چلی جائیں گی۔"

"میں انہیں میڈیکل کالج میں جانے سے روک تو نہیں سکتی۔ مجھے تو یہ بتاؤ کہ انہوں نے ایسا کیا کارنامہ انجام دے دیا؟"

"میڈم، ایسی مقررہ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔"

"کمال ہے، یہ آپ کہہ رہی ہیں جو خود اپنے زمانے میں ایک مایہ ناز مقررہ چکی ہیں۔"

"میں اپنے تجربے کی روشنی میں ہی کہہ رہی ہوں۔ ہم اسے قائد ایوان، قائد حزب مخالف کچھ بھی بنا کر کہیں بھی کسی بھی مقابلے میں بھیج سکتے ہیں۔ اگر اسے آپ کی سرپرستی ملی تو ہمارا کالج اس لڑکی کے نام سے پہچانا جائے گا۔"

"مس نوشی، تم نے تو ہمارا اشتیاق بڑھا دیا۔" پھر وہ ملکہ سے مخاطب ہوئیں۔ "جس کرسی کے پاس تم کھڑی ہو اسے ڈانس تصور کرو اور اپنی شعلہ بانی دکھاؤ۔"

"میڈم، آپ کوئی موضوع دیں۔"

"بھئی ہمارے ذہن میں تو اس وقت موضوع کوئی نہیں ہے۔ تم نے اتنی تقریریں کی ہوں گی، اپنی تیار کی ہوئی تقریر میں سے کوئی بھی بنا دو۔"

ملکہ کو دل ہی دل میں ہنسی آ گئی۔ اس نے نہ کبھی کسی مقابلے میں حصہ لیا تھا، نہ کبھی کوئی تقریر تیار کی تھی۔ جو کچھ کتابوں میں پڑھا تھا، وہ محفوظ تھا یا فطری صلاحیت تھی جو چمک دکھائی رہتی تھی۔

سینس ڈانجسٹ 257 جون 2012ء

سینس ڈانجسٹ 257 جون 2012ء

سینس ڈانجسٹ 257 جون 2012ء

سینس ڈانجسٹ 257 جون 2012ء

سینس ڈانجسٹ 257 جون 2012ء

سینس ڈانجسٹ 257 جون 2012ء

اس نے تقدیر کو موضوع بنایا اور یوں شروع کیا۔ لگتا تھا بجلی کو بند رہی ہے۔ دلائل کا سمندر ہے جو ٹھانیں مار رہا ہے۔ اشعار کی رہنمائی، قرآن وحدیث کے حوالے، مفکرین کے اقوال۔ کیا نہیں تھا جو اس مختصر سے وقت میں اس نے میڈم کے حوالے نہیں کر دیا۔

میڈم کا کمر تالیوں سے گونج اٹھا۔ میڈم نے بھی وہی کیا جو اس سے پہلے مس نوشی کر چکی تھیں۔ اپنی جگہ سے اٹھیں اور اس کی پیشانی پر مہر شفقت ثبت کر دی۔ ”ماشاء اللہ اللہ نظر بد سے بچائے۔“

ملکہ خوشی کے بوجھ سے گردن جھکائے کھڑی تھی لیکن مس نوشی کی گردن فخر سے بلند ہو گئی تھی۔ اپنی کامیابی کو میڈم کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے دیکھا تو حوصلے نے ایک اڑان اور بھری۔

”ملکہ، یہ تو تم نے تقدیر کے حق میں تقریر کی۔ اب ذرا اس کی مخالفت بھی کر ڈالو۔ میڈم کو بتاؤ کہ اصل چیز تدبیر ہوتی ہے نہ کہ تقدیر۔“

ملکہ نے اس مرتبہ سوچنے کی دھمکت بھی نہیں کی۔ مس نوشی کی زبان سے جملہ ادا بھی نہیں ہوا تھا کہ ملکہ نے لفظوں کے طشت میں دلائل کے موتی سجا دیے۔ پھر تو یہ عالم تھا، وہ کہے اور سنا کرے کوئی۔ بجلی پھر کوندی، بادل پھر گر جا، جادو پھر جاگا۔ سماعتیں پھر حیران ہوئیں۔ ہوش آیا تو وہ اس شعر پر تقریر ختم کر رہی تھی۔

میں سمجھتی ہوں کہ میرے پاؤں ہیں میرے نصیب میں جدمر جاؤں وہی ہے فیصلہ تقدیر کا میڈم کا کمر ایک مرتبہ پھر جلسہ گاہ بن گیا۔ تالیوں نے شور مچایا۔ تعریفوں کے ہار ملکہ کے گلے میں آ گئے۔ تقابلی سال کے دوسرے سیشن کی نرم و نازک سی لڑکی، اس شان سے بیٹھی تھی جیسے کمرے میں اس کے سوا کوئی نہ ہو۔ ”مس نوشین، آپ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ یہ لڑکی ہمارے کالج کے لیے واقعی اثاثہ ہے۔ فی البدیہہ تقریر اور ایسی مرصع۔“

”میڈم، میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا۔“

”اچھا ملکہ، یہ بتاؤ.....“ میڈم نے پوچھا۔ ”اب تک تم کتنے مقابلوں میں حصہ لے چکی ہو؟“

”اب تک میں نے صرف آئینے کے سامنے تقریریں کی ہیں، کسی مقابلے میں کبھی حصہ نہیں لیا۔“

اس کا یہ کہنا تھا کہ سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ مس نوشی تو یوں چونک پڑیں جیسے ان کا جھوٹ پکڑا

گیا ہو۔

”ملکہ، تم تو یہ کہہ رہی تھیں کہ اسکول کے مقابلوں میں حصہ لیتی رہی ہو؟“

”یہ نہ کہتی تو آپ میرا نام کبھی شامل نہ کرتیں.....“

ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی کسی مقابلے میں حصہ نہیں لیا۔ اس جھوٹ کے لیے معافی چاہتی ہوں۔ چاہیں تو میرا نام کاٹ دیں۔“

”یہ کہہ کر تو تم نے اور بھی حیران کر دیا۔ کبھی تقریر نہیں کی اور ایسی تقریر کرتی ہو!“

میڈم کی حیرانی نے ایک اور ہی رنگ اختیار کیا۔ انہیں ملکہ کے بارے میں جاننے کا شوق دامن گیر ہوا۔

”ملکہ، تمہارے بہن بھائیوں میں سے بھی کوئی مقرر ہے؟“

”میرا کوئی بہن بھائی نہیں، میں اکلوتی ہوں۔“

”تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟“

”وہ جی وکیل ہیں ہائی کورٹ کے۔“

”پھر تو یہ انہی کا اثر ہے جو تمہارے دلائل میں آیا ہے۔ گھر کے ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ کیا..... نام کیا ہے تمہارے والد کا؟“

”عباد اللہ خاں۔“

”تمہاری والدہ بھی کہیں جاب وغیرہ کرتی ہیں؟“

”جی نہیں۔ وہ پڑھی لکھی تو ہیں لیکن میرے ابو عورتوں کی نوکری کے حق میں نہیں اس لیے.....“

”اوہ، آئی سی!“

”اپنی امی سے کہنا کسی دن مجھ سے آکر ملیں۔“

”میری شکایت کریں گی؟“ ملکہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”نہیں، تمہاری ڈھیر ساری تعریف کروں گی۔“

ملکہ نے ان کا شکریہ ادا کیا اور مس نوشی اسے وہاں سے لے کر اٹھ گئیں۔ اب کالج کی چھٹی کا وقت ہونے کو آیا تھا۔ وہ کچھ دیر مس نوشی کے کمرے میں جا کر بیٹھی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ اب تک ڈرائیور اسے لینے آچکا ہوگا لہذا وہ کالج سے باہر نکل آئی۔

خوشیوں اور تعریفوں سے لدی پھندی وہ گھر پہنچی تو اس کا جی چاہا کہ اپنی خوشیوں میں ماں کو بھی شریک کرے۔ اکیلی تھی لہذا ہر کام میں ماں کو شریک کیا کرتی تھی۔ آتے ہی باتوں کا پنڈو درابکس کھول کر بیٹھ جاتی تھی۔ آج کالج میں یہ ہوا تھا، آج وہ ہوا تھا۔ اس کی والدہ بھی

دشست امکال

الحال جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔ تمہارے پاپا بھی بس آتے ہی ہوں گے۔“

”تو یہ ہے، میڈم کو بھی اسی وقت آنا تھا۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور چہل کھینٹی ہوئی داش روم کی طرف بڑھ گئی۔

کپڑے بدلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اس سے ایسا کیا کارنامہ سرزد ہو گیا کہ میڈم سے صبر نہ ہوا اور ڈھنڈورا پیٹنے چلی آئیں۔ میرا تو سارا پلان ہی تیل کر دیا۔

میں امی کو اندھیرے میں رکھنا چاہتی تھی، انہوں نے سب کچھ بتا بھی دیا۔

وہ چور بنی، ڈرتی، جھجکتی ڈرائنگ روم میں پہنچی تو میڈم کو براجمان دیکھا۔ شاگردوں کے لیے پریسل تو مافوق الفطرت ہستی ہوتی ہے۔ یہاں وہ عام سی عورت کی طرح اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ اس نے ادب سے سلام کیا اور ایک طرف بیٹھنے لگی لیکن میڈم نے بلا کر اپنے پاس بٹھالیا۔ تعریفوں کے وہی پھول پھر نچھادر ہونے لگے جن کی جھک ابھی تک اس کی رگ رگ میں رہی ہوئی تھی۔

اب میڈم کے ساتھ اس کی والدہ بھی اس میں شریک تھیں۔

”میڈم، آپ تو کہہ رہی تھیں کہ میں امی کو آپ کے پاس بھیجوں، آپ خود ہی چلی آئیں۔“

”میں نے سوچا تمہاری امی کو تو جب فرصت ہوگی، تب آئیں گی اور مجھے بھی جلدی۔“

”چلیے اچھا ہوا آپ آئیں مگر آپ کو ایڈریس کیسے معلوم ہوا؟“

”مجھے کیا نہیں معلوم ہے۔ اپنے پاپا کو آنے دو۔ وہ انکشاف کروں گی کہ تم بھی کہو گی مجھے کیا، کیا معلوم ہے۔“

ملکہ اور اس کی والدہ دونوں یہ سمجھے تھے کہ جو تعریفیں وہ اب تک کرتی رہی ہیں، ان میں کوئی اور اضافہ کر دیں گی اور کیا انکشاف ہو سکتا ہے۔

عباد اللہ خاں کورٹ سے تو کب کے فارغ ہو چکے تھے۔ اپنے دفتر میں دوستوں کے ساتھ کب شپ لڑا رہے تھے۔ بیوی کا فون پہنچا کہ ملکہ کی پریسل آئی بیٹھی ہیں اور ان کا انتظار ہو رہا ہے تو وہ بھی یہی سمجھے کہ ملکہ کی کوئی شکایت لائی ہوں گی۔ انہوں نے بیوی سے کہا بھی کہ وہ خود ہی بات کر لیں لیکن جب انہوں نے یہ کہا کہ وہ ان سے ملنے کی خواہش مند ہیں تو انہیں دوستوں سے اجازت لینا پڑی۔

گھر آئے تو کالے کوٹ ہی میں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ میڈم انہیں دیکھ کر کھڑی ہوئیں تو ملکہ کو تعجب بھی ہوا

ت کرنے کو ترستی تھیں لہذا ملکہ کے دم کو غنیمت سمجھتی تھیں۔ آج وہ دیکھ رہی تھیں کہ ملکہ چپ ہے۔ ملکہ یہ سوچ

ی ہی کہ ابھی بتانے کا کیا فائدہ۔ جب وہ کسی مقابلے میں فریک ہوگی اور انعام جیت کر لائے گی، اس دن ماں پر ظاہر کرے گی۔

”ملکہ، آج کیا کالج میں سب نے چپ کا روزہ رکھا؟“

”کیا ہوا امی؟“

”آج کالج سے آ کر تو نے کوئی بات ہی نہیں کی۔“

”آج کوئی اہم بات ہوئی ہی نہیں تو بتاتی کیا؟“

”یہی میں سوچ رہی تھی کہ آج تیری زبان کی قینچی میرے کان کیوں نہیں کتر رہی ہے۔“

ملکہ ہنس کر چپ ہو گئی۔ وہ کیا بتاتی کہ آج اس کی قینچی ایسی چلی ہے کہ بڑے بڑوں کے کان کتر دیے ہیں۔

اب میں نہیں میری باتیں آپ کو دوسرے سنائیں گے۔

اس کی ماں نے بھی فی الحال اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اسے زیادہ چھینرو تو منہ پھلا کر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ بیٹھتی تو ماں کے پاس تھی۔ یہاں بیٹھنے کو جی نہ چاہا تو اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر اپنی کامیابیوں کے خوابوں سے کھلتی رہی پھر نیند نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

اسے تو یوں لگا جیسے ابھی سوئی تھی، ابھی اٹھادی گئی ہو۔ اس کی ماں اس کے سر ہانے کھڑی اسے یوں بیدار کر رہی تھیں جیسے بہت جلدی میں ہوں۔ اس نے کر دٹ

ہل لیکن جب کان کھینچنے کی نوبت آئی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کیا ہے امی! آپ تو سونے بھی نہیں دیتیں ٹھیک سے۔“

”میں نہیں، جو آیا ہے اس کا حکم ہے کہ تمہیں اٹھادیا جائے۔“

”پاپا یہ حرکت کبھی نہیں کر سکتے۔“

”پاپا نہیں، تمہاری پریسل آئی بیٹھی ہیں۔ نہ جانے کالج میں کیا کر کے آئی ہو کہ شکایت گھر تک پہنچ گئی ہے۔“

”امی! آپ کیا سمجھتی ہیں۔ میں نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی ہوگی؟ میں کر سکتی ہوں؟“

”نہیں میری جان! تمہاری شکایت نہیں، تعریف گھر تک آئی ہے۔ تمہاری میڈم تمہاری اتنی تعریف کر رہی ہیں کہ میرا سر فخر سے بلند ہو گیا ہے۔ یہ تو میں بعد میں چوں گی کہ تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی کیوں، فی

سینس ڈائجسٹ 259 جون 2012ء

اور فخر بھی کہ لوگ اس کے باپ کی کتنی عزت کرتے ہیں۔ میڈم نے بات تو ملکہ کی تعریف سے شروع کی لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہیں۔ پھر انہوں نے اچانک یہ سوال اٹھا دیا۔

”عباد بھائی، آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟“

”یہ بتا تو رہی تھیں کہ آپ ملکہ کی پرنسپل ہیں۔“

”اس کے علاوہ آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟“

”محترمہ، میں آپ سے آج پہلی بار مل رہا ہوں۔“

”جہاں تک مجھے یاد ہے آج سے پہلے بھی کئی بار مل چکے ہیں۔ بات پرانی ہو گئی اس لیے یاد نہیں ہوگا۔“

سب کے چہرے فٹ تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ ملکہ کبھی باپ کی طرف دیکھتی، کبھی میڈم کی طرف۔ یہی حال اس کی والدہ کا بھی تھا۔ ملکہ نے اپنے باپ کو پہلی مرتبہ گھبرائے ہوئے دیکھا تھا۔ بھری عدالت میں جرح کرنے والا، لا جواب نظر آ رہا تھا۔

میڈم اس عقدے کے حل کی طرف بڑھیں ”میرا نام شہناز آفریدی ہے۔“

”آپ کا نام تو میں اپنی بیٹی ملکہ سے بھی پوچھ سکتا تھا۔ آپ یہ کون سی نئی بات بتا رہی ہیں۔“

”آگے تو سنئے۔“ میڈم نے کہا ”آپ کی والدہ کے ایک سوتیلے چچا تھے جنہیں سب چاچا بابو کہا کرتے تھے۔ شاید آپ کو بھی یاد ہوں۔“

”آپ انہیں کیسے جانتی ہیں؟“

”میری چھوڑیے، یہ بتائیے آپ کو یاد ہیں یا نہیں؟“

”جی یاد ہیں، آگے کہیے۔“

”وہ یاد ہیں تو ان کے بیٹے نعمت اللہ بھی یاد ہوں گے۔“

”وہ بھی یاد ہیں کیونکہ وہ تو رہتے ہی ہمارے گھر کے ایک حصے میں تھے مگر آپ کو یہ سب داستان کس نے سنا دی؟“

”عباد بھائی، اب آگے بھی تو سنئے۔“ میڈم اس وقت بالکل بچی لگ رہی تھیں ”آپ کے انہی نعمت ماموں کی ایک لڑکی تھی جس سے آپ کی خوب بنتی تھی۔ اپنی اماں کے منع کرنے کے باوجود آپ اس کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔“

عباد اللہ خاں کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا تھا۔ وہ

خوف زدہ آنکھوں سے میڈم کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کا کوئی راز کھلنے والا ہو، جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

میڈم کی کہانی سفر میں تھی۔ ”پھر یاد ہے..... نعمت ماموں کا انتقال ہو گیا تھا۔ چاچا بابو پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ اب نعمت ماموں کی بیوہ کا اس گھر میں کوئی نہیں رہا تھا۔ آپ کی والدہ اس بیوہ سے پہلے ہی خوش نہیں تھیں، اب ستانے کا موقع مل گیا۔ وہ بیوہ اس لڑکی کو لے کر اپنے بھائی کے گھر منتقل ہو گئیں۔ اس بچی کا نام شہناز تھا اور وہ میں ہوں..... عباد بھائی!“

”تم..... وہ شہناز ہو، نعمت ماموں کی بیٹی..... میڈم شہناز!“ عباد اللہ خاں اپنی جگہ سے اٹھے۔ میڈم بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ عباد اللہ خاں نے آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگالیا۔ دونوں کی آنکھیں نم تھیں۔ الگ ہوئے تو عباد اللہ خاں نے ان کے سر پر ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں تو خیر معلوم ہی نہیں تھا کہ تم کہاں گئیں لیکن تم نے بھی ملنے کی زحمت نہیں کی۔ اسی شہر میں ہو، مجھ سے یقیناً واقف بھی ہوگی۔ پھر آج سے پہلے کیوں نہیں آگئیں؟“

”آپ ہی ڈھونڈ لیتے۔“

”میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ تمہارے چلے جانے کے بعد ابانے وہ مکان بیچ دیا اور ہم بہن بھائیوں کے بہتر مستقبل کے لیے یہاں آ گئے۔ بچپن کے کھلونے، دوست احباب یاد تو بہت آتے ہیں لیکن بہت دور ہو جاتے ہیں۔ کچھ دن تم لوگ بہت یاد آئے پھر مصروفیات نے کچھ سوچنے ہی نہیں دیا۔ تم نے کمال کر دیا، مجھے یاد رکھا۔ پہچان بھی لیا اور یہاں تک چلی آئیں۔ یہ سب ہوا کیسے، کہا جاسوس پیچھے لگائے ہوئے تھے۔“

”قصہ یہ ہے کہ کچھ دن پہلے آپ کا انٹرویو کسی اخبار میں شائع ہوا تھا۔ بس یہ انٹرویو میرے لیے تلاش کم شدہ کا اشتہار ثابت ہوا۔ آپ نے اس میں کچھ ایسی باتیں کہہ دی تھیں کہ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ آپ ہی ہیں جو اب ایڈووکیٹ بنے گھوم رہے ہیں۔“

”بندی خدا کی، جب سراغ مل ہی گیا تھا تو آ کر مل لیتیں۔“

”بس ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ نہ جانے آپ کس طرح ملیں۔ آپ کا جو تصور ذہن میں تھا، میں اس کو قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ملکہ سے ملاقات ہوئی، اس کی والدہ

معلوم ہوئی تو نہ جانے کیوں اس میں مجھے آپ کی جھلک

حالی دی۔ غور کیا تو وہی نقش و نگار تھے۔ میں نے سوچا یہ

لے لیا جائے، چل کر دیکھا تو جائے، یہ وہی

ہاں اللہ ہیں یا کوئی اور۔ اگر وہی عباد اللہ ہوئے تو ٹھیک

اور نہ میرے پاس بہانہ تو ہے، میں تو اپنی اسٹوڈنٹ کے

گھر آئی ہوں۔“

کچھ دیر کے لیے ماحول اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ سب

کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں لیکن میڈم کو باتوں میں الجھانے

کا طریقہ آتا تھا۔ انہوں نے کچھ ایسی باتیں پھینک دیں کہ

کچھ دیر کے لیے سب کے چہرے گلزار ہو گئے۔ سب سے

زیادہ خوشی ملکہ کو ہو رہی تھی۔ میڈم کا رعب پورے کالج پر

تھا لیکن اس وقت وہ کوئی دوسری ہی خاتون معلوم ہو رہی

تھیں۔ ملکہ کو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ اس

دشت امکان

تھی۔“

”کامیابی اور شکست کوئی نہیں بھولتا، آپ کیسے

بھول سکتیں؟“

”میں کامیابی بھول گئی، شکست یاد رہی۔ اب اپنی

شکست کا قصہ تجھے کیا سنائی؟“

”آپ تو ابھی کہہ رہی تھیں کہ آپ ناقابل شکست

تھیں؟“

”شکست یوں ہوئی کہ تمہارے پاپا سے میری

شادی ہو گئی۔ سارے شوق دھڑے رو گئے۔ اب تو یاد بھی

نہیں کہ میں کیا تھی۔“

”یہ تو پاپا کی شکست ہوئی۔“ ملکہ نے کہا اور بھاگتے

ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بیگم عباد اللہ اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے

لیٹیں تو ارسلان ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

ارسلان سے ان کی ملاقات ایک مقابلے کے

دوران ہوئی تھی۔ وہ تقریر کرنے کے بعد تالیوں کی گونج

میں اپنی جگہ آ کر بیٹھی تھیں کہ ارسلان کا نام پکارا گیا۔

انہوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ نیلی آنکھوں، گورے

رنگ کا ایک دراز قد لڑکا اپنی جگہ سے اٹھا اور پروتار چال

چلتا ہوا اسٹیج پر پہنچ گیا۔ وہ لڑکا کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

چہرے کا رنگ بتا رہا تھا کہ وہ نروس ہے۔

ان کی تقریر کی گونج اب تک سنائی دے رہی تھی۔

ارسلان کی تقریر کے ابتدائی جملے ہوا میں گھلیل ہو گئے۔ کسی

نے توجہ بھی نہیں دی لیکن یہ کیا، اس نے ایک شعر پڑھا اور

پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ وہ اسی موقع کی تلاش میں

تھا۔ سامعین کی توجہ ملتے ہی اس نے ایسے مضبوط دلائل

دیے کہ سب کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیا۔ انہیں خود تعجب

ہو رہا تھا کہ کیا تقریر اس طرح بھی کی جاسکتی ہے۔ یہ تعجب

بھی ہو رہا تھا کہ ایسا عمدہ بولنے والا کسی مقابلے میں آج

سے پہلے نظر کیوں نہیں آیا؟

وہ تقریر کر کے نیچے اترتا تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اپنے

ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا۔ اس کے بعد وہی ہوا جس کا

انہیں اندیشہ تھا۔ نتائج کا اعلان ہوا تو انہیں دوسرا انعام ملا

اور ارسلان پہلے انعام کا حق دار ٹھہرا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب وہ پہلے نمبر سے دوسرے نمبر پر

آ گئی تھیں۔ انہیں ایسا افسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی انعام ملا ہی

نہ ہو۔ وہ بہت غصے میں تھیں لیکن اپنے جذبات پر قابو رکھنا

مجبور تھا۔

میں تو بھول بھال گئی

مجھے خود بھی یاد آیا ہے۔ میں تو بھول بھال گئی

تھی۔“

☆ ☆ ☆

ہاتھ میں ثرائی کیا آئی، آنسوؤں کو بہا نہ لے گیا۔ کالج

کے باہر کا مقابلہ تھا۔ شہر بھر کے نائی گرامی مقرر شریک تھے

اور اس نے پہلا انعام حاصل کر لیا تھا۔ مس لوشی اسے

پہنائے کھڑی تھیں اور وہ بھی کہہ روئے جا رہی تھی۔

”اتنے قیمتی موتی یوں مت لٹاؤ۔“

”مس، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا

ہے کہ میں.....“ اس کی ہنسی بندھ گئی۔

”تم اس کی حق دار نہیں۔ تقریر کے دوران ہی مجھے

اندازہ ہو گیا تھا کہ ثرائی تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔“

وہ گھر پہنچی تو ماں کی مبارک باد نے اس کا استقبال

کیا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔ اس

وقت وہ ملکہ کے روپ میں اپنا ٹکس دیکھ رہی تھیں۔

”ملکہ! تجھے پتا ہے، میں بھی اپنے طالب علمی کے

زمانے میں ان مقابلوں میں حصہ لیا کرتی تھی اور ہمیشہ اول

آتی تھی۔ میں ناقابل شکست تصور کی جاتی تھی۔“

”ارے واہ ای، آپ تو بڑی چھپی رستم ہیں۔ آپ

نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ آپ تو مجھے ہر بات بتاتی ہیں، یہی

ات چھپا گئیں۔“

مجھے خود بھی یاد آیا ہے۔ میں تو بھول بھال گئی

تھی۔“

☆ ☆ ☆

ہاتھ میں ثرائی کیا آئی، آنسوؤں کو بہا نہ لے گیا۔ کالج

کے باہر کا مقابلہ تھا۔ شہر بھر کے نائی گرامی مقرر شریک تھے

اور اس نے پہلا انعام حاصل کر لیا تھا۔ مس لوشی اسے

پہنائے کھڑی تھیں اور وہ بھی کہہ روئے جا رہی تھی۔

”اتنے قیمتی موتی یوں مت لٹاؤ۔“

”مس، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا

ہے کہ میں.....“ اس کی ہنسی بندھ گئی۔

”تم اس کی حق دار نہیں۔ تقریر کے دوران ہی مجھے

اندازہ ہو گیا تھا کہ ثرائی تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔“

وہ گھر پہنچی تو ماں کی مبارک باد نے اس کا استقبال

کیا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔ اس

وقت وہ ملکہ کے روپ میں اپنا ٹکس دیکھ رہی تھیں۔

”ملکہ! تجھے پتا ہے، میں بھی اپنے طالب علمی کے

زمانے میں ان مقابلوں میں حصہ لیا کرتی تھی اور ہمیشہ اول

آتی تھی۔ میں ناقابل شکست تصور کی جاتی تھی۔“

”ارے واہ ای، آپ تو بڑی چھپی رستم ہیں۔ آپ

نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ آپ تو مجھے ہر بات بتاتی ہیں، یہی

ات چھپا گئیں۔“

مجھے خود بھی یاد آیا ہے۔ میں تو بھول بھال گئی

تھی۔“

☆ ☆ ☆

ہاتھ میں ثرائی کیا آئی، آنسوؤں کو بہا نہ لے گیا۔ کالج

کے باہر کا مقابلہ تھا۔ شہر بھر کے نائی گرامی مقرر شریک تھے

اور اس نے پہلا انعام حاصل کر لیا تھا۔ مس لوشی اسے

پہنائے کھڑی تھیں اور وہ بھی کہہ روئے جا رہی تھی۔

”اتنے قیمتی موتی یوں مت لٹاؤ۔“

”مس، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا

ہے کہ میں.....“ اس کی ہنسی بندھ گئی۔

”تم اس کی حق دار نہیں۔ تقریر کے دوران ہی مجھے

اندازہ ہو گیا تھا کہ ثرائی تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔“

وہ گھر پہنچی تو ماں کی مبارک باد نے اس کا استقبال

کیا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔ اس

وقت وہ ملکہ کے روپ میں اپنا ٹکس دیکھ رہی تھیں۔

”ملکہ! تجھے پتا ہے، میں بھی اپنے طالب علمی کے

زمانے میں ان مقابلوں میں حصہ لیا کرتی تھی اور ہمیشہ اول

آتی تھی۔ میں ناقابل شکست تصور کی جاتی تھی۔“

”ارے واہ ای، آپ تو بڑی چھپی رستم ہیں۔ آپ

نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ آپ تو مجھے ہر بات بتاتی ہیں، یہی

ات چھپا گئیں۔“

مجھے خود بھی یاد آیا ہے۔ میں تو بھول بھال گئی

تھی۔“

☆ ☆ ☆

ہاتھ میں ثرائی کیا آئی، آنسوؤں کو بہا نہ لے گیا۔ کالج

کے باہر کا مقابلہ تھا۔ شہر بھر کے نائی گرامی مقرر شریک تھے

اور اس نے پہلا انعام حاصل کر لیا تھا۔ مس لوشی اسے

پہنائے کھڑی تھیں اور وہ بھی کہہ روئے جا رہی تھی۔

”اتنے قیمتی موتی یوں مت لٹاؤ۔“

”مس، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا

ہے کہ میں.....“ اس کی ہنسی بندھ گئی۔

”تم اس کی حق دار نہیں۔ تقریر کے دوران ہی مجھے

اندازہ ہو گیا تھا کہ ثرائی تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔“

وہ گھر پہنچی تو ماں کی مبارک باد نے اس کا استقبال

کیا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔ اس

وقت وہ ملکہ کے روپ میں اپنا ٹکس دیکھ رہی تھیں۔

”ملکہ! تجھے پتا ہے، میں بھی اپنے طالب علمی کے

زمانے میں ان مقابلوں میں حصہ لیا کرتی تھی اور ہمیشہ اول

آتی تھی۔ میں ناقابل شکست تصور کی جاتی تھی۔“

”ارے واہ ای، آپ تو بڑی چھپی رستم ہیں۔ آپ

نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ آپ تو مجھے ہر بات بتاتی ہیں، یہی

ات چھپا گئیں۔“

مجھے خود بھی یاد آیا ہے۔ میں تو بھول بھال گئی

تھی۔“

☆ ☆ ☆

ہاتھ میں ثرائی کیا آئی، آنسوؤں کو بہا نہ لے گیا۔ کالج

کے باہر کا مقابلہ تھا۔ شہر بھر کے نائی گرامی مقرر شریک تھے

اور اس نے پہلا انعام حاصل کر لیا تھا۔ مس لوشی اسے

پہنائے کھڑی تھیں اور وہ بھی کہہ روئے جا رہی تھی۔

”اتنے قیمتی موتی یوں مت لٹاؤ۔“

”مس، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا

ہے کہ میں.....“ اس کی ہنسی بندھ گئی۔

”تم اس کی حق دار نہیں۔ تقریر کے دوران ہی مجھے

اندازہ ہو گیا تھا کہ ثرائی تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔“

وہ گھر پہنچی تو ماں کی مبارک باد نے اس کا استقبال

کیا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔ اس

وقت وہ ملکہ کے روپ میں اپنا ٹکس دیکھ رہی تھیں۔

”ملکہ! تجھے پتا ہے، میں بھی اپنے طالب علمی کے

زمانے میں ان مقابلوں میں حصہ لیا کرتی تھی اور ہمیشہ اول

آتی تھی۔ میں ناقابل شکست تصور کی جاتی تھی۔“

”ارے واہ ای، آپ تو بڑی چھپی رستم ہیں۔ آپ

نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ آپ تو مجھے ہر بات بتاتی ہیں، یہی

ات چھپا گئیں۔“

مجھے خود بھی یاد آیا ہے۔ میں تو بھول بھال گئی

تھی۔“

☆ ☆ ☆

ہاتھ میں ثرائی کیا آئی، آنسوؤں کو بہا نہ لے گیا۔ کالج

کے باہر کا مقابلہ تھا۔ شہر بھر کے نائی گرامی مقرر شریک تھے

اور اس نے پہلا انعام حاصل کر لیا تھا۔ مس لوشی اسے

پہنائے کھڑی تھیں اور وہ بھی کہہ روئے جا رہی تھی۔

”اتنے قیمتی موتی یوں مت لٹاؤ۔“

”مس، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا

ہے کہ میں.....“ اس کی ہنسی بندھ گئی۔

”تم اس کی حق دار نہیں۔ تقریر کے دوران ہی مجھے

اندازہ ہو گیا تھا کہ ثرائی تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔“

وہ گھر پہنچی تو ماں کی مبارک باد نے اس کا استقبال

کیا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔ اس

وقت وہ ملکہ کے روپ میں اپنا ٹکس دیکھ رہی تھیں۔

”ملکہ! تجھے پتا ہے، میں بھی اپنے طالب علمی کے

زمانے میں ان مقابلوں میں حصہ لیا کرتی تھی اور ہمیشہ اول

آتی تھی۔ میں ناقابل شکست تصور کی جاتی تھی۔“

”ارے واہ ای، آپ تو بڑی چھپی رستم ہیں۔ آپ

نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ آپ تو مجھے ہر بات بتاتی ہیں، یہی

ات چھپا گئیں۔“

مجھے خود بھی یاد آیا ہے۔ میں تو بھول بھال گئی

تھی۔“

☆ ☆ ☆

تک پہنچ گئی تھیں۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔
”بیٹھے۔“

”یہ آپ کی گاڑی ہے؟“

”ڈیڈی کی۔“ انہوں نے ارسلان کو کچھ اور کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اس کے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

”ہوٹل اسٹار چلو۔“ انہوں نے ڈرائیور کو حکم دیا۔
ہوٹل پہنچے تک دونوں چپ بیٹھے رہے تھے۔ ہوٹل نزدیک ہی تھا لہذا کوئی ایسی زیادہ الجھن بھی نہیں ہوئی۔ ایک دوسرے ارسلان نے پوچھا بھی کہ ہم ہوٹل کیوں جا رہے ہیں لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ان سے اتنا مرعوب ہو چکا تھا کہ زیادہ زور دینے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔

ہوٹل پہنچنے کے بعد دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔
”ارسلان، تم میرے مقابلے میں جان بوجھ کر کیوں ہار گئے؟“

”بھلا جان بوجھ کر بھی کوئی ہارتا ہے۔“ ارسلان نے کہا لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

”بعض احمق ہوتے ہیں ایسے۔“

”میں آپ کو احمق دکھائی دیتا ہوں؟“

”بعض ہوتے ہیں مگر وہ کھائی نہیں دیتے۔“

”بس، یہی لطیفہ سنانے کو یہاں لائی تھیں۔“

”ارسلان، میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ تمہارے ہارنے کا مجھے دکھ ہوا ہے۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں۔ تم جان بوجھ کر کیوں ہارے؟“

”سچ بتاؤں؟“

”سچ ہی پوچھ رہی ہوں۔“

”سچ تو یہ ہے کہ آپ کا ہارنا مجھے گوارہ نہیں تھا۔“

”پوچھ سکتی ہوں، کیوں؟“

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس میرا دل چاہ رہا تھا، آپ خوش ہو جائیں۔ میں آپ کو اداس نہیں دیکھ سکتا تھا۔“

”وہی تو پوچھ رہی ہوں، کیوں؟“

”یہ بتانے کی نہیں سمجھنے کی بات ہے۔ اس جذبے کا جو بھی نام ہے، وہ آپ خود جانتی ہیں۔ میں اسے خود کوئی نام نہیں دے سکتا کہ میں آپ کے لائق نہیں۔“

”بس اور کار کے فرق کے سوا بھی کوئی فرق ہے؟“

”اس فرق کو آپ معمولی فرق سمجھتی ہیں؟“

”میں تو فرق ہی نہیں سمجھتی۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ

بھی ضروری تھا۔ پھر انہیں یاد آیا۔ وہ ریفریجیٹ کی ٹیبل پر ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔“ اس نے کہا تھا۔

”کیسی زیادتی؟“

”آپ کی تقریر مجھ سے اچھی تھی۔ پہلا انعام آپ کو ملنا چاہیے تھا۔“

”نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی تقریر مجھ سے اچھی تھی۔ منصفین ہم دونوں سے بہتر جانتے ہیں کہ کون بہتر ہے۔“

”منصفین غلطی بھی تو کر سکتے ہیں۔“

”غلطی ہوئی بھی ہے تو اسے زیادتی نہیں کہہ سکتے۔“

پھر کوئی درمیان میں آ گیا تھا۔ سلسلہ کلام منقطع ہوا تو ارسلان کے پرستاروں نے اسے گھیر لیا۔ وہ بھی کسی اور سے معروف گفتگو ہو گئی تھیں۔

بات آئی کئی ہو گئی تھی۔ لیکن بعض باتیں گزر جانے کے لیے نہیں ہوتیں۔ ایک اور مقابلے میں ان کا سامنا ارسلان سے ہو گیا مگر اس دن عجیب ماجرا ہوا۔ بیگم عباد اللہ اس سے پہلے ایک مقابلہ ہار چکی تھیں اس لیے خوب تیاری سے آئی تھیں۔ تقریر کو پڑھا بھی اس خوبصورتی سے کہ سب اش اش کراٹھے۔ ارسلان کا نام آیا تو اس کے قدم ہی بتا رہے تھے کہ وہ کس ارادے سے جا رہا ہے۔ ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتا ہوا اسے تک پہنچا۔ تقریر بھی یوں کر رہا تھا جیسے لکھی ہوئی تحریر پڑھ رہا ہے۔ ایک آدمہ جگہ بھول بھی گیا۔

اس نے پورا موقع دیا اور دوسرا انعام تو دور کی بات کسی بھی انعام کا مستحق نہیں ٹھہرا۔ مقابلہ ختم ہوا تو وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئیں۔ تعارف تو ہو ہی چکا تھا۔ بات کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

”تمہارے پاس گاڑی ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”کیسے جاؤ گے؟“

”کالج والوں نے ٹیکسی کا کرایہ دیا تھا۔“

”میرے ساتھ آئے۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ کہیں کی تو آپ کو بھی چھوڑ دوں گا۔“

بیگم عباد اللہ کو اب تک یاد تھا کہ وہ دل میں بہت ہنسی تھیں۔ ارسلان کی بات کا جواب دیے بغیر وہ اپنی گاڑی

مجھ سے زیادہ ذہین ہو۔“
”آپ یہ کہتی ہیں تو میں یہ پوچھوں گا کہ کیا ہم بھی جی مل سکتے ہیں؟“

”میں تم سے بہت کچھ سیکھوں گی۔“

”میں آپ کو ایسے شاعر ہوں میں تو نہیں لاسکتا۔“

”بے منت میں کروں گی۔“

”یہ مجھے گوارہ نہیں ہوگا۔“

”میں کل برنس گارڈن میں آپ کا انتظار کروں گی۔“

ملاقات کا آغاز ہونا تھا کہ پھر یہ ملاقاتیں تو اتر سے ہونے لگیں۔ آنکھ بھی نہیں تھی، پہاڑ بھی نہیں تھا۔ کوئی بھی کسی سے ادھمل نہیں ہوا۔ یہی قربت محبت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

بیگم عباد اللہ ماضی کی طرف چلتے ہوئے اس مقام تک پہنچی تھیں کہ ارسلان کا چہرہ دھندلا گیا۔ اس کی جگہ عباد اللہ نے لے لی۔ عباد اللہ ان کے والد کے دوست کے بیٹے تھے۔ ان کا رشتہ آیا تو فاخرہ (بیگم عباد اللہ) کی جذباتی زندگی میں زلزلہ سا آ گیا۔ انہوں نے ماں کو اعتماد میں لیا لیکن بے سود۔ گھر میں باپ کا حکم چلتا تھا۔ ہزاروں کے مجمع میں تقریر کرنے والی باپ کے سامنے گونگی ہو گئی۔

آج ان کی بیٹی ثرائی جیت کر لائی تو ان کا ماضی ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ سیکڑوں اندیشے دل میں جاگ اٹھے۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھ گئے۔ ”اے خدا! اس کا دامن اسی طرح کامیابوں سے بھرا رہے۔ اس کا کرا لافوں سے بچ جائے۔ وہ ہمیشہ جیت کر آئے۔ اس کی خاطر ہارنے والا کوئی نہ ہو۔ اس کی زندگی میں کوئی ارسلان نہ آئے۔“

☆☆☆

ملکہ سائنس کالج سے نکل کر میڈیکل کالج میں پہنچی تو جیسے شاخوں پر پھول آ گئے۔ وہ شہرت کی سواری پر سوار ہو کر آئی تھی۔ وہ کالج کے گیٹ میں داخل ہوئی تو مشتاق آنکھیں اسے اپنے ساتھ لے کر چلتی رہیں۔ کسی نے پہچان لیا، کسی نے پہچان کر دوسروں کو بتایا۔ اپنی اہمیت کا احساس تو اسے اس وقت ہوا جب کالج پہنچتے ہی پرنسپل نے اسے اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ وہ اسٹوڈنٹ تھی لیکن اس وقت مہمان خصوصی بنی پرنسپل کے سامنے بیٹھی تھی۔ پرنسپل کی ٹیبل ٹاشٹے کی میز بنی ہوئی تھی۔ تمام ٹاف بھی موجود تھا۔

”مس ملکہ، آپ نے یہاں داخلہ لیا اس پر آپ ہماری طرف سے شکریہ قبول کیجئے۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔“ پرنسپل نے اسٹاف کی طرف سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”میں بھی آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ میری ایسی پذیرائی کی جا رہی ہے۔“

”ہمیں امید ہے کہ آپ اولین ترجیح تو اپنی تعلیم کو دیں گی اور ملک کو ایک اچھی ڈاکٹر بن کر دکھائیں گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی ملاحتوں سے کالج کا نام بھی روشن کریں گی۔ انتظامیہ آپ کے ساتھ پورا تعاون کرے گی۔“

سینسٹس ڈائجسٹ 263 جون 2012ء

حیرت انگیز بچہ

ایک یہودی عالم نے مجمع سے 3 سوال کے مسلمانوں میں دوسو ڈالنے کے لیے۔

1۔ اللہ ایک ہے تو اس سے پہلے بھی تو کوئی ہوگا؟

2۔ اگر اللہ ہے تو اس کا چہرہ کس طرف ہے؟

3۔ اللہ اس وقت کیا کر رہا ہے؟

مجمع میں سے ایک 9 سال کا بچہ اٹھا اور یہودی عالم سے کہا کہ گنتی گنو۔ 1, 2, 3, 4, 5, 6, 7

یہودی عالم نے گنتی گنی پھر لڑکے نے کہا۔ ”اب اسے الٹ گنو۔“

”7, 6, 5, 4, 3, 2, 1“ جب یہودی عالم نے ایک کہا تو لڑکے نے پوچھا۔ ”ایک سے پہلے کیا آتا ہے؟“

یہودی بولا۔ ”کچھ نہیں۔“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”تو بس اللہ ایک ہے اس کے بعد ہی سب کچھ آتا ہے، اس سے پہلے کچھ نہیں۔“

دوسرے سوال کے جواب میں بچے نے موم بتی منگوائی اور اس کو جلا کے کہا۔ ”اس کی روشنی کا منہ کس طرف ہے؟“

یہودی عالم نے جواب دیا۔ ”چاروں طرف۔“

لڑکا بولا۔ ”اللہ نور ہے اس کا چہرہ ہر طرف ہے اور تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ اس وقت 9 سال کے بچے سے یہودی عالم کو ذلیل کر رہا ہے۔“

مرسلہ: محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور، ضلع مظفر گڑھ

سینسٹس ڈائجسٹ 263 جون 2012ء

www.pdfbooksfree.pk

بڑی مشکل سے یہ طوفان تھا اور پنڈال میں سناٹا ہو گیا۔ اس سناٹے کو ملکہ نے مزید گہرا کر دیا جب اس نے اپنی تقریر کا آغاز قرآن کی ایک آیت سے کیا۔ ایک طرف اس کی خوش الحانی، دوسری جانب اس آیت کے ترجمے کا موضوع پر چسپاں ہونا۔ دنیا کی سب سے بڑی کتاب کی سب سے بڑی دلیل اس نے پیش کر دی۔ اس کے بعد ایک حدیث پیش کی پھر فارسی کا ایک شعر پڑھا، پھر ایک انگریز مفکر کا قول نہایت شائستہ لب و لہجہ میں سنایا۔ اب اس کے اعتماد نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اب عالم یہ تھا کہ جب چاہتی تالی بجواتی، جب چاہتی سناٹا کر دیتی۔ پورا پنڈال اس کے حکم پر چلنے پر مجبور تھا۔

اس کی تقریر ختم ہوئی تو گویا مقابلہ ختم ہو گیا۔ اب کسی کو سننے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ اگلا مقرر آیا ضرور لیکن اس کی آدمی تقریر شور و غل میں گزر گئی۔

وہ اپنی نشست پر واپس آئی تو اس کے برابر کی کرسی خالی پڑی تھی درندہ تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ اتنی اچھی تقریر پر وہ اسے مبارک باد ضرور دے گا۔ نہ جانے کاشف نای اس لڑکے سے اسے اتنی دلچسپی کیوں ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی اس کی طرح باصلاحیت تھا۔

مقابلے کا آخری شریک تقریر کر رہا تھا۔ کاشف ابھی تک غائب تھا۔ مقابلہ ختم ہوا۔ اب نتیجے کا انتظار تھا۔ اسے اجانک ایک اعلان ہوا۔

”منصفین حضرات نتیجہ مرتب کر رہے ہیں۔ آئیے اس وقت تک ہم اپنے مہمان مقرر کاشف رحمٰن سے ان کا کلام سنتے ہیں۔ کاشف رحمٰن صرف اچھے مقرر ہی نہیں، نہایت اچھے شاعر بھی ہیں۔“

وہ اسی لاابالی انداز سے اسٹیج پر آیا۔ وہ خود چپ تھا، اس کی آنکھیں باتیں کر رہی تھیں۔ خطاب ملکہ سے تھا جیسے کہہ رہی ہوں یہ نظم تمہاری نذر ہے پھر اس نے سب کو بتا بھی دیا۔

”ایک نظم اس اجنبی کے نام جس کے لیے میں ابھی اجنبی ہوں۔“

میں عجیب اجنبی ہوں

کہ وہ جانتی ہے مجھ کو

میں عجیب اجنبی ہوں

وہ قریب میرے بیٹھی

میں عجیب اجنبی ہوں

اس نے سوچا، یہاں تو بہت سے چہرے اجنبی ہیں۔ کس کس سے معلوم کرتی پھرے گی۔ جب نام اناؤنس ہوگا تو شہر کا نام بھی پکارا جائے گا۔ خود معلوم ہو جائے گا کہ کون کہاں سے آیا ہے؟

مقابلے کا آغاز ہوا۔ چند ابتدائی تقریروں کے بعد وہ گرما گرمی ہوئی کہ پنڈال میدان جنگ بن گیا۔ ایک سے ایک اچھی تقریر سنائی دے رہی تھی۔ ایک تقریر پر تو ملکہ کو یہ گمان ہونے لگا کہ اس کی تقریر پٹ جائے گی مگر اسی میدان میں وہ نئی نہیں تھی کہ گھبرا جاتی۔ اس نے حوصلہ کیا۔ پچھلی کامیابیوں پر غور کیا اور جم کر بیٹھی رہی۔ آنے والا مقرر تقریر ختم کر کے جا چکا تھا۔ تالیوں کا طوفان تھا کہ قسے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اسی شور میں ایک نام پکارا گیا جسے وہ سن بھی نہیں سکی۔ جب برابر والا لڑکا اٹھ کر جانے لگا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا نام پکارا گیا ہے۔ اس نے اس کی کرسی کی پشت پر دیکھا۔ اس کا نام کاشف رحمٰن تھا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی کہ دیکھیے، محترم کیا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔

کاشف نے تقریر کا آغاز ہی ایک لاجواب شعر سے کیا۔ ایسے مقابلوں میں عموماً سنے سنائے شعر سنائے جاتے ہیں لیکن اس نے جو شعر سنایا وہ بالکل نیا تھا۔ حسب حال بھی ایسا کہ تالیاں بجائیں۔

اس شعر نے ایسا تاثر پیدا کیا کہ ابتدا ہی میں تالیاں بج گئیں۔ جب اس نے تقریر شروع کی تو ملکہ کے غم نے سمجھ لیا کہ وہ کس پائے کا مقرر ہے۔ لفظوں کی ہڈش، فقرات کی چستی، دلائل کا زور، رنگینی اشعار کا شور۔ ایک مکمل تقریر تھی۔ نہ کہیں جھول تھا نہ وقت گزاری۔ لہجہ بھی ایسا کہ میں صدقے، میں داری۔ ملکہ نے ترجمہ نظروں سے منصفین کو دیکھا کہ شاید ان کے تاثرات سے کچھ اندازہ ہو سکے۔

وہ تقریر ختم کرنے کے بعد جب تک اپنی نشست پر نہیں آ گیا، تالیاں بجتی رہیں۔ وہ اسے مبارک باد دینے کے لیے لب کھولنے کو بھی کہ اس کا نام پکار لیا گیا۔ وہ یوں لگی کہ جسے ذرا دیر لگائی تو کاشف کے نام کی تالیاں دوبارہ بجنے لگیں گی۔

اتنی اچھی تقریر کے بعد کسی کو بھی بلایا جاتا تو اس کی ازاں میں تحلیل ہو جاتی لیکن اس وقت وہ اپنی شہرت کی لعل کاٹ رہی تھی۔ وہ کسی کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ اس کے لئے سے پہلے ہی اس کے حق میں تالیوں کا شور بلند

سمجھوں گی آپ چاہتی ہیں۔ آپ لوگوں کو خوش دیکھنے کے لیے میں ڈاکٹر بن کر دکھاؤں گی۔“

”شاباش! میری بچی۔“

وہ نصاب کی کتابیں لے کر بیٹھی تو مشکلیں آسان ہوتی گئیں بلکہ کچھ دن بعد اب محسوس ہوا کہ ان کتابوں سے تو اسے مزید روشنی مل رہی ہے جو اس کی تقریروں کو روشن کر دے گی۔ اس کے دلائل کو نئے زاویے نصیب ہوں گے۔

کالجوں میں بہار کا موسم اتر ا ہوا تھا۔ امتحانات قریب تھے اور امتحانوں سے پہلے جگہ جگہ ہفت طلبہ کا انعقاد کیا جا رہا تھا۔ وہ ہر جگہ اپنے کالج کی نمائندگی کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پرنسپل کا کمر اس کی لائی ہوئی ٹرافیوں سے بھر گیا۔ وہ جس مقابلے میں شریک ہوئی، اعلان سے پہلے ہی نتیجہ اس کے حق میں ہوتا۔ ناکامی تو بڑی بات، کبھی یہ بھی نہیں ہوا کہ وہ پہلے زینے سے دوسرے پر آ جائے۔

ان مقابلوں کا اختتام ہوا اور کارروائیاں اخباروں میں شائع ہوئیں تو اخبارات اس کی تصویروں اور کارناموں سے بھر گئے۔

وہ میڈیکل کے دوسرے سال میں تھی کہ یونیورسٹی سے دعوت نامہ آیا۔ اس کے علاوہ کون تھا جو کالج کی نمائندگی کرتا، پرنسپل نے اس کا نام بھیج دیا۔

مقابلہ یونیورسٹی میں تھا اس لیے اہم بھی تھا اور مشکل بھی۔ یہ آل پاکستان مقابلہ تھا لہذا پورے ملک کے بونے والوں کے سامنے بولنا مذاق نہیں تھا۔ وہ کمر بند کر کے بیٹھ گئی۔ نہایت عرق ریزی سے تقریر تیار کی اور پھر آئینے کو اپنا سا بھی بنا کر مشق کرتی رہی۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نے اپنی والدہ کو بھی شریک کیا۔ انہیں مختلف انداز سے تقریر پڑھ پڑھ کر سناتی رہی۔

جب ہر طرح سے مطمئن ہو گئی اور مقابلے کا دن آ گیا تو وہ یونیورسٹی پہنچ گئی۔ یونیورسٹی کا آسمان طرح طرح کے ستاروں سے آباد تھا۔ کس میں کتنی روشنی ہے، یہ کچھ دیر بعد معلوم ہونے والا تھا۔ مقررین کے لیے الگ نشستوں کا انتظام تھا۔ ہر کرسی پر مقرر کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نے اہل کرسی تلاش کی اور بیٹھ گئی۔ اس کے برابر والی کرسی پر ایک لڑکا آ کر بیٹھا جو اس کے لیے اجنبی تھا۔ اس سے پہلے اس نے کسی مقابلے میں اسے نہیں دیکھا تھا۔ صاف ظاہر تھا وہ کسی دوسرے شہر سے آیا ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ اسے معلوم کرے لیکن تعارف نہیں تھا اس لیے عجیب کر

”میں کوشش کروں گی کہ آپ کی توقعات پر پوری اتر سکوں۔“

میڈیکل کالج تھا۔ لڑکے لڑکیاں انسانی اعضاء اور ان کے فنکشن کے بارے میں رٹے لگاتے پھرتے تھے۔ ادبی ذوق سرے سے ناپید تھا۔ چند لڑکیاں تھیں جنہیں کچھ لگاؤ تھا۔ لڑکوں میں یہ بھی نہیں تھا۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ اس نے میڈیکل میں آ کر غلطی کی۔ اسے تو ادب کی طرف آنا چاہیے تھا۔ اسے اپنے والد پر غصہ آ رہا تھا جو اسے ڈاکٹر کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ والدین بھی خوب ہوتے ہیں۔ اپنے خواب اولاد کی آنکھوں میں ڈال دیتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ان کے مشن کو ان کی اولاد پورا کرے۔ اولاد کیا چاہتی ہے، یہ بہت کم لوگ سوچتے ہوں گے۔ بڑوں کو تو یہ ناز ہوتا ہے کہ ہم بڑے ہیں لہذا جو سوچیں گے، بہتر سوچیں گے۔ ان خیالات نے بہت دن تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ یہ ماحول تو رہا دور کنار، یہ کتابیں تک اسے اپنی جانب متوجہ نہیں کر پا رہی تھیں جو اس کے نصاب میں شامل تھیں۔ چھ مہینے گزر چکے تھے اور اس نے کسی کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اسے تو بس یہ یاد تھا کہ اپنی صلاحیتوں سے کالج کا نام روشن کرنا ہے۔ جب بازار جاتی ایسی کتابیں خرید کر لے آتی جن سے اس کی جزل نالج میں اضافہ ہو اور اس کی تقریروں کے لیے مواد جمع ہو سکے۔ اسے یقین ہونے لگا تھا کہ وہ ڈاکٹر بھی نہیں بن سکتی۔ اس نے ضروری سمجھا کہ ماں سے بات کرے لیکن ماں نے تو پوری بات سنی بھی نہیں۔

”خبردار! اپنے بابا سے یہ بات کہہ بھی مت دینا۔ وہ ابھی سے تمہیں ڈاکٹر تسلیم کرتے ہیں۔ دن رات سوچتے رہتے ہیں کہ تمہارے لیے اسپتال کہاں بنائیں گے۔ اس میں کیا کیا چیزیں ہوں گی، وغیرہ وغیرہ۔ یہ خواب بکھرا تو وہ ٹوٹ جائیں گے۔ تمہیں ان کا دل رکھنا ہے۔“

”امی، میں جاہل رہ جانے کے لیے تو نہیں کہہ رہی ہوں۔ تعلیم کسی ایک شعبے تک تو محدود نہیں۔ میں اردو ادب میں ایم اے کر کے ڈاکٹریٹ کر لوں گی۔ ڈاکٹر تو اس وقت بھی کہلاؤں گی۔“

”اس پر تمہاری بحث ہی فضول ہے۔ تم ڈاکٹر بنو، انسانیت کی خدمت کرو۔ ذہین ہو، پڑھنے بیٹھو گی تو سب سمجھ میں آنے لگے گا۔ دلچسپی بھی ہو جائے گی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ خود میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تم ڈاکٹر بنو۔“

مجھے معلوم ہے کہ آپ یہ نہیں چاہیں لیکن میں

”میں تو اس کی مخالفت کروں گی۔ فاصلے سب کچھ بھلا دیتے ہیں۔ وقت ہر ذمہ کا علاج کر دیتا ہے۔ چروں کے نقوش دھندلاتے دھندلاتے مٹ جاتے ہیں۔ محبت کے لیے قربت ضروری ہے۔ دور کی آواز کون سناتا ہے؟“

”میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ محبت تو وہ آگ ہے جو اپنی ہی آگ میں جلتی ہے۔ کیا قربت کیا فاصلہ.....“

محبت ہو جائے تو پھر اختیار سے باہر ہوتی ہے۔ یہ تو وہ آگ ہے جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔“

”فرض کرو تمہیں کسی لڑکی سے محبت ہو جائے۔ پھر اس کی شادی کہیں اور ہو جائے تو کیا پھر بھی تمہارا جذبہ محبت اسی طرح رہے گا؟“

”میں اس کو کبھی نہیں بھولوں گا بلکہ یہ دوری تو میری آگ کو مزید بھڑکائے گی۔ میں اسے یا اس کے شوہر کو کھلی بھی کر سکتا ہوں۔“

”اسے نل کر دو گے، یہ کیسی محبت ہوئی؟“

”تو پھر میں خود کشی کر لوں گا۔“

”یہ محبت تو نہیں، خود غرضی ہوئی۔ محبت ہے تو محبت کرتے رہو، کسی کو قتل کیوں کرتے ہو؟“

”یہ بتانے کے لیے کہ کسی کے دد در رہنے سے محبت کم نہیں ہوتی۔“

”بتانے کی ضرورت پڑتی ہی اس وقت ہے جب کوئی چیز اتنی کم ہو جائے کہ نظری نہ آ رہی ہو۔“

”مس ملکہ، مجھے معلوم ہے آپ مجھ سے اچھی ڈیٹر ہیں۔ اس موضوع پر بھی آپ جیت گئیں میں ہار گیا۔ مجھے تو یہ بتائیے ملاقاتوں کے ان مقابلوں میں آپ شریک ہوں گی یا نہیں؟“

”شرکت کا وعدہ..... مگر یہ تو بتائیے مقابلے ہوں گے کہاں اور آپ میرے شہر کا سکون غارت کرنے کے لیے دو سال کے لیے یہاں کیوں آدھمکے ہیں؟“

”ملکہ، اب مذاق چھوڑ دیجئے۔ سنجیدہ بات یہ ہے کہ سلطان پور چھوٹا شہر ہے۔ وہاں کوئی یونیورسٹی نہیں۔ مجھے اردو ادب میں ایم اے کرنا تھا لہذا میں نے یہاں یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے۔ اور ملشل میں مقیم ہوں۔ آتی جاتی رہے گا۔“

”جی بہتر جناب! یہ بڑا شہر ہے۔ یہاں تقریری مقابلے بھی بہت ہوتے ہیں۔ ان مقابلوں میں ملاقاتیں ہوتی رہا کریں گی۔“

”آج کی بحث کے لیے موضوع ہے ہاشل کی

”جی ہاں۔ اس شہر میں جموں کی کمی تھوڑی ہے۔“

ابھی کچھ اور باتیں ہوتیں کہ کسی نے اسے آواز دی اور وہ کسی معذرت کے بغیر اس آواز کے جواب میں بھاگ نکلا ہوا۔

اس مرتبہ کوشش کے باوجود وہ اسے تلاش نہ کر سکی۔ اسے اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ اس کا نام کاشف رحمن ہے۔ سلطان پور میں رہتا ہے اور بی بی کا طالب علم ہے۔ اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ فون نمبر کا تبادلہ ہوتا یا اس سے زیادہ کچھ اور پتا چلتا۔ وہ اس کے بارے میں صرف اتنا اندازہ لگا سکی تھی کہ لا ابالی سا لڑکا ہے، خود پسند ہے، اپنے سوا کسی کی پروا نہیں کرتا۔

وہ دو چار دن اس کے سحر میں مبتلا رہی اور پھر اسے خیال بھی نہیں رہا کہ کون اس سے ملا تھا۔ امتحان قریب تھے۔ وہ پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔

امتحانوں کے بعد وہ دوبارہ کالج جانے لگی تھی۔ اس دوران چند مقابلے ہوئے۔ اس نے حسب معمول کامیابی حاصل کی۔

ایک دن وہ کلاس میں تھی کہ اسے اطلاع ملی، کوئی اس سے ملنے آیا ہے، ویٹنگ روم میں اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ حیران تھی کہ کون اس سے ملنے آ گیا۔ پھر خیال آیا ریڈیو یا بی بی کا کوئی نمائندہ ہوگا۔ وہ کلاس سے فارغ ہونے کے بعد ویٹنگ روم میں گئی۔ کاشف کو دیکھ کر اس کا حیران ہونا لازمی تھا۔

”ارے آپ، اب تک اسی شہر میں ہیں؟“

”جی نہیں۔ کل آیا ہوں۔“

”دوبارہ؟ کیا پھر کوئی مقابلہ ہے؟“

”جی ہاں، ملاقاتوں کا مقابلہ ہے۔“

”ملاقاتوں کا مقابلہ.....!“

”میں کم از کم دو سال کے لیے آپ کے شہر میں آ گیا ہوں لہذا ملاقاتوں کا مقابلہ تو شروع ہو ہی جائے گا۔“

”وہ کون خوش نصیب ہے جس سے آپ ملاقات فرمائیں گے؟“

”یہی تو آپ سے پوچھنے آیا ہوں کہ آپ اس مقابلے میں شریک ہونا پسند فرمائیں گی؟“

”موضوع کیا ہے اس مقابلے کا.....؟“

”موضوع ہے کسی کے دور رہنے سے محبت کم نہیں ہوتی۔“

گردپ میں بھی وہ ملکہ کے برابر کھڑا ہوا کیونکہ ملکہ پہلے نمبر پر آئی تھی اور کاشف دوسرے نمبر پر تھا۔ برابر برابر کھڑے ضرور تھے لیکن یہ کوئی موقع نہیں تھا کہ وہ اس کی نظم کی تعریف کرتی یا کاشف کچھ کہتا۔ پرندہ ایک مرتبہ پھر اڑ گیا۔ دسیوں کیمرے ایک ساتھ چمکے اور بج گئے۔ دھوپ سے چھاؤں میں آتے ہی کم از کم ایک منظر آنکھ سے اوجھل ہو گیا۔ ملکہ نے نماز کی طرح سلام پھیرا۔ گردن گھمائی تو کاشف غائب تھا۔ عجیب لڑکا ہے۔ لڑکے تو بات کرنے کے مواقع ڈھونڈتے ہیں لیکن یہ تو چپ رہنے کی قسم کھا کر آیا ہے۔ وہ سیکڑوں مقابلوں میں ایسے کئی مناظر دیکھ چکی تھی۔ لڑکے ایسے پنچے جھاڑ کر پیچھے پڑتے تھے کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ کاشف میں خود دلچسپی لے رہی تھی اور وہ تھا کہ اس کے پاؤں زمین پر نہیں تھے۔

ملکہ کے پرستار بھی کم نہیں تھے۔ اسٹیج سے اتری تو لڑکے لڑکیوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ کچھ دیر کے لیے کاشف کو بھول گئی۔

لڑکیوں کے ہجوم میں گھری ہوئی وہ ریفر۔ شمشاد روم تک پہنچ گئی۔ یہاں صرف شرکا کے لیے انتظام کیا گیا تھا اس لیے لڑکیاں باہر رہ گئیں، اس نے اندر قدم رکھ دیا۔ وہ اپنی پلیٹ بنانے کے لیے میز کے قریب پہنچی تھی کہ اسے کاشف نظر آ گیا۔ ملکہ نے اسے مخاطب کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ اپنی پلیٹ بنا کر میز سے الگ ہوئی تھی کہ کاشف اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

”آپ کو پہلا انعام مبارک ہو۔“ کاشف نے کہا۔

”اس انعام کے حق دار آپ تھے۔“

”ارے واہ..... وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ آپ کی تقریر مجھ سے اچھی تھی۔“

”منصفین کو معلوم تھا کہ لڑکی ہے بے چاری، رونے لگے گی۔“

”آپ تو شاعر بھی بہت اچھے ہیں۔“

”میں یہاں آیا تھا کہ آپ کی تعریف کروں گا، آپ نے تو مجھ پر ہی حملے شروع کر دیے۔“

”مجھے جھوٹ بولنے کی بڑی عادت ہے۔“ ملکہ نے کہا اور دونوں ہنسنے لگے۔

”مجھے یہی عادت تو پسند ہے۔ میں بھی کوئی کم جہو نہیں ہوں۔ آپ بہت خوب صورت ہیں۔“

”میرے لیے یہ کوئی نئی اطلاع نہیں۔“

کہ اسی کی آنکھ بن کر اسے دیکھتا رہا ہوں یہ یقین ہے کہ اک دن مجھے دیکھ کر کہے گی تم عجیب اجنبی ہو کہ میں جانتی ہوں تم کو مرے ساتھ ساتھ چل کر یہ سفر کیا ہے پورا یہ سفر کہ جس سے بچ کر میں چلوں تو چل نہ پاؤں میں رکوں تو رک نہ پاؤں مرے ساتھ ساتھ چلنا مرے ساتھ ساتھ رہنا تم عجیب اجنبی ہو کہ میں جانتی ہوں تم کو۔

ملکہ کو بجا طور پر یہ خوش فہمی ہو رہی تھی کہ کاشف یہ نظم اسی کے لیے پڑھ رہا ہے۔ وہ اجنبی ہے اور میں ہی اس کے قریب بیٹھی ہوں۔ اس کے بعد جو کچھ اس نے کہا وہ اس کی شاعرانہ قلابازیاں تھیں۔ شاعروں کو یہی سہولت تو حاصل ہے کہ جس کی شان میں چاہیں قصیدہ پڑھ دیں۔ بہر حال ملکہ کو یہ موقع مل گیا تھا کہ وہ اس کی تقریر کے ساتھ ساتھ اس کی نظم کی بھی تعریف کر سکے۔

کاشف نے ایک مرتبہ پھر اسے یہ موقع نہیں دیا اور اسٹیج سے اتر کر کہیں اور غائب ہو گیا۔ ملکہ کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو ایک جگہ تک کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ایسے لوگوں کی طبیعت میں ایک اضطراب ہوتا ہے جو انہیں بے چین رکھتا ہے۔ ایسے لوگ اگر کسی پر عاشق ہو جائیں تو بڑے پاگل قسم کے عاشق ہوتے ہیں کیونکہ ان کا سارا اضطراب کسی ایک طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

منصفین نتیجے کا اعلان کرنے کے لیے اسٹیج پر آ چکے تھے۔ ملکہ نے جو نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کیا تھا اس کے مطابق کاشف کو پہلا انعام ملنے والا تھا اور خود اسے دوسرا انعام لیکن نتیجہ اس کے برعکس آیا۔ ملکہ کے لیے پہلے اور کاشف کے لیے دوسرے انعام کا اعلان ہوا۔

اب کاشف کی مجبوری تھی کہ وہ اسٹیج سے نہیں اتر سکتا تھا کیونکہ اعلان یہ ہوا تھا کہ انعام یافتگان کا گردپ فوٹو بنے گا۔ وہ اسٹیج پر موجود رہیں۔



”نہیں! میں نے تو ٹیلی فون پر کسی طوطی کا آڈیو نہیں دیا“

راہ روانہ ہو گئے۔

ملکہ نے یہ بات ابھی اسے بتانا مناسب نہیں سمجھی کہ امتحان ختم ہوتے ہی وہ اسے اپنے والدین سے ملائے گی۔ اس کے بعد کسی کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ پاپا نے میری کوئی بات آج تک نہیں ٹالی، یہ بات بھی نہیں ٹالیں گے۔

دونوں کے درمیان کوئی ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔ فون پر بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ ملک نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خود کو کوئی رابطہ نہیں کرے گی ہاں، اگر کاشف نے رابطہ کیا تو وہ اس کا فون اٹینڈ ضرور کرے گی لیکن کاشف بھی وعدے کا پکا تھا، اس نے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔

امتحان شروع ہو گئے تھے۔ ہر پرچے کے بعد اسے اپنی کامیابی کا یقین ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ آخری پرچے کا دن آ گیا۔ اسے اپنی کامیابی سے زیادہ یہ خوشی تھی کہ اب وہ کاشف سے رابطہ کرنے میں نہ صرف آزاد ہوگی بلکہ کاشف کی ملاقات اپنے والدین سے کرا سکے گی۔

وہ پرچہ دے کر گھر آئی تو عباد اللہ خاں خلاف معمول گھر پر تھے۔ گھر کے اندرونی دروازے میں داخل ہوتے ہی پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا جس پر چلتے ہوئے وہ اپنے کمرے تک گئی۔ فریش ہو کر باہر نکلی تو عباد اللہ خاں کی دراز بائیں کمرے میں تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی آئی اور باپ کی آغوش میں سما گئی۔

”مجھے اپنی بیٹی پر فخر ہے۔ آج میرا دیرینہ خواب پورا ہو گیا ہے۔“

”میں نے ایسا کیا کر دیا پاپا!“

”جب سے تو پیدا ہوئی تھی، میری آرزو تھی کہ تجھے

”بس یا کچھ اور کہنا ہے؟“ ملکہ کی آنکھوں میں واقعی آنسو آ گئے۔ ”کاشف! اگر آئندہ میرا اس طرح مذاق اڑایا تو میں تم سے زندگی بھر بات نہیں کروں گی۔“

”سوری ملکہ، سوری! تمہیں معلوم ہے میری عادت مذاق کی ہے۔ آئندہ ایسا مذاق نہیں کروں گا۔ مجھے معلوم ہے تم مجھے کتنا چاہتی ہو۔ میں تو بس تمہاری زبان سے سننا چاہتا تھا۔“

”سننا چاہتے ہو تو سنو۔ میں تمہیں پانے کے لیے پوری دنیا سے بغاوت کر دوں گی۔“

”اگر دنیا نے مجھے تم سے جدا کر دیا؟“

”تمہارے دور چلے جانے سے تم سے میری محبت تو کم نہیں ہوگی۔“

”لیکن تم تو یہ کہتی رہی ہو کہ دور کی آواز کون سننا ہے۔ فاصلے محبت کو ختم کر دیتے ہیں؟“

”تم نے یہ بھی تو کہا تھا کہ یہ بات تجربے کی ہے۔ جب تمہیں کسی سے محبت ہوگی، اس وقت اپنے دل سے پوچھنا۔“ ملکہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”مجھے اب محبت بھی ہو گئی ہے اور میں نے اپنے دل سے پوچھ بھی لیا ہے۔ اب میں اس مقولے پر قائم ہو گئی ہوں کہ کسی کے دور رہنے سے محبت کم نہیں ہوتی۔ میرے منہ میں خاک..... اگر تم مجھ سے دور بھی چلے گئے تو بھی میں تمہاری رہوں گی۔“

کاشف نے اس سے کہا کہ وہ کچھ دیر کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لے۔ ملکہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ کاشف اس کے قریب گیا اور اس کی بند آنکھوں پر دو بوسے ثبت کر دیے۔ ملکہ نے گہرا کر آنکھیں کھول دیں۔

”میں نے یہ حرکت کر کے اپنی دو نشانیاں تمہاری آنکھوں کے حضور چھوڑ دی ہیں۔ اگر قسمت نے مجھے تم سے جدا کر دیا تو یہ آنکھیں تمہیں یاد دلائیں گی کہ تمہیں میرا انتظار کرنا ہے۔“

”خدا نہ کرے ایسا وقت آئے۔“

”دیکھنا تو پڑے گا..... تم میرا انتظار کرتی ہو یا نہیں؟“

”یہ بھی دیکھ لیتا۔“

وعدوں کی اس چھاؤں میں سفر کرتے کرتے ملکہ کے امتحان سر پر آ گئے۔ دونوں نے طے کیا کہ جب تک امتحان ختم نہیں ہو جاتے، ملاقاتوں کا یہ مقابلہ ختم۔ ملکہ نے ایک ہوش میں اسے الوداعی پارٹی دی اور دونوں اپنی اپنی

لاہالی اور موڈی سمجھتی رہی تھی، اس پر نئے انداز سے کھل رہا تھا۔ جیسے مرنے کے وعدے کبھی کرتے ہیں لیکن اس کی دیوانگی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے نہیں مٹی تو وہ واقعی مرجائے گا۔ کئی مرتبہ کہہ چکا تھا کہ اگر تم نے بے وقائی کی تو میں ان لوگوں میں سے نہیں جو رو دھو کر چپ ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو گولی مار لوں گا یا تمہیں قتل کر دوں گا۔

ملکہ کو اس کی دیوانگی سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اس کی یہی دیوانگی تھی جو ملکہ کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ اس کی ہر بات مانتی رہے۔ اب وہ ہر جگہ ایک ساتھ دیکھے جا رہے تھے۔ مقابلوں سے نکل کر انہوں نے تفریح گاہوں میں بھی جانا شروع کر دیا تھا۔

کاشف فائنل ایئر میں آیا تو ان ملاقاتوں نے دوسرا ہی رخ اختیار کر لیا۔ کاشف اب شادی پر اصرار کرنے لگا تھا جبکہ ملکہ نے اپنی ماں سے اس کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ انہیں معلوم بھی نہیں تھا کہ ملکہ کی زندگی میں کوئی کاشف آ چکا ہے۔ وہ اسے یہ کہہ کر ٹالتی رہی کہ میری تعلیم کا بھی آخری سال ہے اور تمہارا بھی فائنل ایئر ہے۔ شادی اس کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔

”مجھے کون سی جلدی ہے۔ میں تو یہ جانتا چاہ رہا تھا کہ تمہیں اس شادی پر کوئی اعتراض تو نہیں۔ مجھے اپنے لائق سمجھتی بھی ہو یا میں یونہی وقت ضائع کر رہا ہوں؟“

”کاشف، اب تک تمہیں یہی اندازہ نہیں ہو سکا کہ میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں؟“

”میں بھلا تمہارے دل کا حال کیسے جان سکتا ہوں؟“

”پھر تو میں بھی یہی کہوں گی کہ میں بھی اپنا وقت ضائع کر رہی ہوں۔ جو دل کا حال ہی نہ جانتا ہو، اس سے تعلق رکھنے کا کیا فائدہ؟“

”ارے ارے..... تم تو ناراض ہو گئیں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میں تو تمہارے دل میں اٹھنے والی ایک ایک لہر سے واقف ہوں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تم کل رات سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں اور سوچ رہی تھیں کاشف جیسا عظیم لڑکا مجھ پر مرنے لگا ہے۔ کتنی خوش قسمت ہوں میں۔ پھر تم اس خیال سے رو پڑی تھیں کہ تمہاری شادی کہیں اور نہ ہو جائے۔ تمہیں رومال نہیں مل رہا تھا۔ پھر تم نے ددے سے آنسو پونچھے اور یہ کہہ کر سونے کے لیے لیٹ گئیں کہ کہیں بھی ہو بس شادی ہو جائے۔“

ایک شام۔

”میرے پاس ان فضول بکٹوں کے لیے وقت نہیں۔“

”پھر شام کو کہاں مل رہی ہیں؟“

”کہیں مقابلہ ہوا اور کسی نے رحم کھا کر آپ کو بھی بلالیا تو ضرور ملاقات ہوگی۔“

اس چھیڑ چھاڑ میں اتنا وقت ہو گیا کہ ملکہ کو اجازت لینی پڑی اور کاشف اٹھ کر چلا گیا۔ اس نے چلتے چلتے یہ بھی نہیں کہا کہ پھر کب ملاقات ہوگی یا ملاقات ہونی چاہیے۔ جس تپاک سے آیا تھا اسی غلٹ میں روانہ ہو گیا۔

ملکہ کو اس ملاقات سے خوشی بھی ہوئی تھی کہ لائق لڑکا ہے۔ اچھی باتیں کرتا ہے لیکن یہ دھڑکا بھی لگ گیا تھا کہ یہ لڑکا بلا کی طرح پیچھے پڑ جائے گا۔ جب منہ اٹھے گا چلا آئے گا۔ اس سے صاف کہنا پڑے گا کہ ملاقاتیں مقابلوں تک محدود رہیں تو اچھا ہے۔

اس ملاقات کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا پندرہ دن ہو گئے۔ کاشف کی کوئی خبر خبر ہی نہیں تھی۔ ملکہ کو تعجب ہو رہا تھا کہ وہ کیوں ملنے نہیں آیا۔ اس نے خود بھی مناسب نہیں سمجھا کہ اسے تلاش کرنے کی یونیورسٹی پہنچے اور اس کی خود پسندی کو ہوا دے۔

کاشف ان لوگوں میں سے تھا جو خود نہیں جھکتے، دوسروں کو جھکانے کے خواہاں رہتے ہیں۔

وہ اس دن ایک پروگرام میں حصہ لینے ریڈیو گئی ہوئی تھی کہ کاشف سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ وہ کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے ریڈیو آیا تھا۔

تپاک سے ملا، غلٹ میں روانہ ہو گیا۔

اب ملکہ کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ موڈی لڑکا ہے۔ اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے بھی سوچ لیا کہ وہ بھی اسی طرح ملا کرے گی۔

انہی دنوں موسم بدلا۔ کالجوں میں ہفتہ طلبہ منانے کے دن آ گئے تو اس کی مقبولیت نے ایسا پریشان کیا کہ ایک ایک دن میں دو دو مقابلوں میں جانا پڑتا تھا۔ کاشف بھی ہر مقابلے میں شریک ہو رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے واقف ہوئے تو ایک دوسرے کے قاتل بھی ہوتے چلے گئے۔ وہ اس خلوص سے ملا، اس اپنائیت کا مظاہرہ کیا کہ وہ بے اختیار اس کی طرف مچتی چلی گئی۔

ایک شہر میں تھے، ہم مزاج تھے، ہم خیال تھے۔ ملے تو واقعی ملاقاتوں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ وہ لڑکا جسے وہ

ڈاکٹر کے روپ میں دیکھوں۔ تو نے یہ خواب پورا کر دکھایا۔ کیا یہ تیرا کارنامہ نہیں۔ اس خوشی میں کل میں نے ایک پارٹی کا اہتمام کیا ہے۔ اس پارٹی کے بعد تجھے ایک سر پرانز بھی دینا ہے۔

”کوئی تحفہ ہوگا اور کیا ہو سکتا ہے۔“

”ایسا تحفہ جو تیری زندگی بدل دے گا۔“

”بتائیے نا..... کیا تحفہ ہے؟“

”آج نہیں کل بتاؤں گا۔“

”پاپا ابھی تو میرا رزلٹ بھی نہیں آیا۔ رزلٹ کے بعد پارٹی کرنا تھی۔“

”اس کے بعد بھی کر دیں گے۔ اب تم آرام کرو۔ امتحانوں کی ٹھکن ایک دن میں تو اتر ہی جائے گی۔“

ٹھکن تو کیا اتارنی تھی، اسے موقع مل گیا۔ جب پارٹی ہوتی ہے تو مہمانوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس کا خاص مہمان تو کاشف تھا۔ کام خود بخود آسان ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ کاشف کو اپنے والدین سے ملوائے گی۔ اب یہ تقریب ایک جواز خود دین گئی تھی۔ اس نے سوچا، جب پاپا مجھے تحفہ دیں گے تو جواب میں انہیں میں بھی تحفہ دوں گی۔ اس تحفے کا نام ہوگا کاشف۔ اس نے کاشف کا نمبر ملایا اور فون کان سے لگایا۔ اس کا موبائل پاور آف تھا۔ پھر وہ وقفے وقفے سے نمبر ملاتی رہی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے جھنجھلا کر موبائل کو بستر پر پٹخا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے تشویش ہوتی۔ اس نے سوچا ممکن ہے وہ بھی سو رہا ہو۔ شام کو اٹھے گی تو دوبارہ ٹرائی کرے گی۔ اس نے سونے کی کوشش کی، کچھ دیر کروٹیں بدلتی رہی اور پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

کئی راتوں کی نیند جمع تھی۔ سوئی تو پھر اندھیرے کی خبر لائی۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے سر ہانے رکھا ٹیبل لیپ روشن کیا۔ پھر جیسے اس کی یادداشت واپس آ گئی ہو۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے یاد آیا کہ اسے کاشف کو فون کرنا ہے۔ ڈائل میں گئی اور ”کال“ کا بٹن دبا دیا۔ جواب یہی ملا کہ موبائل بند ہے۔ کل پارٹی ہے اور نواب صاحب گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے ہیں۔ خیر ابھی تو رات پڑی ہے۔ کل کا دن بھی ہے۔ پارٹی تو شام کو ہے۔ وہ کمرے سے نکلی اور ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”ملکہ، تم اپنی کچھ دوستوں کو بلانا چاہو تو فون کر دو کل

کی پارٹی کے لیے۔“

”ای، ایک خاص دوست ہے میری۔ اسے فون کر رہی ہوں، اس کا فون ہی بند جا رہا ہے۔“

”کمال ہے۔ صرف ایک دوست ہے تمہاری؟“

”دوست تو ایک ہی ہوتا ہے امی۔ باقی تو سب ملے والے ہوتے ہیں۔ اتنی بڑی پارٹی تو ہے نہیں کہ سب کو بلاؤں۔“

”یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر اس خاص دوست کا فون ہی بند ہے، تم کہہ رہی ہو۔ ایسا کر دو اس کے گھر چلی جاؤ ڈرائیور کو ساتھ لے جاؤ۔“

”یہی سوچ رہی ہوں، اب کل جاؤں گی۔“

ماں کے پاس سے اٹھ کر وہ پھر کمرے میں آئی۔ نمبر پھر ملایا۔ یہ دستور وہی جواب آیا۔ اب اس کی ابھمن تشویش میں بدل گئی تھی۔ گھر میں کل کی پارٹی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اسے ان باتوں میں بھی شریک ہونا تھا اور کاشف میں بھی جان اگی ہوئی تھی۔ باتوں میں کوئی وقفہ آتا تو اٹھ کر موبائل کان سے لگالیتی اور پھر درمیان میں آ کر بیٹھ جاتی۔ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کس اضطراب سے گزر رہی ہے۔

وہ رات گئے تک فون ملانے کی کوشش کرتی رہی اور پھر یہ سوچ کر سونے کے لیے لیٹ گئی کہ صبح اٹھ کر وہ یونیورسٹی جائے گی۔

وہ سو کر اٹھی تو گھر میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔

عباد اللہ خاں نے اپنی تمام معروفیات منسوخ کر دی تھیں۔ وہ آج کورٹ بھی نہیں گئے تھے۔ ڈیکوریشن والے آگئے تھے۔ لان میں ٹینٹ لگایا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے ملکہ کو محسوس ہوا جیسے اس کی شادی کے انتظامات کیے جا رہے ہوں۔ اس نے اپنی ماں سے سہیلی کو مدعو کرنے کا بہانہ کیا اور گاڑی لے کر نکل گئی۔

یونیورسٹی میں چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ ڈیپارٹمنٹ اجاڑ پڑے ہوئے تھے۔ صرف انتظامیہ کے دفاتر کھلے ہوئے تھے۔ وہ رجسٹرار کے کمرے میں چلی گئی۔ رجسٹرار اس کے والد کے دوست تھے اس لیے اسے اسید تھی کہ وہ کاشف کو ڈھونڈنے میں اس کی مدد ضرور کریں گے۔ انہوں نے اسے بتایا کہ یونیورسٹی کے بیسٹ لڑکے ہاسٹل چھوڑ کر گھروں کو جا چکے ہیں۔ چند ہی لڑکے ہوں گے جو اب بھی رہ رہے ہوں گے۔ میں کاشف کے بارے میں چیک کرتا ہوں۔ انہوں نے کہیں فون کیا اور ملکہ کو بتا دیا کہ اس نام کا

حشت امکان

لاکا ہاسٹل چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس کا فائل ایئر تھا اس لیے ٹائیڈ اب وہ نہ آئے۔

”اس نے اپنے گھر کا فون نمبر تو یہاں لکھوایا ہوگا۔ نمبر مجھے مل سکتا ہے؟“

”اگر لکھوایا ہوگا تو ضرور ملے گا۔“

تھوڑی دیر میں فون نمبر اسے مل گیا۔ اس نے وہیں ٹیپ ٹیپ اس نمبر پر فون ملایا۔ تیل جا رہی تھی لیکن کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ نمبر ملایا لیکن ہر مرتبہ یہی ہوا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس وقت کوئی گھر پر نہیں ہے۔

وہ وہاں سے اٹھ آئی لیکن اب کچھ امید بندھ گئی تھی کہ اس وقت کوئی گھر پر نہیں لیکن گھر کا نمبر مل تو گیا ہے، کسی وقت کوئی اٹھا ہی لے گا۔ اگر وہ تقریب میں شریک نہ بھی ہو سکا تو بعد میں سہی، بات تو ہو جائے گی۔ وہ گھر پہنچی تو تیار پاں زور شور سے جاری تھیں۔ گھر پہنچ کر کاشف کے گھر کا نمبر پھر ملایا۔ اس مرتبہ بھی کسی نے نہیں اٹھایا۔ وہ شام کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ خود کو پریشان رکھ کر دوسروں کو شک میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے والدین جس ارمان سے اس کے امتحان ختم کرنے کی خوشی منا رہے تھے، وہ اس خوشی کو غارت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ کس پریشانی میں ہے۔

شام کو مہمان آنے شروع ہوئے تو وہ دروازے پر باپ کے ساتھ کھڑی ایک ایک کو دیکھ کر رہی تھی۔ عباد اللہ خاں کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ وہ چاہتے تو شہر کا شہر آتا لیکن وہ یہ تقریب گھر میں کر رہے تھے اس لیے منتخب لوگوں کو ہی مدعو کیا تھا۔

وہ اس وقت چونکی جب اس کے کالج کے زمانے کی پرنسپل میڈم شہناز داخل ہوئیں۔ اس نے انہیں اس وقت تک دیکھا تھا جب وہ کالج کو خیر باد کہہ رہی تھی۔ تقریباً چار سال بعد انہیں دوبارہ دیکھ رہی تھی۔ ان کے ساتھ ایک لڑکا بھی تھا جس کی عمر تیس سال ہوگی۔ نہایت خوب رو اور اسماٹ تھا۔ وہ یہی بھی تھی کہ میڈم شہناز کا بیٹا ہوگا لیکن میڈم نے یہ بتا کر اس کی غلط فہمی دور کر دی کہ وہ ان کے میکے کی طرف سے ان کا رشتہ دار ہے۔ ان دنوں ان کے پاس آیا ہوا تھا لہذا وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے آئیں۔

جنگلاتی روشنیوں میں مسکراتے چہروں کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اس وقت اگر کاشف بھی



نعمان سکندر نے ایک دن موڈ میں آ کر کہا۔ ”میری بیوی اتنی بڑھی لکھی ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر گفتگو بھربھرت چیت کر سکتی ہے۔“

جواب میں ناصر منٹل صاحب بولے۔ ”اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ یہی کام میری بیوی بھی کر لیتی ہے اور اس کے لیے موضوع کی شرط بھی نہیں ہوتی۔“

باتوں سے خوشبو آنے

☆ محبت اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ جو کسی لمحے میں ایک وحشی کو انسان اور انسان کو وحشی بنا دیتی ہے۔

☆ کچھ تعلق اتنا سے لوٹ جاتے ہیں یقین کچھ رشتوں کو قائم رکھنے کے لیے اتنا بے حد ضروری ہے۔

☆ محبت دکھ نہیں دیتی۔ یہ دکھ ہم خود مستعار لیتے ہیں، اپنے غلط فیصلوں اور غلط نقطہ نظر سے۔

☆ حسین یادوں کو کبھی فراموش نہ کیجیے کیونکہ یہ آئندہ زندگی کے لیے آپ حیات سے کم نہیں ہوتیں۔

☆ جو لوگ آپ سے اختلاف رکھتے ہیں، ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں، پریشان تو ان لوگوں کے بارے میں ہونا چاہیے، جو آپ سے اختلاف تو رکھتے ہیں لیکن اٹھا نہیں کرتے۔

سبحان فاروق..... کراچی

ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور نسبتاً ایک خاموش گوشے میں جا کر کاشف کو فون کرنے لگی۔ پہلے اس کا موبائل نمبر ملایا پھر گھر کا نمبر ملایا اور مایوسی سے گردن جھٹک دی۔ واپس آئی تو فنکشن شروع ہو چکا تھا۔ عباد اللہ خاں نے ایک معروف گلوکار کو بلا رکھا تھا جسے چند غزلیں سنائی تھیں پھر کھانا شروع ہونا تھا۔ گلوکار نے غزل بھی اس کے حسب حال شروع کی تھی۔

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے اگر تو مل بھی جائے اتفاقاً تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے دلوں کی رنجشیں بڑھتی رہیں گی

بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیے جو اس لڑائی میں پیش کیے جاسکتے تھے۔

وہ رات خیریت سے گزر گئی لیکن دوسرے دن عباد اللہ خاں نے عدالت سے آتے ہی اسے اپنی عدالت میں طلب کر لیا۔ فاخرہ بیگم بھی ان کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ کوئی خاص وقت آ گیا ہے۔ اس نے بہانوں کے ہتھیار باندھے اور باپ کے کمرے میں پہنچ گئی۔

”بیٹا، کل کا ڈنر کیسا رہا؟“

”میڈم شہناز نے خواہ مخواہ کی تکلیف کی۔“ ملکہ نے کہا۔

”میری رشتہ دار ہیں اور پھر مجھ پر تو وہ جان چھڑکتی ہیں۔ تکلیف کیسی، ان کی محبت کا ثبوت یہ ہے کہ انہیں تمہاری فکر ہے۔ فکر اپنوں کو ہی ہوتی ہے۔“

”مجھے کیا ہو گیا جو انہیں میری فکر ہے؟“

”بھئی تمہاری تعلیم مکمل ہوئی ہے۔ اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔ اپنوں کی سب سے بڑی فکر یہی ہوتی ہے کہ لڑکیاں اپنے گھروں کی ہو جائیں۔“

”یہ سب پرانے زمانے کی فکریں ہیں پاپا!“

”یہ فکر ایسی ہے جو ہر زمانے کی ہے۔ ہمیں بھی فکر ہے کہ تمہاری شادی ہو جائے۔ میڈم شہناز بہت اچھا رشتہ لائی ہیں۔ میں نے اور تمہاری ماں نے تو تقریباً ہاں کر دی ہے۔ تم بھی انکار نہیں کر دو گی۔ عاطف علی خاں ضلع مجسٹریٹ ہے۔ چھوٹی جگہوں پر ایسے لوگ بادشاہت کرتے ہیں۔ سرکاری گاڑی، نوکر چاکر سب ملا ہوتا ہے۔ عیش کرے گی ہماری بیٹی!“

”پاپا، ابھی تو میرا رزلٹ بھی نہیں آیا۔“ اس نے پہلا ہتھیار پھینکا۔

”رزلٹ بھی آتا رہے گا۔ شادی کے بعد بھی رزلٹ آ سکتا ہے۔“

”پاپا، رزلٹ آ جائے تو میں F.R.C.S کرنے لندن جاؤں گی۔ آپ ہی نے تو کہا تھا۔“

”میں نے کہا ضرور تھا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس دوران اتنا اچھا رشتہ آ جائے گا۔ میں نے شہناز سے کہہ دیا ہے کہ وہ تیاری کریں، ہم تیار ہیں۔“

ملکہ نے کہنا چاہا کہ اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے والے وہ کون ہوتے ہیں۔ بچے کو ایک کھلوتا بھی دلا یا جاتا ہے تو بچے سے پوچھ لیا جاتا ہے۔ انہوں نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا اور میری پسند پوجھے بغیر۔ اس نے انکار کرنا چاہا لیکن

”عاطف رشتے میں میرا بھانجا لگا ہے۔“

”وہ تو ہے میڈم لیکن یہ موصوف ہیں کون؟“

”یہی تو ہیں جو میرے ساتھ آئے ہیں۔ عراب پور میں مجسٹریٹ کے عہدے پر تعینات ہیں۔ چھوٹے شہروں میں ان لوگوں کی بادشاہت ہوتی ہے۔“

”وہ تو ہے مگر ان کی خواہش پر مجھے ڈنر دینے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“

”یہ بادشاہ ہیں اور انہیں ایک ملکہ کی ضرورت ہے۔ ان کی نظر تم پر پڑی اور انہوں نے تمہیں مدعو کر لیا۔“

”مجھے نہیں، پاپا اور امی کو مدعو کیا گیا ہے۔ میں تو ان کے ساتھ آگئی ہوں۔“

”بات ایک ہی ہے۔ عباد بھائی اور فاخرہ کوئی تم سے الگ تھوڑی ہیں بلکہ اس معاملے میں پہلے تو وہی ہیں۔“

”آئیے وہاں انتظار ہو رہا ہوگا۔“ ملکہ اس قفسے کو یہیں ختم کر دینا چاہتی تھی اس لیے وہاں سے ہٹ گئی۔

میڈم شہناز کو بھی اس کے ساتھ آنا پڑا۔

ڈنر ہال میں آ کر اس نے پہلی مرتبہ غور سے عاطف کی طرف دیکھا۔ اسے اگر کاشف کا انتظار نہ ہوتا تو اسے خوبصورت کہا جاسکتا تھا۔ کاشف کی طرح اس کی آنکھیں بھی نیلی اور بال بھورے تھے۔ گورا رنگ، دراز قد۔ ہر طرح سے معقول تھا لیکن کاشف نہیں تھا۔ اس کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔

کچھ تو کاشف کا خیال تھا، کچھ اسے میڈم کی باتوں نے اداس کر دیا تھا۔ وہ سر جھکائے کھانا کھاتی رہی۔

عاطف نے کئی مرتبہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہوں ہاں سے آگے نہیں بڑھی۔ یہ بھی بد تہذیبی تھی کہ کسی بات کا جواب ہی نہ دیتی۔ دو چار باتوں کا جواب بھی دینا پڑا۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا رہا۔ درمیان میں باتیں بھی ہوتی رہیں۔ باتیں کیا کارناموں کا تبادلہ تھا۔

میڈم شہناز عاطف کے قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ عباد اللہ خاں اپنی بیٹی کے کارناموں کی تفصیل بتا رہے تھے۔ کافی کا دور ختم ہوا تو میڈم شہناز، عباد اللہ خاں کو لے کر ایک طرف چلی گئیں۔ ملکہ کو معلوم تھا کہ کیا باتیں ہو رہی ہوں گی لیکن وہ انہیں ردک تو نہیں سکتی تھی البتہ یہ احساس ہو گیا تھا کہ اسے اب ایک اور محاذ پر لڑنا پڑے گا۔ اس نے وہ تمام

میری روح کی حقیقت مرے آنسوؤں سے پوچھو

میرا کجسی قسم مرا تر جہاں نہیں ہے

کسی نے تھوڑی دیر کے لیے اس کی غیر موجودگی کو محسوس بھی نہیں کیا۔ اس کی تلاش تو اس وقت ہوئی جب موسیقی کا یہ پروگرام ختم ہوا اور تحفوں کی ترسیل کا وقت آیا۔ اسے اسٹیج پر بلا یا گیا۔ مہمان ایک ایک کر کے اسٹیج پر آتے رہے اور وہ تحفے وصول کرتی رہی۔

اس کے بعد کھانا شروع ہوا۔ وہ بھی بے دلی سے کھانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ پھر مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔

مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر سناں ہو گئی۔

تھکن کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں آگئی۔ ایک مرتبہ پھر اس نے سونائیل کی بھول بھلیوں میں کاشف کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اندھیرے پھر مسلط ہو گئے۔ وہ ٹانگ ٹوٹیاں مارتی رہی۔ پھر یہ اندھیرے اس کی آنکھوں میں اتر گئے۔ وہ واقعی اتنی تھک گئی تھی کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرا دن بھی چاند چکور کے اسی کھیل میں گزر گیا۔ نمبر ملاتے ملاتے اس کی انگلیاں تھک گئی تھیں لیکن کاشف تو یوں غائب ہو گیا تھا جیسے غائب ہونے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہو۔

میڈم شہناز نے ڈنر پر بلا رکھا تھا لہذا شام سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ہوٹل اسٹار شہر کا سب سے ہنگامہ ہوٹل تھا۔ وہ کاشف کو پہلی مرتبہ اسی ہوٹل میں لے کر گئی تھی۔ اس خیال سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

وہ وہاں پہنچی تو ڈنر میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور وہ ٹپکتی ہوئی سونگنگ پول کی طرف چلی گئی۔ اسی وقت میڈم شہناز بھی وہیں پہنچ گئیں۔

”کیا ہوا ملکہ، یہاں کیوں چلی آئیں؟“

”ایسے ہی بس!“

”جانتی ہو، میں نے کس کی فرمائش پر تمہیں یہاں بلا یا ہے؟“

”پتا نہیں میڈم!“

”عاطف علی خاں کی خواہش تھی کہ میں تمہیں یہاں بلاؤں۔“

”کون عاطف علی خاں اور ان کی یہ خواہش کیوں

اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

وہ لڑکھرائی اور جہاں جگہ ملی وہاں بیٹھ گئی۔ اتفاق دیکھیے کہ وہ میڈم شہناز کے برابر بیٹھی تھی اور ان کے برابر ان کا وہ رشتہ دار لڑکا بیٹھا تھا۔

گلوکار نے غالب کی غزل شروع کر دی تھی۔ مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

میڈم نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے لڑکے کو دیکھا پھر اس سے مخاطب ہوئیں ”کل میں نے فاخرہ کو، عباد بھائی کو اور تمہیں ہوٹل اسٹار میں مدعو کیا ہے۔“

”وہ کیوں میڈم!“

”تمہاری کامیابی کی خوشی میں ٹریٹ دے رہی ہوں۔“

”مجھ سے ایسا کیا کارنامہ سرزد ہو گیا۔ آج پاپا نے یہ ہنگامہ بچا دیا، کل آپ زحمت کر رہی ہیں۔“

”تم اتنی تنہائی پسند تو کبھی نہیں جتنا میں اب دیکھ رہی ہوں۔ کچھ پریشان ہو؟“

”نہیں میڈم! ابھی امتحانوں کی تھکن اتری نہیں تھی کہ یہ ہو گیا۔“

”کل سب تھکن اتر جائے گی، میری بھی تمہاری بھی۔“ انہوں نے عجیب ڈومعنی فقرہ کہہ دیا تھا۔ ادھر گلوکار نے اس کی دھمکی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

مدت سے تری صورت اسے ماہ لقا ہم نے

محسوس بہت کی ہے آنکھوں سے نہیں دیکھی

وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے عجیب بد تمیزی کا مظاہرہ کیا۔ میڈم سے اجازت لیے بغیر اٹھی اور تقریباً بھاگتے ہوئے گھر کے اندر چلی گئی۔ بیڈروم میں پہنچی تھی کہ بیڈ پر اوڑھنے منہ کر کر سسکیاں بھرنے لگی۔ ”تم نے ٹھیک کہا تھا کاشف۔ کسی کے دور رہنے سے محبت کم نہیں ہوتی۔ یہ دیکھو، میں تمہاری یاد میں آنسو بہا رہی ہوں۔ تمہارے بغیر میں ادھوری ہو گئی ہوں۔ لوگ میرے مکمل ہونے کا جشن منا رہے ہیں اور میں ادھوری ہوں۔ جلدی چلے آؤ کاشف! ورنہ میں ادھوری بھی نہیں رہوں گی۔ تم کہاں گم ہو گئے ہو؟ اس طرح کوئی جاتا ہے بھلا۔“

دنیا بھی عجیب جگہ ہے۔ آنسو خود نہیں پوچھتی، رونے والے سے خود کہتی ہے کہ اس کے خوف سے وہ اپنے آنسو پونچھ لے۔ وہ اٹھی، آنسو پونچھے، ہلکا سا میک اپ دوبارہ کیا اور غسل میں پہنچ گئی۔ گلوکار معظفی زیدی کی غزل گارہا تھا۔

یہ لوگ کیوں مرے (لم ہکر کو کہتے ہیں
اس کا ماضی دیکھا کرتے ہوئے اس کے ڈرائنگ روم
تک آ گیا تھا۔

بے وفائی کا مارا رہتا نہیں ہے۔ وہ بھی نہ رہ سکی۔ نہ
اپنے گھر میں نہ شہر میں۔ گھر بھی چھوٹا شہر بھی گیا۔ وہ عاطف
کی بیوی بن کر محراب پور آ گئی۔ گھر میں تین بندے،
عاطف، اس کی ماں اور وہ خود۔ نوکروں کی تعداد چار۔
ڈرائیور، دو مالی، ایک خانساں، سرکاری بنگلا نہ فون کا
خرچ نہ بجلی کا۔

شادی کو تیسرا دن ہوا تھا۔ ابھی اس نے پاؤں نیچے
نہیں رکھے تھے کہ دفتر سے عاطف کا بلاوا آ گیا۔ جیب
دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ اسے خدا حافظ کہنے دروازے
تک گئی۔ واپس آ رہی تھی کہ سوچا گھر کا جائزہ ہی لے
لے۔ ڈرائنگ روم سامنے تھا، اس نے قدم رکھ دیا۔
شاندار فرنیچر، عاطف کو ملنے والے ایوارڈز، پتھر کے دو
مجسمے اور پھر وہ خود بہتر بن گئی۔ ایک شیلف پر کاشف کی
تصویر مسکرا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی تصویر سے نکل
آئے گا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور ٹکٹلی باندھ کر دیکھنے لگی۔
مہمان آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، اپنی تصویر چھوڑ کر
تھوڑی جاتے ہیں۔ یہ تو اسی گھر کا آدمی ہے جو مجھے دیکھ کر
کہیں چھپ گیا ہے۔ وہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ
اس کی ساس نے اس کی محویت کو توڑ دیا۔

”یہ میرا چھوٹا بیٹا ہے کاشف، تمہارا دیور۔ کبھی آئے
تو دیکھنا۔ ایسا شیر ہے کہ تمہارا جینا دو بھر کر دے گا۔“
”کہاں ہیں یہ؟“

”تمہاری شادی سے پہلے ہی تو لندن گیا ہے۔“
”شادی میں بھی شریک نہیں ہوئے۔“

”اس کے جانے کے بعد شادی کا سلسلہ چلا۔ اسے
لکھتے تو تعلیم چھوڑ چھاڑ کر فوراً چلا آتا۔ ہم نے تو اب بھی
نہیں لکھا ہے۔ بھائی کو دیکھنے فوراً چلا آئے گا۔ شاعری وہ
کرتا ہے، مصور وہ ہے، تقریریں وہ کرتا پھرتا ہے۔ جانے
کیا کیا ہے، خیر سے آیا تو دیکھنا۔“

وہ ڈرائنگ روم سے اپنے کمرے تک یوں بھاگتی
ہوئی آئی جیسے آگ نے اس کا دامن پکڑ لیا ہو۔ آگ پانی
سے بجھتی ہے، اسے بھی پانی کا خیال آیا۔ بیڈ روم فرنیچر سے
پانی کی بوتل نکالی۔ ایک گلاس سے آگ کہاں بجھنے والی
تھی، دوسرا گلاس بھی پی لیا۔ حواس تھے کہ قابو میں آئی نہیں
رہے تھے۔ آنے والا وقت اگلے پاؤں چلتا ہوا اس تک

بھگاد تو کچھ دیر دھواں اٹھتا ہے پھر خاموشی۔ روشن دن
سامنے ہو تو چراغ کے بجھنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ جس
گھر میں بیاہ کر جا رہی ہے وہاں عیش ہی عیش ہوگا۔ کچھ دن
میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح
اپنے شوہر سے پندرہ دن کی مہلت طلب کر لی۔ ملکہ سے بھی
کہہ دیا کہ تمہارے پاس سوچنے کے لیے پندرہ دن ہیں۔
چھائیں کا پیچھا کر دیا حقیقت قبول کر لو۔

ملکہ نے یہ پندرہ دن پندرہ سال سمجھ کر قبول کر لیے
در انتظار کی بارگاہ میں جو گن بن کر بیٹھ گئی۔ فاخرہ بیگم اپنے
تجربے کی چاندنی اس پر نچھادر کرتی رہیں۔ اندھیرے
اجالے کا فرق بتاتی رہیں۔ آنسو بوجھتی رہیں، سسکیاں
دباتی رہیں۔ ملکہ اب خود بھی سوچتی تھی تو کاشف کی ہر جاتی
کے روپ میں نظر آتا تھا۔ اس کے پیروں میں پیسے لگے
ہوئے تھے۔ کسی ایک جگہ ٹکٹا ہی نہیں تھا۔ ابھی اس سے
باتیں کر رہا ہے، ابھی کسی دوست کی آواز پر دوڑ پڑا۔
سنجیدگی اس کے قریب سے ہو کر نہیں گزری تھی۔ ہر چیز کو
مذاق ہی سمجھتا تھا۔ اس نے میری محبت کو بھی مذاق ہی سمجھا
ہوگا۔ کسی اور آواز پر دوڑ پڑا ہوگا۔ اس خیال نے ایک
مرتبہ سراٹھایا تو اسی سمت پر سفر شروع ہو گیا۔ اس نے کہا
تھا، دیکھتا ہوں تم میرا انتظار کرتی ہو یا نہیں۔ بار بار ذکر کرتا
تھا، اگر حالات نے ہمیں جدا کر دیا۔ اس نے پہلے ہی سوچ
لیا تھا کہ وہ جدائی کا راستہ اختیار کرے گا۔

جب اس کی بے وفائی کا یقین پختہ ہو گیا تو عاطف
کے خیال نے جگہ بنانی شروع کر دی۔ کاشف نے اس شہر
میں دل لگانے کے لیے مجھے منتخب کیا تھا۔ جب اس شہر میں
رہنے کا جواز ختم ہو گیا تو اپنے شہر واپس لوٹ گیا اور اس
طرح گیا کہ قدموں کے نشان تک مٹا گیا۔ اسے مجھ سے
محبت نہیں تھی، میرے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس خیال کے
آتے ہی اسے وہ زندگی یاد آنے لگی جو اس کا انتظار کر رہی
تھی۔ عاطف خوب صورت ہے، تعلیم یافتہ ہے، اعلیٰ
مہدے پر فائز ہے اور سب سے بڑھ کر میرا تمنا ہے۔
اب وہ خود وہ تمام باتیں سوچ رہی تھی جو فاخرہ بیگم اس سے
کہہ چکی تھیں۔

پندرہ دن پندرہ لمحوں کی طرح گزر گئے لیکن وہ اس
مختصر سے وقت میں ایک بڑا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس نے اس
فیصلے سے اپنی ماں کو بھی آگاہ کر دیا۔

☆☆☆

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو

ضرور آئے گا۔“

”آیا بھی تو اس وقت آئے گا جب وقت گزر چکا
ہوگا۔“

”اسی لیے میں وقت کو اپنی مٹھی میں قید کر کے رکھتا
چاہتی ہوں۔“

”تم سے پہلے بھی ایک لڑکی تھی، اسے بھی ایک لڑکا ملا
تھا۔ پھر وہ بھی اسی طرح غائب ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی
بڑی تیز آمدنی چلی تھی، بڑا خطرناک طوفان آیا تھا۔ اس
لڑکی نے بھی بہت شور مچایا تھا، بہت چینی تھی لیکن طوفان کے
شور میں بے جان آواز کا شور کون سنتا ہے۔ وہ لڑکا آیا
مرد لیکن اس وقت جب وقت گزر چکا تھا۔“

”اس لیے میں فی الحال وقت کو روکنے کے لیے کہہ
رہی ہوں، شاید وہ آجائے۔“

”تم مجھے اس چیز کو روکنے کے لیے کہہ رہی ہو جو کسی
کے اختیار میں نہیں۔ وقت گزر جائے تو پھر پچھتاوے کے
سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس لیے جوں جوں اسے حاصل کر لو۔
کسی کی بے وفائی کے لیے اپنی آنکھیں کیوں نم کرتی ہو۔
وہ اگر سامنے ہوتا تو میں تمہارا مقدمہ لڑ سکتی تھی۔ تمہاری
شادی پر چھائیں سے نہیں ہو سکتی۔“

”آپ کسی طرح پاپا سے مجھے چھ مہینے کی مہلت
دلوادیں۔ اتنے عرصے میں تو وہ آ ہی جائے گا۔ وہ کیا نہیں
ہے مجھے ستانے کے لیے کہیں چھپ گیا ہے۔“

”دیکھو، میں کوشش کرتی ہوں لیکن میرا تجربہ کہتا
ہے کہ اس نے تم سے بے وفائی کی ہے۔ وہ اب بھی نہیں
آئے گا۔“

فاخرہ بیگم کے سامنے ایک مرتبہ پھر ارسلان آ کر کھڑا
ہو گیا تھا۔ وہ بھی اسی طرح غائب ہو گیا تھا۔ اس نے لوٹ
کر آنے میں دو سال لگا دیے تھے اور ان کی شادی
عباد اللہ سے ہو چکی تھی۔ ان کی بیٹی بھی آج اسی موڑ پر کھڑی
ہوئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی کسی کی ہو جائے
اور اس کے بعد آنے والا آجائے لیکن یہ منانت بھی نہیں
دی جاسکتی تھی کہ آنے والا واقعی آجائے گا۔ اگر اس کے
پاؤں واپس کے لیے نہیں اٹھے تو اس وقت ملکہ پر کیا
گزرے گی۔ کیا دو سال کے بعد پھر دو سال، نہیں نہیں۔
عورت کی زندگی شادی کے بغیر ادھوری بھڑکتی ہے۔ ملکہ
کی شادی ہو جانی چاہیے۔ آنکھ ادھول پہاڑ ادھول۔ شادی
ہوگی، بچے ہوں گے، ماضی دھندلا سا خواب بن کر رہ
جائے گا۔ محبت تو چراغ کی آگ کی طرح ہوتی ہے۔

وہ باپ کے سامنے گونگی بن کر رہ گئی لیکن ماں کے سامنے تو
زبان کھول سکتی تھی۔

”امی، پاپا کو منع کر دیں۔“
”کیا پاگل ہو گئی ہو۔ اتنے اچھے رشتے بار بار نہیں
مٹتے۔“

”میں پاپا سے تو نہیں کہہ سکی لیکن آپ سے کہہ رہی
ہوں۔ میں فی الحال شادی نہیں کروں گی۔“

”تمہاری مرضی ہے لیکن تمہارے پاپا زبان دے
چکے ہیں۔“

”ان کی غلطی ہے۔ ان کو پہلے مجھ سے پوچھ لینا
چاہیے تھا۔“

”یہ تم اس باپ کے لیے کہہ رہی ہو جس نے ہمیشہ
تمہیں بانہوں میں جھلایا، آنکھوں پہ بٹھایا۔ خبردار، جوان
کے سامنے تم نے انکار کیا۔“

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ انکار نہیں کرنے کی لیکن
جب ایک مرتبہ پھر عباد اللہ خاں نے اس سے پوچھا تو اسے
اچانک کاشف یاد آ گیا۔ وہ گستاخ بن گئی۔ کاشف کی
محبت میں اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس کا باپ بھی تو اس
سے محبت کرنے والوں میں ہے۔

قیامت ہی تو آ گئی۔ عباد اللہ خاں نے اعلان کر دیا
کہ ملکہ کی شادی عاطف سے ہوگی۔ اب یہ ملکہ کی مرضی کہ
وہ اپنی سسرال زندہ جانا چاہتی ہے یا مردہ۔

فاخرہ بیگم کو معلوم تھا کہ عباد اللہ خاں جو کہتے ہیں وہ
کر گزرتے ہیں۔ انہوں نے ملکہ کو بٹھا کر سمجھایا۔ ملکہ ایک
ہی دن میں مرجھایا ہوا پھول بن گئی تھی۔ ٹھیس لگی تو ہتی ہتی
ہو کر بکھر گئی۔

”امی، میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔“
”کیا کہا.....؟“ فاخرہ بیگم کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”وہی جو آپ نے سنا ہے۔“
”کون ہے وہ.....؟“

”میرے ساتھ تقریری مقابلوں میں حصہ لیا کرتا
تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔“

”کہاں ہے وہ۔ اسے لے کر آؤ تا کہ میں اسے
عاطف کے مقابلے میں پیش کر سکوں۔“

”وہ کہیں چلا گیا ہے۔ میں اسے ڈھونڈوں گی اور
ڈھونڈتی رہوں گی۔ پاپا سے کہیں کچھ زور انتظار کریں۔“

”وہ اب بھی نہیں آئے گا، اس کا انتظار چھوڑ دو۔“
”نہیں، وہ مجھے ستانے کے لیے کہیں چھپ گیا ہے،

آگیا تھا۔ کاشف اسی گھر کا فرد ہے اور مجھ سے پہلے سے یہاں رہ رہا ہے۔ وہ آگیا تو ہر وقت کا ساتھ ہوگا۔ کیا میں اس کے ذریعے فقرے برداشت کر سکوں گی؟ وہ مجھے اپنے بھائی کی بیوی کے روپ میں دیکھ سکے گا؟ میرا ضمیر مجھے چین لینے دے گا؟ میں نے ایک مرتبہ کسی تقریر میں کہا تھا، دو پچھڑے ہوئے اگر مل جائیں تو پھر دی ہوتا ہے جو تیل کو ماچس دکھانے سے ہوتا ہے۔ تو کیا وہ وقت آنے والا ہے؟ کتنے ہی سوالات تھے جن کے جواب اس کے پاس نہیں تھے۔ وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔

دو پہر کی دھوپ گھر سے جانے والی تھی کہ عاطف آگیا۔ وہ خود بہت شرمندہ تھا کہ شادی کے تیسرے دن اسے نوکری پر جانا پڑ گیا تھا لیکن ملکہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھا۔

”یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا؟“
”کچھ بھی نہیں۔ کیا ہو گیا؟“
”تمہارا رنگ پیلا پڑا ہوا ہے، جیسے کوئی خوف دامن گیر ہو۔“

”مجھے کیا خوف ہو سکتا ہے، مجسٹریٹ صاحب کی بیوی ہوں۔“ اس نے ایسے کہا جیسے طنز کر رہی ہو۔
”میرے چلے جانے پر خفا ہو۔ بھی نوکری ہی ایسی ہے۔ کسی وقت بھی جانا پڑ جاتا ہے۔ زیادہ ہوا تو یہ نوکری ہی چھوڑ دیں گے۔ اب تو خوش ہو۔“
”میں نے کہا نا..... میں خفا نہیں ہوں۔“ تنگی اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھی۔

”جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ کہیں باہر چلتے ہیں۔“
”آج رہنے دیں، کل چلیں گے۔“
”معلوم ہوتا ہے اس گھر میں ضرور کوئی ایسی چیز ہے کہ جناب کا دل لگ گیا ہے۔“

ملکہ یوں چونک گئی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو، عاطف کو معلوم ہو گیا ہو کہ میں نے کاشف کی تصویر دیکھ لی ہے۔ میں اگر اس وقت اس کے ساتھ نہیں گئی تو وہ یہی سمجھے گا کہ میں کاشف کی تصویر دیکھنے کے لیے رک گئی ہوں۔ یہ اس کے دل کی آواز تھی جو اس کے کانوں تک آرہی تھی۔ وہ چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔

”کمال ہے! ابھی انکار ابھی اقرار۔“
”آپ پر رحم آگیا۔“
”رحم تو اس پر آتا ہے جس سے محبت نہیں ہوتی۔“

”کبھی کبھی یہ دونوں رشتے ایک محبت کے نیچے جمع

ہو جاتے ہیں۔“
”دو کشتیوں میں سفر کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔“
”اب آپ کو معلوم ہوا میرا رنگ پیلا کیوں نظر آ رہا تھا۔“
”وہ باتیں بھی کرتی رہی اور تیار بھی ہوتی رہی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اسے کاشف کا خیال آگیا۔ جی چاہتا تھا کوئی اس کی باتیں کرے۔“

”سنا ہے آپ کا کوئی چھوٹا بھائی بھی ہے؟“
”سنا ہے کیا مطلب؟“
”آج میں نے اس کی تصویر دیکھی تو امی جان نے بتایا۔“

”صاحب زادے لندن گئے ہوئے ہیں پی ایچ ڈی کرنے۔ اردو کا بھوت سوار ہے ان پر۔ کم از کم مجھ سے تو یہی کہا ہے کہ لندن جا رہے ہیں۔“
”جب کہا ہے تو گئے بھی ہوں گے۔“

”ارے نہیں۔ تم نہیں جانتیں اسے۔ ایک مرتبہ اور غائب ہو گیا تھا محض یہ جاننے کے لیے کہ ہم اس سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اسے تلاش کرتے ہیں یا نہیں۔ واپس آیا اور ہمیں خوش و خرم دیکھا تو بہت مایوس ہوا۔ اس کا خیال تھا ہم سب گریبان پھاڑ کر جنگل میں نکل گئے ہوں گے۔“
”ایسی محبت کرنے والے بھائی کے بغیر ہی آپ نے شادی کر لی۔“

”اس کے جانے کے بعد شادی کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ بلا یا اس لیے نہیں کہ یہاں سے جانے کے بعد نواب صاحب نے خبر ہی نہیں لی ورنہ تمہاری تصویر تو ضرور بھیجتا کہ دیکھو پاکستان میں ایک ہی ہے جو اب ہمارے پاس ہے۔“

”جلدی کیا ہے، دو چار سال میں آئے تو خود ہی دیکھ لیں گے۔“
”مجھے وہ بہت عزیز ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔“

”آپ کو ایسی کیا جلدی ہو گئی۔ جب آنا ہوگا آجائے گا۔“ یہ بیزار جملہ اچانک اس کی زبان سے ادا ہو گیا۔

”وہ آئے گا تو تمہیں خوشی نہیں ہوگی؟“
”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ ہم گھونٹے نکلے ہیں تو کچھ اپنی باتیں کریں۔ کاشف کی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔“

”یہ بھی اپنی ہی باتیں ہیں۔ پھر بھی تم کہتی ہو تو نہیں کرتے کاشف کی باتیں۔“

اتنی دیر میں وہ مارکیٹ آگئی تھی جہاں عاطف کو آنا تھا۔ اس نے گاڑی پارک کی اور ملکہ کے ساتھ مارکیٹ میں داخل ہو گیا۔ وہ کہتی رہ گئی کہ ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ کپڑوں سے الماری بھری ہوئی ہے لیکن عاطف نے پھر بھی دو شاندار جوڑے اسے دلوادے۔

”ایک شرٹ کاشف کے لیے بھی لے لیجیے۔“
”وہ ابھی آیا ہے نہیں اور اتنی ہمدردی ہو گئی۔“
”آپ کا اتنا عزیز بھائی ہے۔ ہمدردی تو مجھے ہوگی۔“

”جب آجائے تو ساری ہمدردیاں پوری کر لیں۔ فی الحال تو چشم کرم ہم پر ہے تو اچھا ہے۔“
”خیر منائے کہیں وہ آئے جائے۔“

اس وقت تو وہ واقعی ہلکے پھلکے سوڈ میں تھی کیونکہ عاطف اس کے ساتھ تھا۔ دو چار دن عاطف گھر پر ہی رہا اس لیے سوچنے کا وقت نہیں ملا لیکن جونہی عاطف نے آفس جانا شروع کیا اور کاٹنے کے لیے لیے دن اسے مل گئے تو کاشف کی یادوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ کچھ دیر وہ اس کی باتیں، اس کی شرارتیں یاد کرتی رہتی اور پھر اس خوف میں مبتلا ہو جاتی کہ وہ آگیا تو کیا ہوگا۔ میرا اس سے اب کوئی رشتہ ہی نہیں۔ میں اسے سمجھا دوں گی کہ اب میں تمہارے بھائی کی بیوی ہوں۔ کیا وہ میرے سمجھانے سے باز آجائے گا؟ اگر وہ نہ مانا..... اگر وہ انتقام پر اتر آیا تو اس نے کہا تھا میں اگر کسی اور کی ہو گئی تو وہ یا تو اسے قتل کر دے گا جس نے مجھے چرایا ہوگا یا خودکشی کر لے گا۔ کیا میں یہ دونوں حالتیں برداشت کر لوں گی؟ اس کو تو چھوڑ دیا اس کے آنے پر میں اپنے جذبات پر قابو رکھ سکوں گی؟

وہ ایسی تکلیف دہ الجھن میں گرفتار تھی کہ جس سے فرار کا راستہ اسے نظر نہ آتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں جانے سے گریز کرتی تھی لیکن کوئی نہ کوئی مہمان آ ہی جاتا تھا اور اسے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ وہ کاشف کی تصویر کو نہیں اٹھا کر رکھ دے لیکن وہ کسی کو شک میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اتنی احتیاط کے باوجود یہ شک ایک دن عاطف کی بان پر آ ہی گیا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کاشف کی تصویر دیکھ کر چونک پڑتی ہو۔ تم نے اسے کہیں دیکھا تو نہیں ہے؟“

”جی ہاں، تلاش کم شدہ کے اشتہار میں دیکھا تھا۔“
وہ ہنسنے لگی۔ ”آپ کمال کرتے ہیں، جب سے میں آئی ہوں تصویر ہی دیکھ رہی ہوں۔“

”وہ تمہارے شہر میں رہ چکا ہے، تمہاری طرح تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیا کرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید تم نے کسی مقابلے میں اسے دیکھا ہو۔“
”اتنے لڑکے لڑکیاں ان مقابلوں میں آتے تھے۔ کون نظر میں رہتا ہے۔“

عاطف یہ سن کر خاموش ہو گیا تھا لیکن ملکہ کے دل کا چور شور مچا رہا تھا۔ بات ابھی یہاں تک آئی ہے کہ دن یہ راز مکمل بھی جائے گا کہ میں اسے پہلے سے جانتی تھی۔

اسی سو گوار فضا میں اس کا زلزلہ آگیا۔ وہ سب کچھ بھول کر اس خوشی میں مگن ہو گئی کہ اب وہ ڈاکٹر بن گئی ہے۔ اس کے پاس ہونے کی خوشی میں ایک پارٹی یہاں بھی ہوئی۔ اس پارٹی میں فاخرہ اور عباد اللہ خاں بھی آئے ہوئے تھے۔

ماں کو دیکھ کر ملکہ کا دل بھر آیا۔ ماں نے کہا تھا کہ اگر آنے والا آیا بھی تو بچتا دے کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اس کا جی چاہا کہ اپنی ماں سے چچ چچ کر کہے کہ آنے والا آیا نہیں ہے مگر اس کا سراغ مل گیا ہے۔ اب وہ بچتا رہی ہے کہ اس نے مزید انتظار کیوں نہیں کر لیا۔ شادی ہوئی ہی تھی تو کسی اور جگہ ہو جاتی۔ وہ کس طرح زندگی بھر کاشف کا سامنا کر سکے گی۔ وہ ماں کے گلے لگی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی لیکن سب یہی سمجھے کہ اتنے دن بعد ماں کو دیکھا ہے تو دل بھر آیا۔ اس کے رونے کا سبب کوئی نہ جان سکا۔

اب ہاؤس جاب کا مسئلہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی بڑے اسپتال میں ہاؤس جاب کرے۔ نخراب پور میں سرکاری اسپتال تھا ضرور لیکن بس واجبی سا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے عاطف سے ذکر کیا کہ وہ ہاؤس جاب کرنے کے لیے اپنے گھر چلی جائے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اجازت کبھی نہیں ملے گی لیکن عاطف نے اسے اجازت دے دی۔ وہ یوں اپنے والدین کے ساتھ اپنے میکے آگئی جیسے قید سے چھٹی رہا ہوتا ہے۔

عاطف بارہ پندرہ دن میں آکر اسے لے جاتا تھا یا وہ خود چلی جاتی تھی۔ شب دروز انہی مصروفیات میں گزر رہے تھے۔ ایک دن وہ پرانے دوستوں سے ملنے ریڈیو چلی گئی۔ وہاں اس کی ملاقات امجد سے ہوئی۔ امجد کو وہ بہت سے تقریریں مقابلوں میں دیکھ چکی تھی۔ اب وہ

پروڈیوسر بن گیا تھا۔ باتوں باتوں میں کاشف کا ذکر نکل آیا۔ کاشف کا نام آتے ہی امجد نے عجیب انکشاف کیا۔
”کیا ٹیلنٹ تھا جو اس شہر کی سڑکوں پر ضائع ہو گیا۔“

”کیا ہوا کاشف کو۔“

”پوری بات تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ سنا ہے کسی لڑکی نے اس سے بے وفائی کی تھی۔ وہ کچھ دن تو شہر کی سڑکوں پر دیوانوں کی طرح گھومتا رہا پھر اچانک غائب ہو گیا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہاں گیا۔“

”کون تھی وہ لڑکی۔ کچھ پتا چلا۔“

”یہ تو معلوم نہیں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ کاشف اس لڑکی کو ستانے کے لیے یا امتحان لینے کے لیے غائب ہو گیا تھا۔ واپس آیا تو اس لڑکی نے کہیں اور شادی کر لی تھی۔“
”بے چارہ کاشف۔ کتنا اچھا لڑکا تھا وہ۔“ ملکہ نے افسردگی سے کہا اور اس کے کمرے سے اٹھ آئی۔

اب کسی اور سے کیا ملنا۔ وہ اپنے قدموں پر چل ضرور رہی تھی لیکن یہ اس کا حوصلہ تھا جو اسے اس کی گاڑی تک لے آیا تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھ کر اے سی آن کر دیا اور سوچنے لگی۔ واقعات کی کڑیاں ملائیں تو تصویر بالکل صاف نظر آنے لگی۔ کاشف اس کا امتحان لینے کے لیے اس سے دور ہو گیا تھا۔ اپنے گھر گیا، ایک مذاق گھر والوں سے کیا۔ ان سے کہا وہ لندن جا رہا ہے اور دوستوں کے ساتھ کہیں نکل گیا۔ واپس آکر اس نے مجھے فون کیا، ہوگا لیکن شادی کے بعد میں نے ”سم“ بدل لی تھی۔ رابطہ نہیں ہوا تو اس نے گھر کے نمبر پر فون کیا ہوگا۔ اسے معلوم ہوا ہوگا کہ ملکہ کی شادی ہو گئی ہے۔ پھر وہ کچھ دن بقول امجد سڑکوں پر دیوانوں کی طرح گھومتا رہا اور پھر کسی طرف نکل گیا۔ خدا جانے کہاں ہوگا؟

اس کا مطلب ہے وہ لندن نہیں گیا۔ یہیں کہیں ہے اور کسی وقت بھی گھر لوٹ کر آ سکتا ہے۔ آنے دو، میں اسے پہچاننے ہی سے انکار کر دوں گی۔ میں کہہ دوں گی میں وہ ملکہ ہوں ہی نہیں۔ اور یہ میں اس کے بارے میں سوچ بھی کیوں رہی ہوں۔ میں شادی شدہ عورت ہوں، کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی میرے لیے گناہ ہے۔ میں اب تک اس کے انتظار میں زندگی گزار دیتی لیکن وہ تو غائب ہو گیا تھا۔ جتنا میں ڈھونڈ سکتی تھی میں نے ڈھونڈا۔ وہ موجود ہی نہیں تھا تو میں کس کے لیے لڑتی۔

وہ کسی قدر پرسکون ہو گئی تھی۔ اس نے گاڑی

اسٹارٹ کی اور گھر چلی آئی۔ وہ اس کے بارے میں سوچتا نہیں چاہتی تھی لیکن گھر پہنچتے ہی ایک ادھورے خیال نے پھر آواز دے لی۔ اس نے تو اپنے شہر کا نام سلطان پور بتایا تھا اور میں رخصت ہو کر محراب پور گئی ہوں۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ اس کا جواب بھی اسے جلد مل گیا۔ سرکاری ملازمتوں میں ٹرانسفر ہوتے رہتے ہیں۔ عاطف کا ٹرانسفر سلطان پور سے محراب پور ہو گیا ہوگا اور یہی وہ دن ہوں گے جب میں سلطان پور والے گھر کا نمبر ملانی رہی تھی۔ وہ سرکاری مکان اس وقت خالی پڑا ہوگا۔

اس کی ہاؤس جاب مکمل ہونے والی تھی۔ اس کا دل پھر دھڑکنے لگا تھا کہ پھر اسی گھر میں جانا ہوگا اور یہی ہوا۔ ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی عاطف اسے لینے کے لیے آ گیا۔ اس کا جی چاہا انکار کر دے مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا، اسے جانا پڑا۔

اتنے بڑے گھر میں کاشف کی تصویر کے ساتھ وہ پھرا کیلی تھی۔ اس نے گھبرا کر نوکری کر لی۔ دن بھر اسپتال میں گزر جاتا۔ واپس آتی تو عاطف کے ساتھ کہیں باہر چلی جاتی۔ رات کی ڈیوٹی ہوتی تو دن کا بیشتر حصہ سوتے ہوئے گزر جاتا۔ سوچنے کے لیے نہ تو وقت تھا نہ ضرورت۔

اس دن وہ اسپتال سے آ کر بیٹھی تھی۔ عاطف بھی اسی وقت پہنچا تھا۔ اطلاعی کھنٹی بجی اور کچھ ہی دیر میں ملازم بھاگتا ہوا آیا۔ ”مالک! کاشف باہر آئے ہیں۔“

”کیا کہا کاشف آیا ہے۔ سمجھو اسے یہاں۔ شرارتی کہیں کا۔“ عاطف نے کہا اور پھر خود ہی اٹھ کر باہر کی طرف بھاگا۔ اس کے پیچھے ملکہ بھی دوڑ پڑی۔ اس نے دور سے دیکھا۔ وہ کاشف نہیں تھا، اس کی ہڈیاں تھیں جو چل رہی تھیں۔ وہ گھبرا کر کمرے کی طرف لوٹ گئی۔ یہ ہڈیاں اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ عاطف ان ہڈیوں کو سمیٹے ہوئے تھا۔

”ملکہ، دیکھو تو کون آیا ہے۔“ عاطف نے کہا۔ پھر وہ کاشف سے مخاطب ہوا۔ ”اپنی بھابی سے نہیں ملو گے۔“
”اچھا تو وہ یہ ہیں جن سے آپ نے شادی رچائی ہے؟“

”دیکھی ہے ایسی خوبصورت لڑکی تم نے؟“
”دیکھ تو رہا ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں ایسی حقارت تھی کہ ملکہ نے آنکھیں جھکا لیں۔
”فکر مت کر یار۔ اب تو آ گیا ہے، تیرے لیے اس سے بھی خوب صورت لڑکی لائیں گے۔“

”اب کہاں زمانے میں دوسرا جواب ان کا۔ یہ تو لگتا ہے بس ایک ہی بنی تھیں۔ انہیں آپ لے اڑے اب کیسی تلاش۔“

وہ کمرے سے یوں بھاگ کھڑا ہوا جیسے سانپ نکل آیا ہو۔ بس یہ کہتا گیا کہ وہ ماں کے پاس جا رہا ہے۔ سچی وفا وہیں ملے گی۔ عاطف بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے نکل گیا۔

وہ کمرے میں تنہا رہ گئی تھی۔ وہ کاشف کی حالت دیکھ کر خود کو ایسا مجرم سمجھ رہی تھی جیسے پھانسی کی سزا ہوئی چاہیے۔ اس نے سوچا، وہ اگر ذرا سی ہمت کر لیتی اور عاطف سے شادی نہ کرتی تو کاشف کی یہ حالت دیکھنے کو نہ ملتی۔ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن آنسوؤں نے بغاوت کر دی۔ وہ ہلکے ہلکے کر رہی تھی۔ اسی وقت عاطف کمرے میں داخل ہوا۔

”ارے تم رورہی ہو۔ آج تو خوشی کا دن ہے۔“

”میں کاشف کی حالت پر رورہی ہوں۔ دیکھتے نہیں اس کی کیا حالت ہو گئی ہے۔ اپنی تصویر سے کتنا مختلف ہو گیا ہے۔ نہ جانے کس راہ سے گزرا ہے، کس حال میں رہا ہے۔“

”واقعی دکھ تو مجھے بھی ہوا ہے۔ گھر کا آرام ملے گا۔ تم اور ماں جی اس کا خیال رکھنے کے لیے ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کیا کر رہا ہے وہ؟“

”ماں سے باتیں کر رہا ہے۔ چلو تم بھی چلو۔“

”اتنے دن بعد آیا ہے۔ کرنے دو ماں سے باتیں۔ اب تو وہ آگیا ہے باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔“ ملکہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوئی پھر آئندہ کے اندیشے عاطف کے سپرد کر دیے۔ ”میرا خیال ہے کاشف کو کسی لڑکی سے محبت ہے، اس کی بے وفائی نے اس کا یہ حال کیا ہے۔ آپ ذرا کاشف سے پوچھیے گا تو۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ میں اس کو اعتماد میں لوں گا۔ شاید کچھ بتا دے۔ یہ بھی معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ لندن گیا بھی تھا یا نہیں۔“

”اس کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ وہ ہر لڑکی میں اس لڑکی کو تلاش کر رہا ہے جو اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں، مجھے دیکھتے ہی اس کے لہجے میں کیسی نئی آگئی تھی جیسے وہ لڑکی میں ہی ہوں۔“

”ہاں انداز تو ایسا ہی تھا۔“

”آپ لوگ نہ سمجھیں مگر میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ اس کی ذہنی حالت کو سمجھ سکتی ہوں۔ اگر اس کے تصور نے مجھے وہ لڑکی سمجھ لیا تو طنز کے ایسے تیر برسائے گا کہ اس گھر میں میرا رہنا مشکل ہو جائے گا۔ کل کو وہ کھل کر بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ لڑکی میں ہی ہوں۔ اگر اس نے کہہ دیا اور آپ نے یقین کر لیا تو میں تو کہیں کی نہ رہوں گی۔“

”اس ذہنی کیفیت کا کوئی علاج بھی تو ہوگا۔“

”علاج تو یہی ہے کہ وہ لڑکی اسے مل جائے۔ نہیں تو اسے ذہنی امراض کے اسپتال میں داخل کرانا پڑے گا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی اس بے وفا کو بھول جائے۔ آپ اس سے بات کر کے تو دیکھیں۔ اس کے جواب سے یہ اندازہ تو ہو جائے گا کہ اس کا مرض کس منزل پر ہے۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔“

”یہ بات گھر میں نہ کیجیے گا۔ ایسے لوگ گھر کے بڑے شیر ہوتے ہیں۔ پتھنے چلانے لگے گا۔ گھر سے باہر اسے یہ احساس ہوگا کہ وہ گھر سے باہر ہے۔“

”آج رات تو میں یوں بھی چاہوں گا کہ وہ آرام سے سو جائے۔ کل ہی کوئی بات کروں گا۔“

”اتنے دنوں میں تو وہ رات کی نیند بھی بھول گیا ہوگا۔ میں آپ کو ایک ٹیبلٹ دیتی ہوں وہ اسے کھلا دیجیے گا۔ اس کے بغیر اسے نیند نہیں آئے گی۔“

”میں یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ اتنے دن کس دوست کے پاس رہا۔ اس دوست سے شاید یہ معلوم ہو سکے کہ وہ لڑکی کون تھی۔ اگر اس کی شادی نہیں ہوئی تو میں ان غلط فہمیوں کو دور کر دوں جو دونوں کے درمیان پیدا ہو گئی ہیں۔“

”ایسا ہرگز مت کیجیے گا عاطف۔ وہ دوست اول تو آپ کو کچھ بتائے گا نہیں۔ اگر بتا بھی دیا تو کاشف کو بھی ضرور بتائے گا۔ اس ذہنی کیفیت کے لوگ یہ ہرگز برداشت نہیں کرتے کہ ان کا راز کسی پر ظاہر ہو۔ اس کا راز کھل گیا تو وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔ وہ خود ہی بتا دے تو الگ بات ہے۔ پاگل آدمی کسی کا بھی نام لے سکتا ہے۔“

وہ رات آرام سے گزر گئی۔ صبح ہوئی تو ملکہ وقت سے پہلے ہی اسپتال چلی گئی۔ اسے یہ ڈر تھا کہ کاشف جاگ گیا تو سوال جواب ضرور کرے گا۔ عاطف بھی جا چکا تھا اور وہ اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ شام کو بھی جان بوجھ کر دیر سے گھر آئی لیکن یہ سوچ ضرور رہی تھی کہ بکرے کی ماں

دشت امکان

کب تک خیر منائے گی۔

وہ گھر پہنچی تو یہ سن کر خوش ہوئی کہ عاطف اسے لے کر باہر گئے ہیں۔ وہ اپنی ساس کے پاس جا کر بیٹھ گئی کہ شاید کاشف سے متعلق کون بات معلوم ہو۔ معلوم ہوا تو صرف اتنا کہ کاشف کہہ رہا تھا، وہ پھر یہاں سے چلا جائے گا۔ اس گھر میں اس کے دوست نہیں دشمن رہتے ہیں۔ اس کا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔

اس کی ساس روٹی جا رہی تھیں اور اسے بتاتی جا رہی تھیں۔ ملکہ نے انہیں تسلی دی کہ ایسے لوگ توجہ حاصل کرنے کے لیے ایسی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ قوت ارادی ایسی کمزور ہو جاتی ہے کہ جو کہتے ہیں وہ بھی نہیں کرتے۔ آپ فکر نہ کریں رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ اپنے کمرے میں چلی آئی اور سوچنے لگی کہ کچھ دن کے لیے اپنے مکے چلی جائے لیکن پھر اس نے یہ فیصلہ بدل دیا۔ کاشف کو حقائق کا سامنا کرنا چاہیے۔ وہ کچھ دن تڑپے گا، طنز کے تیر برسائے گا۔ پھر سمجھ جائے گا کہ حقیقت وہی ہے جو وہ دیکھ رہا ہے۔ پھر اسی پر اکتفا کر لے گا کہ میں اس کی نہیں، اس کے سامنے تو ہوں۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ میں نے یہ تو نہیں چاہا تھا کہ ہم دونوں مل کر بھی دور رہیں۔ اس نے کمر بند کیا اور اپنی بے بسی پر خوب روئی۔

وہ خوشی اور دکھ کے عجیب دورا ہے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ خوشی یہ تھی کہ کاشف زندہ ہے۔ دکھ یہ تھا کہ وہ اس کا ہے یہ سوچتا بھی اب اس کے لیے گناہ تھا۔ عاطف نے بھی کہا تھا کہ دو کشتیوں پر سفر کرنا کتنا مشکل ہے۔ اس کا احساس اسے اب ہو رہا تھا۔

اس کے آنسو ابھی خشک نہیں ہوئے تھے کہ عاطف آگیا۔ اس نے پھر دیکھا کہ ملکہ کی آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھک گئی ہیں۔

”ملکہ، کہیں تمہیں کاشف کا لوٹ آنا گوارا تو نہیں لگا ہے؟“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ دیو تو بھائیوں کے گلے کا ہار ہوتے ہیں۔ میری آنکھیں تو اس کی حالت دیکھ کر بھیگ جاتی ہیں۔ یہ میری محبت نہیں تو اور کیا ہے۔“

”تم اس کے سامنے جانے سے بھی گریز کرتی رہی ہو۔“

”صرف اس لیے کہ اس کے زخم مجھے دیکھ کر مزید ہرے ہو جائیں گے۔ وہ سوچے گا، اس کا کھلونا ٹوٹ گیا ہے۔ تمہیں تمہاری مطلوبہ چیز مل گئی۔ میں اس کے

سائے کم ہی جاؤں تو اچھا ہے۔“

”ایک گھر میں رہ کر ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”آپ کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات کر دی تو آپ ہی کو برا لگے گا۔“

”میں سمجھ رہا ہوں اس کی کیفیت کو۔“

”پھر آپ چلیں، میں آتی ہوں۔“

”میں کھانے پر تمہارا انتظار کروں گا۔“

اس نے اپنا حلیہ درست کیا۔ کچھ سانس کو قابو میں کیا اور باہر نکل آئی۔ سب لوگ ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھ چکے تھے۔ وہ بھی اس طرف بڑھ گئی۔ کاشف نے اسے بیٹھتے ہوئے دیکھ کر فقرہ اچھالا۔

”دیکھو تو اماں، کون آیا ہے۔ بھائی جان کی دلہن کی بھی ہمت ہو گئی کہ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں اور وہ بھی گھر میں۔ یہ تو بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھاتی رہی ہوں گی۔“

”خبردار، یہ بھائی جان کی دلہن نہیں تیری بھابی ہے، بھابی کہا کر۔“

”اتنا کڑوا لفظ مجھ سے نہیں بولا جاتا۔“

”تمہاری بڑی بھابی ہے کچھ تو لحاظ کرو۔“

”میں تو انہیں ملکہ ہی کہوں گا۔ یہ نام کچھ زبان پر چڑھ گیا ہے۔“

”شریر کہیں کا۔ دو دن ہوئے نہیں اور نام زبان پر چڑھ گیا۔“

”یہ نام ہے ہی اتنا پیارا، میں کیا کروں۔“

”اچھا خاموشی سے کھانا کھاؤ۔“

”خاموش ہی تو ہوں۔ ان سے کہو یہ بھی تو کچھ بولیں۔ سنا ہے تقریریں تو یہ بہت اچھی کرتی تھیں۔“

”وہ کیا بولے۔ تم تو آتے ہی اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔“

”وقت وقت کی بات ہے اماں۔ کبھی کوئی پیچھے پڑتا ہے کبھی کسی کے پیچھے پڑنا پڑتا ہے۔“

عاطف خاموشی سے سن رہا تھا۔ ملکہ کے بدن میں کاٹو تو خون نہیں تھا۔ کھانے کے دوران بھی وہ ذمہ داری سے بولتا رہا۔ ملکہ نے جیسے تیسے کھانا ختم کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کچھ دیر بعد عاطف کمرے میں آیا۔ اس کی کیفیت صاف بتا رہی تھی کہ وہ کسی الجھن کا شکار ہے۔ الجھن کیا وہ بھی کاشف کی باتوں سے پریشان ہوا ہوگا۔ وہ سمجھ رہی تھی

”یہ میرا نہیں میرے رقیب کا گھر ہے۔ میں اسے قتل کروں گا۔“ وہ پھر بھڑک اٹھا۔
”میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میرا سہاگ مجھ سے مت چھینو۔“
”پھر میں خودکشی کر لوں گا۔“
”میرے لیے یہ بھی ناقابل برداشت ہوگا۔“
”اس لیے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔“
”میری محبت میرا شوہر ہے۔“

”ایک بار..... بس ایک بار کہہ دو کہ تم اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری دنیا سے نکل جاؤں گا۔ بس ایک بار کہہ دو کہ میرے جانے کے بعد تم مجھے یاد کیا کرو گی۔ ایک بار میری ملکہ بس..... ایک بار۔“

ملکہ سے اس کا یہ گڑگڑانا دیکھا نہیں گیا۔ اس نے سوچا کاشف کا علاج یہی ہے کہ اس وقت اس کا دل رکھا جائے۔ وہ میرے پیار میں موت کے قریب پہنچا ہے، میرا پیار ہی اسے زندگی کے قریب لائے گا۔ اس نے اس کا دل رکھ لیا۔

”میں تم سے کل بھی محبت کرتی تھی آج بھی کرتی ہوں، تمہاری یاد ہر وقت میرے دل میں آباد رہے گی۔“
”مجھے معلوم تھا تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ مسٹر عاطف نے اپنی دولت کا لالچ دے کر تمہارے ماں باپ کو مجبور کر دیا ہوگا۔ تم سے یہ شکایت ضرور ہے کہ تم مجبور کیوں ہو گئیں لیکن خیر، میرے لیے یہ اطمینان ہی بہت ہے کہ تم بیوی اس کی ہو لیکن محبت تو مجھ ہی سے کرتی ہو۔ چلو گھر چلو، تمہارا شوہر آ گیا ہوگا۔“

ملکہ نے گاڑی واپس موڑ لی۔ گھر کے قریب پہنچ کر ملکہ کو دھچکا سا لگا۔ عاطف کی جیب گھر کے باہر کھڑی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی کام سے گھر آیا ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عاطف کو یہ معلوم ہو کہ وہ کاشف کے ساتھ کہیں گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ گاڑی کو آگے لے جائے لیکن اسی وقت وہ اپنے گارڈ کے ساتھ گھر سے باہر نکلا، ملکہ کو گاڑی روکنی پڑی۔ عاطف نے کاشف کو اس کی گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھا اور کچھ پوچھے بغیر ہی جیب میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ ملکہ کا دل بند ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس کا مطلب ہے شیطان کہیں آس پاس تھا۔ شک اپنا کام کر گیا۔ عاطف نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم لوگ کتنے کہاں تھے۔ اس نے سوچا ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا۔ عاطف

اب تمہاری گستاخیاں مزید برداشت نہیں کر سکتی۔“
”صرف یہ کہو گی..... یہ نہیں پوچھو گی کہ میں اسے ان کہاں رہا، کیا کرتا رہا؟“
”یہ پوچھنا میرا کام نہیں، ان لوگوں کا کام ہے جو تمہاری ماں ہے، تمہارا بھائی ہے۔“
”تم سے میرا کوئی رشتہ نہیں؟“
”کبھی ہوگا مگر اب میں تمہارے بھائی کی بیوی ہوں۔ تمہاری بھابی ہوں۔“
”کیا بھائی بھائی لگا رکھی ہے۔ اسے عاطف کہو صرف عاطف..... جس نے تمہیں مجھ سے چھین لیا لیکن میں زیادہ دیر تمہیں اس کے پاس نہیں رہنے دوں گا۔“
”کیا کرو گے؟“

”ایسی ایسی کہانیاں سناؤں گا کہ عاطف تمہیں کھڑے کھڑے طلاق دیدے گا۔“
”کتنی گھٹیا سوچ ہے تمہاری۔“

”پھر میں اور کیا کروں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ”میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔ مارا مارا پھرا ہوں تمہارے لیے۔ یہ دیکھو کیا حالت ہو گئی ہے میری۔ اب تم ملی ہو تو کتنی ہو عاطف کی دلہن ہو۔ قتل کر دوں گا میں اسے۔ پھر تم اس کی دلہن نہیں رہو گی۔ میری دلہن بنو گی، میری۔ ایک گھر میں دو چاہنے والے نہیں رہ سکتے۔ تمہیں ہم دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔“

”اب انتخاب کا وقت گزر گیا۔ یا تو مجھے بھول جاؤ یا یہاں سے چلے جاؤ۔“
”نہ میں جاؤں گا، نہ تمہیں بھولوں گا۔ تم میری ہو اور میری رہو گی۔“

”کاشف اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لو۔“
کاشف کی عجیب حالت تھی۔ کبھی غصے میں آ کر چیخے لگتا تھا کبھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا رویہ برا حال تھا۔

”کیا کروں ملکہ۔ بہت چاہتا ہوں تمہیں بھول جاؤں لیکن بھول نہیں پاتا۔ اب یہ میرے اختیار میں رہا ہی نہیں۔“

”تمہیں یہ اچھا لگتا ہے کہ مجھے تکلیف پہنچاؤ۔“
”تمہاری بے وفائی کی یہی سزا ہے۔ میں نے جو تکلیف اٹھائی ہے اس کا حساب کون دے گا۔“

”اب تم اپنے گھر میں رہو۔ سب تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔“

”کاشف کی زندگی تو برباد کر دی اس نے۔“
”زندگی ایک جگہ رک نہیں جاتی۔ وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ ہم سب کو مل کر کاشف کے زخموں پر مرہم رکھنا ہے۔ وہ اگر مجھ پر اپنا غصہ اتار رہا ہے تو اتارنے دیجیے۔ آہستہ آہستہ نارمل ہو جائے گا لیکن اگر آپ نے مجھ پر شک کیا تو مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوگا۔“

ملکہ نے اپنی دانست میں اپنی بے گناہی کا یقین دلا دیا تھا لیکن وہ یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ کسی دن یہ سیلاب آئے گا اور سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔ کاشف کی اذیت پسندی کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتی ہے۔ کہیں اس کا پاگل پن عاطف کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ وہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ عاطف کب کا سوچ چکا تھا۔

کاشف کی گستاخیاں روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ بات کرتے کرتے اچانک کوئی جملہ ایسا کہہ دیتا کہ اس کی ساس چونک کر اس کی طرف دیکھتی۔ عاطف گھر میں ہوتا تو اس کی آنکھوں میں شک کے سائے لہرانے لگتے۔ اب کاشف کی باتوں میں شرارت نہیں بغاوت نظر آنے لگی تھی۔ اب ضروری ہو گیا تھا کہ ملکہ اس سے بات کرے۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر اس سے یہ کہے کہ یہ کیسی محبت ہے؟ وہ مجھے تکلیف پہنچا کر کیوں خوش ہو رہا ہے۔ اس سے کہے کہ اب وہ اپنی محبت میں آزاد نہیں۔ اب وہ شادی شدہ عورت ہے۔ اب وہ کسی کی عزت ہے۔

ملکہ نے موقع دیکھ کر کاشف کو اپنے کمرے میں بلایا۔

”کیا تم میرے ساتھ کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر چل سکتے ہو۔“

”میرے ساتھ بھاگ رہی ہو؟ کیا عاطف سے بھی دل بھر گیا۔ واہ بھی واہ! بھابی ہو تو ایسی۔“

”جو اس مت کرو۔ میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں جو یہاں بیٹھ کر نہیں ہو سکتی۔“

”چلے باہر چلے۔ ہم تو آج بھی آپ کے غلام ہیں۔“

وہ اسے کسی ہوٹل میں بھی لے جاسکتی تھی لیکن وہ سب کے سامنے تماشا نہیں بن سکتی تھی۔ کیا خبر اس کا رویہ کیا ہو، وہ کتنی زور سے چیخے۔ اس نے ایک ویمن جگہ پر لے جا کر گاڑی روک دی۔

”کاشف، یہاں میں تمہیں یہ کہنے کے لیے لائی ہوں کہ اگر تم حواس کھو چکے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔ میں

لیکن خود کیوں پوچھتی۔
وہ سونے کے لیے لیٹے تو عاطف نے اس سے عجیب سا سوال کر دیا۔

”کاشف اور تم ایک دوسرے کو پہلے سے تو نہیں جانتے؟“

”یہ بات آپ پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔ دہرانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ سنجیدہ ہیں۔ آپ کے بھائی کو آئے ہوئے دو دن ہوئے نہیں کہ مجھے اس الزام کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔“

”جان، میرا مطلب تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔ میں تو یہ پوچھ رہا تھا کہ پھر وہ ایسی باتیں کیوں کرتا ہے؟ تم نے دیکھا، کھانے کی ٹیبل پر وہ کیا باتیں کر رہا تھا۔“

”میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ ایسی باتیں کرے گا۔ اسے کسی کے پیار میں بے وفائی ملی ہے۔ اب وہ ہر لڑکی کو اسی بے وفائی کے روپ میں دیکھ رہا ہے۔ جو باتیں وہ اس لڑکی سے کہنا چاہتا ہے، وہ مجھے دیکھ کر کر رہا ہے۔ ایک دن وہ یہ بھی کہہ دے گا کہ وہ لڑکی میں ہوں۔“

”اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔“
”یہ بھی پاگل پن کی ایک قسم ہے۔ اس میں کمی بھی آسکتی ہے، اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا اس سے معلوم تو کریں۔ ذرا پتا تو چلے میرا اندازہ کتنا صحیح ہے۔“

”میں نے معلوم کیا تھا۔“
”کیا کہتا ہے؟“

”بس اتنا بتایا کہ اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی تھی۔ وہ اسے آزمانے کے لیے کچھ دن کے لیے اس سے دور ہو گیا۔ واپس آیا تو اس لڑکی نے خودکشی کر لی تھی۔“

”وہ آدھا جوتا رہا تھا۔ مرنے والوں کا صبر آ جاتا ہے۔ اگر اس لڑکی نے خودکشی کر لی ہوتی تو وہ اس لڑکی کو نہیں خود کو قصور وار کہتا۔ اس لڑکی نے کہیں اور شادی کر لی ہوگی۔ اس لیے وہ اتنا تلخ ہو گیا ہے۔“

”یہ آج کل کی لڑکیوں کو بھی نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ محبت کسی سے کرتی ہیں، شادی کہیں اور کر لیتی ہیں۔“

”لڑکیاں بھی کیا کریں۔ وہ تو بے چاری مجبور ہوتی ہیں۔ ماں باپ کے دباؤ میں آ جاتی ہیں اور پھر کاشف کی بھی تو غلطی ہی تھی۔ وہ لڑکی اسے ڈھونڈتی رہی ہوگی اور شادی کا وقت آ گیا ہوگا۔“

آئیں گے تو وہ انہیں مطمئن کر دے گی۔

عاطف قدرے دیر سے گھر آیا۔ انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خفا ہے۔ وہ اس کے لیے چائے لے کر آئی تو سامنے ہی بیٹھ گئی۔

”آپ نے یہ تو نہیں پوچھا کہ میں کاشف کو لے کر کہاں گئی تھی؟“

”ضرورت محسوس نہیں کی۔“

”اس لیے تو نہیں کہ آپ کو اس کے ساتھ میرا جانا اچھا نہیں لگا۔“

”مجھے صرف یہ اچھا لگا کہ چلو میں نہ سہی، کاشف تو خوش ہو گیا ہوگا۔“

”میں اسے ساتھ لے کر اس لیے گئی تھی کہ شاید مجھے کچھ بتا دے کہ وہ لڑکی کون تھی جس کے عشق میں وہ پاگل ہو رہا ہے۔“

”شاید بتا دیا اس نے کیونکہ میں اس کے پاس سے ہوتا ہوا آ رہا ہوں، خاصا مطمئن نظر آ رہا ہے جیسے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔“

”مطمئن صرف اس لیے نظر آ رہا ہوگا کہ کسی نے اس سے محبت سے بات کی ورنہ اس نے بتایا تو مجھے بھی کچھ نہیں۔“

”چلو پوچھتی رہنا۔ کسی دن تو کچھ بتا ہی دے گا۔“

”آپ مجھ سے ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ میں کاشف کے مسئلے پر بہت پریشان ہوں۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کی پریشانی بہت جلد ختم ہو جائے گی۔“

”سچ! کیا بات ہو گئی ہے۔“

”کہہ رہا تھا کہ میں اب زندگی کی طرف لوٹ کر آنا چاہتا ہوں۔“

”کمال ہے! جو کام کوئی نہیں کر سکا، وہ تم نے کر دکھایا۔“

ملکہ نے اس کے بعد کوئی بات کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ عاطف کے دل میں شک کا بیج پیدا ہو گیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ احساس شاید زائل ہو جائے۔

اب تو ہر بات وقت پر چھوڑی جاسکتی تھی۔ اس نے بھی ایک ٹھنڈی سانس بھری اور چائے کا کپ اٹھا کر باہر

نکل گئی۔

وہ رات اس طرح گزری کہ عاطف اپنے ذہن میں کچھ سوچ رہا تھا، ملکہ اپنے دل سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔

دوسرے دن وہ اسپتال جانے کے لیے تیار ہوئی تو ساس کے پاس بھی چلی گئی۔ یہ دیکھنا بھی تھا کہ کاشف سوکر اٹھا یا نہیں۔ اس کی ساس نے اسے بتایا کہ وہ کچھ بتائے بغیر گھر سے نکل کر کہیں گیا ہے۔ ملکہ کو یہ سن کر خوش ہوئی۔ اس کا مطلب ہے، وہ زندگی کی طرف لوٹنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ جب کوئی بیمار شخص باہر کی دنیا میں دلچسپی لینے لگے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہا ہے۔

اب کاشف نے یہی معمول بنالیا تھا۔ صبح ہوتے ہی کہیں نکل جاتا اور شام کو لوٹ آتا۔ ماں کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر باتیں کرتا۔ ملکہ سے آنا سامنا ہو جاتا تو ایک آدھ طنزیہ فقرہ اچھال دیتا مگر اب ان فقروں میں وہ تلخی نظر نہیں آ رہی تھی۔ عاطف بھی کچھ مطمئن سا نظر آ رہا تھا جیسے ملکہ کی طرف سے جو کدورت اس کے دل میں آ گئی تھی، وہ نکل گئی ہو۔

تقریباً پندرہ دن گزر گئے تھے۔ وہ حسب معمول اسپتال میں تھی۔ عاطف کا فون آیا کہ وہ فوراً گھر پہنچے۔ یا اللہ خیر! اس کی زبان سے نکلا اور وہ گھر پہنچ گئی۔ گھر کا تو منظر ہی دوسرا تھا۔ اس کی ساس بے ہوش تھیں۔ ڈاکٹر ان کے سر پر ہاتھ بیٹھا تھا۔ عاطف کسی کو فون کر رہا تھا۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ اس کی ساس کی طبیعت خراب ہوئی ہوگی اسی لیے اسے بلایا گیا ہے۔

”کاشف گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔“ عاطف نے فون کرنے کے بعد اسے بتایا اور ایک پرچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ وہ پرچہ ہے جو اس کے بچے کے نیچے سے ملا تھا۔“ اسی پرچے سے یہ معلوم ہو سکا کہ وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

اس نے لکھا تھا ”بھائی جان! میں بہت سوچ سمجھ کر آپ کے گھر سے جا رہا ہوں۔ گھبرائیے مت، میں مروں گا نہیں۔ ہو سکا تو کبھی واپس بھی آ جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں کوئی میرا انتظار کتنا کرتا ہے؟ آپ سکون سے رہیں۔ میرا کیا ہے، کہیں بھی رہ لوں گا۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کیجئے گا۔ میرے نہ ہونے ہی میں سب کا بھلا ہے۔ اپنی دلہن سے کہیے گا، وہ بہت خوبصورت ہیں۔“

”آپ کہیں تو میں دن کی ڈیوٹی کرالوں؟“

”میں تو تمہاری صحت کے لیے کہہ رہا تھا۔“

ملکہ نے دن کی ڈیوٹی کرانی۔ دند کی میں بھر لہلہل آگئی۔ دونوں ایک ساتھ باہر نکلتے، ایک ساتھ واپس آتے۔ شام کو کہیں نہ کہیں کھوٹے نکل جاتے یا کوئی سہان آ جاتا تو وقت گزر جاتا۔ بچے ہوتے تو شور مچاتا۔ یہاں کون شور مچانے والا تھا۔ دل شور مچاتا تو عاطف ماں جی کی باتیں لے کر بیٹھ جاتا یا کبھی کبھی کاشف کو یاد کر لیتا۔

☆☆☆

کاشف کو گئے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں بہت سی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ عاطف کی ترقی ہو گئی تھی۔ وہ ڈپٹی کمشنر ہو گیا تھا۔ کاشف کی باتیں اب اس گھر میں نہ ہونے کے برابر ہوتی تھیں۔ ملکہ نے کاشف کی تصویر ڈرائنگ روم سے ہٹا دی تھی۔ تنہائی اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ ابھی تک اولاد سے محروم تھی بلکہ اب تو یقین ہو گیا تھا کہ یہ محرومی عمر بھر کی ہے۔

یوں بھی گزرتی تو بہت تھی لیکن تقدیر کے ترش میں ابھی ایک تیر اور باقی تھا۔ شہر میں ہنگامے پھوٹ پڑے تھے۔ یہ ہنگامے روز بہ روز شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ عاطف کے عہدے کی نوعیت ایسی تھی کہ اسے ان علاقوں کا دورہ کرنا پڑتا تھا جہاں یہ ہنگامے ہو رہے تھے۔ وہ اس روز بھی دورے پر نکلا تھا کہ مستعمل بھوم کے درمیان گھر گیا۔ اس کے ساتھ چلنے والی پولیس اسکوڈ اور مستعمل افراد کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ ایک آوارہ گولی نے عاطف کو پہچان لیا۔ سینے پر عین دل کے پاس آ کر لگی۔ اسے اسپتال لے جایا جا رہا تھا کہ اس نے راستے ہی میں دم توڑ دیا۔

وہ اسپتال میں تھی جب یہ خبر پہلی۔ اس نے اسے افواہ سمجھا لیکن نی دی کھولا تو یہ خبر چل رہی تھی۔ شہر میں ایک ہی سرکاری اسپتال تھا۔ تھوڑی دیر میں اس کی لاش بھی پوسٹ مارٹم کے لیے آگئی۔ وہ تو بے ہوش تھی۔ اسے کچھ خبر ہی نہیں ہوئی، کب پوسٹ مارٹم ہوا، کب اس کی میت گھر پہنچ گئی۔

شام تک اس کی طبیعت بھی سنبھل گئی تھی۔ کچھ رشتے دار تھے، وہ بھی آگئے تھے۔ ملکہ کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ عباد اللہ خاں تھے، شام تک وہ بھی آگئے۔

عاطف کی میت پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ دفن کر دی گئی۔

اپنے آلس چلا جاتا۔ اسپتال سے آئے کے بعد وہ کچھ دنے ساس کے پاس بیٹھ جاتی۔ ان کی حالت بھی اب ایسی تھی کہ کاشف کے سوا انہیں کچھ یاد نہیں تھا۔ وہ اس پر غور ہی نہیں کر رہی تھیں کہ بھو بیٹے میں کیا تباہ ہے۔

عاطف کی مصروفیات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کاشف کی تلاش میں دن رات ایک کیے دے رہا ہے۔ ملکہ کو ملال تھا تو یہ کہ جس شوہر کے لیے اس نے محبوب کھو دیا وہی اس سے بدگمان ہے۔ عاطف کے روئے نے اس کے دل میں کاشف کے لیے جگہ پیدا کر دی تھی۔ کبھی کبھی تنہائی میں بیٹھ کر اس کی یاد میں چند آنسو بہا لیتی تھی یا ڈرائنگ روم میں جا کر اس کی تصویر دیکھ لیتی تھی۔ ابھی تک کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی تھی کہ کچھ دل بہل جاتا۔

چار پانچ مہینے گزرے تھے کہ اسپتال میں اس نے اپنی ڈیوٹی رات کی کرالی۔ وہ رات کو اسپتال میں رہتی، صبح جان بوجھ کر اس وقت گھر پہنچتی جب عاطف جا چکا ہوتا۔ دن میں اپنی نیند پوری کرتی۔ گھر میں قیامت کا سناٹا تھا۔

اس سناٹے میں ایک دن عاطف کی چیخیں گونجیں۔ پھر لوگوں کی آوازیں شامل ہوئیں۔ وہ اٹھ کر بھاگی۔ یہ آوازیں اس کی ساس کے کمرے کی طرف سے آرہی تھیں۔ وہ اس کمرے کی طرف دوڑی اور سب کچھ سمجھ گئی۔ اس کی ساس بیٹے کے غم میں دنیا سے چلی گئی تھیں۔ اس نے نبض دیکھی، آنکھیں چیک کیں، دل کی دھڑکن ڈھونڈنے کی کوشش کی اور سر جھکا لیا۔

سانا اور گہرا ہو گیا تھا۔ ماں کی تدفین کے بعد تو عاطف کو لگا ہو کر رہ گیا۔ ملکہ نے ایسی دل جوئی کی کہ غلط فہمیوں کی برف کھٹکنے لگی۔ کاشف کے غم نے بھی اب صبر کا منہ دیکھ لیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ سناٹا باتیں کرنے لگا۔

”تم رات کی ڈیوٹی کیوں کر رہی ہو؟“

”اسپتال میں رش کم ہوتا ہے۔ آرام مل جاتا ہے۔“

”رات کی ڈیوٹی تمہاری صحت پر برا اثر ڈالے گی۔“

”تھوڑی بہت نیند اسپتال میں پوری کر لیتی ہوں۔ کام تو نرسیں سنبھالتی ہیں۔“

”جب تک اماں تھیں، ان سے باتوں میں وقت کٹ جاتا تھا۔ اب تو راتیں مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔“

مطمئن بھی ہو گئی کہ عاطف ابھی غصے میں ہیں۔ غصہ اترے گا تو اپنی غلطی کا خود احساس ہوگا۔ اس اطمینان کے باوجود سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ وہ سوچتی رہی اور سوچتے سوچتے نیند آگئی۔

صبح سوکر ابھی تو عاطف جا چکا تھا۔ اسے بھی اسپتال جانا تھا۔ اس نے اپنی ساس کا بلڈ پریشر چیک کیا، نبض دیکھی اور اسپتال چلی گئی۔ اسپتال سے ایک نرس اس نے گھر بھیج دی کہ گھر جا کر اماں کی دیکھ بھال کرے۔

دوسری رات بھی عاطف ماں کے کمرے میں اور وہ اپنے کمرے میں سوئی۔ دونوں کے درمیان بات چیت بھی بند ہو گئی تھی۔

تین چار دن بعد عاطف اس کے کمرے میں آیا۔

”آپ کوشش ضرور کریں لیکن یوں پریشان نہ ہوں۔ اللہ اچھا کرے گا۔“

”اخبار میں اشتہار بھی دے چکا ہوں۔ دوسرے شہروں کی پولیس بھی اسے تلاش کر رہی ہے لیکن کچھ پتا نہیں چلتا۔“

”ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ مل جائے گا۔ وہ کوئی بچہ نہیں ہے۔ اپنا خیال رکھ سکتا ہے۔“

”سچ بتاؤ اس دن تمہاری اس سے کیا بات ہوئی تھی؟“

”کیا تم نے اس سے کہا تھا کہ گھر چھوڑ کر چلے جاؤ؟“

”میں کیوں کہوں گی۔ وہ مجھ پر بوجھ نہیں تھا۔ وہ میرا کیا بگاڑ رہا تھا، بے ضرر سا آدمی!“

”وہ جو پرچہ چھوڑ کر گیا ہے، اس نے اس میں لکھا ہے کہ میرے نہ ہونے ہی میں سب کا بھلا ہے۔ میں یہ معلوم کر کے رہوں گا کہ اس گھر میں وہ کون ہے جس کی وجہ سے اس کے چلے جانے میں سب کی بھلائی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہاں رہے اور میرا سکون غارت ہو۔ میرا سکون تو تم ہی ہو ملکہ بیگم!“

”اس گھر میں بس یہی ایک الزام تھا جو رہ گیا تھا۔ وہ بھی مجھے مل گیا۔“

”ابھی تو یہ محض الزام ہے مگر میں اس کی تحقیق کو ضرور پہنچوں گا۔“

ملکہ اور عاطف میں ایسی کشیدگی ہوئی کہ مہینوں کسی نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ ماں کو شک نہ ہو جائے اس لیے وہ اپنے کمرے میں سونے لگا تھا لیکن دونوں کے بستر الگ تھے۔ دونوں کی مصروفیات ایسی تھیں کہ کسی کو شک بھی نہیں ہوا۔ ملکہ اسپتال چلی جاتی، عاطف

ملکہ نے ڈاکٹر کو رخصت کیا کہ اب وہ آگئی ہے، انہیں سنبھال لے گی۔ عاطف پھر کسی کو فون کرنے لگا۔

”کس کو فون کر رہے ہیں؟“

”میں کنویں میں جال ڈال دوں گا اور اسے تلاش کروں گا۔ اس سے پوچھ کر رہوں گا، وہ کس راز کو چھپا رہا ہے۔ وہ کون ہے جس کی وجہ سے گھر چھوڑ کر گیا ہے۔“

یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ وہ کسی بحث میں الجھتی۔ وہ ساس کی حیار داری میں لگ گئی اور عاطف فون کرنے بیٹھ گیا۔ وہ ایسے عہدے پر تھا کہ پولیس سے دن رات کا واسطہ پڑتا تھا۔ اس کے لیے یہ کام کوئی مشکل نہیں تھا۔ ماں کے ہوش میں آنے کے ساتھ ہی وہ خود بھی نکل کھڑا ہوا تھا۔

دن بھر وقفے وقفے سے ماں کی خیریت دریافت کرتا رہا۔ وہ اپنی ساس کو ہوش میں لے آئی تھی اور انہیں مطمئن کرنے کے لیے ان سے کہہ دیا کہ عاطف اسے لینے کے لیے گئے ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے لیکن ان کے آنسو تھے کہ تمہیں کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اندھیرا ہونے کے بعد عاطف گھر میں داخل ہوا اور سیدھا ماں کے کمرے میں پہنچا۔ ملکہ بھی وہیں تھی۔ عاطف نے ماں کو تسلی دی کہ وہ کاشف سے مل کر آ رہا ہے۔ کسی کے کہنے میں آ کر گھر چھوڑ دیا تھا، جلد آ جائے گا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ملکہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ سخت غصے میں اور جھنجھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”میں نوکر سے کہہ کر کھانا لگواتی ہوں۔ اتنی دیر میں آپ فریش ہو جائیں۔“ ملکہ نے کہا اور اٹھ کر جانے لگی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”تھوڑا سا تو کھا لیجئے۔“

”تم نے کھالیا؟ نہیں کھالیا تو کھالو اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاؤ۔ میں یہیں اماں کے کمرے میں سو جاؤں گا۔ رات میں انہیں کسی چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”آپ کہیں تو میں بھی یہیں سو جاؤں؟“

”تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔“

ملکہ نے اس کی زبان سے ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ اس کا مطلب ہے شک کا پودا جوان ہو گیا ہے؟ وہ ماں کے کمرے میں بھی، لڑ بھی نہیں سکتی تھی لیکن طیش ایسا آیا کہ سیدھی اپنے کمرے میں آئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں سمجھ رہی تھی خطرہ لگ گیا مگر سیلاب تو اب آنے والا ہے جو سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔ پھر یہ سوچ کر

سناتا ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور وہ عدت کے دن پورے کر رہی تھی۔
عدت کے دن گزرے تو اسے آئندہ کی زندگی کا خیال آیا۔ سرکاری مکان تھا، وہ خالی کرنا تھا۔ الگ مکان لے بھی لیتی تو بھی اکیلی یہاں رہ کر کیا کرتی۔ اس نے سوچا میکے جا کر رہے۔ اکیلا گھر پڑا ہے، باپ کی خدمت بھی کرے گی اور وہیں کسی اسپتال میں نوکری کر کے انسانیت کی خدمت بھی کر لے گی۔

عاطف کی موت کے بعد اس نے پیسے مل گئے تھے کہ وہ اپنا اسپتال بھی کھول سکتی تھی۔ یہی سب سوچ کر اس نے محراب پور چھوڑ دیا اور اپنے باپ کے پاس چلی آئی۔
☆☆☆

”نانی اماں، آپ مجھے کہنے سے کیوں منع کرتی ہیں؟“ پانچ سالہ آصف اس سے پوچھ رہی تھی۔
”اس لیے کہ میری چاندی بیٹی کے ہاتھ پاؤں مٹی میں ہو جاتے ہیں۔“

”ارے واہ، خود تو جب چھوٹی ہوں گی تو خوب کھیلتی ہوں گی، مجھے منع کرتی ہیں۔“
”میں کتابوں سے کھیلتی تھی۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو یہی کتابیں پڑھنے لگی۔ بس یہ کھیل تھے ہمارے۔“

”اسی لیے آپ کی آنکھوں پر چشمہ لگ گیا۔ نا بھئی نا، میں تو کتابیں نہیں پڑھوں گی۔“
”ہنگی، یہ چشمہ کتابیں پڑھنے سے تھوڑی لگا ہے۔“
”پھر کیسے لگا ہے؟“

”جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو چشمہ خود بخود لگ جاتا ہے۔“
”جب آپ کھیلتی نہیں تھیں تو آپ کے دوست بھی نہیں ہوں گے۔“

”دوست کس کے نہیں ہوتے؟“
”آپ کا تھا..... کیسا تھا؟“
”بہت پیارا، بالکل شہزادوں کی طرح۔ نیلی آنکھیں، بھورے بال۔ شرارتی ایسا تھا کہ چپ جاتا تھا، میں بے چاری ڈھونڈتی رہتی تھی، بڑا شریر تھا وہ۔“

”اتنا اچھا تھا تو آپ اس سے شادی کر لیتیں۔“
”اب تو بدتمیزی پر اتر آئی ہے۔ چل بھاگ یہاں سے۔“

ڈانٹ سن کر آصف بھاگ کھڑی ہوئی۔ ملکہ نے چشمہ اتار دیا اور آنکھوں کے بیٹے کو شے صاف کر کے

دوبارہ چشمہ پہن لیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ آج اسپتال کے وزٹ کے لیے بھی جانا ہے۔ اس نے ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کو کہا اور خود تیار ہونے لگی۔
ملکہ محراب پور سے آ کر اپنے گھر میں آباد ہو گئی تھی۔ اپنے ساتھ لائی ہوئی دولت کا اس نے یہ مصرف نکالا تھا کہ ایک خالی پلاٹ خرید کر اسپتال تعمیر کرا لیا تھا جس میں غریبوں کا مفت علاج ہوتا تھا۔

یہاں آنے کے کچھ ہی دن بعد اس کے والد کا انتقال ہو گیا تو اپنی بھائی دور کرنے کے لیے اپنی ایک بیوہ رشتے دار سسٹنی کو اپنے پاس بلالیا۔ وہ اپنے ساتھ دس سال کی بیٹی تانیہ کو بھی لائی تھی۔

دس سال اور گزر گئے۔ تانیہ بیس سال کی ہوئی تو ملکہ نے بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کی۔ آصف اسی تانیہ کی بیٹی تھی جو چھینوں میں ملکہ کے پاس رہنے آئی ہوئی تھی۔

☆☆☆
اتنی بڑی حویلی اندھیرے میں ڈوبی کھڑی تھی۔ گاؤں میں لائٹ آچکی تھی لیکن حفاظت کی غرض سے حویلی کے باہر اندھیرا رکھا جاتا تھا، صرف پہرے داروں کی آوازیں گونجتی تھیں۔ یہ ایک دور افتادہ پہاڑی مقام تھا جہاں دشمنیاں پالنے کے سوا کسی کو کوئی کام ہی نہیں تھا۔ اس لیے یہ سب کرنا پڑتا تھا۔ اس کے لیے یہ علاقہ نیا تھا نہ یہ حویلی۔ وہ کچھ نہیں تو بیس سال بعد یہاں آیا تھا۔ بہت کچھ بدل گیا تھا لیکن قدیم روایات ابھی زندہ تھیں۔ حویلی کے صدر دروازے سے ہٹ کر دیوار پر دو مشعلیں روشن تھیں جو اس وقت بھی جلا کرتی تھیں جب وہ یہاں سے گیا تھا۔ اسے معلوم تھا، اب کیا کرنا ہے۔ اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر زور سے آواز لگائی۔

”شاہ رخ خاں کا دوست اس سے ملنے آیا ہے۔ کوئی باہر آئے۔“

دو بندوق بردار فوراً باہر نکلے۔ تلاشی لی کہ آنے والا شخص کوئی ہتھیار وغیرہ تو ساتھ نہیں لایا ہے۔ جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا تو اسے لے کر مہمان خانے میں چلے گئے۔ یہاں مشعلیں بھی روشن تھیں اور جدید طرز کے بلب بھی جل رہے تھے۔ یہ نیا اضافہ تھا ورنہ وہ جب یہاں پہلے آیا تھا تو صرف مشعلوں پر گزرا رہا تھا۔

رات اتنی نہیں گزری تھی کہ شاہ رخ خاں سو جاتا۔ اسے جیسے ہی اطلاع ملی کہ کوئی مہمان آیا ہے، وہ فوراً

دشت امکال

مہمان خانے میں پہنچ گیا۔ پہاڑی لوگوں کی یادداشت مہمانوں کے معاملے میں بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ دیکھنے کی ہر قسم کی نورا پیمان کیا۔

”ارے..... کاشف رحمن..... میرا پار، میرا دوست!“ شاہ رخ خاں زور سے چیخا اور دونوں ہتھم کھٹا ہو گئے۔ لگتا تھا گلے نہیں مل رہے، کشتی لڑ رہے ہیں۔

”ابے کتنے برسوں بعد آیا ہے۔“ شاہ رخ خاں نے بیٹھے ہوئے کہا ”اور یہ کیا تم تو کہتے تھے تم کبھی بوڑھے نہیں ہو گے۔ بال آدھے سفید ہو گئے۔ آنکھوں پر چشمہ آ گیا۔“

”اپنی طرف تو دیکھ۔ مجھ سے زیادہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ میں تو پھر بھی جوان ہوں۔“
”یہ تو اس وقت پتا چلے گا جب کل شکار پر چلیں گے۔“

شاہ رخ خاں اسے لے کر ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کمرے کی آرائش جدید طرز پر کی گئی تھی۔ نہایت شاندار ڈبل بیڈ پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف صوفے رکھے ہوئے تھے۔ فرش پر نہایت قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ یہ کمران بیرونی مہمانوں کے لیے آراستہ کیا گیا تھا جو حویلی میں مہمان کے طور پر آتے تھے۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد باتوں کا دفتر کھل گیا۔
”یہ بتاؤ، برسوں بعد وطن کی یاد کیسے آگئی؟“
”ایک شادی میں شرکت کے لیے آنا پڑا۔ شادی تو اس بے وفا شہر میں ہے جہاں میں اجڑا تھا لیکن یہ سوچ کر پہلے محراب پور آ گیا کہ بھائی جان سے مل لوں گا لیکن وہاں تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ یہ تو مجھے اندازہ تھا کہ میری ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی ہوگی لیکن یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ بھائی جان بھی مجھے چھوڑ جائیں گے۔ سرکاری بنگلا تھا اس میں اب کوئی اور کمشنر صاحب رہتے ہیں۔“

”تمہارے بھائی کے بیوی بچے.....!“
”ان کا مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں یہاں اس لیے آ گیا کہ تمہارا شکر یہ ادا کرنا تھا۔ جس وقت میں گھر سے نکلا تھا، اسی کمرے میں آ کر ٹھہرا تھا۔ تم نے مجھے پناہ دی تھی۔ بھائی جان مجھے مجرموں کی طرح ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ یہاں نہ چھپتا تو فوراً پکڑا جاتا۔ پھر میں ایک صاحب کی وساطت سے لندن چلا گیا۔ اپنا بزنس سیٹ کر لیا ہے۔ مزے سے گزر رہا ہوں۔“

”میرا بیٹا بیس سال کا ہو گیا۔ اب تک شادی کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ اس کی شادی کو تو ایک سال ہو گیا ہے۔ بیٹیاں بھی اپنے اپنے گھر کی ہو گئیں۔ اب تیری خاطر میں دوسری شادی کروں گا، اس میں آ جانا۔“

کاشف کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ انتظار کرنے والے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اب تو میں ہی رہ گیا ہوں انتظار کرنے کو۔ دوسرے دن وہ شاہ رخ خاں کے ساتھ شکار پر چلا گیا۔ ارادہ تو یہی تھا کہ اسی دن روانہ ہو جائے گا لیکن شاہ رخ نے اسے ضد کر کے روک لیا۔ شکار سے واپس آیا تو اتنی تھکن ہو چکی تھی کہ اسے ایک رات اور رکتا پڑ گیا۔ یہ رات بھی آدمی باتوں میں گزر گئی۔ صبح ہوتے ہی جیب آگئی۔ اس کے سج باڈی گارڈ دوسری جیب میں سوار ہوئے۔ شاہ رخ خاں اور کاشف جیب میں سوار ہوئے اور اسے گاؤں سے باہر بہ حفاظت پہنچا کر واپس آ گئے۔

وہ محراب پور آیا اور یہاں سے ملکہ کے شہر کی طرف روانہ ہو گیا جسے وہ بے وفا شہر کے لقب سے یاد کرتا رہا تھا۔ شہاب اللہ خان نیازی شہر کے رئیس ترین آدمی تھے۔ اسی (80) سے تجاوز کر چکے تھے لیکن اب بھی لوجوانوں سے زیادہ پھر تیلے تھے۔ کاشف کے محسن تھے۔ جب وہ گھر سے نکلا تھا اور کچھ دن شاہ رخ خاں کے پاس رہ کر وہاں سے رخصت ہوا تھا تو شہاب خان ہی تھے جنہوں نے اسے سہارا دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس کے لندن جانے کا بندوبست کیا تھا بلکہ ایسے وسائل بھی مہیا کیے تھے

کہ لندن پہنچے ہی اس نے اپنا کارڈ باریٹ کر لیا تھا۔ اب ان کے پوتے کی شادی تھی جس میں انہوں نے کاشف کو مدعو کیا تھا اور اسے آنا پڑا تھا۔

دیکھے بھالے راستے بھی اس کے لیے اجنبی ہو گئے تھے لیکن شہاب خان کے گھر پہنچتا کون سا مشکل تھا۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا، کچھ اپنی یادداشت پر زور ڈالا اور پہنچ گیا۔

☆☆☆

شادی اور ویسے کا دعوت نامہ آیا رکھا تھا۔ ملکہ شادی میں نہیں جاسکی تھی لیکن ویسے میں جانا ضروری تھا۔ اس لیے بھی کہ شہاب خان خود دعوت نامہ دینے آئے تھے بلکہ اس لیے بھی کہ شہاب خان نے اس کے اسپتال کے لیے ایک بڑی رقم چندے میں دی تھی۔ اس احسان کا تقاضا تھا کہ وہ ضرور جائے۔ اس نے تقریبات میں جانا تقریباً ختم کر دیا تھا لیکن یہاں جانا ضروری تھا۔

ویسے کا اہتمام شہاب خان نے اپنی کوٹھی پر ہی کیا تھا۔ وہ گاڑی سے اتری تو شہاب خان اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان کی بیٹی نے ملکہ کا ہاتھ تھاما اور مہمانوں کے ہجوم سے ہوتے ہوئے اسے ایک نشست پر بٹھا دیا۔ وہاں بیٹھی ہوئی خواتین سے اس کا تعارف کرایا اور معذرت کر کے خود بھیڑ میں گم ہو گئی۔ ملکہ نے کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ادھر ادھر نظر دوڑائی اور مہمانوں کا جائزہ لینے لگی۔ اچانک اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی جس کے بال بھورے تھے، کچھ سفید ہو گئے تھے۔ آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے یہ پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کاشف ہے۔ پہلے تو اس نے سوچا انجان بن جائے لیکن وہ خود کو اتنا بڑا دھوکا نہ دے سکی۔ وہ اپنی نشست سے اٹھی اور اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بھی نظر اٹھا کر دیکھا۔

”تم کاشف ہی ہونا؟“

”ملکہ تم.....!“

دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کو خراج ادا کر رہی تھیں۔ دونوں چپ تھے جیسے کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو۔ پھر ملکہ نے ہمت کی۔

”تمہیں خبر ہے، ہم کتنے لمبے عرصے بعد مل رہے ہیں۔“

”ہاں، جب محبت سے محبت ہو جائے تو شرط محبوب باقی نہیں رہتی۔ میں نے بھی یہ دن تمہارے تصور میں کاٹ

دیے مگر اب تھک گیا ہوں۔ بڑھاپے میں چھڑی کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”تمہیں معلوم ہے، ان گزرے سالوں میں کیا، کیا ہو گیا ہے؟“

”میں یہاں آنے سے پہلے محراب پور گیا تھا۔ سب چلے گئے۔ یہ بتاؤ، تمہیں میرا انتظار تھا؟“

”یہ انتظار ضرور تھا کہ تمہیں ایک مرتبہ زندہ دیکھ لوں۔ یہ بتاؤ، شادی کی؟“

”کس سے کرتا۔ یہ تو مجھے اب معلوم ہوا کہ تم بھائی جان کی دلہن نہیں رہیں پھر سے ملکہ بن گئی ہو۔“

”میں اب بھی ملکہ نہیں عاطف کی بیوہ ہوں۔“

”مجھ سے شادی کر دو گی؟“

”فاصلے محبت کے قاتل نہیں ہو سکتے۔ میں تم سے ہمیشہ محبت کرتی رہوں گی لیکن ہم شادی کے لیے بنے ہی نہیں تھے۔“

”شاید!“

”رہ کہاں رہے ہو؟“

”میں تقریباً پچیس سال پہلے لندن چلا گیا تھا۔ اپنا بزنس ہے۔ یہ کارڈ رکھ لو۔ کبھی بھی فون کر لیا کرنا۔ میں تمہیں گاہم سے قریب ہوں۔“

ملکہ نے کارڈ لیتے ہوئے پوچھا ”کب جا رہے ہو؟“

”کل صبح کی فلائٹ ہے۔“

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کھانا شروع ہو گیا۔ وہ دونوں کھانے کی میز پر ساتھ ساتھ گئے۔ کھانے کے دوران بھی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ سوٹ ڈش کی طرف گئی تھی۔ واپس آئی تو وہ غائب تھا۔ شریر کی یہ عادت اب تک نہیں گئی۔

یہیں کہیں چھپا ہوگا اور میری بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہو رہا ہوگا۔ وہ اسے ڈھونڈتی رہی۔ جان بوجھ کر دیر تک رکی لیکن وہ اسے نہیں ملا۔

گھر پہنچ کر اس نے اس کا دیا ہوا کارڈ نکالا، کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس کے پرزے کر ڈالے۔

”میں عاطف کی بیوی نہیں رہی، بیوہ تو اسی کی ہوں۔ کسی اور کو فون بھی کیوں کروں..... کہ شادی سے پہلے بھی تو کاشف کو فون کرتی رہی تھی..... وہ اس وقت نہیں ملا تو اب اسے فون کر کے کیا کرنا.....“

تو اب اسے فون کر کے کیا کرنا.....“

